الفرقان

لکھنؤ

مدیر

محمد منظور نعمانی

سالانہ چندہ
ہندوستان سے: -/15
پاکستان سے: -/22
بنگلادیش سے: -/16
قیمت فی کاپی 1/40

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ممالک غیر سے سالانہ چندہ
بحری ڈاک سے ا پونڈ ۱ شلنگ
ہوائی ڈاک سے
امریکہ و کناڈا سے ۳ پونڈ
یورپ و افریقہ سے ۲½ پونڈ
ممالک عربیہ (مشرق وسطیٰ) سے ۱½ پونڈ

جلد (۴۴) | بابت جنوری ۱۹۷۶ء مطابق محرم الحرام ۱۳۹۶ھ | شمارہ (۱)

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۱۰ تاریخ تک آجائے ورنہ اگلا پرچہ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۱۰ تاریخ تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان اور کتب خانہ الفرقان کے پتہ میں تبدیلی: الفرقان کا دفتر اور کتب خانہ لکھنؤ ہی میں کچہری روڈ سے دوسری جگہ منتقل ہوگئے ہیں —— اب پتہ یہ ہے:-

۳۱- نیا گاؤں مغربی (نظیر آباد) لکھنؤ (یو-پی)

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، اڈیٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱- نیا گاؤں مغربی۔ لکھنؤ سے شائع کیا۔

افتتاح جلد چہل و چہارم (۴۴)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات۔

حق جل مجدہ کے فضل وکرم سے الفرقان کی عمر کے ۴۳ سال پورے ہو گئے اور اس شمارہ سے چوالیسواں (۴۴) سال شروع ہو رہا ہے۔ اس طویل مدت میں اس کے ذریعہ اللہ کے دین کی اور امت مسلمہ کی اگر کوئی خدمت ہوئی تو وہ صرف اللہ کی توفیق سے — اس لیے حمد وشکر اسی کا اور صرف اسی کا حق ہے۔

اس موقع پر اپنی اس تقصیر وکوتاہی کا اعتراف بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "معارف الحدیث" کا سلسلہ جو ربیع الآخر ۱۳۹۳ھ سے منقطع ہے، ابھی تک جاری نہیں ہو سکا۔ ناظرین کرام بھی دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے وہ جلد ہی پھر شروع کیا جا سکے اور سوچے ہوئے پروگرام کے مطابق تکمیل کو پہنچ جائے اور اس عاجز کے لیے وسیلۂ نجات اور ذخیرۂ آخرت بنے۔

قریباً تین سال سے الفرقان کی ترتیب اور تیاری کے سارے کاموں کی ذمہ داری راقم سطور ہی پر رہی حتیٰ کہ کاپیوں اور پروف کی تصحیح بھی خود ہی کرنی پڑتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے دوسرے ضروری کاموں کے لیے وقت نہیں ملتا اور فطری طور پر صحت بھی متاثر ہوتی ہے۔ اب مجبوراً یہ فیصلہ کیا ہے کہ "الفرقان" کے ان کاموں کے لیے جو خاص مجھ پر موقوف نہیں ہیں، کسی صاحب کا وقت لیا جائے اور ان کو مناسب معاوضہ پیش کیا جائے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی طے کیا ہے کہ آئندہ سے الفرقان بجائے رف اخباری کاغذ کے عمدہ سفید چکنے کاغذ پر چھاپا جائے۔

ان دونوں فیصلوں کی وجہ سے مصارف میں جو اضافہ ہوگا اس کے لیے یہ طے کرنا پڑا ہے کہ سالانہ بدل اشتراک بارہ روپے کے بجائے پندرہ (۱۵) کر دیا جائے۔ امید ہے کہ ناظرین کرام اس کو قبول فرمالیں گے۔

"انتخاب نمبر" گزشتہ دو سالوں کی طرح انشاء اللہ اس سال بھی شائع ہوگا۔ اس کے بارہ میں تفصیلی اعلان خدا نے چاہا تو آئندہ کیا جا سکے گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

———— عتیق الرحمٰن سنبھلی

[ستمبر کے شمارہ میں جو رمضان مبارک میں شائع ہوا تھا مولوی عتیق الرحمٰن سلمہم اللہ کا ایک مکتوب ناظرین کرام نے ملاحظہ فرمایا ہوگا جو انگلستان سے لکھا گیا تھا۔ آج انہی صفحات میں ان کا ایک دوسرا مکتوب ہدیہ ناظرین کیا جارہا ہے جو انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی حفیظ نعمانی کے نام مدینہ منورہ سے لکھا ہے]

مدینہ منورہ۔ ۳ر نومبر ۷۵ء

میاں حفیظ! جس خدائے رحمٰن نے مجھ بے بال و پر کے لیے انگلستان جیسے دور دراز ملک کے سفر کا غیب سے سامان فرمایا تھا اس کے مزید کرم نے اپنی درگہ عالی تک بھی پہنچا دیا۔ پہلے سے سوچے ہوئے پروگرام کے مطابق ۲۴ر ستمبر کو مصر ایرلائن کی فلائٹ میں لندن سے جدّہ کے لیے ریزرویشن کرایا تھا۔ مگر یہ دیکھ کر کہ ان دنوں میں وہاں سردی بڑھ جانے کا جو خیال تھا، جس کی بنیاد پر یہ پروگرام بنا لیا تھا، وہ واقعہ نہیں بنا اور سردی میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا، میں نے ارادہ کر لیا کہ ابھی اور ٹھیروں اور کم از کم ۱۵ر اکتوبر تک رُک جاؤں۔ کیونکہ طبیعت پر بڑا اچھا اثر پڑ رہا تھا۔ اس نئے ارادے کے مطابق ریزرویشن کینسل کرا دیا۔ مگر رمضان کے عمرہ کی سعادت شاید مقدر ہو چکی تھی اس نئے ارادہ کے تین چار ہی دن کے بعد سے موسم نے رنگ بدلنا شروع کر دیا اور پھر سردی میرے لیے ناقابل برداشت ہو گئی۔ ۲۴ر تاریخ بالکل قریب آچکی تھی چاہا کہ کینسل کرائی ہوئی سیٹ دوبارہ مل جائے تو پتہ چلا کہ اب تو ۱۰ر اکتوبر تک کوئی سیٹ نہیں ہے۔ دوسری ایرلائنوں سے رجوع کیا تو قریب ترین تاریخ میں شام ایرلائن کی فلائٹ مل سکتی تھی۔ یعنی ۲۶ر ستمبر کو۔ چنانچہ اسی کو اختیار کیا جس سے بیروت اور دمشق ہوتا ہوا ۲۷ر کی صبح کو جدہ اُترا۔

روانگی سے ایک دن پہلے (یعنی ۲۵ر کو) مولانا عبداللہ عباس صاحب (مکہ معظمہ) کو تار دیدیا تھا۔

اس کے بروقت مل جانے میں کوئی شبہ ہی نہیں تھا۔ اسی دن ملنے والے گھر کے خط سے اباجی کا مکہ معظمہ تشریف لے جانا بھی معلوم ہو گیا تھا۔ سجاد میاں کے بھی وہاں ہونے کا تقریباً یقین تھا۔ اس لیے بالکل اطمینان تھا کہ جدہ کے ہوائی اڈے پر کوئی نہ کوئی ضرور ملے گا۔ مگر باہر نکل کر آیا تو میدان صاف تھا۔ خیریت تھی کہ اباجی نے جدہ کے محمد نور، نور ولی صاحب کا پتہ لکھ بھیجا تھا۔ ٹیکسی کر کے سیدھا اُنہی کے مکان پر پہنچا اُن کا مکان اور دوکان سب ایک جگہ ہے مگر دوکان بھی بند اور مکان کا دروازہ بھی بند۔ نو بجے کا وقت تھا۔ تعجب ہوا کہ مکان کا دروازہ اب تک کیوں بند ہے۔ پتہ چلا کہ یہاں لوگ رمضان میں رات کو کم ہی سوتے ہیں اور اس کے بجائے یہ سونے کا وقت ہے۔ میں مجبور تھا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ اور پھر ٹھکانا ملا لمبا چوڑا مکان ہے۔ اہل خانہ اوپر رہتے ہیں۔ نیچے صرف ملازم تھا جس نے دروازہ کھولا۔ دو ایک گھنٹے کے بعد اہل خانہ میں سے بعض لوگ آئے مگر یہ نہ محمد نور صاحب تھے اور نہ محمد ولی عبد اللہ صاحب جنھیں مجھ سے اور مجھے اُن سے غائبانہ واقفیت تھی (محمد نور صاحب مدینہ منورہ میں تھے اور محمد ولی عبد اللہ صاحب مکہ معظمہ میں تھے)، بلکہ ان کے بھائی بھتیجوں اور بیٹوں میں سے تھے۔ ایک گونہ اجنبیت ہی کا سا احساس رہا بس اتنا کام چلا کہ مولانا عبد اللہ عباس کے یہاں ٹیلیفون اُن کے ذریعہ ہو سکا۔ معلوم ہوا کہ مولانا کسی ضرورت سے جدہ ہی گئے ہوئے ہیں۔ اور اباجی مع سجاد میاں کے مدینہ منورہ میں ہیں۔ فون پر بات کرنے والے سجاد میاں کے ایک ساتھی تھے جو میرے ہی لیے مکہ معظمہ میں رہ گئے تھے۔ یہ تھے مولوی وقار عظیم ندوی جو گذشتہ سال ہی سے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں تعلیم حاصل کرنے گئے ہیں۔ اُن سے مولانا کے یہاں پہنچنے کے لیے جو اتہ پتہ پوچھا تو ہوائی اڈے سے نور ولی صاحب کے مکان تک لانے والے ٹیکسی ڈرائیور کا تجربہ سامنے رکھتے ہوئے اکیلے مولانا کے یہاں پہنچ جانا آسان نہیں نظر آیا۔ چوبیس گھنٹے سے مسلسل سفر، روزہ اور یہاں کی شدید گرمی نے یوں ہی خستہ اور پست ہمت کر رکھا تھا چنانچہ میاں وقار صاحب کی اس پیشکش کو قبول کرنے ہی میں عافیت سمجھی کہ وہ جدہ آ جائیں اور پھر میں ان کے ساتھ مکہ معظمہ جاؤں۔ وہ ظہر بعد آئے تو مولانا عبد اللہ صاحب بھی ساتھ تھے جدہ ہی میں انھیں مل گئے تھے۔ مولانا کے ساتھ خواتین تھیں اس لیے مولوی وقار صاحب کو اپنا بھی قائم مقام کر کے تشریف لے گئے۔ ہم دونوں نے عصر بعد ذرا وقت ٹھنڈا ہو جانے پر چلنا طے کیا۔ اس طرح مولوی وقار صاحب کی معیت میں مغرب کے قریب مولانا عبد اللہ صاحب کے یہاں پہنچنا ہوا۔ اور اللہ مولانا کو بہت ہی جزائے خیر دے بالکل گھر کا سا آرام ملا۔

اور دستر خوان میرے گھر سے بہت بڑھا ہوا۔

عمرہ کا احرام تھا۔ تراویح وغیرہ سے فارغ ہو کر اور تھوڑا سا آرام کر کے مولوی وقار کے ساتھ عمرہ کی ادائگی کے لیے حرم شریف گیا۔ باب السلام سے داخلہ کا شرف حاصل کیا اور چند قدم کے بعد آنکھیں عظمت و جلال کی اس تصویر کے دیدار سے منور ہونے لگیں جسے بیت اللہ کہتے ہیں طواف کیا۔ اور دوگانۂ طواف کی شکل میں خاص خانۂ کعبہ کے روبرو عمر کی پہلی نماز پڑھنے کی سعادت حاصل کی۔ وقت ایسا تھا کہ پروانوں کا ہجوم کم تھا اس لیے طواف میں یمین اللہ (حجر اسود) کو بوسہ دینے کا موقع بھی ملا۔ گو بہت جھجک ہوئی کہ اپنے گنہگار لب اس قابل نہیں۔ اسی طرح ملتزم سے چمٹ جانے کا موقع بھی میسر آیا۔ اگرچہ وہاں بھی جھجک کی ہی کیفیت رہی۔ یہاں سے فارغ ہو کر آب زمزم سے سیراب ہونے کی باری تھی۔ یہاں تھوڑی جگہ تھی اس لیے ہجوم زیادہ ملا۔ پھر بھی چند منٹ انتظار کرنے پر جی بھر کے یہ آب حیات پینے کا موقع مل گیا۔ احرام باندھنے سے لیکر ان سارے مراحل تک طبیعت پر ایک بندش کی سی کیفیت مسلط تھی۔ جو مسلسل ملول کر رہی تھی۔ الحمد کہ اس بندش کی گرہ آب مقدس کے ان جرعوں سے کھلی۔ ایمان کے منجمد چشمے میں کچھ حرکت ہوئی اور آنکھوں سے خشکی کا جو گلہ تھا وہ تھوڑی دیر کے لیے جاتا رہا۔ امید ہوئی کہ شاید اس وقت کی دعا میں اللہ کی نظر کرم متوجہ ہوئی ہو گی۔

یہاں سے نکل کر پھر حجر اسود کا استلام کیا اور صفا مروہ کے مابین سعی کے لیے چلے۔ سعی پوری ہوئی بال ترشوائے اور عمر کے اس پہلے عمرہ کی ادائگی مکمل ہو گئی۔ یہ مکہ معظمہ میں رمضان کی تیئیسویں شب تھی۔

جدہ میں یہ معلوم ہونے کے بعد کہ اباجی مدینہ منورہ جا چکے ہیں اور وہیں اعتکاف فرما لیا ہے سوچا تھا کہ عمرہ کر کے مدینہ منورہ چلا جاؤں گا۔ مگر دوسرے دن تھوڑی دیر بعد مدینہ منورہ سے محمد نور صاحب کا ٹیلیفون آیا اور میری آمد معلوم کر کے انھوں نے اباجی کا یہ پیغام مجھے دیا کہ مدینہ منورہ میں اس وقت گرمی بہت زیادہ ہے اس لیے میں ابھی مکہ معظمہ ہی میں ٹھیروں۔ اس لیے تا اطلاع ثانی یہیں قیام کا فیصلہ کیا۔ اندازہ تھا کہ اب رمضان یہیں پورا ہو گا۔ مگر چند ہی دن بعد اباجی کا دوسرا پیغام آ گیا اور ستائیسواں روزہ پورا کر کے ۲۸ ویں شب میں مدینہ منورہ روانگی ہو گئی۔ مولوی وقار صاحب ساتھ تھے۔ فجر کے وقت مدینہ منورہ پہنچ گئے اور تین روزے مدینۃ النبی کے نصیب ہوئے۔ اور عید بھی اسی دربار میں کرنے کی سعادت ملی جس کے لیے حجاز کے اکثر مقامات سے لوگ مع اہل و عیال کے کھنچ کھنچ کر آ جاتے ہیں۔

عید کے دن ظہر بعد اباجی نے واپسی کا پروگرام بنا لیا تھا۔ دوشنبہ ۶ر اکتوبر کو عید ہوئی تھی۔ ۸ر کو اباجی کی سیٹ جدہ سے ریزرو تھی فلائٹ کا وقت علی الصباح تھا۔ درمیان کا دن مکہ معظمہ میں گزارنا تھا۔ اباجی کے ساتھ اگرچہ تین چار دن مل گئے تھے مگر روزے اور اعتکاف کی وجہ سے ایسے رہے کہ جی سیر نہ ہوا تھا۔ ادھر اباجی کی خواہش بھی یہی ہوئی کہ میں اور سجاد وقت رخصت تک اُن کے ساتھ ہی رہیں۔ اس لیے ایک بار پھر عمرہ کا احرام باندھ کر مکہ معظمہ کی سمت روانگی ہوئی۔ ایک عمرہ مکہ معظمہ کے قیام کے دوران ہی میں مزید کر لیا تھا۔ اب یہ تیسرے کی سعادت اباجی کے ساتھ ملی۔ مدینہ منورہ سے نکلنے میں دیر ہو گئی تھی رات کو دیر سے مکہ معظمہ پہنچے اور عمرہ کی ادائیگی صبح پر رکھی۔ دوم شوال کی صبح کو ایک بار پھر بیت اللہ کی زیارت سے آنکھیں روشن ہوئیں۔ بعد عشاء تک مکہ معظمہ ہی میں رہ کر جدہ روانگی ہوئی اور جیسا کہ اباجی سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ جہاز کے وقت کے بارے میں غلط فہمی کی وجہ سے اُن کی روانگی بدھ کو نہ ہو سکی اس کے بجائے جمعرات کو وہ روانہ ہوئے۔

میں یہ بتانا بھول گیا کہ جدہ اترتے وقت تو اپنے عزیز دوست فریدالوحیدی کا پتہ مجھے معلوم نہ تھا۔ مولانا عبداللہ عباس صاحب کے یہاں آکر فون نمبر ملا۔ اور پھر ایک دن وہ ملنے آ بھی گئے۔ اب جب دوبارہ جدہ جانا ہوا تو اباجی کو رخصت کرنے کے بعد میں سیدھا انھیں کے یہاں چلا گیا۔ رات تک بڑا اچھا وقت گزرا۔ رات کو وہیں سے مدینہ منورہ واپسی ہوئی۔ اور تب سے مسلسل اب یہیں در رسولؐ پر پڑاؤ ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

پہلی حاضری کے موقع پر جو تین چار دن قیام رہا وہ یہاں کے تبلیغی مرکز مسجد نور میں رہا۔ کیونکہ سجاد یہاں یہیں مقیم تھے جدہ سے واپسی کے بعد بھی تین چار دن یہیں رہنا ہوا۔ لیکن یہ جگہ حرم نبوی سے دور ہے اور یوں بھی یہاں لمبا قیام بغیر کسی تبلیغی سلسلے کے کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔ اس لیے جدہ سے آتے ہی حرم نبوی کے قریب کسی کمرہ کی تلاش شروع کر دی تھی۔ تیسرے دن یہ کمرہ رباط بنگال میں مل گیا۔ اور چوتھے دن مع سجاد یہاں سے اس میں منتقل ہو گیا۔ ایک مہینے کے قریب یہاں رہتے ہوئے ہو گیا ہے۔ کمرہ بہت اچھا ہے۔ بجلی پنکھے اور دیگر تمام ضروریات کے معقول انتظام کے ساتھ ہے۔ مسجد شریف کا فاصلہ بس دو تین منٹ کا۔ الحمدللہ یہاں آنے کے بعد سے اب تک سوائے ایک نماز عصر کے (جس میں سوتا رہ گیا) ہر وقت کی جماعت میں حاضری کی توفیق ملتی رہی ہے۔ ۱۶ر ذی قعدہ کو یہاں سے مکہ معظمہ روانگی کا قصد ہے اُس وقت انشاء اللہ یہاں کے مسلسل قیام کو چالیس دن ہو جائیں گے۔ خدا کرے ان باقی دنوں میں بھی کم از کم اتنی توفیق شامل حال رہے جتنی اب تک رہی ہے۔ افسوس ہے کہ یہاں طبیعت اچھی نہیں رہی جو شکایتیں گھر پر

رہا کرتی تھیں کافی حد تک لوٹ آئیں۔ اس لیے طویل مدت کے قیام سے جو فائدہ یہاں اٹھایا جاسکتا تھا اُس کا عشر عشیر بھی نہیں اُٹھایا جاسکا۔ مگر کم نصیبی کے اس احساس کے ساتھ جب اس پہلو پر نظر کرتا ہوں کہ یہاں کی مجرد حاضری اور ایک بار عرض سلام ہی کیا کم خوش نصیبی ہے تو خدا کے اس کرم پر سراپا شکر بنجانے کو جی چاہتا ہے اور پھر ہیں مولانا یعقوب اسمٰعیل منشی یاد آتے ہیں جو اس حاضری کا ذریعہ بنے۔ میں نہیں جانتا کہ میں کیسے اُن کے اس احسان کی شکرگزاری کرسکتا ہوں۔ بس اللہ ہی سے دعا کرتا ہوں کہ وہ انھیں دنیا و آخرت کی بہترین نعمتوں سے نوازے۔ ان کی بدولت اہل دنیا کا "کعبہ" اور اہل دین کا کعبہ دونوں ایک ہی سفر میں دیکھ لیے۔ ایک جگہ جسمانی صحت کا بھولا ہوا ذائقہ ایک بار پھر میسر آیا تو دوسری جگہ روحانی صحت سے دامن بھر لینے کے بھرپور مواقع پھیلے ہوئے ہیں لیکن کسی کے پاس دامن ہی نہو تو اس کا کیا علاج؟

مولانا کو میں ۲۶ ستمبر کو انگلستان میں خدا حافظ کہہ کر آیا تھا۔ مگر انھوں نے امکان بتایا تھا کہ شاید جلد ہی دیار پاک میں بھی ملاقات ہو اس امکان کو خدا نے واقعہ ہی بنا دیا۔ یکم شوال کو اباجی کو رخصت کرنے کے بعد جب ہم مکہ معظمہ مولانا عبداللہ عباس صاحب کے یہاں پہنچے تو دیکھا مولانا یعقوب صاحب موجود ہیں۔ ایک دن پہلے مکہ معظمہ پہنچ چکے تھے اور اُسی وقت مولانا عبداللہ عباس صاحب سے ملنے کے لیے آئے تھے اس طرح مولانا سے ایکبار پھر ملنے کا موقع میسر آگیا اور اتفاق کہ وہ جس کام سے آئے تھے اسکے اعتبار سے لیٹ ہوجانیکی وجہ سے ایکبار پھر رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس کے موقع پر آنے کا پروگرام بناکے واپس جانا پڑا۔ اس لیے ایک بار پھر ملاقات کا قوی امکان ہے۔

میں مولانا اور انگلستان میں جگہ جگہ پھیلے ہوئے اُن کے اُن دوستوں اور عزیزوں کو خود ہی اتنی جلدی کہاں بھول سکتا تھا جن کی محبتوں اور عنایتوں کے درمیان ڈھائی مہینے رہ کر آیا تھا کہ مولانا کے ایک بار پھر مل جانے نے اس یاد کے نقوش کو اور بھی تیز کر دیا۔ ان میں سے اکثر کا تذکرہ انگلستان سے لکھے ہوئے اُس خط میں کرچکا ہوں جو الفرقان میں شائع بھی ہوا۔ اُس خط کے لکھنے تک لندن نہیں گیا تھا۔ وہاں اتفاق سے مولانا کے کوئی دوست یا عزیز ایسے نہیں تھے جن کی وجہ سے لندن میں کچھ وقت گزارنے کی سہولت میسر آسکے تو وہاں اپنے مسرور صاحب (صاحب فاران) موجود تھے۔ رمضان سے کوئی پانچ چھ دن پہلے وہاں جانا ہوا اور دس رمضان تک مسرور صاحب کا مہمان رہا۔ اُن کی خاطر مدارات بھی یاد رہے گی۔ اور ان مبارک مقامات پر برابر انھیں یاد دلاتی رہی ہے۔ لندن میں ایک تو رمضان آگئے جن میں مجھ سے لکھنے کا کام بالکل نہیں ہوتا اور پھر لندن کی سیر الگ بہت وقت طلب تھی اس لیے میں وہاں سے تم کو یا کسی اور کو کوئی مفصل

خط نہیں لکھ سکا تھا۔ اور اب بھی اس خط میں مزید گنجائش نہیں رہی ہے۔ بہت طویل ہو گیا۔ مگر اتنا ذکر کر دوں کہ سرور صاحب بہت مصر تھے کہ میں لندن ہی میں رہ جاؤں۔ ایک تو اس لیے کہ انگلستان اور اس میں بھی خاص طور پر لندن میری صحت کے لیے نہایت ساز گار ثابت ہوا تھا۔ دوسرے اس لیے کہ ان کا "فاران" کچھ دن سے بند پڑا ہوا ہے۔ اس طرح اُن کا خیال تھا کہ میرے رہ جانے سے جہاں میری صحت کا لاینحل مسئلہ حل ہو جائے گا وہاں اُن کے فاران کا مسئلہ بھی حل ہو گا اور اُن کی دوسری دینی سرگرمیوں کے منصوبوں میں بھی انھیں ایک معاون مل جائے گا۔ میں نے حجاز مقدس کی حاضری کے اس موقع کے پیش نظر جو ٹکٹ کی مدت آئندہ جون میں ختم ہو جانے کی وجہ سے باقی نہیں رہ سکتا تھا اس وقت تو رک جانے سے معذرت کی۔ مگر وعدہ کر آیا ہوں کہ ان شاء اللہ اس پر غور کروں گا۔ کیونکہ میری صحت کا مسئلہ واقعی ایک مسئلہ ہے جس کا حل یہاں ملا۔ اور دینی خدمت کے لیے بھی خدا اگر توفیق دے تو بلاشبہ یہاں بڑا میدان ہے۔ سرور صاحب کے علاوہ خود میرے معالج ڈاکٹر چودھری کا بڑا اصرار تھا کہ اب یہیں رہ جاؤ۔ اُن کے علاوہ ڈیوزبری اور نیز لندن کے کئی احباب یہی فرمائش کرنے والے تھے۔ دیکھو اللہ کو کیا منظور ہے۔ میں بھی دعا کرتا ہوں اور تم بھی کرو کہ اللہ تعالیٰ باقی زندگی کسی کام میں گزروا دے۔ تقریباً دس سال تو بالکل ہی بیکار ہو گئے۔ اور اب عمر طبعی حساب سے کچھ زیادہ نہیں۔

اللہ کرے تم سب عافیت سے ہو اور خدا مجھے حج کی سعادت نصیب کر کے تم لوگوں سے پھر ملائے۔

والسلام
عتیق

مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

جواہر پارے

اقتباسات مکاتیب رشیدیہ

الحاج مولانا سید کوثر علی مہاجر مکی رحؒ کے نام

(پانچ مکتوبات کے اقتباسات)

حامداً و مصلیاً - از بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہٗ بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند۔ بندہ بعافیت ہے اور شکر حق تعالیٰ کا کرتا ہے۔ بعد انتقال والدہ حافظ مسعود احمد کے انداز طبیعت کا کچھ بدل گیا ہے۔ نہ بظاہر الم (و) صدمہ معلوم ہوتا ہے اور نہ کچھ تندرستی کے آثار ہیں۔ ایک حیرانی سی ہے اور بجز تقدیر پر حوالہ کر کے صبر کرتا ہے۔ اپنے توحشات تو موجب پریشانی تھے، اپنے دوستوں عزیزوں کے ترددات سے بھی رنج ہوتا ہے۔ یہ دنیا سخت دار اُکدار ہے کہ ہرگز رہائی اس سے نہیں ہوتی، بجز اس کے کہ سب امور کو ترک کر کے علاحدہ ہو جاوے۔

والسلام

(مورخہ ۲۷ رجب)

.... آپ کا خط آیا۔ سب حالات بدستور ہیں کوئی لکھنے کے قابل نہیں

لہ بجواب استفسار حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مدظلہٗ نے آپ کے بارے میں ارقام فرمایا ہے "مولانا کوثر علی صاحب حاجی صاحب کے خواص میں تھے اور ان کے حالات سنے بھی بہت مگر اس وقت بالکل یاد نہیں .... الخ"

(مکتوب محررہ ۱۶ شوال ۱۳۹۵ھ)

ہے۔ مولوی خلیل (احمد) و مولوی محمود حسن کو مولوی منور علی میرٹھ لے گئے اور مولوی عبدالسمیع[1] (بیدل رامپوری صاحب انوار ساطعہ) کو ملا دیا۔ پرسوں مولوی عبدالسمیع گنگوہ آئے تھے۔ مجھ سے ملے مگر کوئی عذر معذرت نہیں کیا۔ مصافحہ، سلام، بات ہوئی جیسے پہلے ہوتی تھی۔ مجھ سے تو ملے مگر نہ معلوم کہ حکیم صاحب (ضیاء الدین) سے رام پور میں ملے یا نہیں۔ خود بندہ نے اس امر کو ذکر نہیں کیا۔ نہ انھوں نے کچھ کہا۔ چونکہ وہ میرے پاس قدر ایک گھڑی کے بیٹھے۔ پھر وہ جہاں پہلے اپنے رشتہ داروں میں آئے اور ٹھہرے تھے وہیں رہے زیادہ نوبت کلام کی نہیں آئی .... حکیم احمد سعید[2] نے مجھ کو لکھا کہ مولوی مشتاق حسین[3] نے یہ جواب دیا کہ تقرر منصب میرے اختیار میں نہیں، معذور ہوں۔

---

[1] مولوی عبدالسمیع بیدل رامپوری (ساکن رام پور منہیاران ضلع سہارنپور) آپ ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۴ء میں تحصیل علم کے لیے دہلی آئے اور مفتی صدر الدین خاں سے عربی پڑھی۔ فن شاعری میں میرزا غالب کے شاگرد تھے۔ انوار ساطعہ کے علاوہ ایک نعتیہ دیوان، ایک مختصر رسالہ نور ایمان اور حمد باری آپ کی تالیفات میں سے ہیں۔ تلامذہ غالب مولفہ مالک رام ایم اے کے اندر آپ کا مختصر تذکرہ موجود ہے۔ [2] حکیم سید احمد سعید نقوی امروہی ابن حکیم سید اکبر علیؒ امروہی۔ امروہہ کے مشہور طبی خاندان 'خاندان عسکریہ' کے ممتاز ماہر فن تھے۔ ۱۲۵۶ھ میں امروہہ میں پیدا ہوئے۔ امروہہ اور رام پور میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے والد بزرگوار اور چچا حکیم سید نثار علی مرحوم سے طب عملی کی تکمیل کی۔ اپنے عہد میں امام فن تسلیم کیے گئے۔ نواب آسماں جاہ نے آپ کو حیدر آباد بلایا اور منصب مقرر کیا۔ وہاں افسر الاطباء مقرر ہوئے۔ تشخیص کامل اور معیار الاطباء عربی زبان میں آپ کی بہترین طبی شاہکار ہیں۔ تسکین الانفس فی تحقیق ذیابیطس، تالیفات سعیدیہ، دار العلاج اور رسالہ مرض جذام وغیرہ آپ کی تالیفات ہیں۔ حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ سے بیعت تھے۔ آپ کی بیعت کا واقعہ تذکرۃ الرشید میں تفصیل سے موجود ہے۔ حضرت گنگوہیؒ کے حلقہ بیعت میں جہاں مختلف علوم و فنون کے ماہرین موجود تھے حکیم احمد سعید صاحب امروہیؒ اور حکیم عبدالوہاب صاحب نابینا دہلویؒ فن طب کی عظیم شخصیتیں بھی شامل تھیں۔ آپ نے ۱۳۱۳ھ میں وفات پائی۔ حیدر آباد میں مزار ہے۔ [3] الشیخ الکبیر مشتاق حسین بن فضل حسین الحنفی الامروہوی نواب انتصار جنگ وقار الدولہ وقار الملک۔ آپ ۱۲۵۷ھ میں سراوہ ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ چھ ماہ کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ماں نے ان کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ رکھی۔ مولانا رافت علی امروہیؒ سے آپ نے کچھ کتابیں پڑھیں۔ بعدہٗ رڑکی کالج میں پڑھا۔ ۱۲۹۲ھ میں آپ حیدر آباد چلے گئے اور وہاں مناصب جلیلہ پر فائز رہے۔ تعلیمی سلسلہ میں سر سید احمد خاں مرحوم کے رفقاء میں سے تھے۔ سر سید اور محسن الملک کے بعد علی گڑھ کالج کے انتظام و اہتمام کی

(باقی صفحہ آئندہ پر)

.... آپ کا خط آیا۔ حال دریافت ہوا۔ حق تعالیٰ آپ کو جلد حیدر آباد سے بہ آکر کے مکہ معظمہ پہونچا دیوے۔ آمین۔ دعا سے دریغ نہیں، مگر سب امور اپنے اوقات پر موقوف ہوتے ہیں۔ والدہ سید حسن کو بعد سلام مسنون فرما دیویں کہ بندہ تو تمہارا دعاگو ہے مگر جب خود ہی کچھ نہ ہوں تو دعا میری کیا ہو۔ بہر حال جو کچھ ہے دعا سے دریغ نہیں .... باقی دعوات کرتا ہوں۔ مولوی صاحب! اگرچہ دریا کی طغیانی کا اندیشہ ہے مگر جو سامان ہو جاوے تو مکہ معظمہ چلا جانا (اور) اس دار کفر سے نکل جانا بہت ضرور ہے۔ طمع دنیا کی سزا تھی جو کچھ ہوا۔ یہ حق تعالیٰ کا نہایت احسان ہے کہ تم کو یہاں ہی پاک کر دیا۔ محبت حق تعالیٰ کے واسطے کثرتِ ذکر بہ فراغِ خاطر نہایت موثر ہے۔ مگر کہیں الموو بیٹھ کر ہو سکتا ہے حیدرآباد میں کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب[1] کا حال دریافت ہونے سے مجھ کو سخت ملال ہوا۔ حق تعالیٰ ان کو سب تکالیف سے پاک فرما دے۔ اپنی کچی بے سروپا دعا سے جو کچھ ہے ان کے واسطے دریغ نہیں مگر مقدر کے سامنے کچھ کارگر نہیں ہوتا۔ ان کو میرا سلام مسنون فرما دیویں۔ اور جس کو جا ہو سلام فرما دینا۔ حافظ مسعود احمد کا بھی سلام پہونچے۔ والسلام

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اگرچہ وہ آپ ہی کے ہاتھ میں رہی سیاسیات اور تعلیمات کے حلقوں میں آپ کی شخصیت مشہور و معروف ہے۔ اکابر دیوبند سے آپ کو خاص ربط تھا۔ آپ کی دین داری، دیانت داری، خوش خلقی اور وضع داری خاص و عام میں مشہور ہے ۔۔ آپ کی تین سوانح عمریاں مختلف حضرات نے لکھ دی تھیں۔ ان کے بعد آپ کے صاحبزادے الحاج شتاق[4] ایم اے (آکسن) بار ایٹ لا نے خطوط وقار الملک کو مرتب کیا ہے جن کے ضمن میں آپ کی سیاسی و مذہبی زندگی کے بہت سے پہلو آگئے ہیں۔۔ ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۷ء میں آپ نے وفات پائی۔ امروہہ میں آپ کا مدفن ہے۔ ڈاکٹر محمد اقبال[؟] نے آپ کی تاریخ وفات اس طرح نکالی ؎

برلوح مزار او نوشتم　　　انجام بخیر باخطا بخش

وقار الملک انجام بخیر کے اعداد سے تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے۔ (نزہۃ الخواطر جلد ۸، خطوط وقار الملک)

[1] مولانا عبدالرحمٰن سہارنپوری بن مولانا احمد علی محدث سہارنپوری۔ آپ نے ابتدائی اور متوسط تعلیم کے بعد حدیث شریف اپنے والد ماجدؒ سے پڑھی اور ادب مولانا فیض الحسن سہارنپوریؒ سے۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت تھے۔ ایک عرصہ تک سہارنپور میں درس دیا۔ اس کے بعد علاج معالجہ کی طرف توجہ ہوئی اور آگرہ میں مطب کا سلسلہ قائم کیا۔ وہاں محسن الملک

(باقی برصفحۂ آئندہ)

.... بندہ مع الخیر (ردکر) آپ کا دعا گو ہے۔ آپ یہاں سے کیا کیا وعدے کر کے گئے تھے، اگر کسی امر کا ظہور وقوع نہ ہوا۔ یہ تو دریافت ہوا کہ آپ جلسے کے ساتھ بیمار ہو گئے۔ مگر سال کا سال گزرا کچھ پتا نہ لگا، نہ یہ معلوم ہوا کہ خود تم پر کیا گذری۔ اور نہ حال براہین کے رد و قبول کا دریافت ہوا۔ افسوس یہ ہے کہ مولوی رحمت اللہ (کیرانوی) کی نظر جاتی رہی۔ ورنہ ان سے توقع تھی کہ بغور ملاحظہ فرما کر جس امر پر مواخذہ فرماتے یا قبول فرمانے اطلاع ہو جاتی۔ کیونکہ رسوم بدعات کے باب میں (اور) مجلس مولود کے باب میں جو کچھ مولوی خلیل احمد سلمہٗ نے براہین میں لکھا ہے وہ ہی عقیدہ بندہ کا ہے اور سب ہماری جماعت کا ——— اور جو کچھ انوار ساطعہ میں عبد السمیع نے لکھا ہے وہ افترا و تخریب سے مملوہے کہ حد سے بڑھ گیا ہے۔ تو مولوی رحمت اللہ سے محاکمہ ہو جاتا کہ وہ عالم ہیں۔ مگر یہ امر تقدیر سے پیش آیا کہ ان کی نگاہ جاتی رہی۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ تم کو فرصت نہیں خصوصاً موسم حج میں۔ سو اگر بعد موسم حج کے تم سے ہو سکے اور مولوی صاحب بھی قبول فرمالیں تو ساری انوار ساطعہ اور براہین قاطعہ ان کو بتدریج سنا کر جس جس موقع کو وہ رد و قبول سے مدلل فرمادیں تو کیا عمدہ ہو جاوے۔ ورنہ خیر جو کچھ ہوا، سو ہوا۔ اور جو کچھ ہووے گا سو ہووے گا۔ بندہ کو تو اس کی کچھ پرواہ نہیں کہ خلق بُرا کہے۔ مگر اس امر مخالفت کا ہونا البتہ بُرا معلوم ہوتا ہے۔ اب عبد السمیع کی مخالفت بہت درجہ بڑھ گئی۔ (اور یہ عہد باہم سب مبتدعین کے ہو گیا ہے کہ خواہ کوئی کچھ لکھے رشید احمد کے نام سے سب و شتم کرو ——— ایک شخص نے بمبئی سے یہ لکھا ہے ——— سو واللہ کہ اس کا کچھ اندیشہ نہیں کرتا ہوں۔ مگر اس کی (یعنی مد مقابل کی) مخالفت کا بیان کرتا ہے کہ رات دن اسی فکر میں رہتا۔ اور پورب، دکھن، بنگالہ، پنجاب جہاں جہاں مبتدعین ہیں ان سے مکاتبہ و طرح طرح کے قصے کھڑے کرتا ہے .... والسلام

(مورخہ ۲۲ رمضان پنجشنبہ)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس کے بعد نواب محمد علی نے حیدرآباد جانے کی ترغیب دی۔ حیدرآباد میں آپ خورشید جاہ کے طبیب خاص مقرر ہوئے۔ بعدہٗ اپنے طور پر مطب کرنے لگے۔ آپ کا مطب بہت کامیاب تھا

میر محبوب علی خاں نظام دکن نے دو سو روپے ماہوار آپ کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ آپ کی تالیفات میں ایک کتاب الطب العثمانی ہے اور ایک التحفۃ الخزانیہ جو عربی میں ہے اور منظوم ہے۔ ۱۳۲۲ھ میں آپ کا وصال ہوا۔

(نزہۃ الخواطر جلد ۸)

.... بعد سلام مسنون الاسلام مطالعہ فرمایند۔ بندہ بہ منتہ سبحانہ بخیریت ہے۔ عافیت احباب کی دعا کرتا ہے .... بخدمت مرشدی سلمہ و حافظ احمد حسین سلام مسنون بندہ کا عرض کردیں۔ میں ان حضرات کی خدمات میں خط پہلے بھیج چکا ہوں۔ اب کوئی امر تازہ اس کے سوا نہیں کہ میری آنکھ میں روز بروز نظر کی کمی اور مرض کی زیادتی ہوتی جاتی ہے۔

حکیم عبدالعزیز خاں پنجلاسوی کے نام

برادرم حکیم عبدالعزیز خاں صاحب دام حبکم۔ بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند ـــــ آپ کا خط آیا۔ حال معلوم ہوا۔ بقتضائے خط حاجی محبوب بخش سوداگر کا یہ ہے کہ دسویں تاریخ کو یہاں سے روانہ ہو جاویں۔ مگر میں نے ایک خط بمبئی کو روانہ کیا ہے۔ اس کے جواب کی انتظاری ہے۔ جب وہاں سے جواب آیا تو فوراً تاریخ مقرر کر کے آپ کو اطلاع دوں گا۔ اس وقت آپ سہارنپور تشریف لے آویں اور سامان سب مجتمع کر لینا چاہیے۔ والدہ محمد رمضان مرحوم کا نہ جانا تو آپ کی تحریر سے معلوم ہوا اور ہمشیرۂ خورد کا نہ جانا پہلے خط سے معلوم ہو لیا تھا۔ میاں نجو سر مست خاں رام پور کی راہ سے تشریف لے گئے مجھ سے ملاقی نہیں ہوئے۔ مگر خط آپ کی ہمشیرہ صاحبہ کا میرے نام کا جو تھا وہ نانوتہ مولوی محمد قاسم کو دے گئے تھے۔ وہ میرے پاس پہنچا جس کا مضمون یہ تھا کہ اب کے سال چلنا معلوم نہیں ہوتا۔ اگر ہو سکا تو چلوں گی۔ حاصل اس کا نہ جانا معلوم ہوتا ہے۔

غلہ جو حاجت سے زاید ہے فروخت کرنا مضائقہ نہیں۔ اور اڑھائی سو روپے کے زیور کے شاید اب دو سو روپیہ وصول ہوں۔ اگر کوئی اس پر بطور رہن کے زیادہ دے دیوے تو بہتر ہے۔ مگر سودی نہ ہو۔ بہر حال اگر دو سو روپیہ بھی ہو جاوے تو قدر خرچ کو کافی ہو جاوے گا۔ اس عاجز کا سامان خرچ سفر بفضلہ قدر کفایت ہو گیا۔ ظروف حاجت کے (مطابق) ہونے ضرور ہیں۔ اور مجھ کو ضروریات سفر کی خبر نہیں کہ کیا چاہیے۔ پہلی دفعہ ایسا ہی دوسروں کے سہارے پر گیا تھا۔ اب بھی ایسا ہی تکیہ کر رہا ہوں۔ غرض اشیاء ضروری لینی ضرور ہیں۔ مگر بار گراں کو سفر میں بندہ پسند نہیں کرتا۔ خفیف سامان بہتر ہوتا ہے۔

...........آپ کو تو کسی وجہ سفر نامناسب نہیں۔ رہا یہ بندہ سو پہلے بھی عرض کیا تھا اور اب بھی کہ بسبب مرض سابق کے کم ہمت ہے۔ مگر اب جو کچھ تخفیف ہوتی جاتی ہے تو ہمت قوی ہوتی جاتی ہے۔ اور حضرت کا ارشاد اشتعال سفر دیتا ہے۔ اور ماموں محمد شفیع صاحب جب شوق طلب حضرت مرشدنا سلمہ بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تو کسی طرح چلا ہی جا۔ اگر شدت مرض کا اندیشہ نہ ہوا۔ اور در صورت ارادہ وہ مدد خرچ کی تسلی دیتے ہیں۔ تو اب یوں عزم ہو رہا ہے کہ ذیقعدہ کے اول میں اگر عزم پختہ ہو ہی گیا تو ماموں صاحب سے ان کے وعدہ کا خرچ لے کر چلا جاؤں گا۔.........

.........۱۱ شوال کو قافلۂ دیوبند روانہ ہو رہا ہے۔ ان کو بہ تاکید کہہ دیا ہے کہ وہاں کا سب حال دریافت کر کے مطلع کریں۔ اور جو اوائل ذیقعدہ میں ہمت نہ ہوئی ضعف کے سبب یا جہازوں کے حالات کے سبب تو بس مقیم وطن رہوں گا۔ اپنا تو یوں قصد ہو رہا ہے مگر تم کو ایسی حالت میں سفر ہرگز مناسب نہیں جانتا ہوں۔ اور ماموں صاحب نے کہہ دیا ہے کہ اگر تو جاوے تو جس قدر روپیہ درکار ہوگا مجھ سے طلب کر لینا۔ ان سے روپیہ لینے میں مجھ کو یوں بھی اندیشہ نہیں کہ اگر واپس چلا آیا تو طعن کریں گے۔ کیونکہ وہ تو میرے پدر شفیق کی جگہ ہیں۔ مگر اور کسی سے یہ کرتے شرم آتی ہے اس ہی واسطے جو کوئی پوچھتا ہے۔ یہ کہتا ہوں کہ ابھی میرا قصد نہیں ——— مجھ کو یہ تمنا ہے کہ مر جانا بھی مکہ والوں میں محشور کراوے گا ——— تو حالت مرض میں جانا مناسب نہیں۔ اور مجھ کو روز بروز کچھ قوت اور ہمت بڑھتی جاتی ہے۔ گو بالکل صاف نہیں ہوں۔

والسلام

...........آپ کا خط مژدہ صحت پہونچا۔ بحمد اللہ کہ بہت بہت فرحت ہوئی۔ اور شکر خدا تعالیٰ کا بجا لایا۔ مجھ کو اپنے مرض کا اس قدر رنج نہ تھا جس قدر تردد آپ کی تکلیف کا تھا۔ مگر شکر ہے کہ اس احقر کو بھی شفا ہوئی اور آپ کو بھی حق تعالیٰ نے صحت عطا فرمائی۔ اگرچہ افسوس ہوتا ہے کہ اس سال قدمبوسی حضرت مرشد سے محروم ہوا۔ مگر اس میں بھی بہت سے اسرار و حکمت تھے کہ ہماری نظر اس سے قاصر ہے۔ مولوی خلیل احمد کا خط ۱۵ ذی الحجہ کا لکھا ہوا مکہ سے آیا۔ جمعہ کا حج ہوا اور اس سال بہت مجمع حجاج کا ہوا۔ کرایہ تو ٹکٹ کا سو روپیہ تک ہو گیا تھا۔ اس پر بھی حجاج بمبئی سے واپس آئے۔ ٹکٹ جہاز کا نہ ملا۔ مولوی خلیل احمد اور قافلہ انبیٹھہ کا اور دیوبند کا سب لوگ مکان حضرت مرشدنا میں

فرحت بخش ہوئے۔ حضرت کے مزاج کی خیریت لکھی ہے۔ خود حضرت کا نامہ عالی حجاج کے ہاتھ آوے گا۔ ...... ۲۵ ذی الحجہ روانگی مدینہ طیبہ کی لکھی تھی۔ بہر حال اس خط سے اور دیگر خطوط سے جو کہ ہے آئے خیریت مزاج حضرت مرشدنا اور سب اہل قافلہ و احباب کی معلوم ہو کر فرحت ہوئی۔ ادھر آپ کا فرحت نامہ آگیا۔ اب میرا حال بھی اچھا ہے۔ تو اب ہر طرف سے خبریں سرور کی آتی ہیں۔ دنیا عجب کارخانۂ عجیب ہے کہ گاہ ملال و رنج کا زور ہر طرف سے ہوتا ہے، گاہ سرور کا زور شور رہتا ہے یہ حال انقلاب آثار کیا قابل اعتبار رکھا جاوے۔ معتبر وہ امر ہے جس کو بقا ہووے اور دائما سرور و راحت کا موجب ہووے۔ تو وہ بجز رضائے ہی اپنے مالک تعالیٰ شانہ کے اور کوئی شے نہیں جس کو نصیب ہو جاوے ع تا یار کرا خواہد میلش بکہ باشد۔ رزقنا اللہ تعالیٰ وایاکم۔

.... پچھلے خط میں آپ نے درباب پسر عبد النبی خاں لکھا تھا۔ دعا سے تو دریغ نہیں مگر امراء سے بخدا میرا دل گھبراتا ہے۔ بس وہیں ان کی طمانیت کر دویں کہ دعا کرتا ہے یہاں نہ لاویں۔ دور دور سے ہی ان کو تسلی رکھیں۔ والسلام

.... تم کو جو کچھ مجھ سے خیال ہے وہ محض حسن ظن (ہے) اور میں اپنے اندر کو جانتا ہوں کہ اپنی محبت اور غرض سے پُر ہے۔ تم تو دوسرے درجہ میں ہو۔ الحق کہ خود حضرت مرشدنا سے بھی مجھ کو جیسی چاہیے اعتقاد و محبت نہیں۔ ایک بار خدمت میں حضرت کے بھی عرض کر دیا تھا کہ آپ کے سب خادموں سے اس بات میں کم ہوں، ہر شخص کو کسی درجہ کی آپ کی محبت ہے اور اعتقاد۔ مگر مجھ نالائق کو کچھ بھی نہیں۔ اور یہ اس واسطے ذکر کیا تھا کہ نفاق اپنا ظاہر کر دوں اور حقیقت الحال کو عرض کر دوں۔ سو اب دیکھو کہ جب خود اس شخص مبارک سے کہ جس کے پاپوش کی بدولت دنیا میں عزت ہو رہی ہے اور یہ توجہ آپ کو ہے، اس کے ہی ساتھ اپنا یہ حال ہو تو پھر اور کوئی تو دوسرے درجہ میں ہے۔ بس جب یہ حال خوار اپنا اپنے دوستوں کے ساتھ ہوا تو کس طرح میں بُرا یا اپنے حوصلہ سے زیادہ قبول کروں۔ وہ کسی خیال میں اور اپنا کچھ اور حال تو اب کیا کہوں۔ نہ کہہ سکتا ہوں، نہ چپ رہ سکتا ہوں .... اے برادر دین! تم سے بھی توقع ہے کہ میرے واسطے اس امر کی دعا

کیونکہ حق تعالیٰ مجھ کو اپنی محبت دیوے تو اس کی محبت سے محبت اس کے اولیاء کی ہووے، اور پھر اس محبت سے محبت برادرانِ دینی کی ہووے۔ ورنہ جس قدر میری کوئی شکایت کرے بجا ہے۔ میں خود معترف ہوں اور اپنا حال جانتا ہوں ——

اور یہ بھی ضرور ہے کہ جب آدمی کو رنج ہوتا ہے تو خلاف توقع سے ہوتا ہے کہ جہاں آدمی توقع کسی امر کی رکھتا ہے اور وہ توقع برآمد نہیں ہوتی تو رنج ہو جاتا ہے۔ اس ہی واسطے غیروں سے رنج کم ہوتا ہے۔ اور عزیزوں اور دوستوں سے (زیادہ) رنج ہو جاتا ہے کہ ان سے توقع بھلائی (کی) رکھتا ہے۔ جب بھلائی (توقع) میں نہ آئی، رنج ہوا۔ خلاف توقع ہونے کے سبب دل پر صدمہ ہوا۔ سو چونکہ اپنے آپ سے مجھ کو خود توقع نہیں کہ کسی سے سلوک کروں اور اپنے آپ (کو) قابل دوستی کے نہیں جانتا" تو الحق اگر کوئی میری شکایت کرے تو مجھ کو بُری نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ اپنے آپ کو ایسا ہی جان رہا ہوں۔ اور کسی کی شکایت کو بجا جانتا ہوں کیونکہ میرے افعال ظاہری پر وہ لوگ مغرور (فریب خوردہ) ہو کر وہ مجھ کو اپنا دوست جان گئے۔ پھر جب معاملہ خلاف پیش آیا تو ضرور شکایت ہونی چاہیے ......

.... حضرت کی عنایات سے تو میں دنیا میں سب کچھ مشہور ہو گیا۔ اے خدا! اگر آخرت میں اس کا دسواں حصہ بھی نصیب ہو جاوے تو میری برابر کوئی صاحبِ نصیب نہیں —— مگر چونکہ دنیا ظاہر ہے۔ اور آخرت میں باطن ظاہر ہو جاوے گا۔ وہاں کچھ بھی تو توقع نہیں بن سکتی۔ الٰہی توبہ توبہ!

.... تم نے مولوی پیر محمد خاں سے شکر رنجی کا قصہ لکھا مگر یہ نہ معلوم ہوا کہ کیا وجہ ہوئی؟ باہم شکر رنجی اچھی نہیں۔ گاہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ قصور فہم ہو جاتا ہے۔ بات کچھ ہوتی ہے اور فہم میں دوسری طرح آجاتی ہے۔ تو صفائی عمدہ بات ہے جب آپ ظاہر (صاف) لکھ دیویں اُس وقت پیر محمد خاں سے پوچھوں .... اہل مجلاسہ کی دشمنی پر صبر کرنا لازم (ہے)۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں اپنے واسطے کرتے ہیں۔ مگر ایک نصیحت آپ کو بھی لکھتا ہوں کہ حتی الامکان دوسرے کے فعل کی تاویلِ حسن کرنا اور جہاں تک ہو سکے دوسرے کی بات کو بھلائی پر حمل کرنا اچھا ہے۔ اور تھوڑے سے قصور پر چشم پوشی کرنا عمدہ ہے۔ اس میں آپ کو بہت راحت رہے گی اور دشمن کے فعل کے بدلہ نیکوئی کرنا تو بہت عجیب بات ہے کہ ہر ایک کا کام نہیں .... ان نفروں سے ناراض نہ ہونا۔ اور ان فقرات کی تصدیق حضرت مرشد نا سے کرانا کہ یہ فقرات مجھ سے عمل ہی نہیں

آئے۔ آپ کو لکھتا ہوں۔ بھلا آپ ہی عمل کریں۔ یہ قدیم نصائح ہیں۔ والسلام

.... آپ کے واسطے ۱۵ھ وہاں مقرر ہوں باین شرط کہ غربا کا علاج کیا جاوے اور امراء سے بطور خود حسب عرف لیا کرو۔ کچھ مضائقہ نہیں۔ اور اگر یہ شرط ہے کہ بعد اس تنخواہ کے کسی سے کچھ نہ لو، اس کو میں پسند نہیں کرتا ہوں۔ آئندہ جیسی رائے ہو غرض اس چندہ کی تنخواہ میں تو کچھ عیب نہیں۔ مگر مقدار قلیل پر قناعت آپ سے مشکل ہے اور گذارہ دشوار ـــــ بس اس بات کا خیال کر کے اگر کر لو کچھ مضائقہ نہیں اور حالات آمدنی جب تک کہ قیام دو چار ماہ کا نہ ہو معلوم نہیں ہو سکتے۔ اور آپ کا قیام اب تک وہاں کچھ ہوا نہیں ـــــ اگر بقدر گذران وہاں حاصل ہو سکے تو بے قیدی بہت عمدہ شے ہے۔ ورنہ روزگار کرنے کا کچھ عیب نہیں۔ والسلام

(باقی)

حضرت صوفی عبد الرب صاحبؒ
کا
ایک اصلاحی مکتوب

ناچیز راقم سطور حجاز مقدس کے حالیہ سفر سے واپس ہوتے ہوئے ۲۴ر دسمبر کی شام کو بمبئی پہنچا اور ۲-۳ دن وہاں قیام کیا۔ ایک مخلص دوست جو چند ہی روز پہلے الفرقان کے دسمبر کے شمارہ میں حضرت صوفی صاحب کا تذکرہ پڑھ چکے تھے انھوں نے خود اپنا ایک سبق آموز واقعہ سنایا اور اسی سلسلہ کا حضرت مرحوم کا ایک مکتوب دکھلایا، میں نے ان کی اجازت سے اس کی نقل کر لی ——— اختصار کے ساتھ واقعہ اور مکتوب ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

ان دوست نے بتلایا کہ اب سے تقریباً ۲۰-۲۲ سال پہلے حضرت صوفی صاحب سفر حج کے سلسلہ میں بمبئی تشریف لائے، اور چند روز قیام فرمایا، اپنے دوسرے اکابر کی طرح میں اُن کی خدمت میں بھی حاضری کا اہتمام کرتا تھا، میرے بعض بزرگوں نے حضرت صوفی صاحب سے میرا تعارف بھی کرا دیا تھا۔ ایک دن تنہائی میں حضرت صوفی صاحب نے مجھ سے فرمایا "تمھارے حالات بظاہر بہت اچھے ہیں اور فلاں بزرگ نے تمھارے بارہ میں بڑا حسن ظن بھی ظاہر کیا ہے، لیکن میں اپنے دل میں کچھ تکدر محسوس کرتا ہوں۔ کیا بات ہے؟ ——— پھر کئی معصیتوں کا ذکر کیا، آخر میں فرمایا، تمھارے اندر "بدنگاہی" تو نہیں ہے؟ ——— جب صوفی صاحب نے یہ فرمایا تو میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اور میں نے عرض کیا کہ واقعہ یہ ہے کہ میں اس بیماری میں بہت بری طرح مبتلا ہوں اور اس پر کسی طرح میرا قابو نہیں چلتا۔ صوفی صاحب نے کچھ پڑھا، مجھے سینہ سے لگا کر دبایا اور توجہ دی اور دعا فرمائی ——— مجھے بالکل ایسا معلوم ہوا کہ وہ بیماری اس طرح نکل گئی جس طرح آٹے میں سے بال کھینچ لیا جائے۔ پھر مدت تک میرا یہی حال رہا اور میں اس بیماری سے بالکل محفوظ رہا۔ کئی سال کے بعد پھر وہی مرض پیدا ہو گیا ——— میں نے حضرت صوفی صاحب کو خط لکھا اور اپنی

حالت مرض کی اس کے جواب میں ان کا مفصل مکتوب آیا۔
مکتوب کا وہ حصہ جو "مرض بدنگاہی" سے متعلق ہے ناظرین کرام بلفظہٖ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

.... مرد اور عورت کے مابین جنسی میلان بالکل فطری چیز ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے بہت سے مصالح اور فوائد کے لیے بنایا ہے۔ مثلاً نسل کا چلنا، تمدن کا قائم ہونا، معاشرت کا درست ہونا، محبت کے جذبات کا لطف حاصل ہونا، اور محبت کے فوائد کو دیکھنا، اور ان سب کو کام کو خود کے لیے اور اللہ تعالیٰ کے لیے خرچ کرنے کی لیاقت پیدا کرنا۔ لیکن جب اس رجحان اور میلان کا غلط استعمال ہوتا ہے تو نتائج بھی بالکل الٹے اور خوفناک پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً نسل کا خراب ہونا، تمدن کے نظام کا درہم برہم ہونا، بیحیائی پیدا ہونا، معاشرت کا شر انگیز ہونا، شیطان کی حکومت کا قائم ہو جانا، اللہ تعالیٰ سے تعلق ختم ہو جانا اور اس کے بُرے نتائج دیکھنا، وغیرہ وغیرہ

... الحمد للہ ہر شخص بدنگاہی کو بُرا کہتا ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ کہنا رسمی ہے یا حقیقی؟ اگر رسمی ہوگا تو اس سے کبھی نجات نہ ملے گی اور اگر حقیقی ہوگا تو اس کی کبھی ہمت نہ ہوگی۔ اور اگر اغوا شیطانی سے ابتلا ہو گیا ہوگا تو جلد توبہ نصیب ہوگی۔ حقیقی حیثیت حاصل کرنے کی کچھ تدابیر ہیں اور آپ کو انھیں کی ضرورت ہے۔ اس لیے اُن تدابیر کو درج ذیل کرتا ہوں۔

(۱) اپنی بیوی کی صحت اور تندرستی کی حفاظت کیجیے۔

(۲) پوشاک، زیورات اور آرائش سے اُس کو اپنے لیے دیدہ زیب بنائیے۔

(۳) ادنیٰ درجہ کی بدنگاہی کی برانگیختگی پر اپنی بیوی سے اپنی خواہش کو پورا کر کے شیطانی تیروں کا ترکش خالی کر دیجیے۔

(تنبیہ) لیکن ان تینوں باتوں میں اس کا خیال رہے کہ یہ صرف نفسانی لہو و لعب کی شکل اختیار نہ کر لے اور شہوانی خواہشات ان باتوں کی طرف اس قدر متوجہ نہ ہو جائیں کہ دوسرے امور میں خلل پڑنے لگے۔

(۴) جس طرح ہر مرض کروہ اور خوفناک ہوتا ہے اور سب مانتے ہیں لیکن اگر اس مرض کی شکل مثالی دکھا دی جائے تو شاید ہمیشہ کے لیے اس سے نفرت پیدا ہو جائے۔ مثلاً ڈاکٹر کہتے ہیں کہ تپ دق کے کیڑے

یعنی جراثیم الگ ہوتے ہیں اور کوڑھ کے الگ۔ یہ بالکل صحیح ہے۔ بالکل اسی طرح ہر گناہ کے جراثیم الگ رنگ اور قسم کے ہوتے ہیں اور ان کے مخصوص اثرات پیدا ہوتے ہیں۔

بدنگاہی بھی ایک مرض اور معصیت ہے اس کے جراثیم کی شکل دکھا دینا میرے امکان میں نہیں ہے لیکن ان کا کچھ بیان کیے دیتا ہوں۔

بدنگاہی کے ساتھ ہی کچھ جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں جو طرح طرح کے خوفناک اثرات پیدا کرتے ہیں، اسی طرح دوسرے معاصی کے جراثیم بنتے ہیں۔ جراثیم کے ساتھ کچھ خوفناک گیس بھی بنتی ہے، کچھ زہر بنتے ہیں۔ بعض کی شکل دھوئیں کی ہوتی ہے، بعض کی شکل خون کی، بعض کی پیپ کی، وغیرہ وغیرہ۔ پھر ایک بار جب یہ جراثیم اور گیس اور زہر پیدا ہو جاتے ہیں تو یہ برابر ترقی کرتے رہتے ہیں اور اپنا اثر ڈالتے رہتے ہیں، بعض گیس بینائی کو ضعیف کرتی ہیں، بعض زہر قلب کو کمزور کرتے ہیں اور بعض جراثیم کسی اور عضو کو نقصان پہنچاتے ہیں، حتیٰ کہ زندگی بھر ان کے نقصانات چلتے رہتے ہیں اور بندہ غافل رہتا ہے، خسارے طرح طرح کے ہوتے ہیں اور بندہ کی سمجھ میں نہیں آتا۔ احادیث میں اس کے اشارے موجود ہیں، مثلاً زنا سے قحط پڑتا ہے، طاعون آتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح بدنگاہی سے رزق کی تنگی، اولاد کی حرماں نصیبی اور دل کی پریشانی وغیرہ جیسی بلائیں لاحق ہوتی ہیں۔ ان سب کا جی لگا کر تصور باندھنا اور خوب بار بار سوچنا اور مراقبہ کرنا حقیقی حیثیت پیدا کرنے میں معین ہوگا۔ آپ کو چاہیے جب ایسی برانگیختگی پیدا ہو تو اولین فرصت میں باوضو ہو کر نماز توبہ دو رکعت پڑھ کر توبہ کریں اور اس خبیث شیطانی مرض اور معصیت کے دنیاوی اور اُخروی نقصانات سوچیں، حتیٰ کہ دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ یہ محض حماقت اور بے سود شغل ہے اور اُس کے نقصانات بیش از بیش ہیں۔ اصل میں معصیت کے صدور پر مواخذہ ہوتا ہے اس لیے کافی تو شرعاً اتنا بھی ہے کہ جب برانگیختگی پیدا ہو تو اس کو دبا دیا جائے اور اس کو نہ تو باقی رکھا جائے اور نہ اُس سے لطف اٹھایا جائے، نہ اُس پر عمل کیا جائے تو مواخذہ نہ ہوگا اور جراثیم اور زہر اور گیس نہ پیدا ہوں گے۔ لیکن مجاہدہ کر کے اس مرض کو ضعیف نہ کیا جائے گا تو برابر یہ کشمکش رہے گی، اس لیے صوفیائے کرام نے مجاہدات کو اختیار کیا اور کرایا ہے۔ بدنگاہی کا مرض مجاہدے سے اس طرح بدل جاتا ہے اور دور ہو جاتا ہے کہ سوا اپنی منکوحہ کے دوسری غیر محرم پر نظر پڑنے سے اندر سے متلی ہونے لگتی ہے اور گھن معلوم ہوتی ہے، اس کے لیے کوشش کرنا محض اس لیے ضروری ہے کہ آسانی سے راہ حق پر چلا جا سکے۔

پس میں ان مجاہدات کا ذکر ذیل میں کرتا ہوں۔

(۱) راستہ چلتے وقت آنکھ سے صرف اس قدر کام لیا جائے جتنا راستہ دیکھنے کے لیے ضروری ہو ورنہ نگاہ کو نیچا رکھا جائے۔ راستہ چلنے سے پہلے اس کا ارادہ کیا جائے اور راستہ چلتے وقت اس پر عمل کیا جائے۔ اور راستہ ختم ہو جانے پر اس کا جائزہ لیا جائے کہ آیا نظر نیچی رکھنا نصیب ہوا یا نہیں؛

(۲) اگر نظر نیچی رکھنا نصیب نہ ہوا ہو تو باوضو ہو کر دو رکعت نفل توبہ پڑھی جائے اور از سر نو پھر عہد کیا جائے حتیٰ کہ آہستہ آہستہ چند روز میں یہ بات پیدا ہو جائے کہ راستہ چلتے وقت آنکھ نہ بہکے۔

(۳) راستہ چلتے وقت ہاتھ میں تسبیح رکھی جائے اور راستہ ہی کے لیے کوئی معمول مقرر کیا جائے مثلاً جب راستہ چلنا ہو تو استغفر اللہ کا ورد رکھیں گے یا لا الہ الا اللہ کا ورد رہے گا۔

(۴) اگر اجنبیہ یعنی غیر محرم عورت پر نظر پڑ جائے تو فوراً نظر نیچی کر کے اپنی ماں کی صورت کا تصور کرنا شروع کیا جائے اور جب تک دل اور نظر پاک نہ ہو جائے ماں کا تصور باقی رکھا جائے۔

(۵) اگر عمداً شرارت نفس یا اغوائے شیطانی سے غیر محرم کو دیکھنے کے لیے نظر اٹھائی جائے تو فوراً نظر نیچی کر کے جہنم کا تصور کیا جائے اور سوچا جائے کہ اس کی سزا میں آنکھوں میں سیسہ بھرا جا رہا ہے۔

(۶) جہنم کے تصور کے علاوہ جتنی مرتبہ غیر محرم پر نظر پڑے اتنے تازیانے اپنے ہاتھ سے تنہائی میں اپنی ننگی پیٹھ پر لگائے جائیں۔ ایک سوت کی دو گز کی رسی کو دوہری کر کے جیب میں رکھیں اور اس کا نام تازیانۂ شریعت رکھیں اور جب بدنگاہی ہو جائے کسی قریب کی مسجد میں یا کسی تنہائی کی جگہ میں جا کر اپنی برہنہ پیٹھ پر تازیانے لگائیں۔ اور اگر کوئی تنہائی کی جگہ راستہ میں میسر نہ آئے تو یہ عمل واپسی پر گھر میں کریں۔

(۷) جب بدنگاہی ہو جائے تو ہر بدنگاہی پر اتنی رکعتیں نفل بطور جرمانہ پڑھیں کہ نفس کو شاق ہو، مثلاً بیس رکعت۔

(۸) جب بدنگاہی ہو جائے بطور جرمانہ اتنی رقم صدقہ کریں کہ نفس پر شاق ہو مثلاً ایک روپیہ۔

(۹) جب بدنگاہی ہو جائے تو ذیل کی عبارت اپنے کو اپنے نام سے مخاطب کر کے سنائیں۔

اے فلاں تیرا نام اتنا بلند مگر تیری حرکتیں ایسی پست: اے فلاں تو مخلوق کے

سامنے مولوی، مولانا، بنا پھرتا ہے اور مخلوق سے چھپا کر زانیوں کی حرکتیں کرتا ہے جو مخلوق سے تو پوشیدہ ہوتی ہیں لیکن خالق پر آشکارا ہوتی ہیں۔ اے فلاں تو تو صوفی اور سلوک پر مخلوق کے نزدیک گامزن ہے اور بزرگوں سے تعلق رکھتا ہے اور تیرا اصل تعلق ان حرکتوں سے ہے جو جہنم تک پہنچانے والی ہیں۔ اے فلاں تو ہوش و حواس رکھتا ہے لیکن ایسی حماقت میں مبتلا ہے جو سراسر خسارے کا موجب ہے اور نفع مطلق نہیں۔ اے فلاں تیری کیا اچھی تجارت ہے کہ ان حرکتوں کے سبب تو دنیا کے عذاب کا ر ہا ہے اور آخرت کا عذاب تیرا منتظر ہے۔ کیا تو اس وقت تک توبہ نہ کرے گا جب تک تو اس کام سے مجبور نہ ہو جائے۔ بس اب توبہ کر۔

میں امید کرتا ہوں کہ انشاء اللہ اس قدر تحریر اگر آپ غور سے پڑھیں گے اور اس پر عمل کریں گے تو یہ خبیث مرض باقی نہ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اور آپ کو اور سب کو طہارت اور پاکیزگی ارزانی فرمائے اور گندگیوں سے بچائے۔"

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی
جامعہ اسلامیہ - بنارس

قاضی خاں ظفرآبادی

(۲)

[اس مضمون کی پہلی قسط اگست کے شمارہ میں شائع ہوئی تھی بعض غیر معمولی وجوہ کی بنا پر دوسری قسط اب پیش کی جارہی ہے ——— ادارہ]

قاضی خاں کا مقام علماء کی نظر میں

مخدوم قاضی خاں کے تمام تذکرہ نگاران کی جلالتِ شان کا تذکرہ نہایت شاندار اور پُرشوکت الفاظ میں کرتے ہیں۔ شیخ محدث دہلوی لکھتے ہیں،

"میاں قاضی خاں ظفرآبادی قدس سرہٗ مرید و خلیفہ شیخ حسن طاہر است از جملہ عارفان ایں طریق است، صاحبِ استقامت و کرامت و حرمت و زہد و تجرید، و بے بحسب زماں اگرچہ متاخر است ولیکن بجہت صفائی معاملہ از اعداء از متقدماں است[1]"۔

قریب قریب انہیں خیالات کا اظہار مفتی غلام سرور لاہوری نے بھی کیا ہے لکھتے ہیں؛

"شیخ قاضی خاں ظفرآبادی قدس سرہ مرید و خلیفہ شیخ حسن طاہر است شیخ بود صاحب استقامت و کرامت و زہد و ورع و تقویٰ و تجرید و تفرید[2]"

مولانا عبدالحئی مرحوم ان الفاظ میں ان کی جلالت کا اعتراف کرتے ہیں؛

"الشیخ العالم الصالح جلال الحق قاضی خاں بن یوسف الضحی العمری الظفرآبادی کان من کبار المشائخ الچشتیہ[3]"

---

[1] اخبار الاخیار ص ۲۲۹ [2] خزینۃ الاصفیاء ص [3] نزہۃ الخواطر ص ۲۶۵ ج ۴

صاحب تجلی نور رقم طراز ہیں:

حضرت بندگی جلال الحق در بزرگان متاخرین اہل چشت از بس نام آور صاحب فہم در توکل عبادت و ریاضت و اہل استقامت و کرامت بود حتی کہ پیرش ہنگام فروشدن پسر خود عبدالعزیز را جہت تعلیم باطنی باو تفویض نمود [1]

سلوک کے مراحل طے کر لینے اور درجۂ کمال حاصل ہو جانے کے بعد پیر و مرشد کی اجازت سے وطن مالوف واپس تشریف لائے۔ ہر نوع کے شاہی عہدے اور مناصب کے دروازے آپ پر کھلے تھے مگر سب سے کنارہ کش ہو کر درویشانہ زندگی اختیار کی اور دنیاوی عزت و جاہ سے بے نیاز ہو کر درس و تدریس اور تصفیہ قلوب و تزکیۂ نفوس میں مشغول ہو گئے۔

لیکن جب افلاس اور تنگدستی کی گرفت سخت ہو گئی اور اہل و عیال کی حالت فقر و فاقہ سے بالکل خستہ تو قاضی صاحب کو بھی یک گونہ پریشانی لاحق ہوئی ناچار ایک عریضہ غربت و تنگدستی کی شکایت میں شیخ کی خدمت میں ارسال کیا۔ شیخ حسن قدس سرہٗ نے جواب میں تحریر فرمایا۔

بخدمت قاضی خاں ظفر آبادی چوں غم فرزند و اطفال و عیال و متعلقہ آں در دل بگذرد مضمون یک بیت را در خاطر تصور نمائند ۔

از خدا خواہم و ز غیر نخواہم بخدا
کہ نیم بندہ غیر و نخدائے دگر است

فرزند بندہ است خدا را تو غم مخور تو بندہ ہستی نہ خداوند پروری اگر مفلس است گنج توکل برائے اوکافی تو رنج ناحق و نا رو امبر [2]

شیخ کے مکتوب سے قاضی خاں کی ساری پریشانی کافور ہو گئی اور اطمینان و سکون حاصل ہو گیا اس کے بعد زندگی بھر نہ فقر و فاقہ کی شکایت لب پر آئی نہ کبھی خانقاہ سے باہر قدم نکالا۔

شانِ استغناء مخدوم قاضی خاں کے مزاج میں حد درجہ قناعت و استغناء تھی۔ امراء و سلاطین کے دربار میں حاضری تو درکنار ان سے کسی قسم کا ہدیہ اور تحفہ قبول کرنا بھی گوارا نہ

---

[1] تجلی نور ص ۱۶ [2] بیاض درویشیہ قلمی بحوالہ چراغ نور ص ۸۴

تھا۔ ایک بار ہمایوں شاہ نے اپنے ایک امیر مرزا عسکری کو خدمت میں بھیجا کہ مخدوم جتنے مواضعات کی خواہش کریں معاف کردیے جائیں۔ مرزا عسکری کو باریابی نصیب نہ ہوئی اس لیے آپ کے چچا قاضی صدر الدین ناصحی کے ذریعہ بادشاہ کا پیغام پہنچایا۔ آپ نے ہمایوں شاہ کی اس پیش کش کو ٹھکرا دیا اور یہ قطعہ پڑھا۔

ما حرص و ہوا دو بندہ داریم — با ہر دو مدام پادشاہیم
تو بندۂ بندگان ما ہستی — از بندۂ بندگان چہ خواہیم

ہمایوں شاہ کو جب اس بے نیازی اور شان استغنا کا علم ہوا تو اس کی عقیدت اور بڑھی خود آستانہ پر حاضر ہوا مگر قاضی خاں اس وقت خلوتکدہ میں تھے ملاقات نہ ہو سکی دوسرے دن صبح سویرے پھر حاضر ہوا مگر قاضی صاحب حسب معمول اس وقت طلبہ کے درس میں مشغول تھے۔ درس سے فراغت کے بعد ملاقات ہوئی ہمایوں نے بحسب خواہش خود مواضعات و قریات کی معافی کا فرمان پیش خدمت کیا۔ آپ نے فرمان واپس کردیا اور فرمایا کہ میں نے اپنے شیخ سے عہد کیا ہے۔

از خدا خواہیم و ز غیر نخواہم بخدا — کہ نیم بندۂ غیر و بخدائے دگر است

جاتے جاتے ہمایوں نے سادہ کاغذ پر مہر شاہی ثبت کر کے قاضی صاحب کی خدمت میں بھیج دیا کہ جتنے مواضعات اور نقد کی خواہش ہو مخدوم اس پر تحریر فرما دیں آپ نے اسے بھی لوٹا دیا اور فرمایا کہ

"ما را احتیاج نیست و بے احتیاج حق مسلمانان گرفتن روا نہ باشد [1]

کہتے ہیں کہ جب مخدوم قاضی خاں نے اس گراں بہا نذرانہ کو قبول کرنے سے انکار کردیا تو ہمایوں نے ان کے بڑے صاحبزادے شیخ عبداللہ کی خدمت میں پیش کیا شیخ عبداللہ نے بھی رد کردیا اور فرمایا:

پسر باید کہ بر متابعت پدر رود چوں پدر ما قبول نکرد ناچار ما را نیز ازاں ابا کرد کہ ایشاں کردند [2]

وفات

بالآخر علم و فضل اور رشد و ہدایت کے اس امام نے تعلیم کتاب و حکمت اور تطہیر قلوب و النفس میں پوری زندگی گزار کر ۵ ؍ صفر ۹۴۲ھ کو جان جان آفریں کے حوالہ

---

[1] اخبار الاخیار ص ۲۲۵ و تجلی نور ص ۷، چراغ نور ص ۹۴ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۶

[2] اخبار الاخیار ص ۲۲۴ و تذکرہ علماء ہند ص ۱۶۶

کردی ہے

سید نور الدین زیدی ظفر آبادی نے تاریخ رحلت ان اشعار میں لکھی ہے۔

گل گلزار باغ لامکانی	در دریائے عمان معانی
مئے شوق محبت نوش کردہ	خمار جام وحدت ہوش بردہ
بملک فقر شاہنشاہ مسعود	جلال الدین قاضی خان محمود
ز مہجوری بسا قرب جستند	ز دنیا رفتہ خلد آباد کردند

چوں زیدی جست سال فوت قاضی
ندا ے فخر دین کردہ منادی [1]

شیخ محدث دہلوی نے اخبار الاخیار[2] میں اور مفتی غلام سرور لاہوری نے خزینۃ الاصفیاء میں سال وفات ۹۰۷ھ تحریر فرمایا ہے۔ صاحب تذکرہ علمائے ہند[3] نے بھی اسی سن کو درج کیا ہے۔ ان حضرات کے برخلاف شیخ محمد یحییٰ خوب اللہ الہ آبادی المتوفی ۱۱۴۴ھ نے وفیات الاعلام میں ۹۰۵ھ لکھا ہے[4]۔ زیدی ظفر آبادی مخدوم قاضی خاں کی کرامات کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ میر علی عاشقاں سرائے مری، شیخ اللہ بن جونپوری، سید غیاث الدین درویش ظفر آبادی اور مخدوم جلال الحق قاضی خاں ظفر آبادی میں باہم مخلصانہ دوستی اور راہ و رسم تھی۔ ایک مرتبہ چاروں حضرات بیٹھے موت اور مابعد الموت کے موضوع پر گفتگو کر رہے تھے درمیان میں یہ بات آئی کہ ہم میں سے جس کی وفات پہلے ہو وہ اطلاع دے کہ وہاں سب سے زیادہ قدر کس عمل کی ہے۔

خدا کا چاہا ایسا ہوا کہ ان حضرات میں سے پہلے قاضی خاں کی وفات ہوئی۔ وفات کے تیسرے دن تینوں حضرات قاضی خاں کے مزار پر حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ "الکریم اذا وعد وفا" اسی وقت ہوا کا ایک بگولہ اٹھا اور قبر کے پاس ختم ہو گیا۔ ہوا کے ختم ہونے کے بعد دیکھا گیا تو کاغذ کا ایک ٹکڑا ملا جس پر حافظ شیرازی کا یہ شعر قاضی خاں کے خط میں لکھا ہوا تھا۔

آنجا فنون شیخ نیرزد بنیم خس	راحت بدل رساں کہ ہمیں است ہنر دیں

---

[1] چراغ ازص ۵ و تجلی نورص ۱۸ [2] دیکھئے اخبار الاخیار ص ۱۴۲ و تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۷ و وفیات الاعلام ص ۱۸۰

سید میر علی عاشقاں کی وفات حسب تصریح شیخ محمد عارف ۹۵۵ھ ہے۔[1] اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو قاضی صاحب کا سن وفات ۹۵۰ یا ۹۴۴ھ ہی صحیح ہوگا۔ شاید اسی وجہ سے مولانا عبدالحئی مرحوم نے نزہۃ الخواطر ص ۲۶۵ ج ۴ میں انھیں دونوں تاریخوں کو نقل کیا ہے اور ۹۷۰ھ والی روایت کو نظر انداز کر دیا۔ واللہ اعلم۔

اولاد اور خلفاء مبدأ فیاض نے حضرت قاضی کو علم و فضل اور زہد و ورع کی دولت جاودانی کے ساتھ اولاد کی نعمت سے بھی شادمانی عطا فرمائی تھی۔ مناقب درویشیہ اور اور اخبار الاخیار سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کثیر الاولاد تھے مگر شیخ عبداللہ ناصحی کے علاوہ بقیہ اولاد کی تفصیل سے تمام تذکرے خالی ہیں۔

شیخ عبداللہ ناصحی نام نامی آپ کا عبداللہ اور لقب جمال الحق ناصحی ہے۔ آپ مخدوم قاضی خاں کے پہلوٹے صاحبزادے ہیں۔ شیخ محدث دہلوی لکھتے ہیں "شیخ عبداللہ اکبر اولاد اوبود" آپ بڑے صاحب حال بزرگ تھے۔ کبھی کبھی صحو و سلوک میں آجاتے ورنہ ہمیشہ جذب و مستی اور سکر کی کیفیت طاری رہتی۔ ریاضت و کرامت میں خاص شہرت کے مالک تھے اور بڑے مستجاب الدعوات، سیف زبان تھے۔ والد بزرگوار کی طرح دنیا اور اہل دنیا سے بے نیاز اور نذر و نیاز قبول کرنے سے محترز تھے۔

حضرت قاضی خاں کے بعد سجادۂ مشیخت پر رونق افروز ہوئے اور والد محترم کی صحیح جانشینی فرمائی۔ ۱۰۰۰ھ میں وفات ہوئی اسم گرامی "شیخ عبداللہ" سے سن وفات نکلتا ہے۔[2]

حضرت قاضی خاں کے متوسلین اور خلفاء کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر ان میں دو بزرگوں کو خاص شہرت حاصل ہوئی لبغرض اختصار انھیں دو کے حالات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

شیخ عبدالعزیز چشتی دہلوی آپ شیخ حسن بن طاہر جونپوری کے فرزند ارجمند تھے ۸۹۸ھ میں جونپور میں پیدا ہوئے ڈیڑھ برس کی عمر میں باپ کے ساتھ دہلی

---

[1] رسالہ عاشقیہ ص ۱۳۲۔ رسالہ عاشقیہ کو شیخ محمد عارف نے میر علی عاشقاں سرائے میری کے حالات میں قلمبند کیا ہے۔ شیخ علی عاشقاں کے حالات میں اس سے زیادہ اہم اور مستند کوئی اور ماخذ نہیں ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ مولانا نجم الدین اصلاحی دامت برکاتہم کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے [2] اخبار الاخیار ص ۲۳۷ و تاریخ شیراز ہند ص ۹۶۲

آگئے، پھر وفات تک یہیں رہے۔ شیخ عبدالعزیز شریعت و طریقت دونوں کے جامع تھے۔ علوم باطنی کی تکمیل حضرت قاضی خاں کے زیر تربیت کی، شیخ حسن بن طاہر نے وفات کے وقت انھیں قاضی خاں کے سپرد کر دیا تھا چنانچہ والد کی وفات کے بعد یہ ظفرآباد آئے اور طویل مدت تک یہاں مقیم رہ کر عبادت و ریاضت اور کسب سعادت میں مشغول رہے اور سلوک کی منزلیں طے کر کے قاضی خاں سے خرقۂ خلافت حاصل کیا پھر دہلی آ کر مسند ارشاد کو زینت بخشی۔ دہلی اور اس کے قرب و جوار میں آپ سے بڑا فیض ہوا اس عہد میں آپ کا کوئی ہمسر اور مثیل نہ تھا۔

شیخ محدث دہلوی لکھتے ہیں:

> او در اورع و تواضع و حلم و صبر و رضا و تسلیم و شفقت بر خلق و رعایت فقر نظیر نبود و در زمان خود یادگار مشائخ چشت بود، در دہلی بوجود او سلسلۂ ارشاد و مشیخت برپا بود[1]

ان کے تقدس، حلم اور تواضع نے انھیں ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ سلسلۂ چشتیہ کی دیرینہ روایات اس تاریک دور میں پھر ایک بار ان کے ذریعہ زندہ ہونے لگی تھیں۔ عوام و خواص سب ہی ان سے عقیدت رکھتے تھے۔ بیرم خاں خانانان خاص طور سے معتقد تھا۔

۲۶ جمادی الاخری ۹۷۵ھ میں آیت "فسبحان الذی بیدہ ملکوت کل شیٔ و الیہ ترجعون" کے سماع پر بحالت وجد محبوب حقیقی سے جا ملے۔ "یادگار چشت" سے تاریخ وفات نکلتی ہے[2]۔

شاہ سعید خلوتی | یہ بزرگ بھی حضرت قاضی خاں کے ارشد خلفاء میں ہیں۔ بیعت کے بعد ذکر و شغل کی غرض سے بارہ سال تک عوام الناس سے بالکل منقطع ہو کر ذکر و فکر اور مراقبہ میں مشغول رہے اسی وجہ سے "شاہ خلوتی" کے لقب سے مشہور ہوئے۔

آپ عزلت گزیں اور تنہائی پسند تھے۔ عوام سے اختلاط بالکل پسند نہ کرتے۔ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر شب و روز تذکر الٰہی اور یاد ربانی میں محو رہتے۔ بلا کسی شدید ضرورت کے بات نہ کرتے۔ ہمیشہ ایک جوڑا کپڑا رکھتے۔ ازدواجی جھمیلوں سے بھی تا حیات الگ رہے۔ ۹۸۴ھ میں بعہد اکبر شاہ انتقال فرمایا۔ مزار محلہ ناصحی ظفرآباد میں موضع رام داس پور کے متصل اب بھی موجود ہے[3]۔ (ختم شد)

---

[1] اخبار الاخیار ص ۲۸۸ [2] چراغ زندگی ص ۱۰۵ تاریخ مشائخ چشت ص ۲۲۶ اخبار الاخیار ص ۲۸۹
[3] تاریخ شیراز ہند ص ۹۵ و چراغ زندگی ص ۱۰۶

مولانا حافظ محمد نعیم ندوی صدیقی رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ

کردار شکنی کا المیہ

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ آزادی کے بعد ہندوستان نے اپنے بیدار مغز قائدین کی رہنمائی میں بہت غیر معمولی ترقی کی ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی نہایت افسوسناک ہے کہ ملک کی اخلاقی حالت میں زوال و انحطاط بھی بے حد پیدا ہوا ہے۔ کوئی بھی معقول انسان یہ باور نہیں کر سکتا کہ کسی ملک کی ترقی نام ہے صرف اس کی مادی ترقی کا۔ لیکن یہ انسانیت کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے کہ یورپ کی موجودہ تہذیب نے انسان کے دل و دماغ پر مادیت کو ایک کابوس کی طرح سوار کر دیا ہے۔ اور وہ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اپنے تمام مسائل کو صرف مادی نقطۂ نظر سے سوچنے کا عادی بن گیا ہے۔ جتنے بھی ترقیاتی منصوبے مرتب کیے جاتے ہیں، ان میں اخلاقی سدھار اور بلندی کردار کو ترقی دینے کا ذکر کسی حاشیے میں بھی نہیں ہوتا ہے۔ انسان کو محض حیوان فرض کر لینے سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ انسان جسم اور روح دونوں سے مرکب ہے۔ جب تک ان دونوں کے تقاضے پورے نہیں کیے جائیں گے۔ اس کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ جس طرح انسان ایک حیوانی اور طبعی وجود رکھتا ہے، بعینہ اسی طرح اس کا ایک اخلاقی اور روحانی وجود بھی ہے۔ بلکہ اس کا یہی آخر الذکر وجود اس کو انسان بناتا اور حیوانوں سے ممتاز کرتا ہے۔

اس طرح انسان کی ہستی دو جداگانہ حیثیتوں کی جامع ہے۔ ایک اس کی مادی و جسمانی حیثیت اور دوسرے اس کے اندر کی روحانی اور اخلاقی حیثیت۔ جب انسان کا اول الذکر وجود اس کے دوسرے وجود پر غالب ہو جاتا اور قاہرانہ تسلط حاصل کر لیتا ہے تو بسا اوقات اسے اپنے روحانی وجود اور اخلاقی حیثیت کا احساس تک باقی نہیں رہتا، اور وہ خود کو محض ایک حیوان سمجھنے لگتا ہے۔

آج کے انسان نے اپنی زندگی کا مستقل نظریہ یہ بنا لیا ہے کہ انسان اصلاً صرف دو اعضا سے مرکب ہے۔ پیٹ اور شرمگاہ۔ اس کے نزدیک انسان کی تمام صلاحیتوں اور قابلیتوں کا اصل مقصود یہ ہے کہ

وہ اپنے جسمانی وجود کو زیادہ سے زیادہ آرام اور زیادہ سے زیادہ لذت بخش سکے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان صرف جسم ہی جسم نہیں ہے۔ بلکہ جسم تو انسان کا ایک ناقص اور فانی وجود ہے اس کا اصل وجود تو وہ ہے جسے سطور بالا میں ہم نے اخلاقی اور روحانی وجود کے نام سے ذکر کیا ہے۔

ایک زمانہ میں حسنِ خلق و شرافت، طہارت و تقویٰ، صدق و دیانت، اخوت و مودت، عدل و مساوات، عفو و حلم، تواضع و فروتنی، استغنا و خودداری، صلح و توکل، ایفائے عہد و رحمدلی، صبر و ثبات امداد باہمی و خوش کلامی اور حسن سلوک و شکر گذاری کو انسانیت کی معراج اور کذب و نفاق، رشوت و خیانت، حرص و ہوس، خوشامد و تملق، بدزبانی و بدگوئی، غیبت و بہتان، کبر و غرور، بغض و کینہ، حسد و ریاکاری، مفاد پرستی، منفعت پسندی اور ضمیر فروشی کو اخلاقی دیوالیہ پن کی علامت تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ دورِ حاضر کا وصف امتیازی ہے کہ اس نے استدلال کی پوری قوت کے ساتھ ثابت کیا کہ شہوت پرستی اور جسم پروری انسان کی فطرت ہے کیونکہ انسان بھی دوسرے حیوانات کی طرح ایک حیوان ہی ہے، جو اپنے اندر کچھ خواہشات اور داعیات رکھتا ہے۔ ان خواہشات کو پورا کرنے کے لیے اس کو چند لمحاتِ حیات حاصل ہیں۔ جن کے ختم ہونے پر وہ عدم کے پردے میں چھپ جائے گا۔ چنانچہ اسے جو کچھ دادِ عیش دینی ہے اور لطفِ زیست حاصل کرنا ہے، اس وقفہ حیات میں حاصل کرلے۔ آج کے انسان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس کو اپنی خواہشات و جذبات دبانے کے بجائے ان کو تیز سے تیز تر کرنا چاہیے تاکہ وہ اپنے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی مرغزارے سے بیش از بیش حظ اندوز ہو سکے۔ اور وہ دنیا سے اس حال میں نہ جائے کہ اس کی تمنائیں اور ولولے ماتم کناں رہ جائیں۔

یورپ میں زنا کی حرمت کو مذہبی تنگ نظری قرار دے کر اسے ایک فطری مطالبہ کی تسکین قرار دیا گیا۔ اس فلسفے نے بہیمیت کی تمام صفات کو انسانی فطرت اور اس کا خاصہ ثابت کر دکھایا۔ بندگیِ نفس اور خواہشات کی غلامی کے جواز میں اس طرح دلائل فراہم کیے کہ انسان کے اندر سے ضمیر کا وہ کانٹا نکل گیا جو معصیت کے ارتکاب پر خلش پیدا کرتا تھا۔ اور ہر گناہ کے لیے انسان کا دل اس طرح کھل گیا جیسے وہ کار ثواب انجام دے رہا ہو۔ چنانچہ اب وہ پورے شرح صدر کے ساتھ تہذیب و تمدن کا ایسا نقشہ بنانے میں مصروف ہے جس کے ایک ایک نشان سے عیاشی اور صنفی خواہش نمایاں ہے۔ تاکہ وہ دیکھے تو مناظرِ عیش و طرب دیکھے، اس کے کان آشنا ہوں تو نغماتِ کیف و طرب سے، اور فکر و دماغ کی قوتیں صرف ہوں تو تکمیل

خواہشات کی راہ میں۔ عورت اور مرد کا آزادانہ اختلاط، فحش لٹریچر، اخلاق فروش تعلیم، عریاں تھاویر، گندے سینما اور منشیات کا استعمال، غرض شہوانیت کو برانگیختہ کرنے والا کون سا ذریعہ ہے جسے موجودہ انسان نے اختیار نہ کیا ہو۔

اس اخلاقی انحطاط کا نتیجہ یہ ہے کہ آج پورا یورپ جنسی انارکی کے الاؤ میں جل رہا ہے۔ اہل مغرب کی اس اخلاقی زبوں حالی پر خود یورپین مفکرین اور دانشوروں کو بھی تشویش ہے۔ چنانچہ ایک امریکن مفکر مسٹر ہڈسن کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ "ہماری تہذیب کی دیواریں منہدم ہونے کو ہیں۔ اس کی بنیادوں میں ضعف آگیا ہے اور اس کے شہتیر جل رہے ہیں۔ نہ معلوم یہ ساری عمارت کب پیوند خاک ہو جائے۔"

(بحوالہ زندگی ماہ ربیع الثانی ۹۵ھ)

دراصل مغرب میں جس دن سے مذہب کو اجتماعی معاملات سے بے دخل کیا گیا اسی وقت سے عالم انسانی میں مصائب و آلام کے ہجوم میں اضافہ شروع ہو گیا۔ اور لادینیت جس رفتار سے آگے بڑھتی اور چھاتی گئی اسی رفتار سے انسانی مسائل میں پیچیدگیوں پر پیچیدگیاں بڑھتی گئیں۔ پہلے کلیسا کے زیر اثر یورپین اقوام ایک رشتے میں منسلک تھیں۔ یہ رشتہ ٹوٹا تو وہ سب ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح منتشر ہو کر رہ گئیں۔ یہی نہیں ہر قوم نے نیشنلزم کو اپنا بلند ترین نصب العین اور مطمح نظر ٹھہرایا جس نے نفاق، تصادم اور قوم پرستانہ جنگوں کے کڑوے پھل دیئے۔ اور نہ صرف مغرب بلکہ پورا عالم انسانی تباہی و بربادی کے کنارے جا لگا۔

حریت فکر نے بے لگام ہو کر فکری انتشار کو جنم دیا۔ اعتقادات و افکار کی دنیا میں کوئی چیز ایسی باقی نہ رہی جو اختلاف کی نذر نہ ہوئی ہو۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بنی نوع انسان پر بے یقینی اور ریب و تذبذب کا شدید حملہ ہوا اور وہ تمام بنیادیں جن پر ہزار ہا سال سے سماج کی تعمیر ہوتی چلی آ رہی تھی ڈھے گئیں، اور دوسری بنیادیں ان کی جگہ نہ لے سکیں۔ مختلف انسانی گروہ اپنی فہم کے مطابق مختلف بنیادوں پر سماج کے مختلف ڈھانچے بناتے اور ان سے کچھ عرصہ بعد غیر مطمئن ہو کر انھیں توڑتے رہے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

اور جب اخلاق کو اجتماعی زندگی سے بے دخل کر دیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اجتماعیات سے خیر و صلاح کے تمام عناصر رخصت ہو گئے اور عالم انسانی کی باگیں بدترین اشرار کے ہاتھوں میں چلی گئیں، جنھوں نے دنیا کو شر و فساد سے بھر دیا۔ حتیٰ کہ اخلاقی اقدار انفرادی زندگی کے حصار میں بھی پناہ نہ پا سکیں، افراد و اقوام کی

زندگیوں میں بد اخلاقی، بدکرداری اور بے قیدی کا اس قدر شیوع ہوا کہ تاریخ کے کسی دور میں نہ ہوا تھا۔

اخلاق و مذہب کے بند ٹوٹ جانے کے بعد برائی، خواہش نفس، خود غرضی، ظلم، قساوت قلب، مفاد پرستی، ضمیر کی سودے بازی اور شر و فساد کے سیلاب کو کس طرح روکا جا سکتا تھا؟ چنانچہ یہ سیلاب آگیا اور افراد و اقوام سب کو بہا کر لے گیا۔ اس سیلاب کے باعث دنیا معاشی بدحالی، سیاسی جوڑ توڑ، انقلابات جنگ اور بہیمیت کا گہوارہ بن گئی۔ اس نازک اور پرخطر صورت حال نے مادہ پرست یورپ کے ساتھ پوری دنیا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ مادیت کے ان نتائج نے مادیت پرست لوگوں کا یقین متزلزل کر دیا ہے۔ اور وہ ان دانشوروں کی آواز میں وزن محسوس کرنے لگے ہیں جو لادینیت و الحاد کو انسانیت کے لیے زہر ہلاہل اور دین و اخلاق کو امراض انسانی کے لیے تریاق قرار دیتے ہیں۔ اور اب دنیا میں ایسے مفکرین کی کمی نہیں ہے۔

کیا واقعی دنیا اس مہلک مادیت سے نجات پا سکے گی؟ اس کا جواب ان لوگوں کے طرز عمل پر منحصر ہے جو مادیت کے مخالف اور دین و اخلاق کے حامی ہیں۔ یہ لوگ اپنی زندگی سے دین و اخلاق پر اپنے یقین، اس سے اپنی مخلصانہ وابستگی، مادہ پرستانہ افکار و نظریات سے علیحدگی و یکسوئی اور اپنے حسن عمل کا جس قدر ثبوت دیں گے، جس قدر مادیت کی فکری بنیادوں کو ڈھا کر ان کی جگہ مثبت طور پر ان فکری اساسات کو استوار کریں گے جن پر دین و اخلاق کی عمارت تعمیر ہوتی ہے، دنیا کے ذہنوں کو اس بات پر جس قدر مطمئن کر سکیں گے کہ ان کے مسائل کا حل لادینیت والحاد میں نہیں، دین و اخلاق میں مضمر ہے، اسی قدر دین و اخلاق کو عالم انسانی میں نفوذ حاصل ہوگا اور اسی تناسب سے لادینیت و الحاد پسپا ہونے پر مجبور ہوں گے۔

آج دنیا پر بداخلاقی کا جو مانسون چھایا ہوا ہے، زرگری کا مانسون، خود غرضی، ضمیر فروشی، مفاد پرستی اور عیش کوشی کا مانسون، اس کو روکنے کے لیے اللہ کا یقین، محاسبۂ آخرت کا یقین اور سزا و جزا کا یقین ضروری ہے۔ عہد جاہلیت کا فلسفۂ زندگی "کھاؤ پیو اور مست رہو" تھا۔ اور آج کے اس ترقی یافتہ دور کا فلسفۂ حیات اور تعلیم بھی یہی ہے کہ "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست"۔ جب زندگی کا یہ نظریہ بن جائے تو اس سے یہی کردار تیار ہوگا جو ہمارے شب و روز کے مشاہدہ میں ہے۔

وقت کا اہم مسئلہ موجودہ معاشرے کے اخلاقی زوال اور کردار کے بدترین انحطاط کی اصلاح وقت کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ دنیا کے تمام دانشور اس کو حل کرنے کے لیے حیران و

مرگرداں ہیں۔ لیکن اس کا واحد علاج یہ ہے کہ پورے انسانی معاشرے کو بالآخر اسلامی نظامِ اخلاق اپنا لینا چاہیے۔ اسی میں اس کی فلاح وبقا کا راز مضمر ہے، اور آج کی تباہ حال انسانیت کے لیے یہی واحد راہ نجات ہے۔

ایسے وقت میں پوری امت مسلمہ کا یہ فرض ہے کہ وہ جہاں علمی اعتبار سے اسلامی اساسات اور اسلامی نظام حیات کو پورے عقلی استدلال کے ساتھ پیش کرے وہیں ضروری ہے کہ اسلام پر اپنے یقین، اسلام کے لیے اپنے اخلاص و خیفیت اور حسن کردار کا بھی بہترین ثبوت بہم پہونچائے۔ اسلام کا علمبردار ہونے کی حیثیت سے ایک مسلمان کا یہی مقام ہے کہ وہ لوگوں میں خدا اور آخرت کا صحیح تصور اجاگر کرے۔ ان کی اخلاقی حس کو زیادہ سے زیادہ بیدار کرے اور اسلام کی پیروی کرتے ہوئے اپنے کردار سے ایسا اعلیٰ اخلاقی نمونہ ان کے سامنے رکھے جو انھیں صحیح رخ کی طرف موڑنے والا اور تعمیر سیرت میں انھیں مدد دینے والا ہو۔ یہی ایک مسلمان کا حقیقی منصب ہے اور امت مسلمہ اسی مقصد عظیم کے لیے مبعوث کی گئی ہے۔

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ امت کے کچھ افراد اس ذمہ داری کو ادا کرنے کی کسی نہ کسی حد تک ضرور کوشش کر رہے ہیں مگر یہاں سوال پوری امت یا کم از کم اس کی اکثریت کا ہے۔ اور یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ مسلمان عام طور پر اس فریضے کی ادائیگی میں حد درجہ کوتاہ ہیں ان کی زندگیوں سے اس بات کا ہرگز پتہ نہیں چلتا کہ وہ کسی ایسے دین کے پیرو ہیں جو مفاداتِ دنیا کے بجائے رضائے الٰہی اور فلاح آخرت کو انسان کا مقصود اور مطمح نظر ٹھہراتا ہے۔ ان کے طرز عمل سے ہرگز یہ مترشح نہیں ہوتا کہ وہ حق پرست با اصول اور اخلاق پسند لوگ ہیں، جو سب کچھ قربان کر سکتے ہیں مگر حق و صداقت، اصول و دیانتداری اور اجتماعی مفادات کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑ سکتے۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب ہزاروں ستمگر مل کر بھی زخموں سے چور بلال رضؓ کی آواز حق کو دبا نہ سکتے تھے لیکن اب مسلمانوں کے سینے بلالی کی ایمانی طاقت سے خالی ہیں۔

ہر شخص دوسرے کی اصلاح کا ذمہ دار ہے

معاشرے میں کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن پر انفرادی اصلاح کا رجحان غالب رہتا ہے اور اس کے باعث انھیں اس امر سے کچھ زیادہ تعلق خاطر نہیں ہوتا کہ دوسرے لوگ کیا کرتے ہیں۔ قرآن کریم ایسے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے:-

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

اور بچتے رہو اس فتنہ سے جو مخصوص طور پر انھیں لوگوں کو نہیں لاحق ہوگا جنھوں نے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ اور جان رکھو اللہ سخت پاداش والا ہے

یعنی اپنے معاشرے کے اندر ابھرنے والی خرابیوں اور برائیوں سے بے تعلق نہ رہو۔ بلکہ اپنے امکان اور دینی صلاحیت کی حد تک اس کی اصلاح کی کوشش کرو۔ اس لیے کہ اگر معاشرے میں کوئی خرابی جڑ پکڑ لے تو وہ تدریجاً ایک وبائے عام کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور پھر اس کے بُرے نتائج ان ہی لوگوں کی حد تک محدود نہیں رہتے جو بالفعل ان برائیوں میں ملوث ہوتے ہیں، بلکہ ان خرابیوں پر راضی یا خاموش رہنے والے بھی ان کی زد میں آجاتے ہیں۔ اگرچہ وہ عملاً اس میں مبتلا نہ ہوں۔

اس حقیقت کو نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ایک کشتی کے مسافروں کی تمثیل سے سمجھایا ہے کہ اگر کچھ لوگ ایک کشتی میں سفر کریں۔ کچھ اس کے اوپر کے حصے میں ہوں اور کچھ نیچے والے حصے میں۔ زیریں حصے والے یہ محسوس کرکے کہ انھیں پانی کے لیے اوپر جانے کی زحمت اٹھانی پڑتی ہے اور اوپر والوں کو اس سے تکلیف ہوتی ہے یہ فیصلہ کریں کہ ہم کیوں نہ کشتی کے نچلے حصے میں سوراخ کرلیں، اور بالائی حصے والے یہ خیال کرکے کہ وہ اپنے حصے میں سوراخ کر رہے ہیں ہمیں اس سے کیا سروکار۔ اس پر خاموش رہیں تو نیچے والوں کے اس فعل کے نتیجہ میں جب کشتی ڈوبے گی تو اوپر والوں اور نیچے والوں دونوں کو لے ڈوبے گی۔

(تدبر قرآن ج ۳ ص ۵۰)

اسی بنیاد پر اسلام نے ہر شخص پر دوسروں کو برائی سے روکنے کی ذمہ داری ڈالی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

من رای منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ و ذلک اضعف الایمان۔

(رواہ مسلم فی مشکوٰۃ المصابیح صفحہ ۴۳۶)

تم میں سے جو شخص بھی کوئی برائی دیکھے تو اگر ہاتھ سے اس کو روک سکتا ہو) تو ہاتھ سے روک دے اور اگر ہاتھ سے روکنے پر قادر نہ ہو تو زبان سے روکنے کی کوشش کرے اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو دل سے اسے برا سمجھے اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔

قرآن اور اخلاق

اخلاق کی ابتدا انسانیت کی ابتدا سے وابستہ ہے۔ جب سے دنیا میں انسان کا وجود ہوا اسی وقت سے اخلاق کی تعلیم و ترویج بھی شروع ہوئی۔ تاریخی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ طوفان نوح کے بعد خدا کے جتنے بھی مقدس رسول کائنات انسانی کے لیے پیغام

نجات سے کر آپؐ سب نے اپنی دعوت و تبلیغ میں اخلاقی تعلیم پر زور دیا ہے۔ اور خاتم الانبیا علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے تو اپنی نبوت و بعثت کی غرض و غایت ہی تکمیل اخلاق کو قرار دیا ہے۔

بعثت لأتمم مکارم الأخلاق وفی روایۃ حسن الأخلاق (ترمذی) — میری بعثت اخلاق کریمانہ اور حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے ہوئی ہے۔

اور قرآن میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جتنی تعریفیں مذکور ہیں ان سب میں جامع ترین مدح یہ ہے۔

وانک لعلی خلق عظیم (ن) — بلا شبہ آپ عظیم اخلاق کے حامل ہیں۔

یعنی مکارم اخلاق کا کوئی خلق ایسا نہیں ہے جو آپ میں کمال درجہ پر موجود نہ ہو اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر حضور کے مذکورہ بالا ارشاد کے کوئی معنی نہ ہوتے۔ مکارم اخلاق کی تکمیل وہی شخص کر سکتا ہے جس میں وہ خود بدرجہ اتم موجود ہوں۔ گویا آیت بالا ارشاد نبوی کی پر زور تصدیق ہے یہی وجہ ہے کہ حضور کی ذات گرامی کو تا قیام قیامت تمام صالح انسانوں کے لیے اسوہ کی حیثیت دی گئی ہے لقد کان لکم فی رسول اللہ أسوۃ حسنۃ۔

قرآن کریم نے تمام مکارم اخلاق کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے اور حضور کا اخلاق بقول حضرت عائشہؓ تمام تر قرآن تھا یعنی حضور کی ذات گرامی ان تمام مکارم اخلاق سے آراستہ تھی جن کا قرآن نے حکم دیا ہے۔ حضور نے اپنے بکثرت ارشادات میں یہ بات واضح فرما دی ہے کہ بہترین اور افضل ترین انسان وہ ہے جو کمال حسنِ اخلاق سے آراستہ ہو۔ بخاری کی روایت ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان من أخیرکم أحسنکم خلقًا — حضور نے فرمایا تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو اخلاق میں سب سے اچھا ہو۔

ترمذی میں ہے:۔

ان من اکمل المؤمنین ایمانا احسنہم خلقًا — ایمان کے لحاظ سے کامل ترین مومن وہ ہے جو اخلاق میں سب سے اچھا ہو۔

قرآن ایک مکمل ضابطۂ اخلاق

قرآن حکیم درحقیقت انسانی کردار کا ایک مکمل ضابطہ ہے اور قرآنی ضابطہ کردار خالص مذہبی تصورات پر مبنی ہے۔

اور مذہب کی مخصوص زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ مگر اس کی وجہ سے اس کی افادیت صرف شیدائیان مذہب کے زمرہ تک محدود نہیں ہو جاتی۔ ان لوگوں کے لیے بھی وہ کافی اہمیت اور جاذبیت رکھتا ہے جو مذہب کے ظاہری ڈھانچہ سے گریز کرتے ہیں۔ اس ضابطہ کے پس منظر یا مذہبی رنگ غالب ہے۔ اس کے باوجود عقل کے ذریعہ اس کی تنقیح و تصدیق بھی ممکن ہے اس لیے یہ ضابطہ ان لوگوں کو بھی غور و فکر کی دعوت دیتا ہے جو الہامی مذہب پر اعتقاد نہیں رکھتے مگر ساتھ ہی فکر و عمل میں نراج کو بھی پسند نہیں کرتے اور ایسے قابل اعتبار معیار کے طالب ہیں جس کی مدد سے اپنی روزمرہ سرگرمیوں کی اخلاقی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کر سکیں۔ جس راہ عمل کا خاکہ قرآن میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کی غرض و غایت ایسے ذہن کی تخلیق ہے جو انسان کو اس قابل بنا دے کہ کائنات کے عمیق تر مقصد کی خدمت کرتے ہوئے وہ خود اپنی ذات اور خارجی ماحول دونوں کے ساتھ کامل توافق اور ہم آہنگی کے ساتھ زندگی بسر کر سکے۔

گذشتہ اقوام کے زوال کا حقیقی سبب کردار و سیرت کا انحطاط

قرآن نے اپنی دعوت کے سلسلہ میں بکثرت قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ پیش کی ہے اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ قوموں کا ابھرنا اور فنا ہو جانا اتفاقی واقعات کے طور پر ظہور میں نہیں آتا۔ بلکہ اس میں اصل دخل اخلاقی عوامل کا ہوتا ہے۔ جب کوئی قوم زندگی کے اخلاقی عناصر سے خالی ہو جاتی ہے تو قانون قدرت اس کو فنا کر دیتا ہے۔ اور کوئی دوسری قوم اس کی جگہ اٹھا کھڑی کرتا ہے، جو کردار و اخلاق میں اس سے بہتر ہوتی ہے۔ قدیم قومیں مثلاً عاد، ثمود، مدین، سبا، قوم لوط اور قوم فرعون وغیرہ کے ساتھ بھی عروج و زوال کے یہی خدائی ضابطے ظہور میں آئے۔ جب وہ اخلاقی و روحانی انحطاط سے دوچار ہوئیں تو اللہ جل شانہ نے ان کی اصلاح اور فلاح کے لیے اخلاقی طبیب یعنی انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا۔ ان انبیاء نے اپنی تمام تر کوششیں قوموں کی اصلاح و درستگی کے لیے صرف کیں۔ لیکن جب انھوں نے ان کی باتوں پر کان نہ دھرے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو فنا کر دیا۔ قرآن نے مسلمانوں کو عروج و زوال کا یہ خدائی قانون سنا کر در اصل ان کو متنبہ کیا ہے کہ اگر تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کی اتباع نہ کی تو تم بھی روئے زمین سے اسی طرح فنا کر دیے جاؤ گے جس طرح تمہاری پیشرو قومیں فنا کر دی گئیں۔

(باقی)

ضیاء الحسن فاروقی (جامعہ ملیہ دہلی)

"گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را"

کہتے ہیں کہ اگر کوئی اپنے سینے کے داغوں کو تازہ اور شگفتہ رکھنا چاہے تو اسے چاہیے کہ کبھی کبھی پرانی داستانوں کو دہراتا رہے۔ ایک زمانہ تھا کہ مولانا روم کی مثنوی اور سعدی شیرازی کی گلستاں و بوستاں کا تعلیم یافتہ طبقے میں بڑا چرچا تھا۔ خاص طور سے تعلیم کے ابتدائی مرحلوں میں گلستاں و بوستاں کے انتخابات بچوں کو پڑھائے جاتے تھے، پھر ثانوی مرحلے میں مثنوی معنوی کے ایک حصے کی تعلیم ہوتی تھی۔ ان دونوں کتابوں نے نہ معلوم کتنی نسلوں کی اخلاقی تربیت کی، کیا ہندو کیا مسلمان، سب کے یہاں ان اخلاقی جواہر پاروں کی قدر تھی، اب عرصے سے ہم ان سے محروم ہیں اور ہمیں معلوم ہے کہ ان کی جگہ ہم ان سے کمتر درجہ کی بھی کوئی ایسی کتاب اپنے بچوں کو نہیں پڑھاتے جن سے ان کی اخلاقی تربیت ہو سکے، دیکھیے ہم کیسے گلستاں و بوستاں سے کیسے ویرانے میں آگئے ہیں، جی چاہتا ہے کہ آج مثنوی اور گلستاں کے قصے دہراؤں اور اپنے اور قارئین دونوں کے سینوں کے داغ تازہ کروں۔

عارف رومی نے مثنوی میں چار ہندوستانیوں کا قصہ بیان کیا ہے جو آپس میں لڑ رہے تھے اور اپنے عیوب سے بے خبر تھے۔ قصہ یوں ہے کہ چار ہندوستانی ایک مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے گئے اور نماز میں مشغول ہو گئے۔ اتنے میں موذن آگیا اور ایک کی زبان سے نکل گیا کہ وقت ہو گیا ہے تو نے اذان کہی یا نہیں۔ دوسرے نے کہا ارے تو نماز میں بول پڑا، تیری نماز باطل ہو گئی۔ تیسرے نے دوسرے سے کہا، حضرت، آپ دوسروں کو کیا کہتے ہیں، خود آپ کی نماز بھی ٹوٹ گئی، چوتھے نے کہا کہ الحمد اللہ میں بال بال بچ گیا، ان تینوں کی طرح کنوئیں میں نہ گرا، اس طرح

چاروں کی نمازیں باطل ہوگئیں۔ بات یہ ہے کہ جو دوسروں کے عیب ڈھونڈتا ہے وہ خود گم کردہ راہ اور تباہ ہے۔ بشارت ہے اس بندہ کے لیے جو اپنے عیوب پر نظر رکھتا ہے اور اگر کوئی اس کی برائیاں ظاہر کردے تو وہ انھیں مان لیتا ہے۔ دوسروں کی کمزوریوں پر ہنسنا اور طعنہ زن ہونا خدا کے نزدیک پسندیدہ نہیں، کسی وقت وہی کمزوریاں تم سے ظاہر ہوسکتی ہیں، اگر تم کسی میں کوئی عیب دیکھو تو خدا کا شکر ادا کرو کہ تم اس سے محفوظ ہو۔ اس میں تمھارے لیے عبرت ہے۔

چند ترک خونریزی اور لوٹ مار کے لیے ایک گاؤں پر حملہ آور ہوئے اور گاؤں کے سربرآوردہ لوگوں میں سے دو کو گرفتار کیا اور ان میں سے ایک کو مار نے دوڑے۔ اس نے کہا اے عالی مرتبہ لوگو! تم مجھے کیوں قتل کر رہے ہو۔ میں تو فقیر اور پریشان روزگار ہوں۔ انھوں نے کہا کہ ہم تمھیں اس لیے مار رہے ہیں کہ اس سے تیرا ساتھی ڈر کر بتا دے گا کہ مال و متاع کہاں ہے، اس نے کہا کہ وہ تو مجھ سے زیادہ محتاج ہے۔ ترکوں نے کہا، نہیں، وہ متمول ہے اور اس نے مسکینوں جیسی صورت قصداً بنائی ہے۔ اس نے کہا کہ یہ تو آپ لوگوں کا محض خیال اور وہم ہے ورنہ ہم دونوں برابر ہیں اور دونوں سے متعلق احتمال و شبہ ایک جیسا ہے، اس لیے پہلے تم اسے مار ڈالو تاکہ میں ڈر کر بتا دوں کہ مال کہاں ہے، پہلے مجھے کیوں قتل کرتے ہو، مولانا کہتے ہیں کہ اس سے تم یہ نتیجہ نکالو کہ ہم سب برابر تھے اور ہم کو پہلے لوگوں پر کوئی ترجیح نہ تھی مگر خدا نے اپنے فضل سے ہم کو آخر میں پیدا کیا اور رتبہ میں پہلوں سے مقدم کیا، مشہور حدیث ہے: نَحْنُ الْآخِرُوْنَ السَّابِقُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بَيْدَ أَنَّهُمْ أُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِنَا وَأُوْتِيْنَاهُ مِنْ بَعْدِهِمْ۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ نوحؑ اور ہودؑ کی امتوں کو جن ہلاکتوں کا سامنا ہوا اُن سے ہمیں آگاہی اور تنبیہ ہوگئی اور اس طرح ہم نے گویا ان ہلاکتوں کے توسط سے خدائے برتر و بزرگ کی رحمت بے پایاں کا چہرہ دیکھ لیا۔ قہر الٰہی نے قوم نوح و ہود کو ہلاک کیا کہ ہم ڈریں اور سنبھل جائیں لیکن اگر معاملہ الٹا ہوتا تو ہمارا کہاں ٹھکانا تھا۔

سعدی علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے کہ مجھے یاد ہے، ایام طفولیت میں میں بڑا عابد و زاہد، سحر خیز اور شب بیدار تھا۔ ایک رات اپنے والد کی خدمت میں حاضر تھا، تمام رات جاگتا رہا اس طرح کہ قرآن

پاک کی تلاوت میں مصروف تھا، اور کچھ لوگ تھے جو ہمارے چاروں طرف محو خواب تھے، میں نے والد مرحوم سے کہا: ان میں سے کسی کو یہ خیال نہیں کہ فجر کی دو رکعت نماز ادا کرے، سب کے سب اس طرح خوابِ غفلت میں مبتلا ہیں کہ جیسے خفتہ نہیں مُردہ ہیں۔ والد نے فرمایا: جانِ پدر، تو بھی اگر سوتا رہتا تو بہتر تھا کہ اس طرح دوسروں کی عیب جوئی و غیبت سے محفوظ رہتا۔

نیکو کاروں میں سے کسی نے خواب میں دیکھا کہ بادشاہ جنت میں ہے اور پارسا دوزخ میں۔ اس نے کہا: لوگوں کا خیال تھا کہ بادشاہ جہنم میں ہوگا اور پارسا جنت میں، اس بلندی و پستی کا سبب کیا ہے؟ ندا آئی کہ یہ بادشاہ درویشوں کی دوستداری و عقیدت مندی کی وجہ سے جنت میں ہے اور یہ پارسا اس لیے دوزخ میں ہے کہ دنیا میں بادشاہوں کا تقرب ڈھونڈتا پھرتا تھا۔

دلقت بچہ کار آید و تسبیح و مرقع — خود را ز عملہائے نکوہیدہ بری دار
حاجت بکلاہ برکی داشتنت نیست — درویش صفت باش و کلاہ تتری دار

صوفیوں کی چادر و خرقہ پہن لینے سے تجھے کوئی فائدہ نہ ہوگا، البتہ اپنے آپ کو بُرے کاموں سے بچائے رکھیو ضروری نہیں کہ تیرے پاس کلاہ نشین ہو، ہاں، دل درویشوں جیسا ہونا چاہئے خواہ سر پر کلاہ تاتاری ہی کیوں نہ ہو۔

ایک چور ایک درویش پارسا کے گھر میں داخل ہوا، بہت تلاش کی، کچھ نہ ملا۔ مایوس اور دل تنگ ہوا۔ درویش یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے، ان سے چور کی محرومی و دل تنگی دیکھی نہ گئی، گدڑی جو ان کے پاس تھی اس کے سامنے ڈال دی تاکہ چور ان کے گھر سے مایوس نہ جائے۔

شنیدم کہ مردانِ راہ خدای — دل دشمناں را نکردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام — کہ با دوستانت خلاف است و جنگ

میں نے سنا ہے کہ مردانِ خدا دشمنوں کو بھی دل تنگ نہیں کرتے۔ تجھے کس طرح یہ مقام و مرتبہ حاصل ہو سکتا ہے کہ تو تو اپنے دوستوں کے ساتھ بھی ہمہ وقت ستیزہ کاری و دشمنی میں لگا رہتا ہے۔

ایک روز ہارون الرشید کا بیٹا غصہ سے بھرا ہوا اس کے پاس آیا اور شکایت کی کہ فلاں سپاہی زادے نے مجھے ماں کی گالی دی ہے۔ ہارون نے ارکان سلطنت سے پوچھا کہ ایسے شخص کی کیا سزا ہے؟ کسی نے کہا کہ اسے قتل کر دینا چاہیے، کسی نے زبان کاٹ لینے کی سزا تجویز کی اور کسی نے تاوان وجلا وطنی کی۔ ہارون نے کہا: بیٹے! اگر تو اسے معاف کر دے تو اسے کرم سمجھا جائے گا اور اگر تو اس کار نیک کا متحمل نہیں ہو سکتا تو تو بھی اسے ماں کی گالی دے۔ یہ مناسب نہیں کہ انتقام حد سے تجاوز کر جائے۔ ایسی صورت میں ہم ظالم ہوں گے اور وہ شخص مظلوم اور عدل کا خواستگار۔

نہ مرد است آں بنزدیک خردمند　　کہ با پیل دماں پیکار جوید
بلے مرد آنکس است از روئے تحقیق　　کہ چوں خشم آیدش باطل نگوید

خردمندوں کے نزدیک وہ شخص مرد نہیں ہے جو مست وخشمگیں ہاتھی سے ٹکرا جائے بلکہ حقیقت میں مرد وہ ہے جو غضب وغصہ کی حالت میں بھی کوئی ناسزا اور بیہودہ بات زبان سے نہ نکالے۔

ایک بادشاہ تھا، وہ ایک ناگفتنی مرض میں مبتلا ہو گیا طبیبوں کا اس پر اتفاق ہو گیا کہ اس کے سوا اس کا اور کوئی علاج نہیں کہ ایسی ایسی خصوصیات کے آدمی کے پتے کی تھیلی دی جائے۔ حکم ہوا کہ ایسے آدمی کی تلاش کی جائے۔ ایک کاشتکار کا بیٹا دستیاب ہوا جو انھیں اوصاف کا حامل تھا۔ اس کے ماں باپ کو بلایا گیا اور انھیں بہت کچھ مال ومتاع دے کر راضی کر لیا گیا۔ قاضی نے بادشاہ کی سلامتی کے لیے رعایا میں سے کسی کے خون کے جواز کا فتویٰ بھی دے دیا جلاد نے جب گردن اڑا دینے کا قصد کیا، اس دہقان زادہ نے آسمان کی طرف سر اٹھایا اور مسکرایا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ ایسی حالت میں مسکرانے کا کیا موقع ہے؟ اس نے کہا: ماں باپ اپنی اولاد کی ناز برداری کرتے ہیں، قاضی کے سامنے لوگ اپنے دعوے لیکر جاتے ہیں اور بادشاہوں سے داد انصاف طلب کرتے ہیں۔ یہاں صورت یہ ہے کہ ماں باپ نے مال دنیا کے عوض مجھے بیچ دیا ہے، قاضی نے میرے خون کے جواز کا فتویٰ دے دیا ہے اور سلطان میری ہلاکت میں اپنی سلامتی دیکھتا ہے، اب سوائے خدائے عزّ وجلّ کے کون پناہ دے سکتا ہے سلطان کا دل بھر آیا، آنکھیں نم ہو گئیں اور کہا: کسی بیگناہ کے خون سے بہتر ہے کہ میں ہلاک ہو جاؤں۔ اس نے اس نوجوان کی پیشانی کو چوما، بغلگیر ہوا اور انعام واکرام کے ساتھ رخصت کیا۔ کہتے ہیں کہ چند روز کے بعد وہ صحتیاب ہو گیا۔

(جامعہ ملی کے شکریہ کے ساتھ)

محمد منظور نعمانی

تحدیث نعمت

(۱۲)

حاجی عبد الرحمٰن صاحب نومسلم — اسلام کا ایک معجزہ

اب سے ٹھیک ایک سال پہلے جنوری ۵۹ء کے شمارہ میں اس سلسلہ کی گیارھویں قسط شائع ہوئی تھی جس میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں اپنی حاضری اور حضرت ممدوح کے ساتھ عقیدت ومحبت اور اسی کے ساتھ حضرت کے بعض چشم دید ایمان افروز احوال کا تذکرہ کیا گیا تھا۔ اس کے بعد مسلسل ایسے حالات رہے کہ اس سلسلہ میں کچھ نہیں لکھا جاسکا، آج اس بارھویں قسط میں حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے ایک خاص رفیق حاجی عبد الرحمٰن صاحب نومسلم کے بارہ میں لکھا جارہا ہے۔

حاجی صاحب نے اپنے اسلام لانے کا عجیب وغریب واقعہ بڑی تفصیل کے ساتھ اس عاجز کو خود سنایا تھا، میرا خیال ہے کہ مجھے وہ واقعہ جوں کا توں یاد ہے۔ اور میں قریباً تیس سال کے بعد اس وقت اُس کو حافظہ ہی سے لکھ رہا ہوں۔

حاجی صاحب میوات کے ایک بڑے اور مشہور گاؤں اٹاوڑ کے ایک دولت مند بنیے کے بیٹے تھے۔ اُن کا نام کندن لال تھا۔ انھوں نے بتایا کہ "میری عمر ۱۱-۱۲ سال کی تھی، میں گاؤں کے اسکول میں پڑھتا تھا اور پڑھائی میں بہت تیز تھا۔ میرے ساتھ مسلمان لڑکے بھی پڑھتے تھے، میں نے گاؤں کے مسلمانوں سے اور ساتھی لڑکوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اور آپ کا نام پاک سنا تھا اُس سے میرے دل میں حضورؐ کے ساتھ ایک محبت سی پیدا ہوگئی تھی۔ میرے باپ کی دکان تھی جو گاؤں میں خوب چلتی تھی۔ ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنی دکان پہ ہوں، باپ نہیں ہیں،

میں بھی ان کی جگہ بیٹھا سودا بیچ رہا ہوں، گاؤں کی کچھ عورتیں جن میں میری رشتہ دار بھی ہیں سودا لینے کے لیے دکان پر کھڑی ہیں اور میں سودا دے رہا ہوں، اتنے میں معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے پیغمبر صاحب کی سواری آرہی ہے، میں ان کے درشن کے لیے دکان چھوڑ کر جانے لگا، ان عورتوں نے مجھے نہیں جانے دیا اور کہا کہ کمبخت! پہلے ہمیں سودا دیدے، پھر کہیں جا، میں نے جلدی جلدی ان کو نپٹانا چاہا، ابھی نپٹا نہیں سکا تھا کہ معلوم ہوا کہ حضرتؐ کی سواری آگئی، اور بہت مجمع ہے، میرے ہاتھ میں سیر اتولنے کی جو ترازو تھی، میں نے اس کو زمین پر پٹک دیا اور حضورؐ کو دیکھنے کے لیے دکان چھوڑ کر بھاگ پڑا مگر جب میں پہونچا تو آپ کی سواری آگے بڑھ چکی تھی، اور میں چہرۂ مبارک نہیں دیکھ سکا، پیچھے کی جانب سے بس گردن دیکھ پایا، اسی سے دل میں ایک عجیب عشق کی سی کیفیت پیدا ہوگئی — آنکھ کھلی تو دل میں وہی کیفیت تھی، میں نے گھر میں کسی سے ذکر نہیں کیا اور دل میں طے کرلیا کہ میں مسلمان ہو جاؤں گا۔ صبح کو اسکول گیا لیکن لکھنے پڑھنے میں بالکل جی نہیں لگا۔ رات جو خواب دیکھا تھا بیٹھے بیٹھے بس اسی کو سوچتا تھا، جو پنڈت جی پڑھاتے تھے انھوں نے دیکھا تو کہا کمبخت! آج کیا بات ہے، کیوں گم سم بیٹھا ہے، پڑھتا کیوں نہیں؟ میں نے انھیں بتایا کہ آج میں نے ایسا سپنا (خواب) دیکھا ہے، انھوں نے مجھے ڈانٹا اور کہا کہ جا اپنی جگہ بیٹھ، اپنا کام کر، میں اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا۔ پنڈت جی نے سلیٹ ہاتھ میں لیکر نجومیوں کے طریقہ پر کچھ حساب لگایا، تھوڑی دیر کے بعد مجھے اپنے پاس بلایا اور پوچھا کمبخت ذرا پھر بتا تو نے رات کیا سپنا دیکھا ہے؟ میں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ انھیں پھر بتایا، انھوں نے پھر مجھے ڈانٹا اور کہا جا اپنی جگہ بیٹھ اپنا کام کر! میں آکے بیٹھ گیا، پنڈت جی نے پھر سلیٹ پر اپنا کچھ حساب لگایا اور کچھ دیر کے بعد مجھے پھر بلایا اور رات کے خواب کو پھر پوچھا، اور جب میں نے بتایا تو پھر مجھے خوب ڈانٹا کئی دفعہ ایسا ہی ہوا، جب اسکول کی چھٹی کا وقت آیا تو پنڈت جی میرے ساتھ ہمارے گھر آئے اور میرے باپ کو الگ بلا کے کہا کہ ایسا لگتا ہے کہ تیرا بیٹا کبھی مسلمان ہو گا۔ مجھے اس وقت کچھ معلوم نہیں ہوا کہ پنڈت جی نے میرے باپ سے کیا کہا لیکن بعد میں مجھے معلوم ہو گیا، باپ نے میری ماں کو بھی بتا دیا، دونوں بہت فکرمند اور پریشان ہو گئے، میرا اسکول جانا بھی بند کر دیا گیا، مگر میں نے دل میں طے کرلیا کہ جو کچھ بھی ہو مجھے مسلمان ہونا ہے، اب میں دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کہاں چلا جانا چاہیے۔ میں اسی فکر اور ٹوہ میں رہتا تھا — میں نے کچھ مسلمانوں

سے سُن رکھا تھا کہ دہلی کے پاس ایک بستی ہے "نظام الدین" وہاں ایک بنگلہ والی مسجد ہے، اس میں ایک میاں صاحب رہتے ہیں، بڑے نیک اور اللہ والے آدمی ہیں، جو کوئی اُن کے پاس جائے وہ اس کو اپنے پاس رکھ کر پڑھاتے بھی ہیں اور کھلاتے پلاتے بھی ہیں۔ میں نے انہی کے پاس جانے کا ارادہ کر لیا۔ چپکے چپکے راستہ کی معلومات حاصل کرتا رہا، پھر ایک دن موقع پا کر گھر سے ایک رقم لے کر نکل گیا اور کسی طرح نظام الدین کی اُس مسجد میں پہنچ گیا، گھر اور گاؤں والوں کو بالکل خبر نہ ہوئی کہ میں کہاں گیا! بعد میں معلوم ہوا کہ ماں باپ بہت دنوں تک روتے رہے۔

یہ بزرگ حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے سب سے بڑے بھائی حضرت مولانا محمد حسن صاحبؒ تھے، انہوں نے بڑی شفقت سے رکھا، پڑھایا اور وہی میرے باپ اور میری ماں بن گئے، اور میں بھی انہی کا ہو گیا، اُن کی وفات کے بعد یہ حضرت جی (حضرت مولانا محمد الیاسؒ) یہاں آ گئے، اُس وقت سے انہی کے ساتھ ہوں ۔۔۔ میں جو رقم گھر سے ساتھ لایا تھا میں نے بہت دنوں تک حضرت مولانا محمد حسن صاحبؒ سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا، پھر ایک دن بتا دیا ۔۔۔ میں بنیے کا بیٹا تھا جب کوئی نفع کا کام سامنے آیا میں نے وہ رقم اُس میں لگا دی، اللہ نے بہت برکت دی، جس کام میں لگائی بہت نفع ہوا۔ اللہ کی توفیق سے اُس کی راہ میں خرچ بھی کرتا رہا۔"

حاجی صاحب غیر مسلموں میں (غالباً زیادہ تر میوات ہی کے علاقہ میں) ذاتی اور انفرادی طور پر کام کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعوت اور اُن کی ذات میں بھی بڑی تاثیر اور کشش رکھی تھی۔ راقم سطور کو انہوں نے خود بتلایا تھا کہ اب تک اُن کے ذریعہ قریباً ۱۴ سو (۱۴۰۰) آدمی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اسلام قبول کر چکے ہیں ۔۔۔ کسی نے یہ بھی بتلایا تھا کہ میوات ہی میں کسی مقام پر انہوں نے ایک خاص طرح کا مدرسہ بھی قائم کر رکھا تھا جس کے مصارف کے وہ خود ہی ذمہ دار تھے، جو لوگ اسلام قبول کرتے اُن کی ضروری تعلیم و تربیت کا بھی اس مدرسہ میں کچھ انتظام تھا۔

وہ وعظ بھی فرماتے تھے، اُن کا وعظ خاص کر میواتیوں کے لیے بڑا دلچسپ ہوتا تھا۔ بدعات اور مشرکانہ رسوم کی اصلاح اُن کے وعظ کا خاص موضوع ہوتا تھا، میوات ہی کے ایک جلسہ میں راقم سطور نے بھی ایک دفعہ اُن کا وعظ سنا تھا۔

اُن کے اوقات کا زیادہ حصہ تلاوت اور ذکر و عبادت میں گزرتا تھا اُن کے کسی خاص محرم راز اور واقفِ حال نے مجھے بتلایا تھا کہ حاجی صاحب کو سترہ پارے قرآن پاک کے حفظ ہیں اور روزانہ نوافل میں اُن کے پڑھنے کا معمول ہے۔ ذکر و عبادت کا نور آنکھوں میں اور چہرہ پر صاف محسوس ہوتا تھا۔

اُنکے جاننے والوں اور ان سے تعلق رکھنے والوں کے نزدیک اُن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ مستجاب الدعوات تھے۔ حضرت مولانا محمد الیاسؒ بھی اہم امور میں اُن سے خاص طور سے دعا کرایا کرتے تھے۔ اُنکے حلقۂ تعارف میں اُنکی قبولیت دعا کے غیر معمولی قسم کے بہت سے واقعات مشہور تھے۔ ایک واقعہ کسی سلسلۂ کلام میں انہوں نے راقم سطور کو خود سنایا۔ فرمایا کہ

"فلاں گاؤں کے لوگ بڑے جاہل اور بدعات و خرافات میں مبتلا تھے اور دین کی بات اور نصیحت سننے کو بھی تیار نہ ہوتے تھے، میں بار بار اُس گاؤں گیا لیکن اُن پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اُس گاؤں میں کنوئیں کا پانی بہت کھاری تھا، پینے کا پانی دور سے لانا پڑتا تھا —— ایک دفعہ میں اُس گاؤں میں گیا، وہاں کے لوگوں نے کہا کہ دیکھو حاجی! ہمارے کنوئیں کا پانی کڑوا ہے ہم چاہتے ہیں کہ دوسرا کنواں دوسری جگہ کھودیں، تو دعا کر کہ پانی میٹھا نکل آئے، اگر تیری دعا سے پانی میٹھا نکل آیا تو ہم سب تیری بات مان لیں گے —— میں نے اپنے اللہ کے بھروسے پر اُن سے کہا کہ تم جگہ تجویز کرو اور بتاؤ کہ کہاں کنواں کھودنا چاہتے ہو؟ انہوں نے آپس میں مشورہ کر کے گاؤں سے باہر جگہ طے کی، میں نے اُن سے کہا کہ اب جاؤ کل صبح کھودنا شروع کیجیو۔ رات کو میں نے اسی جگہ مصلّے ڈالا اور نماز پڑھی اور اللہ سے دعا کی —— صبح کو میں نے اُن سے عہد لیا کہ اگر اللہ اُن کو کنوئیں سے میٹھا پانی دے گا تو وہ نماز پڑھا کریں گے۔ اور کھدائی شروع ہوئی، سب سے پہلے پھاؤڑا ہاتھ میں لیکر کھدائی میں نے شروع کی، پھر سارا گاؤں جُٹ گیا۔ جب کھدائی پانی کے قریب تک پہنچ گئی تو میں نے اُن سے کہا کہ اب تم سب اوپر نکل آؤ۔ وہ سب آ گئے اور میں نیچے اتر گیا میں نے دو رکعت نماز پڑھی اور اللہ سے دعا کی اور عرض کیا کہ کھاری پانی بھی تیرے ہی حکم سے نکلے ہے اور میٹھا بھی تو ہی نکالے ہے اور تجھے پوری قدرت ہے کہ جہاں سے چاہے کھاری یا میٹھا نکالے! اے میرے اللہ! اس وقت تو اس جگہ سے میٹھا ہی پانی نکال دے۔ یہ دعا کر کے اللہ کے کرم سے بڑی امید رکھتے ہوئے میں نے زمین پر پھاؤڑا مارا فوراً ہی پانی نکلا میں نے دونوں ہاتھوں میں لیکر پیا، الحمد للہ میٹھا نکلا پھر میں نے شکر کے نفل پڑھے اور گاؤں والوں سے کہا لو اللہ تعالیٰ نے میٹھا پانی نکال دیا اب کھودلو،

سب نے پانی پی کے دیکھا پھر وہاں کے لوگ دین کی بات سننے اور ماننے لگے۔

حاجی عبدالرحمٰن کی قبولیت دعا کا ایک واقعہ اور قابل ذکر ہے جس کا تعلق خود اس عاجز راقم سطور کی ذات سے ہے۔ حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی وفات اب سے قریباً ۱۶ سال پہلے رجب ۱۳۶۳ھ میں ہوئی۔ وفات کے اگلے ہی دن میوات کے کسی گاؤں میں تبلیغی اجتماع تھا جو پہلے سے طے شدہ تھا تبلیغی کام سے تعلق رکھنے والے جو اکابر یا احباب حضرت کی وفات کی وجہ سے نظام الدین میں جمع تھے قریب قریب وہ سب ہی اس اجتماع میں شرکت کے لیے میوات گئے۔ یاد پڑتا ہے کہ کئی لاریاں بھر کے گئی تھیں میوات جانے والوں میں راقم سطور بھی تھا، جب وہاں سے واپسی ہونے لگی تو حاجی عبدالرحمٰن صاحب نے اصرار کر کے مجھے اپنے ساتھ ایک بیل گاڑی میں بٹھا لیا، یہ بیل گاڑی کسی میواتی کی تھی جو حاجی صاحب کا معتقد تھا۔ گاڑی والے میواتی کے علاوہ اس پر حضرت حاجی صاحب تھے اور یہ راقم سطور۔ جب گاڑی چل پڑی تو حاجی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ مجھے تم سے ایک بات تنہائی میں پوچھنی تھی، اس لیے میں نے تمہیں زبردستی بیل گاڑی میں بٹھایا ہے، اور تکلیف دی ہے، تنہائی کا ایسا اطمینان کا موقع ملنا بہت مشکل تھا ——— اس کے بعد حاجی صاحب نے فرمایا۔

"کوئی دو ڈھائی برس پہلے کی بات ہے، گرمی کا موسم تھا، ٹھیک دوپہر کا وقت تھا، میں کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کے اپنی عادت کے مطابق حجرے کے کواڑ بند کر کے سونے کے ارادہ سے لیٹ گیا تھا کہ حضرت جی (حضرت مولانا محمد الیاسؒ) نے دروازہ پر آ کر دستک دی اور آہستہ سے فرمایا کہ "حاجی عبدالرحمان اگر تم جاگ رہے ہو تو دروازہ کھول دو، مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے" ——— میں اگرچہ جاگ رہا تھا ابھی سویا نہیں تھا لیکن میں نے دروازہ نہیں کھولا اور کچھ بولا بھی نہیں۔ تاکہ وہ واپس جا کر اس وقت آرام کر لیں، بات تو پھر بھی ہو جائے گی ——— میں نے سوچا کہ اگر میں دروازہ کھول دوں گا تو یہ دیر تک باتیں کریں گے اور پھر ان کے آرام کا وقت نہیں رہے گا۔ تو میں نے ان کے آرام کے خیال سے نہ دروازہ کھولا نہ کوئی جواب دیا ——— حضرت جی نے تھوڑا انتظار فرما کے پھر وہی کہا کہ۔
"حاجی عبدالرحمان اگر تم جاگ رہے ہو تو دروازہ کھول دو مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے" ———
میں نے اس کے بعد بھی دروازہ نہیں کھولا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ تاکہ وہ واپس چلے جائیں اور اپنے حجرہ میں آرام کر لیں ——— لیکن وہ اس کے بعد بھی واپس نہیں گئے اور تھوڑی دیر کے بعد پھر وہی

فرمایا — میں نے مجبور ہو کر دروازہ کھولا؟ اور اُن سے کہا کہ میں جگ تو رہا تھا لیکن میں اس لیے نہیں
بولتا تھا کہ آپ اس وقت باتیں شروع کریں گے تو آرام نہیں کر سکیں گے۔ بات تو آرام کرنے کے اور ظہر
کے بعد بھی ہو سکتی تھی۔ حضرت نے فرمایا کہ میرے دل میں یہ تقاضا تھا کہ تمہیں اٹھا کے ابھی بات کروں
—— اس کے بعد حضرت جی نے تمہارا (راقم سطور محمد منظور نعمانی کا) نام لیکر فرمایا کہ اُن کو جانتے ہو؟
میں نے کہا مجھے تو یاد نہیں، فرمایا وہ، جن کا بریلی سے رسالہ نکلتا ہے اور وہ بدعات کا اور اہلِ بدعات
کا رد کرتے ہیں — میں نے کہا ہاں اُن کو تو جانتا ہوں —— فرمایا وہ ایک غلط جگہ چلے گئے ہیں،
اسی وقت اُن کے لیے دعا کرنی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو وہاں سے نکال لے —— پھر حضرت مجھے
ساتھ لیکر اپنے حجرے میں تشریف لے گئے۔ مجھے ساتھ کھڑا کر کے پہلے دو رکعت نماز پڑھی، پھر مجھ سے فرمایا
کہ اُن کے لیے اللہ سے دعا کرو اور اللہ سے مانگو، خود بھی دعا فرمائی:

یہ پورا واقعہ بیان کر کے حاجی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ تمہارا کیا قصہ تھا
اور تم کہاں گئے تھے، میں نے حضرت جی سے پوچھا بھی نہیں —— اگر تم بتا سکو اور بتانا مناسب
سمجھو تو بتلاؤ کہ تم کہاں گئے تھے جس کی حضرت جی کو اتنی فکر تھی؟

میں نے اُن کی بتلائی ہوئی رات اور موسم کا حساب لگایا تو اندازہ ہوا کہ غالباً یہ وہ زمانہ تھا جب میں
"جماعت اسلامی" کے ایک اساسی رکن کی حیثیت سے اُس کے اُس وقت کے مرکز اور مستقر (دارالاسلام
جمالپور ضلع سرگودھا) میں جا کر مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی وغیرہ چند رفقاءِ جماعت کے ساتھ مقیم ہو گیا
تھا،

وہاں پہنچکر چند ہی روز کے بعد میرے قلب کی جو ایک خاص کیفیت ہو گئی تھی، اور جس شدید
اندرونی کشمکش میں میں مبتلا ہو گیا تھا (جس کے نتیجہ میں بالآخر چند ہی مہینے کے بعد میں جماعت سے مستعفی
بھی ہو گیا) جس کے کچھ ظاہری اسباب و وجوہ بھی تھے —— لیکن حاجی عبدالرحمٰن صاحب سے مذکورۂ
بالا واقعہ سن کر دل میں یہ یقین سا پیدا ہو گیا کہ میری اُس قلبی کیفیت اور اندرونی کش کش میں اصل عامل اِن
دونوں بزرگوں کی یہ دعا تھی —— والعلم عند اللہ تعالیٰ

یہاں یہ بات خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ جس زمانہ کا یہ واقعہ حاجی عبدالرحمٰن صاحب نے بیان
فرمایا اُس وقت تک حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ سے میرا کوئی خاص تعلق نہیں تھا اور ان کے تبلیغی کام

سے تو بالکل ہی تعلق نہیں تھا بلکہ میں اُس کی صحیح نوعیت کو جانتا بھی نہیں تھا اُن کے ساتھ اور ان کے تبلیغی کام کے ساتھ مجھے کسی درجہ کا جو تعلق نصیب ہوا وہ بعد کا واقعہ ہے۔

حاجی صاحب کے سلسلہ میں ایک یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بعد میں انھوں نے اپنے گاؤں اور اپنے خاندان والوں سے رابطہ قائم کر لیا تھا۔ برابر آنا جانا رہتا تھا اور وہ ہمیشہ کوشش کرتے رہے کہ اُن کے خاندان والے اسلام قبول کر لیں، راقم سطور کو معلوم نہیں کہ اُن میں سے کسی کو قبول اسلام کی توفیق ہوئی یا نہیں لیکن یہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اُن کے اہل خاندان غیر مسلم" ان کا بڑا احترام اور اکرام کرتے تھے ——— غالباً اُسی سفر میں جو حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی وفات کے اگلے ہی دن میوات کے کسی گاؤں میں ہونے والے تبلیغی اجتماع کی شرکت کے سلسلہ میں ہوا تھا، جس میں حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہٗ جیسے اکابر بھی شریک ہوئے تھے (غالباً اسی سفر میں) حاجی عبدالرحمٰن صاحب کے گاؤں اٹاوڑ بھی جانا ہوا تھا تو حاجی صاحب کے خاندان کے لوگ (جن کے بارہ میں معلوم ہوا تھا کہ وہ گاؤں کے بڑے دولت مند بنیے ہیں) ہدیہ اور نذرانہ کے طور پر خود اپنے سروں پر مٹھائیوں کے تھال لیکر حاجی صاحب اور دوسرے اکابر کی خدمت میں اُن کی قیام گاہ پر آئے تھے۔ اُس وقت خود آنکھوں سے دیکھا کہ وہ حاجی صاحب سے ویسی ہی عقیدت رکھتے ہیں جیسی روحانی بزرگوں سے ہوتی ہے ——— حاجی صاحب نے اپنے ان خاندان والوں کے سامنے ہی حضرت رائے پوریؒ سے مخاطب ہو کر بڑی بے تکلفی سے فرمایا کہ حضرت میں ان سے بار بار کہتا ہوں کہ تم لوگ ایمان لے آؤ، نا تو سب دوزخ میں جلوگے، مگر ابھی تک ان کی سمجھ میں نہیں آیا ——— حاجی صاحب کے اس فرمانے پر بھی اُن لوگوں نے اپنی کسی ناگواری کا اظہار نہیں کیا بلکہ اُن کے احترام اور اظہار عقیدت کے رویہ میں بھی کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔

یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ حاجی صاحب کا دستور اور معمول ہے کہ جب اپنے خاندان والوں اور رشتہ داروں کے ہاں جاتے ہیں تو اُن کے بچے اور بچیوں کو خوب روپئے بانٹتے ہیں ——— اللہ تعالیٰ ان سب باتوں سے سبق لینے کی توفیق دے۔

راقم سطور کے ساتھ حاجی صاحب کا برتاؤ بڑی ہی عنایت اور شفقت کا تھا، بلاشبہ ایسے بندگانِ خدا کی شفقت و محبت اللہ تعالیٰ کے عظیم انعامات میں سے ہے۔

شکر نعمتہائے تو چندانکہ نعمتہائے تو

سیر و سوانح پر شاہکار تصنیفات

Regd. No. LW/NP-62

Monthly **ALFURQAN** 31, Naya Gaon West Lucknow (U.P.)

VOL. 44 NO. 1 JANUARY, 1976 Phone : 25547

Cover Printed at—Shining Press, Naya Gaon, Lucknow

الفرقان لکھنؤ

مدیر

محمد منظور نعمانی

ممالک غیر سے سالانہ چندہ
بحری ڈاک سے ۱ پونڈ ۱۰ شلنگ
ہوائی ڈاک سے
امریکہ و کناڈا سے ۳ پونڈ
یورپ و افریقہ سے ۲½ پونڈ
ممالک عربیہ و مشرق وسطیٰ سے ۲½ پونڈ

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے: ۱۵/-
پاکستان سے: ۲۵/-
بنگلادیش سے: ۱۶/-
قیمت فی کاپی: ۱/۵۰

جلد (۴۴) | بابت فروری سنہ ۱۹۷۶ء مطابق صفر سنہ ۱۳۹۶ھ | شمارہ (۲)

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۵ تاریخ تک آجائے ورنہ اگلا پرچہ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کردیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع ۳۰ تاریخ تک آجانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر و ایڈیٹر نے تنویر پریس میں چھپواکر دفتر الفرقان ۳۱- نیا گاؤں مغربی۔ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

یادِ رفتگاں

مولانا محمد اسمٰعیل سنبھلی علیہ الرحمہ

راقم سطور رابطۂ عالم اسلامی (مکہ مکرمہ) کے اجلاس کی شرکت کے لیے ۱۵؍ نومبر کو لکھنؤ سے روانہ ہو گیا تھا، رابطہ کے اجلاس اور حج سے فراغت کے بعد، حجاز مقدس کی ۱۴؍ ذی الحجہ (۱۶؍ دسمبر) کو مدینہ طیبہ حاضری ہوئی۔ میرے چھوٹے لڑکے خلیل الرحمٰن سجاد سلمہٗ جو تعلیمی سلسلہ سے مدینہ طیبہ میں مقیم ہیں، حج کی وجہ سے مکہ معظمہ میرے ساتھ ہی تھے۔ وہ بھی ساتھ ہی مدینہ طیبہ گئے۔ وہاں ان کے نام جو خطوط آئے ہوئے تھے ان میں ایک خط اپنے قدیم وطن سنبھل کے ایک عزیز کا تھا جس میں یہ بھی اطلاع تھی کہ ۲۲؍ نومبر کو مولانا محمد اسمٰعیل صاحب انتقال فرما گئے — انا للہ وانا الیہ راجعون

اللّٰھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ واکرم نُزُلہٗ ووسّع مُدخلہٗ وتقبّل حسناتہ وتجاوز عن سیّئاتہ

اب سے ۵۰-۵۵ سال پہلے جب اس عاجز کی طالب علمی کا زمانہ تھا سنبھل میں جو ضلع مراد آباد کا ایک قصبہ ہے (یہ قصبہ بہت سے علماء) بلکہ اکابر علماء و اساتذہ کی بڑی تعداد تھی اور اس لحاظ سے سنبھل کو نہ صرف ضلع بلکہ یوپی بلکہ پورے ہندوستان میں ایک شرف امتیاز حاصل تھا، حضرت [illegible] ایک [illegible] میں

حضرت مولانا کریم بخش صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالمجید صاحبؒ، اور حضرت مولانا شبیر حسینؒ ملک کے جید
علما و اساتذہ میں تھے جن سے درس نظامی کی بعض مشکل ترین کتابیں پڑھنے کے لیے دوسرے ملکوں تک
سے شوقین طلبہ آیا کرتے تھے۔ — ان تین حضرات کے علاوہ بھی متعدد علمائے کرام ہمارے ہی محلہ میں
تھے — یہ سب حضرات اللہ کے مقرر کیے ہوئے قانون کے مطابق اپنے اپنے وقت پر ایک ایک کرکے
رخصت ہو گئے، اور ان کے بعد کوئی نہ رہا جس کو علمی رسوخ میں ان کا صحیح جانشین کہا جا سکے۔ تاہم انہی
حضرات کے شاگردوں کی ایک صف رہ گئی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت اور قضا و قدر کا فیصلہ کہ لگ
بھگ ایک ہی سال کی مدت میں قریباً وہ سب ہی واصل بحق ہو گئے — مولانا محمد عابد صاحب
مولانا وجیہ اللہ صاحب، میرے بڑے بھائی مولانا محمد حسن صاحب، ان سب نے اس گزرنے والے سال
ہی میں دنیا کو خیرباد کہا — آخر میں مولانا محمد اسماعیل صاحب بھی رخصت ہو گئے — رہے نام اللہ کا

مولانا عمر میں مجھ سے قریباً ۸ سال بڑے تھے، میں جس زمانہ میں صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں
پڑھ رہا تھا وہ "ہدایہ" وغیرہ متوسطات پڑھتے تھے — غالباً ۱۹۲۱ء میں وہ دیوبند چلے گئے
اور دارالعلوم میں داخلہ لے لیا۔ یہ زمانہ تحریک خلافت کے شباب کا تھا، علی برادران اور ان کے رفقا
حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ وغیرہ کی گرفتاری کے بعد سے ملک میں طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا،
ہمارے مولانا محمد اسمٰعیل ان لوگوں میں سے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے دینی و ملی جذبہ کے ساتھ طلاقتِ لسانی
اور تقریر و خطابت کی خاص صلاحیت بھی عطا فرمائی تھی، وہ اپنی طالب علمی کے ابتدائی دور میں بھی
بہت اچھی تقریر کر لیتے تھے۔ — دیوبند سے اپنے وطن سنبھل آئے ہوئے تھے وہیں تحریک
خلافت سے متعلق ایک جلسہ میں گورنمنٹ کے خلاف سخت تقریر کی، گرفتار کر لیے گئے، مقدمہ چلا
دو سال قید بامشقت کی سزا ہوئی، اپنے ضلع مرادآباد ہی کی جیل میں رہے۔ یہ وہ منحوس دور تھا جب
ہندوستان کی جیلوں میں سیاسی قیدیوں سے بھی اخلاقی مجرموں، چوروں ڈاکوؤں کی طرح سخت مشقت
کے کام لیے جاتے تھے اور ان کو پہننے کے لیے انہی کے جیسے کپڑے دیے جاتے تھے — مولانا
نے قید کی پوری مدت اسی طرح گزاری۔ بتلاتے تھے کہ ان دنوں میں چکی بھی پیسی، بیلوں کی طرح کولھو
بھی کھینچا، ہم سے کھینچنے میں اتنا پسینہ بہتا تھا کہ زمین کے جس دائرہ پر ہم کولھو کا چکر چلاتے تھے
وہ پورا چکر ہمارے پسینہ سے ایسا تر ہو جاتا تھا جیسے کہ بارش ہوتی ہے اور اس پر خود اپنا پاؤں

پھسلنے لگتا تھا ۔۔۔۔ قید کی پوری مدت ختم ہونے پر رہائی ہوئی۔

اِس کے بعد کچھ عرصہ "جامعہ ملیہ" میں بھی قیام رہا اُس وقت تک جامعہ ملیہ غالباً علی گڑھ ہی میں تھا۔ (اس قیام کی نوعیت کیا تھی اور کتنے دن رہا؟ راقم سطور کو اس کا علم نہیں) ۔۔۔۔ بہرحال اس گرفتاری اور قید کی وجہ سے تین سال سے زیادہ مولانا کی تعلیم کا سلسلہ منقطع رہا، اس کے بعد پھر مولانا نے درسیات کی تکمیل کا ارادہ کیا، اس مرحلہ پر میرا اور اُن کا تعلیم میں ساتھ ہو گیا اور یہیں سے اُن کے ساتھ ایک طرح کی رفاقت کا تعلق قائم ہوا۔

استاذنا حضرت مولانا کریم بخش صاحب سنبھلیؒ شوال ۴۲ھ میں سنبھل کے "مدرسۃ الشرع" میں صدر مدرس کی حیثیت سے تشریف لے آئے تھے، اُس سال انہی سے ہم دونوں نے منطق و فلسفہ اور اصول فقہ کی آخری کتابیں پڑھیں، "میر زاہد ملا جلال" اور اُس کا حاشیہ "بحر العلوم" "حمد اللہ" "قاضی مبارک" "صدرا" "توضیح تلویح" یہ سب اسی سال پڑھیں ۔۔۔۔ "امور عامہ" "شمس بازغہ" اسی سال رمضان مبارک کی تعطیل میں حضرت مولانا عبد المجید صاحبؒ سے پڑھیں۔

اگلے تعلیمی سال شوال ۴۳ھ کے شروع میں ہم دونوں دیوبند چلے گئے؛ میں نے چونکہ مشکوٰۃ شریف اور ہدایہ اخیرین نہیں پڑھی تھیں اس لیے میں نے اِن اسباق میں شرکت کی اور مولانا محمد اسماعیل صاحب دورۂ حدیث میں شریک ہو گئے اور اسی سال فارغ ہونے کے بعد غالباً شوال ۴۴ھ میں مدرسہ شاہی مسجد مراد آباد میں مدرس ہو گئے، اور یہ تعلق ۴۰ سال سے زیادہ قائم رہا ۔۔۔۔ اس مدت میں بھی جنگِ آزادی کے سلسلہ میں کئی مرتبہ گرفتار ہوئے اور مختلف جیلوں میں رہے۔ آخری دفعہ غالباً اس وقت گرفتار ہوئے، جب دوسری جنگِ عظیم کے دوران کانگریس نے "ہندوستان چھوڑ دو" کا نعرہ بلند کر کے آزادی کی آخری فیصلہ کن جنگ چھیڑی جمعیۃ العلماء کے قریباً سب ہی اکابر اور کانگریس کے تمام لیڈر جو روپوش نہیں ہوئے تھے گرفتار کر لیے گئے، مولانا محمد اسماعیل صاحبؒ کو بھی اُس موقع پر گرفتار کر کے غیر معینہ مدت کے لیے مراد آباد جیل میں نظر بند کر دیا گیا، قریباً ایک سال کے بعد رہا کیے گئے ۔۔۔۔

مدرسہ شاہی مراد آباد کی مدرسی ہی کے زمانہ میں دو بار مولانا نے صوبائی اسمبلی کی ممبری کا الکشن لڑا اور کامیاب ہوئے۔ پہلی دفعہ ۳۶ء کے جنرل الکشن میں جو انڈیا ایکٹ ۳۵ء کی بنیاد پر ہوا تھا۔

اس میں مولانا تحصیل سنبھل اور بلاری کی سیٹ پر مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کی طرف سے کھڑے ہوئے تھے (جس میں اس وقت جمعیۃ العلماء بھی شریک تھی) دوسری دفعہ ۱۹۴۶ء کے جنرل الیکشن میں جو برطانوی حکومت کے دور کا آخری الیکشن تھا مولانا کانگریس کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے اس الیکشن کے بعد مولانا کو پٹیشن لڑنا پڑا اور دوبارہ الیکشن ہوا اور مولانا کامیاب ہوئے انہی دنوں میں ملک آزاد ہوا۔

اس کے بعد مولانا کی اس سلسلہ کی مصروفیتیں اتنی بڑھ گئیں کہ مدرسہ شاہی مسجد مراد آباد کی تدریسی ذمہ داری سے سبکدوشی کا فیصلہ کرنا پڑا ـــــ لیکن ۱۹۵۲ء میں جب اسمبلی کی ممبری کی مدت ختم ہوگئی تو درس تدریس اور وعظ و تقریر کی اپنی پرانی لائن پر پھر واپس آگئے۔ گزشتہ ۱۵-۲۰ سال کے عرصہ میں وہ مختلف مدرسوں میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے حدیث پاک کا درس دیتے رہے ـــــ ادھر دو تین برس سے جب عمر ۷۵ سے تجاوز ہوچکی تھی وطن ہی میں قیام کا فیصلہ کرلیا تھا اور مطالعہ اور تصنیف و تالیف کو اپنا مشغلہ بنالیا تھا۔

مدرسی کے ابتدائی دور ہی میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے تھے اور بعد میں اجازت سے بھی سرفراز ہوئے ـــــ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس زندگی میں ساری بلندیاں عطا فرمائیں۔ گزشتہ رمضان مبارک کے آخری دنوں میں وہ ایک سفر سے مریض ہوکر واپس ہوئے، اس بیماری کا سلسلہ نشیب و فراز کے ساتھ چلتا رہا۔ آخر اکتوبر (شوال) میں مرض نے تشویشناک شکل اختیار کرلی؛ کوئی علاج سازگار نہ ہوا۔ آخر میں علاج کے لئے مراد آباد لے جایا گیا، ڈاکٹروں نے اپنی سی سب کوششیں کیں لیکن ـــــ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی ـــــ تقدیر الٰہی میں یہی طے ہوچکا تھا ـــــ بالآخر حالت کی نزاکت کو محسوس کرکے ۲۳ نومبر کو مراد آباد سے سنبھل واپس لے آیا گیا ـــــ مکان پہ آنے کے بعد بہت تھوڑی دیر اس دنیا میں رہے، آخر وہ گھڑی آگئی جو سب کے لیے موعود اور مقدر ہے روح نے جسم کو الوداع کہا اور ملاء اعلیٰ کی طرف پرواز کرگئی۔

اللہ تعالیٰ اُن کی دینی، ملی خدمات اور قربانیوں کو قبول فرمائے اور مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے۔

خوش نصیب مولوی محمود حسن وکیل مرحوم :-

مولوی محمود حسن مرحوم اودھ کے ضلع بہرائچ کے ممتاز وکلا میں سے تھے، صوم و صلوٰۃ اور تلاوت قرآن وغیرہ

کے پابند، علماء اور اہل دین سے تعلق رکھتے تھے۔ کسی زمانہ میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے بیعت بھی ہو گئے تھے ——— جہاں تک یاد ہے قریباً ۴۰ سال سے اس عاجز سے تعارف اور تعلق تھا، جو ادھر کئی سال سے بہت بڑھ گیا تھا۔ گزشتہ رمضان مبارک سے پہلے ایک دن غریب خانہ پر تشریف لائے اور کہا کہ میں ابھی تک حج نہیں کر سکا اس سال ارادہ ہے۔ میرے لڑکے مسقط میں ہیں، انھوں نے لکھا ہے کہ میں پہلے اُن کے پاس مسقط جاؤں، وہاں کچھ قیام کروں، پھر وہیں سے اُن کے ساتھ حج کے لیے حجاز مقدس جاؤں۔ انھوں نے حج سے متعلق کچھ باتیں دریافت کیں اور اپنے ضعف پیری پر نظر کرتے ہوئے وہاں قیام وغیرہ کی سہولتوں کے بارہ میں بھی مشورہ چاہا، ——— میں نے کہا آپ بالکل فکر نہ کریں، آپ کے اور میرے نہایت مخلص و عزیز دوست مولانا حافظ محمد نعمان صاحب (استاذ نور العلوم بہرائچ) کے لڑکے مولوی رضوان جو آپ کی اولاد کی جگہ ہیں، وہ جیسا کہ آپ کو بھی معلوم ہے مکہ معظمہ ہی میں مقیم ہیں، بڑے ہوشیار اور بڑے فعال آدمی ہیں، آپ ان کو لکھ دیجیے کہ وہ آپ کے قیام وغیرہ کے بارے میں سوچ رکھیں، اور جب آپ کے جدہ پہنچنے کی تاریخ مقرر ہو جائے اُن کو تار سے اطلاع دیدیجیے وہ خود جدہ کے ہوائی اڈہ پہ پہنچ کے آپ کو اتار لیں گے اور سارے انتظامات کر دیں گے ——— میں نے اُن سے یہ بھی ذکر کر دیا کہ "رابطہ عالم اسلامی" کا اجلاس اب حج ہی کے موقع پر ہوتا ہے اس لیے اس کا بھی امکان ہے کہ میں اور مولانا علی میاں بھی حج کے موقع پر وہاں ہوں ——— معلوم ہوا کہ بعض خاص دوستوں سے انھوں نے اپنی اس آرزو کا بھی اظہار کیا کہ زندگی تو ختم ہونی ہی ہے کیا اچھا ہو کہ وہیں خاتمہ ہو جائے۔

اس کے بعد مجھے نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ کب مسقط کے لیے روانہ ہوئے اور کب وہاں سے مکہ معظمہ پہنچے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے راقم سطور رابطہ کے اجلاس اور حج سے فراغت کے بعد جلدی ہی مدینہ منورہ چلا گیا۔ جب وہاں سے مکہ معظمہ واپسی ہوئی تو حضرت شیخ الحدیث کی مجلس ہی میں ایک صاحب نے بتلایا کہ بہرائچ کے مولوی محمود حسن صاحب وکیل یہیں مکہ معظمہ میں حج سے فراغت کے بعد ۱۰ ذی الحجہ کو انتقال فرما گئے، اور وہ تم کو بہت یاد کرتے رہے۔

ان کی خوش نصیبی پر رشک آیا لیکن اس وقت اپنے موجود نہ ہونے کا سخت رنج و قلق ہوا، مگر اللہ تعالیٰ کی مشیت یہی تھی ——— حضرت شیخ کی مجلس سے اٹھنے کے بعد مرحوم کے صاحبزادے ناصر محمود سلمہ سے ملاقات ہوئی وہ میری تلاش ہی میں مدرسہ صولتیہ آئے ہوئے تھے، انھوں نے بتلایا کہ حج کے مناسک

سے فارغ ہونے کے بعد والد صاحب کو سانس کی تکلیف ہوگئی، جو کبھی کبھی ہو جایا کرتی تھی، بظاہر کوئی بڑے خطرہ کی بات نہ تھی لیکن خود ان کو کچھ ایسا اندازہ ہوگیا کہ یہ ان کی آخری بیماری ہے اور وقت قریب ہے، اُس وقت انھوں نے ہم لوگوں سے آپ کے بارہ میں فرمایا کہ وہ یہیں مکہ معظمہ میں ہوں گے، اگر میرا وقت یہیں آجائے تو میری تدفین وغیرہ کے بارہ میں ان کے مشورہ پر عمل کیا جائے۔ ۱۶ ذی الحجہ کی صبح نماز فجر کے بعد اچانک ہی انتقال فرما گئے۔ آپ کے بارہ میں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مدینہ منورہ جا چکے۔ مولوی رضوان وغیرہ نے سارے انتظامات کیے، حرم شریف میں جنازہ کی نماز ہوئی۔ لاکھوں بندگان خدا نے جو ابھی حج کر چکے تھے نماز جنازہ پڑھی اور مکہ معظمہ کے قبرستان "جنۃ المعلیٰ" میں تدفین ہوئی۔

میں نے اُن سے کہا کہ میرے بیٹے! بجائے تعزیت کے تمھیں اور تمھارے سب گھر کے لوگوں کو مبارکباد دینے کو جی چاہتا ہے، ان کی تو مراد پوری ہوگئی اور تمھارے لیے یہ سعادت مقدر تھی کہ اُن کے ساتھ حج کرو، بلکہ اُن کو حج کراؤ، اور آخری دنوں اور آخری وقت اللہ کے اس مقدس شہر مکہ معظمہ میں ان کی خدمت کرو اور اُن کے سفر آخرت کا بھی سامان کرو، اور اپنے ہاتھوں سے تجہیز و تکفین اور تدفین کرو، صبر کرو اور ان نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کرو۔ —— اگر میں اس وقت یہاں مکہ مکرمہ میں ہوتا تو میں بھی تمھارے ان کاموں میں شریک ہوتا، ان کی مخلصانہ محبت کا یہ حق ہے کہ اُن کے لیے مغفرت و رحمت کی دعا کا اہتمام کروں اللہ تعالیٰ مجھے توفیق عطا فرمائے، اور تم کو اور تمھارے بھائیوں کو ان کی حسنات کا پورا وارث بنائے۔

ماسٹر محمود الحسن کاندھلوی علیہ الرحمہ

ماسٹر صاحب حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ کے قریبی رشتہ داروں میں تھے۔ بیعت کا تعلق حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائپوری قدس سرہٗ سے تھا۔ قدیم زمانہ کے "علی گڑھ کالج" کے تعلیم یافتہ تھے لیکن ظاہر و باطن میں اپنے بزرگوں کے رنگ میں رنگے ہوئے کسی دور میں سرکاری اسکولوں میں ملازمت کی تھی، اسی نسبت سے "ماسٹر" کا لفظ اُن کے نام کا گویا جزو ہو گیا تھا، ورنہ اس لفظ کو ان کی صورت اور اُن کے حال سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔

جہاں تک یاد ہے راقم سطور نے ان کو سب سے پہلے اب سے قریباً ۳۲ سال قبل حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے مرض وفات میں مرکز نظام الدین ہی میں دیکھا تھا۔ —— جب تک حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کا قیام رائے پور

رہا، خاصکر آخری دور میں ماسٹر صاحب مرحوم زیادہ تر رائے پور کی خانقاہ ہی میں رہتے ——— معلوم نہیں کب سے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے ذکر و عبادت ہی کو زندگی کا مصرف اور مشغلہ بنالیا تھا ——— حقیقت کا علم تو اللہ ہی کو ہے، لیکن راقم سطور نے اُن کا حال ہمیشہ وہی دیکھا جو اولیائے کاملین کا ہوتا ہے۔

ضعف پیری اور بعض عوارض کی وجہ سے ادھر کئی سال سے اپنی بشری ضروریات کے لیے چلنا پھرنا بھی دشوار ہوگیا تھا، مگر اسی حالت میں اب سے کئی سال پہلے حجاز مقدس تشریف لے گئے، طویل مدت تک مکہ معظمہ مدرسہ صولتیہ ہی میں قیام رہا، غالباً اسی امید اور آرزو میں رہے کہ یہیں خاتمہ ہو جائے اور یہاں کی خاک پاک کا پیوند ہونا نصیب ہو جائے۔ لیکن اُس وقت تقدیر الٰہی کا فیصلہ نہیں تھا۔ واپس آگئے۔

اب خاصی مدت سے قیام مرکز نظام الدین میں تھا، گزشتہ رمضان مبارک میں اور پھر شوال میں بھی راقم سطور وہاں حاضر ہوا اور دونوں دفعہ مختصر قیام بھی رہا۔ ماسٹر صاحب کو انتہائی معذوری کی حالت میں دیکھا، اٹھنا بیٹھنا تک دشوار تھا ——— راقم سطور ذیقعدہ (نومبر) میں مکہ معظمہ چلا گیا، حج سے چند ہی روز پہلے ایک دن حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی خدمت میں حاضری ہوئی، تو حضرت نے بتلایا کہ فلاں دن کے ہوائی جہاز سے ماسٹر محمود صاحب آرہے ہیں ——— مجھے حیرت ہوئی، میں نے عرض کیا کہ ان کو تو اُٹھنا بیٹھنا بھی مشکل ہے، ایسے میں دلی سے بمبئی اور بمبئی سے یہاں تک کا سفر کیسے ہو سکے گا؟ فرمایا بس آرہے ہیں بمبئی پہنچ جانے کی بھی اطلاع آچکی ہے۔ وہ دن آیا تو شام کو دیکھا کہ مدرسہ صولتیہ کے بڑے دروازہ کی ایک جانب ماسٹر صاحب اپنے اسی حال میں لیٹے ہوئے ہیں۔ غالباً عمرہ کا احرام بھی باندھے ہوئے تھے، اسی حال میں مصافحہ اور معانقہ ہوا ——— اُن کا حال دیکھ کے خیال آیا کہ شاید یہاں کی موت کے شوق ہی میں ایسی حالت میں یہ سفر کیا ہے ——— اب جنوری کے دوسرے ہفتہ میں مرکز نظام الدین کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ ۴ جنوری کو مکہ معظمہ ہی میں ماسٹر صاحب وفات پا گئے۔ حرم شریف میں مغرب کی نماز کے بعد اُن کی نماز جنازہ ہوئی اور "جنة المعلیٰ" میں دفن ہو کر اپنی مراد کو پہنچ گئے ——— دل کہتا ہے کہ روح نے ملاء اعلیٰ کی طرف پرواز کرتے ہوئے کہا ہوگا "فزت و رب الکعبہ"

اللہ تعالیٰ اُن کے ساتھ اپنی شان عالی کے مطابق مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے۔

مدرسہ صولتیہ کے مدیر و سربراہ مولانا شیخ محمد سلیم مدظلہ کی اہلیہ محترمہ (برادر عزیز و مکرم مولانا محمد شمیم صاحب کی والدہ ماجدہ) ماسٹر صاحب کی حقیقی ہمشیرہ ہیں، غالباً قریبی زمانہ دیکھ رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کو اور سب متعلقین کو اجر و صبر عطا فرمائے۔

ڈاکٹر میر ولی الدین علیہ الرحمہ

"الفرقان" کے ناظرین میں وہ اصحاب اب بہت ہی کم ہوں گے جو بریلی کے زمانہ سے اس کا مطالعہ فرما رہے ہوں گے، اُس دور میں ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کے عارفانہ اور مصلحانہ مضامین ومقالات الفرقان میں شائع ہوا کرتے تھے، لکھنے کا بڑا البیلا اور موثر طرز تھا ـــــ ماشاء اللہ عثمانیہ کے ایم، اے، لندن کے پی ایچ ڈی اور بیرسٹرایٹ لا تھے لیکن اللہ تعالیٰ کے عطا فرمائے ہوئے اپنے جوہر طبیعت اور حیدرآباد کے ایک صاحب نسبت اور صاحب حال بزرگ مولانا شاہ محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت وتعلق سے باطن میں پورے صوفی تھے ـــــ راقم سطور جب آخر دسمبر میں حجاز مقدس سے واپس آیا تو یہیں آکر معلوم ہوا کہ شروع دسمبر میں ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب بھی عالم آخرت کی طرف سفر فرما گئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃ

۱۶ر جنوری کے "صدق جدید لکھنؤ" میں "ڈاکٹر میر ولی الدین ـــ زندگی کے آخری لمحے" کے عنوان سے اُن کے صاحبزادہ میر رحیم الدین صاحب کا لکھا ہوا اُن کے حادثہ انتقال اور آخری دن اور آخری وقت کا حال کل ہی نظر سے گزرا ـــــ جی چاہا کہ الفرقان کے ناظرین بھی پڑھ لیں اور اس کے صفحات میں محفوظ بھی ہو جائے۔

پہلی دسمبر ۱۹۷۵ء کو بھی وہ علی الصباح حسب معمول تہجد کو اٹھے اور اپنے سارے کام بخوبی انجام دے رہے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ ناشتہ پر نہیں آئے بلکہ اپنے کمرہ ہی میں ناشتہ کر لیا، عذر یہ تھا کہ وہ کمزوری محسوس کر رہے تھے سارا دن ٹھیک رہے۔ مغرب کے وقت انھیں کچھ بھول سی ہو گئی تھی، اسی بھول میں نماز مغرب تین مرتبہ ادا کی ـــــ بعد حسب معمول اپنی دوائیں استعمال کیں۔ رات کے آٹھ بجکر ۴۵ منٹ پر انھیں رات کا کھانا کھلایا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ میں نماز عشا ادا کرنا چاہتا ہوں، اور بعد نماز تجھ سے بات کروں گا۔ نماز عشا انھوں نے لیٹ کر ہی ادا کی اور دوران نماز ہی میں انھیں کچھ تھکا دگا، میں نے انھیں لیٹے سے اٹھا کر بٹھایا اور اُن کا بوجھ اپنے جسم پر لیتے ہوئے کہا کہ وہ ذرا

کھکار کر تھوک دیں۔ لیکن چونکہ وہ نماز میں تھے بات نہیں کی اور نہ ہی تھوکا۔ بس
ایک گہری سانس لے کر اپنے رب سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

.... طالب دعا میر رحیم الدین۔ فتح دروازہ حیدر آباد

اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور رحمت کاملہ سے نوازے اور اخلاف کو ان کی ایمانی صفات کا بھی وارث بنائے اور ملت میں اُن جیسے افراد پیدا فرمائے۔

اب سے ۳۰ سال پہلے سنہ ۱۳۶۵ھ میں اُن کا ایک مضمون "رفع خوف و حزن" کے عنوان سے الفرقان میں شائع ہوا تھا۔ اس کا آخری حصہ جو بجائے خود مستقل مضمون اور پیام و نصیحت ہے اُن کی یاد تازہ کرنے کے لیے ان سطور کے بعد متصلاً شائع کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ناظرین کو اس سے سبق آموزی اور نصیحت پذیری کی توفیق دے اور ڈاکٹر صاحب مرحوم کے رفع درجات کا وسیلہ بنائے۔ مضمون کا جو حصہ شائع کیا جا رہا ہے، راقم سطور نے اس کا عنوان "تسلیم و رضا" مناسب سمجھا ہے ـــــ ناظرین کرام اگلے صفحہ پر اس کو ملاحظہ فرمائیں۔

تسلیم و رضا

از ڈاکٹر میر ولی الدینؒ ایم اے۔ پی ایچ ڈی (لندن)

ہم پر کوئی حادثہ یا مصیبت نازل نہیں ہو سکتی، مگر وہی جو حق تعالیٰ نے ہمارے لیے مقدر فرمائی ہے، وہ ہمارے مولیٰ ہیں، آقا ہیں، ہمیں اپنے سب کام ان ہی کے سپرد کر دینے چاہئیں، ان ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ ان ہی کا آسرا ڈھونڈنا چاہیے، مجھے ان کے در کے سوا کہاں پناہ مل سکتی ہے؟ اور کون مجھے پناہ دے سکتا ہے؟

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَا اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰنَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (پ ۱۰-ع ۱۴)

شاد و خنداں پیش تیغش سر بنہ!
ہمچو اسمٰعیل پیشش سر بنہ! (رومی)

"میرا یہ پختہ ایمان ہے کہ، ہر غم و مصیبت کا مجھ پر ورود حق تعالیٰ ہی کی مشیت و ارادت سے ہوتا ہے"

مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (پ ۲۰-ع ۱۵) — کوئی مصیبت بدوں خدا کے حکم کے نہیں آتی۔

جب ہر مصیبت کا ورود حق تعالیٰ ہی کے حکم و ارادہ سے ہوتا ہے، اور حق تعالیٰ مجھ پر بعد ایمان رحیم ہیں، جیسا کہ ان کا ارشاد ہے وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا۔ تو اب جو کچھ بھی ان کی طرف سے پیش آئے گا، اس میں رحمت بھی ہوگی اور حکمت بھی!

جامی از یار پسندیدہ مبر ید حاشا
کاں پسندیدہ بجز پسندے نکند (جامی)

جو اس کی آنکھ مظاہر حقائق میں فرق نہیں کر سکتی، نمود و بود کے امتیاز سے قاصر ہوتی ہے! اس لیے ایک ذرا یاد دہانی کی ہے۔

عَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ — شاید تم کسی چیز کو برا جانو اور حق تعالیٰ

فیہ خیراً کثیراً (پ ۴-ع ۱۲)　　نے اس میں خیر کثیر رکھا ہو۔

میری عقل بھی امروز و دوش کی زنجیروں میں پابستہ ہے، تابع نفس ہے، حقیقی اقدار سے غافل حقیقت سے جاہل ہے، اسے منزل کی خبر نہیں، اس کو حقائق حیات کا علم نہیں، !

زیں خرد جاہل ہمی باید شدن　　دست در دیوانگی باید زدن

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد　　ایں عسس را دید و در خانہ نشد　　(رومی)

عاقل و بالغ تو وہی مرد ہے، جو ہوئی و ہوس سے آزاد ہے، علم اللہ کا تابع ہے، اس کے سوا سب ہی بچے ہیں! نادان اور بے عقل!

خلق اطفال اند جز مست خدا

نیست بالغ جز رسیدہ از ہوئی　　(رومی)

بچہ ہی تو دودھ چھوٹتے وقت پریشان ہوتا ہے، سخت تکلیف محسوس کرتا ہے، ایک مصیبت خیال کرتا ہے، لیکن وہی کچھ عرصہ بعد اپنی ماں کو دعائیں بھی دیتا ہے کہ

ع　جزاک اللہ چشمم باز کردی!

اگر تو میرا دودھ نہ چھڑاتی، تو میں آج یہ لذیذ اور نفیس غذائیں کیونکر کھاتا! بچہ ہی تو ختنہ کو ایک مصیبت عظمیٰ خیال کرتا ہے، اس سے پناہ مانگتا ہے، لیکن اس کی مہربان ماں اس کو مصیبت نہیں سمجھتی۔

طفل می لرزد ز نیش احتجام

مادر مشفق ازاں غم شاد کام　　(رومی)

مجھ پر جو مصیبت آئی ہے وہ حق تعالیٰ ہی کے ارادے اور مشیت سے آئی ہے، اور حق تعالیٰ میرے آقا اور مولیٰ ہیں، اور مجھ پر رحیم و حلیم ہیں، ان کی طرف سے جو بات بھی آتی ہے اس میں خیر ہی ہوتا ہے، وہ رحمت سے مملو ہوتی ہے، ہرگز حکمت سے خالی نہیں ہوتی! ——— اس لیے میں اپنی ارادت حق تعالیٰ کی ارادت اور مرضی کے تحت کر دیتا ہوں، ان کے فعل سے راضی ہو جاتا ہوں اور ان کے حکم کے آگے سر جھکا دیتا ہوں، لیکن ان کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں تھامے رکھتا ہوں، اور اب وہ جس تاریکی میں بھی مجھے لے جانا چاہیں، ذوق و شوق کے ساتھ قدم اٹھاتا ہوں، یقیناً وہ مجھے بالآخر سرسبز و شاداب وادی میں پہونچا دیں گے، وہ میرے مولیٰ ہیں، میرے مالک ہیں، استر ماؤں

سے زیادہ مجھ پر رحیم ہیں! بے ضرورت وہ مجھے آزار میں کیوں مبتلا کریں گے؟!

آں کسے را کہ چنیں شاہ کشد　　سوئے تخت وبہترین جائے کشد

نیم جاں بستاند وصد جاں دہد　　آنچہ در وہمت نیاید آں دہد! (رومی)

ایسے کریم کا در چھوڑ کر کہاں جاؤں، کس کے آگے ہاتھ پھیلاؤں، کس کے قدم پکڑ لوں؟

تو کریم مطلق ومن گدا چہ کنی جز انیکہ نخوانیم!

در دیگرے بنما کہ من بکجا روم چو برانیم!

نہ بنقش بستہ مشوشم نہ بحرف ساختہ سرخوشم!

نفسے بیاد تو می کشم چہ عبارت وچہ معانیم!

ہمہ عمر برزدہ دودیدہ ام خجلم کنوں کہ خمیدہ ام!

ئن اگر بحلقہ تنیدہ ام تو بروں در منشانیم! (بیدل)

اللّٰھم لک الحمد والیک المشتکیٰ	یا اللہ تیرے ہی لیے تعریف ہے، اور تجھی سے لائق ہے شکایت؛ اور تجھ ہی
وبک المستغاث وانت المستعان	سے فریاد ہے اور تو ہی مستعان ہے، اور
ولاحول ولا قوۃ الا باللہ۔	اللہ کے سوا نہ حرکت ہے اور نہ کوئی قوت

بقیہ "مستشرقین اور اسلام" صفحہ ۴۸

حرف جر ماننے کے بجائے آلاء بمعنی نعمت کی جمع قرار دیتے تھے اور ترجمہ یہ کرتے تھے کہ "وہ لوگ اس دن اپنے رب کی نعمتیں دیکھ رہے ہوں گے"۔ــــ یہ بے شریف مرتضیٰ کی ایک تاویل کے سلسلے میں مسٹر گولڈ زیہر کی تشریح کہ یہاں اِلیٰ حرف نہیں بلکہ اسم بمعنی نعمت ہے۔ شریف مرتضیٰ نے نہ الیٰ کو آلاء کی جمع کہا تھا اور نہ وہ کہہ سکتے تھے کیونکہ اِلیٰ اور اَلًا دونوں واحد ہیں جن کی جمع آلاء آتی ہے۔ لیکن مسٹر گولڈ زیہر جو علوم اسلامیہ کے اندر دستگاہ رکھنے والے مستشرقین میں ممتاز ترین مانے جاتے ہیں، ان کے علم اور فہم دونوں کا یہ حال تھا کہ جو بات ہمارے یہاں کا ایک کم عمر طالب علم بھی قاموس دیکھ کر جان سکتا ہے اُسے وہ نہ جان سکے اور غلط بحث کر گئے۔

مولانا محمد تقی امینی
ناظم دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

خطاب عید الاضحیٰ

محبت اور قربانی

یہ خطاب عید الاضحیٰ کے موقع پر مسلم یونیورسٹی میں پڑھا گیا

انی وجهت وجهی للذی فطر السموٰت والارض حنیفا وما انا من المشرکین ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین لاشریک له وبذلک امرت وانا اول المسلمین ۰

حضرات! آج ملتِ ابراہیمی کی عید ہے جس میں اللہ کی محبت کی خاطر ہر چیز کے قربان کرنے کا عہد و بیان ہوتا اور بطور نمونہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی یاد تازہ کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے

قد کانت لکم اسوة حسنة فی ابراھیم والذین معه اذ قالوا لقومھم انا برآؤ منکم ومما تعبدون من دون اللہ له

تمہارے لیے ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں میں عمدہ نمونہ ہے جبکہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور تمام ان چیزوں سے برأت ظاہر کرتے ہیں جنکی تم پرستش کرتے ہو۔

غور سے دیکھا جائے تو اسلام کی حقیقت بس یہی دو چیزیں ہیں۔ (۱) محبت۔ اور (۲) قربانی
عارفین نے انسانی عظمت و بلندی کا راز صرف اللہ کی محبت میں دیکھا ہے جس کے لیے ہر چیز کی قربانی لازمی ہے۔ شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ فرماتے ہیں:-

موجودات بسیار بودند و مصنوعات بے شمار لیکن

موجودات و مصنوعات بے شمار تھے لیکن کسی مخلوق کے ساتھ

له الممتحنہ ع ۱

تسبیح موجودے ایں کار نہ بود کہ بآب و گل۔ چوں رب العزت خواست کہ نقطۂ خاک را لباس وجود بوشاند و سریر خلافت بنشاند ملائکہ ملکوت گفتند "اتجعل فیہا من یفسد فیہا" لطف قدیم جواب داد "لیس فی الحب مشورۃ" عشق و تدبیر بہم جمع نشوند، تسبیح و تہلیل شما را چہ خطر اگر قبول نبود و ایشاں را گناہ چہ ضرر چوں ساقی لطف قدح اقدح عفو در دست ایشاں نہد .... شما آں بینید کہ سرکار ایشاں با ما است در معاملت آں نمی بینید کہ سرو کار ما با ایشاں در محبت چنانچہ قائلے گفتہ است ؎

واذا الحبیب اتیٰ بذنب واحد
جاءت محاسنہ بالف شفیع[1]

وہ معاملہ نہ تھا جو اس مشتِ پانی کے مجموعہ انسان کے ساتھ ہوا، جب اللہ کو منظور ہوا کہ اس خاکی پتلے کو وجود کا لباس پہنائے اور خلافت کے تخت پر بٹھائے تو ملائکہ نے عرض کیا "آپ زمین میں ایک ایسی مخلوق کو خلیفہ بنانا چاہتے ہیں جو اس میں فساد برپا کرے گی"۔

"لطف قدیم" نے جواب دیا کہ محبت میں مشورہ نہیں ہوتا۔ اور عشق و تدبیر جمع نہیں ہوتے اگر ہمیں قبول نہ ہو تو تمہاری تسبیح و تہلیل کی کیا قیمت ہے؟ اور اگر ہمارے لطف و عنایت کا ساقی عفو و معافی کا پیمانہ انسانوں کے ہاتھ پر رکھ دے تو ان کو گناہوں سے کیا نقصان ہوگا؟ تم یہ تو دیکھتے ہو کہ معاملات میں وہ ہم سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ محبت میں ہم ان سے تعلق رکھتے ہیں جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

جب محبوب سے کوئی گناہ سرزد ہوتا ہے تو اس کے محاسن ہزار سفارشی کھڑے کر دیتے ہیں۔

محبت میں بڑے نشیب و فراز، اتار چڑھاؤ اور لیل و نہار ہیں۔ رسول اللہ سے سوال کیا گیا۔

ای الناس اشد بلاءً
کن کو زیادہ آزمائش و مصیبت پیش آتی ہے

آپ نے فرمایا:۔

الانبیاء ثم الامثل فالامثل[2]
اللہ کے نبیوں کو، پھر ان کو جو فضیلت و بزرگی میں ان سے قریب ہوتے ہیں پھر ان کو جو ان سے قریب ہوتے ہیں

کتب عشق کا دیکھا یہ نرالا دستور
اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

---

[1] کشف المحجوب ... [2] ترمذی، مشکوٰۃ باب عیادۃ المریض و ثواب المرض

یہ محبت ہی تھی جس نے ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ بیٹے کی گردن پر چھری رکھ دو اور اسمٰعیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ باپ سے یہ کہو

یٰاَبت افعل ما تو مر ستجدنی ان شاء اللہ من الصابرین[1]
اے باپ جس بات کا حکم ہے اس کو کر گزریے آپ مجھ کو انشاء اللہ صابر پائیں گے

یہ محبت ہی تھی جس نے یوسف علیہ السلام کو حضرت یعقوبؑ سے جدا کیا اور چاہ کنعان میں جھانک کر دیکھنے کی بھی توفیق نہ دی لیکن پھر جب اسی محبت کی بجلی کوندی تو مصر سے ان کے پیرہن کی بو سونگھ لی۔

زمصرش بوئے پیراہن شنیدی　　چرا در چاہ کنعانش نہ دیدی
بگفت احوال ما برق جہان است　　دمے پیدا و دیگر دم نہان است

یہ محبت ہی تھی جس نے حضرت ایوبؑ (جن سے بڑھ کر مشرق میں کوئی مالدار نہ تھا) کے گھر کے سارے اثاثے اور بیٹے بیٹیوں میں کسی کو نہ چھوڑا صرف جسم کی تندرستی باقی رہ گئی تھی، اس میں بھی تلوے سے لیکر سر کی چاندی تک پھوڑے نکل آئے لیکن کیا مجال کہ ان کی زبان ایک لمحہ کے لیے شکوہ و شکایت سے آلودہ ہوئی ہو، صبر و شکر کے ساتھ بارگاہ خداوندی میں صرف یہ درخواست کی۔

ربّ انی مسنی الضر وانت ارحم الراحمین[2]
اے میرے پروردگار میں دکھ میں پڑ گیا ہوں تجھ سے بڑھ کر رحم کرنے والا کوئی نہیں۔

اور یہ محبت ہی تھی جس نے محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس سے یہ کلمات کہلائے۔

والذی نفسی بیدہ لوددت ان اقتل فی سبیل اللہ ثم احیٰ ثم اقتل ثم احیٰ ثم اقتل ثم احیٰ ثم اقتل[3]
اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں جان ہے میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ اللہ کی راہ میں مارا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر مارا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر مارا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر مارا جاؤں

محبت میں ہر چیز کی قربانی کا مطالبہ ہوتا ہے۔

ترک جان و ترک مال و ترک سر　　در طریق عشق اول منزل است

قرآن حکیم میں ہے:

---

[1] الصفت ع　[2] الانبیاء ع　[3] بخاری و مسلم، مشکوٰۃ کتاب الجہاد

قل ان کان آباؤکم وابناؤکم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم واموال ن اقترفتموعا وتجارۃ تخشون کسادھا ومسٰکن ترضونھا احب الیکم من اللہ ورسولہ وجھاد فی سبیلہ فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہٖ

اے پیغمبر آپ کہہ دیجیے کہ اگر تمھارے باپ بیٹے بھائی بیویاں تمھاری برادری وکنبہ قبیلہ تمھارا مال جو تم نے جمع کیا تمھاری تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے ڈرتے ہو تمھارے رہنے کے پسندیدہ مکانات یہ ساری چیزیں تمھیں اللہ سے اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو تم انتظار کرو یہاں تک کہ جو کچھ اللہ کو کرنا ہے وہ تمھارے سامنے آئے۔

غور سے دیکھیے! زندگی میں الفت ومحبت کے بڑے رشتے یہی ہیں اور اپنی جگہ سب مطلوب و ضروری ہیں لیکن اگر ایمان والی محبت اور ان میں مقابلہ ہو جائے تو پھر مومن وہ ہے جس پر ان میں سے کسی کا جادو نہ چل سکے اور کوئی محبت بھی اتباع و پیروی میں رکاوٹ نہ ڈال سکے۔

محبت میں قربانی کا حال مدینہ کے انصاریوں سے پوچھیے۔ تاریخ اسلام میں جنگ حنین پہلی جنگ ہے جس میں بکثرت مال غنیمت ہاتھ آیا اور انصاریوں کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ نہ دیا۔ یہ حالت دیکھ کر بعض نوجوانوں کو کچھ خیال ہوا تو رسول اللہ نے انصاریوں کو جمع کر کے فرمایا

الا ترضون ان یذھب الناس بالشاۃ والبعیر وتذھبون بالنبی الی رحالکم

کیا تمھاری خوشی کے لیے یہ بات کافی نہیں کہ لوگ یہاں سے مال غنیمت کے حصے لیکر جائیں اور تم اللہ کے نبی کو اپنے ساتھ لیکر جاؤ۔

یہ سن کر انصار بے اختیار پکار اُٹھے:۔

رضینا یا رسول اللہ رضینا یا رسول اللہ

اے اللہ کے رسول ہم راضی ہیں اے اللہ کے رسول ہم راضی ہیں۔

قربانی کا حال مردہ احد کے شہداء سے پوچھیے جو اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے باوجود "فزت ورب الکعبۃ" (رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوا) کہتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے۔

سعدؓ بن ربیع سے پوچھیے جو احد کے زخمیوں میں پڑے سانس توڑ رہے تھے پوچھا گیا کوئی وصیت کرنی ہو تو کردو ——— جواب دیا کہ اللہ کے رسول کو میرا اسلام پہونچا دینا اور قوم سے کہدینا کہ ان کی

ۓ التوبہ ۲۴ ؎ بخاری ومسلم

راہ میں جانیں قربان کرتی رہے۔

عمارہ بن زیاد سے پوچھیے جو زخموں سے چور جاں کنی کی حالت میں پڑے تھے۔ اللہ کے رسول ان کے سرہانے پہنچ گئے۔ فرمایا عمارہ کوئی آرزو ہو تو کہدو۔ عمارہ نے اپنا زخمی جسم گھسیٹ کر زیادہ قریب کر دیا اور اپنا سر آپ کے قدموں پہ رکھ کر بزبان حال یہ کہا

منم و ہمیں تمنا کہ بوقت جاں سپردن به رخ تو دیده باشم تو درون دیده باشی

زیاد بن سکن سے پوچھیے کہ جیسے ہی اللہ کے رسول نے ان کا سر ہاتھ میں لیا جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔

بچہ ناز رفتہ باشد زجہاں نیاز مندے کہ بوقت جاں سپردن بسرش رسیدہ باشی

اور اس خنساء نامی عورت سے پوچھیے جس نے جنگ یرموک میں نظروں کے سامنے اپنے تمام لڑکے ایک ایک کر کے کٹوا دیے اور جب آخری لڑکا بھی شہید ہو چکا تو پکار اٹھی۔

الحمد للہ الذی اکرمنی بشہادتھم اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے ان کی شہادت سے عزت بخشی

آج ہماری عید ہم سے محبت و قربانی کا مطالبہ کرتی ہے اور ہم عید کے مالک سے بصد آہ و زاری یہ التجا کرتے ہیں۔

خدارا باب رحمت کھول دے ہاں کھول دے ساقی
کھڑا کھٹکا رہا ہوں میں در میخانہ برسوں سے
صراحی در بغل ساغر بکف مستانہ وار آجا
لگائے آسرا بیٹھا ہے اک مستانہ برسوں سے
بس اب آجا بس اب آجا کرم فرما کرم فرما
صدائیں دے رہا ہے کوئی بیتابانہ برسوں سے

خواجہ مجذوب

مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

جواہر پارے

اقتباسات مکاتیب رشیدیہ

حکیم عبدالعزیز خاں پنجلاسوی کے نام

(۲)

.... دو ماہ کے قدر ہوا کہ ایک خط حافظ احمد حسین کا آیا تھا کہ اس میں خیریت مزاج حضرت سلمہٗ کی بھی لکھی تھی۔ مکہ (معظمہ) میں ایک مہمان سرائے (رباط) کی تجویز ہوئی ہے جس میں غربا، آئندہ فرودگش ہوا کریں۔ اور جب تک ان کو مکان ملیں اس میں ہی رہیں۔ اس کے انتظامات طبع ہو کر آئے ہیں۔ اور تخمینہ اس مکان کی جگہ لاکھ روپیہ کے قریب ہوئی ہے۔ حافظ احمد حسین منتظم اس کام کے بہ تجویز شیخ المشہود اور جملہ اہل شوریٰ مقرر ہوئے ہیں۔

.... عرصہ گزرا کہ آپ کا خط آیا۔ حال معلوم ہوا۔ آپ کی بیماری سے نہایت رنج و ملال ہوتا ہے اور دعا بدرگاہ حق تعالیٰ کرتا ہوں اگر قبول ہو جاوے۔ حضرت سلمہٗ کو جو عریضہ خط لکھا ہے آپ کی بیماری کا حال اور طلب دعا بھی اس میں لکھ دیا ہے ...... اور تکالیف داخلی و خارجی عزیز و اجنبی پر بجز صبر کے اور کیا چارہ ہے۔ سب امور اپنے سپرد حق تعالیٰ کے کرنا ہی چارہ ہے۔

آپ کے دو خط ہوئے۔ برادر اپنے کا حال مثل طفل ناعاقبت دال اور ناواقف اپنی مصلحت کے ہے کہ طفل اپنے والدین سے جو اس کی خواہش ہو مانگتا ہے، اور اس پر اصرار کرتا ہے اور روتا ہے

اور نہایت طول ہوتا ہے۔ بلکہ اپنے والدین کو اپنے اوپر تعدی (ظلم) کرنے والا جانتا ہے۔ مگر والدین اس کے شفیق ہیں۔ ہرگز جس میں اس کا نقصان ہو قبول نہیں کرتے۔ وہی کرتے ہیں جو اس کے واسطے فی الحال اور مآل کار بہتر ہو۔ ایسا ہی بندہ اپنی خواہش میں مشغول ہے۔ آخر کی بات اس کو معلوم نہیں ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ مگر حق تعالیٰ اس کے لیے وہ ہی کرتا ہے جو خیر ہو۔ اگرچہ بندہ کو ناگوار معلوم ہو۔ اور اپنے واسطے برا جانے اس واسطے حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ بہت سی چیز کہ اس کو تم خیر جانتے ہو اور وہ تمہارے واسطے شر ہے۔ لہٰذا بندہ کو واجب ہوا کہ ہر امر پر ٹوٹ کر اس قدر فریفتہ نہ ہو۔ بلکہ اول اپنی خواہش کے طلب میں مشورہ و استخارہ کرے۔ ازاں بعد یوں دعا کرے کہ الٰہی اگر یہ امر میرے واسطے تیرے علم میں بہتر ہے تو مقدر کر دے اور جو برا ہے تو میرے دل کو اس طرف سے پھیر دے اور یہ کام نہ ہووے۔ اب بعد اس تقریر کے میں لکھتا ہوں کہ تم کو اس قدر اس کام پر شیفتہ ہونا اور ایسی طرح سے لکھنا مناسب نہیں۔ دعا اس طرح کرو کہ اوپر لکھا ہے، اور عمل وہ پڑھو جو پہلے بتایا ہے اور اپنے سب کام حق تعالیٰ کے سپرد کرو۔

.... اذیت مخلوق پر بجز صبر کیا ہو سکتا ہے۔ فی الواقع مخلوق محض مدد پوشش ہے۔ سب کچھ قضاء و قدر کی طرف سے ہے۔ پس جیسا مرض پر آدمی صبر کرتا ہے اور کسی سے طول نہیں ہوتا، اگر نظر سلیم ہو تو اس اذیت پر بھی کسی سے ملال نہ کرے۔ مگر چونکہ آدمی عالم اسباب کا کاربند ہے ظاہر پر نظر ہو کر موجب الم و ملال ہو جاتا ہے۔ بہرحال حق تعالیٰ رحم فرماوے۔ والسلام

.... آپ کا خط آیا۔ آپ کے اس حالِ مرض میں ایسی مخالفت اہل دیہہ (گاؤں) سے بھی رنج ہوا۔ اگر اندیشہ آبرو کا ہو تو اپنے گھر میں فرض ظہر کے ادا کر لیجیے جمعہ ایسی صورت میں ساقط ہو جاتا ہے۔ اور دوسرے گاؤں میں نماز جمعہ پڑھنے کو جانا ضرور نہیں۔ ناچاری حکم حق تعالیٰ کا ہے کہ سب یک لخت ایسے ہو گئے اور پھر یہ نقصان باغات کا بھی تقدیر سے ہے۔ حق تعالیٰ جو کچھ اپنے بندہ کے واسطے کرتا ہے، خیر ہی ہے۔ گو بندہ اس کی وجہ نہیں سمجھتا۔ اب ایک فرحت کی بات لکھتا ہوں کہ ایک شخص بریلی کے رہنے والے مولوی محمود حسین نام ہیں۔ اب کے سال حج کو گئے تھے۔ بعد حج

کے مکہ میں مقیم ہو گئے۔ اب تیسری شعبان کو کہ سے چل کر تیسویں شعبان کو بریلی پہونچے۔ ان کا جو خط آیا ہے انھوں نے لکھا ہے کہ جناب مرشدنا ہر طرح سے تندرست بہ عافیت تمام ہیں۔ اس مژدہ سے ایک فرحت دل کو ہوئی کہ خیریت حضرت کی بے توسم حاصل ہوگئی۔ والسلام

.... مجھ کو یہ بات کہ جناب مرشدنا کو تمھارے ساتھ الفت ہے سب چیزوں سے زیادہ وجہ محبت تمھارے ساتھ ہونے کی ہے .... جب تمھارا علاقہ بہ جہت حضرت کے ہے پھر مجھ کو کسی نے رنج و شکوہ سے بحث نہیں۔ ہاں میں کچھ نہیں اور کچھ کر نہیں سکتا اور کسی تمھارے امر میں معاونت مجھ سے نہیں ہو سکتی، اور کسی لائق نہیں ہوں۔ مگر بوجہ حضرت مخدوم کے دل سے تمھارے ساتھ ہوں۔ اس بات کو خوب یاد رکھنا ....

اپنا یہ حال ہے کہ طبیعت (طبیعت) برداشتہ ہو رہی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ پھر خدمت میں حاضر ہوں مگر ہمت و موقع نہیں۔ اب تک سبق شروع نہیں کرائے۔ اگر کوئی آیا تو جواب دیا۔ مہذا ضعف ایسا ہو گیا ہے کہ کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ والسلام

مہربانی نامہ پہونچا۔ احوال معلوم ہوئے۔ مخالفتِ اہل نجلاسہ پر کیا خیال کرتے ہو۔ ہر روز اہل حق کے ساتھ یہ خرخشہ رہتا ہے۔ جو کچھ تم سے ہو سکے کرو، باقی وہ جانیں ان کا کام ——— دوسرے امر میں ایک بات آپ کو بتلاتا ہوں اس کو ضرور کرنا لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَا مِنَ اللّٰہِ اِلَّا اِلَیْہِ ۵ بہ نیتِ رفع تشتت حال و حصول مقاصد پسندیدۂ حق تعالیٰ پڑھو ——— اس میں کوئی مقدار اور وقت معین نہیں، جس قدر ہو سکے جس وقت ہو پڑھو۔ والسلام

.... بندہ دعا کرتا ہے کہ حق تعالیٰ آپ کو کامیاب فرماوے۔ اگر مقدر ہے تو مقصود نصیب ہووے گا۔ یہ زمانہ کی عرضِ گذاری نہیں ہونے دیتی۔ جو کچھ ذکر ہو جاوے وہی کام آوے گا۔ فی الواقع کوئی شئے شوق سے زیادہ نہیں۔ صاحب شوق کو کوئی چیز مانع نہیں ہوتی۔ جس کو شوق ہوتا ہے وہ حسب لیاقت و استعداد ضرور کچھ لے جاتا ہے۔ اور بدون شوق ساری عمر کی محنت

بھی تھوڑا حظ دیتی ہے۔ آپ کو شوق لگا ہوا ہے سو خالی نہ جاوے گا۔ نالاں و گریاں ہونا ہی کافی ہے ——— ولایت نظری کے یہ معنی ہیں کہ بعض وقت بدون اختیار عارف کے ایسا آجاتا ہے کہ عارف کی نظر میں اور توجہ میں اثر ہوتا ہے کہ جس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اس پر ایک اثر پڑتا ہے جس سے وہ ملون ہو جاتا ہے۔ مثل آفتاب کے کہ جب وہ نمایاں ہوتا ہے تو ہر شے پر اس کی شعاع ہوتی ہے۔ مگر جو طبع صفا قابل ہوتی ہے تو انوار کا عکس آتا ہے اور نہیں تو حرارت کا اثر ہوتا ہے۔ اس میں بھی تفاوت استعداد ہے۔ آئینہ پر نور زیادہ اور عاج (ہاتھی دانت) پر کم۔ پتھر پر گرمی زیادہ اور گارے پر کم ——— علیٰ ہذا پھر جو وہ عکس بزرگ کا قائم ہو گیا فبہا، اور جو زائل ہو گیا تو پھر ویسا ہی رہ گیا۔ یہ بھی تفاوت رکھتا ہے، تو یہ امر اتفاقی ہے، بے اختیاری ——— ..... اس پر کوئی انتظار کر کے نہیں بیٹھا۔ اپنا سر مارنا اور مجاہدہ مشروط ہے اور اپنا ہی کیا حالِ قائم (و) دائم لاتا ہے ——— الغرض اب آپ ملازمتِ پاسِ انفاس بہت رکھیں اور اس [illegible] زیادہ توجہ [illegible] ہے۔ اور وظائف و اورادِ زبانی جو ارشاد حضرت ہیں ان کو بھی کرتے رہیں۔ جو مقدر ہے ہو گا۔ اور تمہارے [illegible] حال پر جس قدر توجہ حضرت کی ہے وہ مخفی نہیں۔ اور یہ کمینہ محض بت بنا ہے۔ [illegible] کو ایک [illegible] ندامت اپنے [illegible] پر [illegible] گارے یہ بھی ہے، سوائے بہت سی خرمندگیوں کے مجھ کو [illegible] سے ہرگز الفت نہ ہوئی۔ جیسا تم ہو تو محبت و عشق پیر کا ہے مجھ کو نہ ہوا اور محبت کچھ [illegible] نہیں ہوتی۔ [illegible] فقط اعتقاد و نسبت جو تم کہے وہ ہی بس ہے اور میرا تو [illegible] یہ کہ ادب اور حسنِ ظن جناب مرشد کا ہے۔ جب یہ ناکارہ ننگ خاندان مکہ معظمہ کو اپنے ہادی کے ساتھ کشتی سوار ہو کر چلا تو راہ میں خلوت پا کر عرض کیا اے ہادیٔ من! میرا تو آپ کی خدمت میں عقیدہ بھی جیسا چاہیے ویسا نہیں۔ اور محبت مثل دیگر مریدین کے اور نہ کوئی ایسا حال جس پر طمانیت ہو، بلکہ خود ایمان پر بھروسہ نہیں تو پھر باوجود ان نقصانات کے حضور کی عنایت اگر محض میری بیہودہ باتوں پر ہے تو وائے بر من۔ اور اگر آپ کو باشارہ باطن یا حکم الٰہی یا بزرگانِ خاندان سے تو ارشاد ہو کہ میری بھی طمانیت ہو جاوے۔ حضرت نے سکوت فرمایا ....

.... میرے یہاں یہ حادثہ ہوا کہ زوجہ حافظ مسعود احمد ۲۴ جمادی الاولیٰ

روز جمعہ کو فوت ہو گئی۔ اس کی جوانی پر ایک حسرت ہے۔ ایک دختر یک نیم سالہ چھوڑی جس کی تربیت اب دشوار ہو رہی ہے۔ پھر سہ شنبہ ۲۰ جمادی الاولیٰ عزیز ابو النصر کا ہمشیرزادہ جوان صالح تیرہ برس کی عمر میں تھا حافظ قرآن اور نیک بندہ انتقال کر گیا۔ بجز صبر اور رضا کے بندہ کا کیا چارہ ہے۔۔۔ جو وہ پسند فرماوے وہ ہی عین حکمت و مصلحت ہے۔ اس دنیا میں کوئی مال کو روتا ہے، کوئی اولاد و اقارب کو، دوسروں کے نام سے اپنا رونا روتا ہے مگر فی الواقع اپنا رونا کہ اصلاح اپنی آخرت کی ہے اس کی کسی کو خبر و پروا نہیں عجب روزگار ہے ـــــ

آپ کا خط آیا۔ عزیز الطاف الرحمٰن خاں کے تقرر نکاح سے فرحت ہوئی۔ شرکت نکاح زیر قسمت نظر اس کے کہ حرج ہے، بڑی قباحت یہ ہے کہ ہر شخص بندہ کو شرکت نکاح کی تکلیف دیوے گا۔ اب تک سب کو یہ معلوم ہے کہ کہیں نہیں جاتا تو کوئی لب کشا نہیں ہوتا۔ تو پھر بہت بہت حرج اور دشواری پیش آجاوے گی۔ لہذا اپنی شرکت سے معذور ہوں۔ ایک سفر دیوبند کا کہ حسب حکم حضرت مرشدنا اختیار کیا ہے (اس سے) بہت بندہ کو کلفت ہے اور حرج ہے۔ مگر اس سے گویا مجبور ہوں۔ ایک دفعہ ایک سال میں جانا پڑتا ہے۔ چاہتا ہوں کہ اس سے بھی نجات ملے۔ والسلام

آپ کا خط انبالہ سے آیا۔ واقعہ جدیدہ معلوم ہو کر رنج ہوا۔ مگر بندہ بجز التجا اپنے مالک کے کیا کر سکتا ہے۔ مجھ کو بھی خدا آپ کے ان مقاصد کا نہایت خیال ہے۔ مگر قضاء و قدر سے سب مجبور ہیں۔ جو کچھ مرضی مالک تعالیٰ شانہ کی ہے اس پر ہی راضی اور شاکر ہونا چاہیے۔ آدمی کو ہرگز توقع نہ توڑنا چاہیے (کیوں) کہ ہوتا وہ ہی ہے کہ مقدر ہے۔ انبیاء علیہم السلام نے بعض امور میں سالہا سال التجا کی اور کچھ نہ ہوا۔ غرض بندگی کا اظہار ہوتا ہے۔

۔ اعداء کی مخالفت کو بھی حوالہ خالق تعالیٰ شانہ کے کرو اور مجھ کو دخل ہرگز ہرگز مت سمجھو۔ مولوی عبدالعزیز جیسا کریں گے اس کا پھل دنیا و آخرت میں پاویں گے ـــــ اولیاء کو برا کہنا خالی نہیں جاتا۔ مگر اب یہ زمانہ ایسا ہے کہ بد کی سزا بعد پڑتی ہے اور فروغ دروغ کو بہت ہے۔ سو تم سب امور سے اعراض کرو کہ ہر کس اپنی پاداش پا دے گا۔ اور ان کے

افسوس کب تک چلیں گے۔ یہ سب مقدر تقدیر ہے، نہ کوئی افسوس کر سکے اور نہ کوئی کسی کو تکلیف دے سکے۔ سب ایک مالک مختار کے ہاتھ بات ہے۔ اس کی ہی طرف سے ہے۔ . . . .

. . . . . . تم اپنی تدبیر ظاہری کرو کہ عالم اسباب میں سامان و تدبیر پر ظاہر مدار رکھا ہے۔ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيل کو پانچسو بار اوقات مختلفہ میں پڑھتے رہو۔ اور قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس تین تین بار اور آیۃ الکرسی ایک بار سوتے وقت ہاتھوں پر دم کر کے تمام بدن پر پھیر لیا کرو۔ اور ان کو ہی صبح شام بعد نماز پڑھ لیا۔ کسی کا سحر مکر اثر نہ کرے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور استغفار کثرت سے کرو۔ استغفار کی کثرت برائے ادائے قرض و رفع غم و حصول مطلب کا وعدہ ہے۔ ایک بات یاد رکھنا کہ اپنے راز کی کسی کو دوست جان کر اطلاع مت کرنا۔ یہ بھی ایک ضروری بات ہے کسی کا اعتبار نہیں۔ والسلام

آپ کا خط آیا۔ حال معلوم ہوا۔ فساد عبدالعزیز خاں کا موجب رنج ہوا۔ حق تعالیٰ اس کو ہدایت فرماوے۔ آپ کو صبر ہی لازم ہے۔ اگر زیر باری مال کی ہوئی اس کو بھی تحمل کرنا اور زبان سے احسان کی طرح پر بیان نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ صدقہ جان کر صبر کرو۔ اور خرقۂ شیخ کے آنے پر نہایت فرحت ہوئی۔ خدا تعالیٰ مبارک فرماوے۔ اس خرقہ کا بھی حق یہ ہی ہے کہ اپنے کیے کو نہ جانے، دوسرے کے کیے کو بہت کچھ جانے۔ اور جو کسی سے تکلیف پہونچے اس کو حق تعالیٰ کی طرف سے جان کر صبر کرے۔

اب اس مقدمہ میں تو صرف اتنا ہی لکھتا ہوں کہ اگرچہ اس نے بے مروتی اور سخت برائی کی مگر تم اس کے ساتھ سلوک و پرداخت ویسے ہی رکھو جیسے پہلے کرتے تھے۔ اور اس کی نادانی پر خیال نہ فرماؤ۔ اگرچہ یہ نہ لکھا کہ جب خرقۂ شیخ مرحمت ہوا اب اس کا کرنا ضرور ہوا اور مجھ کو اطلاع کرنی واجب آئی۔ حضرت سلمہ نے بھی اپنی تحریر میں اس کا اشارہ کیا ہے۔ و علیٰ ہذا دیگر لوگوں کی برائی کو خیال نہ کر کے صبر کرو اور اپنے کام میں مشغول رہو۔

در باب عزیمت حج اگر آپ کے پاس سامان ہو جاوے تو قصد کرو، ورنہ کسی چیز کو بیع، رہن ہرگز مت کرنا۔ اور بندہ کے واسطے جو آپ تحریر کرتے ہیں تو اگر بلا تکلف غیب سے میرا بند و بست ہو گیا، خواہ آپ کے ذریعہ سے یا کسی اور وجہ سے تو اس وقت۔ مجھ کو اپنی طبع (طبیعت) کا تلاش کرنا

واجب ہوگا۔ اگر ہمت ہوئی تو قصد کروں گا ورنہ نہیں۔ ضعف ایسا ہے کہ کوئی کام کرنا سہل نہیں۔ مع ہذا ایک عنایت نامہ حضرت مرشد کا مورخہ ۲۲ رجب آیا۔ بجواب عریضۂ بندہ جس میں مولانا مرحوم کے انتقال کی خبر لکھی تھی۔ اس میں ایک فقرہ مخدوم سلسلہ نے ایسا لکھا کہ جس سے ہمت کوتاہ ہی ہوگئی اور طبع کاہل کو تائید ہوئی۔ لکھتے ہیں "معلوم می شود کہ قصد ایں صوب است۔ عزیز من! ایں سفر بہتر است مگر فقیر غم خوردہ می ترسد کہ ازتکلیف سفر کہ عظیم است تن ناتوان آں عزیز را رسد و صدمہ آں بر جان ناتواں احقر افتد"
اس عبارت نے وہ جستی جو تھی رفع کر دی اور طبع کو جو آرام طلب ہے فرصت ہوگئی۔ پہلے تو بہانہ عدم سامان کا تھا۔ اب اگر سامان کی صورت بھی ہوئی تو قطعی ارادہ نہیں کر سکتا اگر ضعف اور یہ اشارہ حضرت سلسلہ کا مانع نہ ہو جاوے۔ تو وقت پر جو پیش آوے وہی قابل اعتبار ہے۔ والسلام

.... چونکہ بہت ایام سے آپ کے حالات کی خبر نہیں تعلق خاطر ہے۔ امید کہ کیفیت مزاج سے اطلاع فرما دیں گے۔ اور بندہ پر سال گذشتہ جو صدمہ فوت ہونے حافظ محمد اسحٰق نواسہ کلاں کا ہنوز فراموش نہ ہوا تھا کہ اب دوسرا صدمہ تقدیر سے پہونچا۔ مگر بجز رضا کیا ہو سکتا ہے۔ حق تعالیٰ صبر عطا فرما دے۔ وہ یہ ہے کہ ۱۶ جمادی الاولیٰ کو میرے فرزند خوردسال حافظ محمود احمد کا اسہال دموی میں انتقال ہو گیا۔ یہ اس قدر واقعہ جانکاہ ہوا کہ کیا کہوں۔ حق تعالیٰ اس کو بخشے۔ ایک فرزند دو ماہ کا اس نے چھوڑا۔ حق تعالیٰ اس کی عمر کرے کہ اس سے بھی دل بہلا دے۔ حافظ مسعود احمد کو سلام مسنون پہونچے۔ والسلام ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۰۱ھ

---

(۹) غالباً [illegible] حضرت مولانا محمد [illegible] مراد ہیں جن کا وصال [illegible] ہوا۔
(۱۰) معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا ارادہ آنے کا [illegible] یہ سفر بہتر ہے مگر یہ فقیر غم خوردہ ڈرتا ہے کہ سفر کی بڑی تکلیف تمہارے کمزور جسم پر پہونچے۔ اور میری جان ناتواں پر اس کا صدمہ ہو۔
(۱۱) [illegible] مولانا سعید احمد [illegible] دار العلوم دیوبند کے اساتذہ میں سے تھے۔ [illegible] خوش خلق، باوضع اور صاحب تاثیر بزرگ تھے۔ [illegible] زمانہ تعلیم میں آپ سے [illegible] کا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت مولانا [illegible] علاوہ اوقات درس اور اوقات نماز اور [illegible] اپنے قیام گاہ
(باقی آئندہ)

یہاں کے حادثات کیا لکھوں۔ مولوی علاء الدین پسر مولوی محمد یعقوب صاحب جن کو سال گذشتہ میں دستار اجازت بندھائی تھی، ذی الحجہ کی دسویں کو فوت ہوئے۔ تھے اور سوائے ان کے تین پسر اور چار پوتے اور دو پوتیں ایک زوجہ ایک بیوہ اور ایک نواسہ مولوی محمد یعقوب صاحب مرحوم کا فوت ہوا تھا۔ اب ۳ ربیع الاول کو خود مولوی محمد یعقوب صاحب مرحوم نے نانوتہ آ کر وفات پائی۔ اور ایک سخت حادثہ مدرسہ پر اور لوگوں پر ڈالا۔ سہارنپور میں حافظ فضل حق جو رفیق مہتمم مدرسہ کے تھے فوت ہوئے۔ حق تعالیٰ سب کو بخشے اور ہم کو عبرت دیوے۔ آمین - والسلام

آپ کا خط آیا۔ خیریت رہی پر شکر حق تعالیٰ کا کیا اور عبدالکریم کی حرکت بیہودہ پر سخت رنج ہوا کیا وہ ہر روز (ہمیشہ) دنیا میں رہے گا۔ خیر کیا مضائقہ ہے۔ اب تم صبح شام اعوذ بکلمات اللہ التامات من شر ما خلق کو تین تین بار بہ نیت رد سحر پڑھتے رہو۔ اور قل یا اور قل ھو اللہ اور قل اعوذ برب الفلق، قل اعوذ برب الناس، سورہ فاتحہ، آیۃ الکرسی کو صبح و شام ایک ایک بار پڑھ کر اپنے دونوں ہاتھ پر دم کر کے تمام بدن پر پھیر لیا کرو۔ اور جو ہو سکے تو ایک بار کسی وقت مقرر کر کے حزب البحر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

ہے۔ بہ ہجرت کر جاتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے احقر کو یہ معلوم ہو سکا کہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے پوتے جو بھائی جی کہلاتے ہیں دارالعلوم میں مدرس ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا کہ احقر نے دوران ملاقات مکاتیب رشیدیہ کے اس خط کا ذکر کیا تو فرمایا کہ میرے علم میں یہ خط نہیں تھا۔

تذکرۃ الرشید جلد دوم میں مولانا عاشق الٰہی میرٹھی مرحوم آپ کے متعلق یہ الفاظ تحریر فرماتے ہیں:۔

"صاحبزادہ حکیم احمد مرحوم کی یادگار ایک صاحبزادے یعنی حضرت قدس سرہٗ کے پوتے سعید احمد اطال اللہ عمرہٗ ہیں جن کی ولادت ۲۹ ربیع الاول ۱۳۱۲ھ کو ہوئی۔ باپ کا جس دن انتقال ہوا ہے ان کی عمر ایک ماہ بیس یوم کی تھی حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کو ان کے ساتھ خاص الفت اس وجہ سے بھی تھی کہ ہونہار مرحوم کی نشانی تھی اور نیس سالہ جوان بیٹے کے بدلہ پونے دو ماہ کی جان حق تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئی تھی۔ اس وقت ۱۶ برس کی عمر ہے اور دیوبند میں عربی پڑھتے ہیں" ۳۰۳ ص

آپ کو حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رح سے بڑا عقیدت مندانہ روحانی تعلق تھا۔ آپ کو گوشۂ گمنامی زیادہ پسند ہے اور شہرت سے طبعاً نفور ہیں۔

(حاشیہ سلہ اگلے صفحہ پر)

پڑھ لیا کرو۔ ورنہ کچھ ضرورت نہیں۔ یہ ہی دونوں عمل کافی ہو جاویں گے۔ اور بندہ ہرگز تمہاری طرف سے غافل نہیں۔ حق تعالیٰ تمہارے ہر طرح کے کاروبار کی اعانت فرماوے اور مخالفوں کو سزا دے۔ اگر تعویذ ۳۲۳ آیتہ کا جو چھپا ہوا فروخت ہوتا ہے کہیں سے مل جاوے۔ تو اس کو پڑھ کر باندھ یا باندھ دینا۔ یہاں تلاش کیا نہ ملا۔ بعد میں اگر ملا تو انشاء اللہ بعد کو روانہ کروں گا۔ والسلام۔

آپ کا خط آیا۔ سب حال معلوم ہوا۔ اگرچہ آپ کی طرف سے اور آپ کے ان احوال سے بہت کچھ قلق ہوتا ہے اور بخدا اپنے علم میں بحلف کہتا ہوں کہ تمہارے واسطے ہر روز تو دعا یقیناً کرتا ہوں اگر پانچ وقت میں شاید کسی وقت ترک ہوتی ہو۔ لیکن آپ کے حسن ظن سے سخت پریشان ہوتا ہوں کہ آپ کو میرے ساتھ اس قدر عقیدت بے محل ہو گئی۔ مجھ جیسے صدہا عالم میں موجود اور بہتر بھی بہت ہیں۔ ہاں اپنے مرشد کی نسبت میرا بھی یہ ہی عقیدہ ہے کہ ایسا شخص کم ہے۔ سو بندہ کا حال تو اس سے ہی واضح ہو جاوے گا کہ تاایں دم شب و روز آپ کے باب میں دعا کرتا ہوں اور کچھ اجابت کے آثار نہیں۔ جس سے صاف روشن ہے کہ مثل دیگر عوام مومنین کے میں ایک ہوں۔ کوئی شخص اپنی تعریف کو برا نہیں جانتا۔ میں بار بار اپنا عیب و حقیقت جو ظاہر کرتا ہوں تو فقط اس سبب سے ہی کہ میرے سبب تم اپنے مقصود سے نہ رہ جاؤ۔ میری عقیدت تم کو مضر نہ ہو جاوے۔ ناقص کے ساتھ ہو کر اپنا نقصان ہوتا ہے۔ دوسرے قیامت کو جب اپنا حال ظاہر ہوگا مجھ کو ندامت نہ ہو کہ خلاف توقع ظاہر ہووے گا۔ اب سنو کہ اس دم تک پختہ ارادہ حضور (حاضری) خدمت حضرت کا نہیں ہوا۔ البتہ دل چاہتا ہے، مگر صعوبت سفر اب تک نفس پر گوارا نہیں ہوئی اور مقدر کی خبر نہیں کہ کیا پیش آوے۔

(گذشتہ صفحہ کا حاشیہ ۱)

الشیخ العالم الکبیر المحدث (محمد یعقوب بن مولانا مملوک علی الصدیقی الحنفی النانوتوی۔ آپ ہندوستان کے مشہور اساتذہ میں سے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس آپ ہی تھے۔ اکابر دیوبند میں جن حضرات کی دستار بندی بتعلیم سنہ ۱۳۰۰ھ تک ہوئی وہ آپ ہی کے تلامذہ میں سے تھے۔ ۳ ربیع الاول سنہ ۱۳۰۲ھ میں نانوتہ میں آپ کا وصال ہوا۔ (ماخوذ از نزہۃ الخواطر جلد ہشتم)

آپ کا خط آیا۔ آپ کے مرض سے رنج ہوا۔ حق تعالیٰ صحت دیوے۔ اگرچہ بندہ کا شوق تو مزید ہوتا ہے مگر تشخیص حال مانع سفر ہے۔ اب کے سال بہت دوست معتبر گئے۔ مگر اپنا چلنا جو مظنون تھا کچھ نہ ہوا۔ اب بھی ذیقعدہ کی دسویں بندرھویں تک جہاز روانہ ہوویں گے۔ ارسال روپیہ ممکن ہے۔ سو لفافہ جو بخدمت حضرت مرشدنا بھیجے ہیں وہ تو روانہ کردوں گا۔ مگر سو روپیہ جو بمراد حج خانم مرسل کرتے ہو اس میں مجھ کو یہ کہنا ہے کہ حضرت ممدوح تو سینہ صاف مثل اپنے رب کو جانتے ہیں اور خدام جناب مرشدنا پر بندہ کو اعتماد نہیں۔ بخدا ایک صاحب نے جو ہمارے زمانے میں حج بدل کیا میرے نزدیک بالکل خراب کیا۔ ان کو فقط روپیہ لینا مقصود ہوتا ہے کچھ حج نہیں کرتے۔ لہٰذا ایسا حج کرانا موجہ راست نہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر خانم مرحومہ پر حج فرض تھا تو اس حج سے فرض ادا نہ ہووے گا۔ اگر کسی نے اچھی طرح بھی کیا۔ حج فرض جب ادا ہو کہ یہاں سے کوئی اس کے روپے میں جاوے اور حج کر کے واپس آوے .... اس طرح حج کرانے میں اول تو کرنے والے محتاط نہیں۔ پھر اگر ہوا بھی تو نفل ہووے گا۔ فرض ذمہ پر رہے گا۔ والسلام

آپ نے حال دشمنی کا ذکر لکھا ہے سو اگر اندیشہ ہے تو بنام خدا تعالیٰ بعد استخارہ (ملازمت) ترک کردو۔ حق تعالیٰ دوسرا سامان کر دیوے گا۔ یہ ضرور ہے کہ آپ کی محبت و عقیدت بجناب حضرت (مرشد) اس درجہ کی ہے کہ خالی نہیں جیہ ذاتی۔ اور بفضلہ تعالیٰ نسبت تم میں آئی ہوئی ہے۔ اگر چند روز خدمت حضرت میں رہے اس کو قوت ہو جاوے گی۔ جو کچھ آثار لکھے ہیں وہ سب حسن عقیدت کے ثمرات ہیں خرقہ شائخ تبرک رہتا ہے اور گاہ گاہ اس کو تھوڑی دیر کو بہ نظر حصول برکت زیب بدن کر لیا۔ پھر باادب رکھ دیا۔ گاہ پہننے کی برکت بدن و قلب پر اثر کرتی ہے۔ نوکری تو فی الواقع ایک پابندی اور خصوصاً کفار کی چاکری ہے۔ مگر ضرورت کے واسطے سب بلائیں سر پر رکھی جاتی ہیں۔ پاخانہ میں جانا کس کو خوش معلوم ہوتا ہے کہ ہر طرح کی تکلیف اور دل تنگی ہے۔ مگر ناچاری کو قدر ضرورت جانا ضرور ہے۔ ایسا ہی حال نوکری کفار کا ہے۔ سو در صورتیکہ آپ کو تردد اور اندیشہ اس روزگار کا ہے، ترک کر دو حق تعالیٰ دوسرا سامان کر دیوے گا۔ اور حسد قوم آپ کو مضر نہیں۔ ان کو ہی مغفرت دیوے گا۔ آپ نظر اپنے مالک تعالیٰ شانہ پر رکھیں ——

.... بہرحال جو حق تعالیٰ کو آپ کے واسطے بہتر پسند ہے وہ پیش آوے گا۔ آپ بھی اس کو ہی یاد کریں۔ اور اُس طرف سے ہی اپنے امور میں مدد چاہیں۔ سب کو محض بیکار جان کر التفات چھوڑ دیویں۔ والسلام

آپ کا خط پہنچا۔ حال معلوم ہوا۔ چوری اس قدر زر کثیر کی جو آپ نے لکھی ہے موجب ملال و رنج عالم بشریت میں ہوتی ہے۔ مگر تسلی دیدینا دل کا بھی لازم ہے۔ حق تعالیٰ کسی کا مال رائیگاں نہیں کرتا۔ لینے والا سردست خوش ہوتا ہے کہ ہم کو مفت مال ملا۔ اور جس کا جاتا ہے وہ ملول ہوتا ہے۔ مگر معاملہ علی العکس ہے۔ جس کا جاتا ہے اس کا ذخیرہ ہوتا ہے اور جو لیتا ہے وہ خسران میں پڑتا ہے۔ حق تعالیٰ نے تم کو دیا ہے اور اب بھی دیوے گا۔ چور ذلیل و خوار اب بھی ہے اور آخرت میں پشیمان ہوگا۔ حق تعالیٰ آپ کے مال میں برکت دے گا۔

خط آپ کا آیا۔ حال معلوم ہوا۔ در باب روزگار پہلے خط میں صاف لکھ چکا ہوں کہ اگر اس تکلیف کو گوارا کر سکتے ہو تو بخیال تنگی معاش قبول رکھو۔ اگرچہ یہ کلفت ہے مگر اور بہت خرخشوں سے محفوظ رہو گے۔ آخر فرائض تو ادا کر سکتے ہو۔ اگر نوافل میں قصور ہے تو کوئی گناہ نہیں۔ اور جو اس تکلیف کو گوارا نہیں کر سکتے اور نوافل و وظائف کا افسوس ہوتا ہے تو واقعی اس کا ترک ضرور ہے۔ مگر اس صورت میں قلت خرچ و تنگی دنیا کو گوارا کرو۔ اب بھی یہ ہی لکھتا ہوں کہ اس میں اب بات قطعی کیا لکھوں۔ طالب آخرت کی حالت دیگر ہے اور مبتلائے عیال کا حال دیگر ——— جس کو ثواب آخرت کی رغبت ہے وہ ایک سبحان اللہ کہنے کے عوض کروڑ روپیہ کو ترک کرتا ہے اور تنگی معاش پر خیال نہیں کرتا۔ اور جس کو معاش کی فکر ہو وے اس سے فرائض کا ادا ہونا بھی غنیمت ہے۔ سو اگر آپ کے عیال و خرچ کو دیکھتا ہوں تو اس علاقہ (تعلق) کو ترک کرنا پسند نہیں آتا جب تک کوئی دوسری شکل نہ ہو وے۔ اور جب آپ کے ترک وظائف کا دھیان ہوتا ہے تو ثواب عقبیٰ کے مقابل میں اس علاقہ قلیل کو ہیچ محض جان کر ترک کو ضرور جانتا ہوں۔ اب قطعی بات کیا کہوں تم خود اپنے نفع نقصان کو موازنہ کر کے جو کرو استخارہ کر کے کر لو۔ اور جو میری رائے ہی لیتے ہو تو میرے نزدیک ثواب آخرت مقدم شے ہے۔ لیکن پھر آپ کو مشکل ہو گی کہ خرچ آپ کا فراخ ہے۔ اگر تنگی پر صبر کرو تو بے شک

ترک کردو .... اور کچھ پروا نہ کرو۔ چونکہ میرا عمل ایسا نہیں، تو دوسرے کو کیا کہوں۔ اور ہے وہ ہی بات کہ متاع دنیا تمام ایک اسم ذات کی برابر نہیں ۔ والسلام

ابنا عزم (یعنی حج کا) نہ اس سبب سے سست ہے کہ موت سے ڈر ہو، بلکہ موت با ایمان کو ہزار درجہ ایسی حیات سے کہ کچھ نفع نہ ہووے (اور ہمیں صدمہ صلحا کو دیکھنا ہووے) بہتر جانتا ہوں۔ اپنی زندگی سے سوائے نقصان کے کوئی نفع نہیں جانتا۔ اور نہ اس وجہ سے (عزم سست ہے) کہ روپیہ کی کوتاہی مانع ہے۔ ڈیڑھ سو موجود ہیں۔ اور جب چلوں گا۔ بچاس ساٹھ کی ضرورت ضرور یقین رکھتا ہوں۔ بلکہ یہ وجہ ہے کہ اگرچہ ظاہر تندرست اور سالم ہوں مگر اندر میں اس قدر خراب ہوں اور ضعف ہمت اور اعضا ہے کہ سر کی حالت ذرا سی غذا کی بے اعتدالی میں سخت پریشان ہوتی ہے۔ ذرا تبدل تغیر خواب (نیند) میں سخت پریشانی ہوتی ہے۔ دیر تک بیٹھے رہنا دشوار ہے۔ اعضا شکنی کسل اکثر رہتا ہے۔ سو ایسی حالت میں سفر میں کیا کیا مشقت پیش نہ آویں گی۔ ان سب امور کا انتظام کسی نواب سے تو شاید ہو سکے ۔۔۔ گھر پر البتہ خدمت کرنے والے مفت کے ہیں۔ ان کے دل میں حق تعالیٰ نے ڈال دیا۔ حسن ظن سے میرا دنیا کا آرام ہو گیا۔ آخرت میں دیکھا چاہیے کیا پیش آوے۔ پھر جب ضعف طبع سے یہ حال تو دل میں کچھتانا آنے لگتا ہے کہ کاش نہ آتا۔ بس محنت برباد، گناہ لازم آیا۔ حج کا ثواب تو کہاں ہیلی جمع کا اندیشہ ہے .... ایک فقرہ اپنے استاد کا یاد ہے۔ لکھتا ہوں "در ہندوستان بہ ہوائے مکہ زیستن ہزار درجہ بہتر است از آنکہ در مکہ بہ ہوائے ہندوستان باشی"[ل]

سو وجہ تو یہ ہے ورنہ دل میں ہوس زیارت مرشد کا ہے۔ یہ تو منہ نہیں کہ محبت کہوں۔ ہاں ہوس ہے۔ سو یہ ہوس تین سال سے چلی جاتی ہے۔ اب بھی وہی حال ہے۔ دل چاہتا ہے اور ضروری اشیا بھی موجود رکھی ہیں۔ اگر وقت پر غلبہ ہو گیا تو چل دوں گا۔ مگر یہ اپنا عزم کا حال نہیں۔ اس واسطے میرے سبب آپ یا کوئی رہ جاوے سخت ناگوار ہے۔ والسلام

آپ کا خط آیا۔ حال معلوم ہوا۔ عنایت فرمایا! سچ لیل ہے کہ اصل مقصود آخرت ہے اور بندہ عبادت اور بندہ پن ظاہر کرنے پر مخلوق ہوا ہے۔ تو اس کا وظیفہ اور ذمہ واجب یہ ہے کہ رات دن ایسے حرکات و افعال

ل ہندوستان کے اندر تمنائے مکہ میں زندگی گذارنا، مکہ میں رہ کر ہندوستان کی تمنا کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

اقوال کرتا رہے جس سے بندگی و عجز اپنا اور حمد و شکر و عظمت خالق تعالیٰ شانہ، کی ظاہر ہوتی رہے۔ بس اس میں ہی مرجاوے۔ مگر یہ مشکل ہوئی کہ یہ قالب جسمانی کھائے پیئے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ تو اس کا اسباب مہیا کرنا ضرور ہوا۔ پھر بعد کھانے کے پاخانہ پیشاب و شہوت لازم ہوئی۔ اس کا دفع کرنا پڑا۔ اس کا سامان کرنا واجب ہوا۔ ہم جنسوں میں ملے بغیر یہ سامان نہیں ہو سکتے (لہذا) لباس وغیرہ امور واعیہ ہوا۔ اس کا بہم پہونچانا ضرور ہوا۔ اب ایک عبادت کے واسطے یہ سب قصہ کرنا آیا جس کا اگر حساب کرکے دیکھئے تو اکثر اوقات ان اسباب میں خرچ ہوتا ہے۔ اور اصل مقصود جو تھا وہ کچھ بھی نہ رہا۔ لہذا حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کو مجبور جان کر معذور رکھا فقط پانچ وقت کی نماز مقرر کر دی اور اس تھوڑی عبادت کو قبول کرکے قائم مقام تمام رات دن کے ٹھہرا دیا اور سارا رات دن فقط اس کے حوائج میں صرف کرنے کو دے دیا۔ اب اگر بندہ فہیم ہوا تو اس نے جانا کہ یہ سب کمانا، کسب کرنا، اِن عبادت ہے۔ اس ہی خیال سے سب کام کرتا ہے کہ عبادت کی فراغت حاصل ہو۔ اس کا تو سب کسب و کام عبادت ہی ہو گیا۔ اور جو بندہ غبی کوڑمغز نکلا وہ سمجھا کہ یہ سب کام میری راحت کو ملے ہیں۔ اس کا کمانا، کسب کرنا، سونا، جاگنا، خانہ داری محض دنیا و لذتِ دنیا ٹھہری فقط پانچ وقت کی نماز کو عبادت ٹھہرایا۔ سو ہمارا حال یہی ہے کہ سارے دن غفلت میں گذرتا ہے۔ اور سب کام حظِ نفسانی ہے۔ فقط یہ نماز باقی عبادت میں ہے۔ اگر اس میں بھی کوتاہی اور تشویش رہی تو وہ کسب و اکتساب بالکل واہیات ہے۔ اس کو کیا کرے جب اصل مقصود ہی گم ہوا سو اگر آپ کو اس نوکری کا خدشہ ہے تو ترک کردو۔ اپنے رزاق مطلق پر توکل اختیار کرو۔ سو باقی یہ کہ خرچ آپ کا فراخ ہے تو اس کا جواب اوپر کی تقریر سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ حوائج بشریہ ضروری ہیں۔ اگر قدر ضرورت پر کفایت کرو تو ہو سکتا ہے گو خلاف طبع ہے کہ قدیم سے عادت ترفہ پسندی ہے مگر آخرت پسند کو قناعت ہونا ضروری ہے۔ اگر حب آخرت ہے تو تنگیٔ دنیا چنداں دشوار کبھی نہیں۔ سو آپ کے حق میں بہ نظر خیر خواہی آخرت ایسا روزگار جس میں نماز کا بھی خشوع رفع ہو جاوے پسند نہیں کرتا ہوں۔ مگر اب اس تحریر کا میرا منہ نہیں، یہ دوسری بات ہے۔ والسلام

از بندہ رشید احمد عفی عنہ بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند۔ ملاقات احباب و برادران اگرچہ باعث ملال کا ہے مگر چونکہ تقدیر ہے اس پر بھی رضا واجب ہے۔ عنایت نامہ حضرت کا واپس ارسال کرتا ہوں رسید سے مطلع فرماویں۔ والسلام

مولانا حافظ محمد نعیم صدیقی
دار المصنفین اعظم گڈھ

کردار شکنی کا المیہ (۲)

(مسلسل)

اسلام کی اخلاقی تعلیمات یہاں اسلام کی تمام اخلاقی تعلیمات کا استقصا مقصود نہیں ہے، نہ اس مقالہ میں اس کی گنجائش ہی ہے۔ ان اخلاقی تعلیمات کو اسلام نے تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ حقوق، فضائل ورذائل اور آداب۔ پھر ان میں سے ہر ایک کی لاتعداد اقسام ہیں۔ ہمیں اس وقت صرف ان بعض اخلاقی ضابطوں اور اخلاقی رویہ سے بحث ہے جن کا فی زمانہ عموم وشیوع ہے اور جن کا فقدان بیسویں صدی کے سماج بالخصوص مسلم معاشرہ کا ایک عظیم المیہ ہے۔

سورۂ فرقان میں اللہ کے اچھے بندوں کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے:۔

(۱) وعباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض ھونا واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما۔	خدا کے وہ بندے جو زمین پر آہستہ آہستہ چلتے ہیں اور جاہل جب ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ سلام کہتے ہیں۔
(۲) والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذلک قواما۔	اور جب وہ خرچ کریں تو نہ تو فضول خرچی کریں اور نہ تنگی کریں، اور دونوں کے بیچ کی راہ ہو۔
(۳) ولا یقتلون النفس التی حرم اللّٰہ الا بالحق ولا یزنون۔	اور جو ناحق کسی بے گناہ کی جان نہیں لیتے اور نہ بدکاری کرتے ہیں۔
(۴) والذین لا یشھدون الزور واذا مروا باللغو مروا کراما۔	اور جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب وہ بیہودہ مشغلہ کے پاس سے گذریں تو شریفانہ وضع سے گذر جائیں۔

یہ تمام آیتیں سورہ فرقان کے صرف آخری چھوٹے سے رکوع سے ماخوذ ہیں۔ اور ان میں ساتوں اخلاقی محاسن یکجا کر دیے گئے ہیں یعنی عاجزی وفروتنی، بردباری، اعتدال وتوسط، رحمدلی، عفت، صدق

اور متانت و سنجیدگی۔ اسی طرح پورا کلام پاک اخلاقی تعلیمات سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن جیسا کہ ذکر کیا گیا ذیل میں صرف ان چند محاسن و رذائل اخلاق کا ایک آئینہ پیش کیا جاتا ہے جن کا فقدان یا وجود موجودہ سوسائٹی کا بہتا ہوا ناسور ہے۔ ہر شخص کو اس آئینہ میں اپنا عکس دیکھکر احتساب نفس اور اصلاح کی فکر کرنا چاہیے۔

راست گفتاری اخلاقیات میں راست گوئی کی صفت کو سب سے اہم درجہ حاصل ہے۔ آج جبکہ اخلاقی انحطاط کا بازار گرم ہے، تمام دنیا میں جھوٹ، فریب اور ریاکاری کا دور دورہ ہے، اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مسلمان صحیح معنی میں مسلمان بنے، اپنے اللہ کو راضی کرنے اور اپنی گذشتہ عظمت کو قائم کرنے کے لیے راست گفتاری کو اپنا شعار بنائیں۔ انسان کے ہر قول و عمل کی درستی کی بنیاد یہ ہے کہ اس کے لیے اس کا دل اور اس کی زبان باہم ایک دوسرے سے مطابق اور ہم آہنگ ہوں۔ جو سچا نہیں اس کا دل ہر برائی کا گھر ہو سکتا ہے۔ اور جو سچا ہے اس کے لیے ہر نیکی کے حصول کا راستہ آسان ہے۔

آج راست بازی کے معنی عام طور پر صرف سچ بولنے کے سمجھے جاتے ہیں۔ مگر درحقیقت اس لفظ کا مفہوم وسیع ہے۔ صدق کے مظاہر میں زبان و دل کی ہم آہنگی، قول و عمل کی مطابقت، ظاہر و باطن کی ہم رنگی اور عقیدہ و فعل کی ہم عنانی سب شامل ہے۔ کیسے ہی خطرات کا سامنا اور شدائد کا اندیشہ ہو، قدم جادۂ حق سے نہ ڈگمگائے۔ ذاتی نفع نقصان کا لحاظ کیے بغیر قلب کی سچائی کے ساتھ حق بات کہنا اور حق پر عمل کرنا ایک مؤمن کامل کی شان ہے۔ اظہار حق میں کبھی پس و پیش نہ کرنا چاہیئے۔ اس سے انسان کے اندر جرأت و استقامت کی صفات میں اضافہ ہوتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

یاایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ و قولوا قولاً سدیداً (احزاب ع ۹)

اے ایمان والو اللہ سے ڈرو۔ اور راست گوئی و صداقت شعاری اختیار کرو۔

اللہ جل شانہٗ نے صدق کو ایمان و اسلام اور اس کے مقابل کذب کو نفاق و کفر کی علامت قرار دیا ہے، فرمایا!

لیجزی اللہ الصادقین بصدقھم ویعذب المنافقین ان شاء (احزاب ع ۳)

تاکہ اللہ سچوں کو انکی سچائی کا بدلہ دے اور منافقین کو سزا دے اگر چاہے۔

حافظ منذری نے "الترغیب والترہیب" میں کئی صحابیوں کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "مومن میں خیانت اور جھوٹ کے علاوہ ہر خصلت ہو سکتی ہے یطبع المؤمن علی الخلال کلھا إلا الخیانۃ والکذب (مسند احمد) کیونکہ یہ جوہر ایمان کے منافی ہے۔ دوسری جگہ فرمایا "کسی بندہ کا ایمان پورا نہیں ہوگا جب تک وہ جھوٹ کو ہر طرح سے نہ چھوڑ دے۔ یہاں تک کہ مذاق اور جھگڑے میں بھی۔ اگرچہ وہ حق ہی پر کیوں نہ ہو" (باب الترغیب فی الصدق)

زبان کے ساتھ ساتھ صدق کا تعلق دل سے بھی ہے۔ اگر حق گوئی میں زبان کے ساتھ دل بھی ہم آہنگ ہو تو اسی کا دوسرا نام اخلاص ہے۔ اور اگر انسان زبان سے سچی بات کا اظہار کرے لیکن دل کی تہ میں چور چھپا ہو تو اسی کو نفاق کہا جاتا ہے۔ آج انسان اپنی چشم بینا کے سامنے بعض ناگوار حقائق کو دیکھتا ہے۔ دل میں اس کے خلاف نفرت کا ایک الاؤ ابل رہا ہوتا ہے۔ لیکن اپنے جسمانی وجود کی راحت، ذاتی منفعت اور دنیا طلبی کی خاطر اپنے ضمیر کی خلش کے علی الرغم ظاہر میں اس حقیقت کی حمایت کرتا ہے۔ یہ بھی نفاق کی قسم ہے۔ منافقین حضور اکرم کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کی رسالت کا زبانی اقرار کرتے تھے۔ لیکن چونکہ یہ اقرار ان کے ضمیر کے خلاف تھا اس لیے اللہ جل شانہ نے فرمایا!

واللہ یشھد ان المنافقین لکذبون٭ (المنافقون ع ۱) — اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔

یعنی ان کے دل میں کچھ رہتا ہے اور زبان پر کچھ۔ معلوم ہوا کہ صدق زبان سے دل کی صحیح ترجمانی کا نام ہے۔ اسی طرح اگر کسی عمل کی دلی غرض کچھ اور ہو اور ظاہر کچھ اور کیا جائے۔ تو وہ بھی جھوٹ کی تعریف میں داخل ہے۔ ترمذی نے کتاب الزہد باب الریاء والسمعہ میں حضرت ابوہریرہ سے حدیث نقل کی ہے کہ قیامت کے دن خدا کے حضور میں ایک عالم، ایک شہید اور ایک دولت مند پیش کیے جائیں گے۔ اور ان سے پوچھا جائے گا کہ تم کیا توشۂ آخرت ہمراہ لائے تو ہر ایک اپنے علم، دولت اور جانبازی کے کارنامے بیان کرے گا اور کہے گا کہ ہم نے یہ سب کچھ تیری رضا ہی کے لیے کیا تھا۔ ارشاد خداوندی ہوگا تم جھوٹ کہتے ہو۔ تمہارا مقصد عالم، سخی اور شہید کہلانا تھا (یعنی تم نے یہ سب ناموری اور دنیا میں بڑا بننے کے لیے کیا تھا) سو دنیا میں تمہارا یہ مقصد پورا ہو چکا۔ اب کنارہ جہنم بنائے جاؤ گے" اس حدیث کو امام مسلم نے بھی اپنی جامع صحیح میں نقل کیا ہے۔

عمل کی سچائی کا مطلب یہ ہے کہ ہر کام ضمیر کے مطابق ہو۔ (ضمیر کی تعریف اور اس کی آواز کے بارے میں ہم آئندہ تفصیل سے لکھیں گے۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے صدق عمل کے مختلف مدارج تحریر فرمائے ہیں ان میں سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان کی زبان کا ہر حرف، دل کا ہر ارادہ اور عمل کی ہر جنبش حق و صداقت کا پورا مظہر ہو جائے۔ قرآن نے ایسے ہی لوگوں کو صدیق کہا ہے ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ دل سے مانتے ہیں، عمل سے اس کی تصدیق اور زبان سے اس کا برملا اقرار اور یقین کی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں (سیرت النبی ۶/۵، ۳۰)

اور جو لوگ علم و عمل کے اس درجہ کمال کو پہونچ جاتے ہیں ان کو شریعت کی زبان میں "صدیق" کہتے ہیں۔ جو نبوت کے بعد انسانیت کا سب سے اونچا مرتبۂ کمال ہے۔

راست بازی کے مفہوم کی مذکورہ بالا وسعتوں کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ آج کا وہ صحافی جو روزانہ بے بنیاد خبریں شائع کرتا ہے وہ سیاستدان جو عوام کی حمایت حاصل کرنے کے لیے اُن کے سامنے مسائل و معاملات کی غلط اور الٹی تصویریں پیش کرتا ہے، وہ سیاسی حاشیہ نشین جو ایمان و ضمیر کا سودا کر کے باطل کو حق ثابت کرنے کے لیے اپنے قلم و زبان کی پوری طاقت صرف کر دیتا ہے۔ وہ مفاد پرست طبقہ جو حقیر متاع دنیا کی خاطر اجتماعی مفادات کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ وہ صاحب علم اور اہل قلم جو زہر کو زہر کہنے کی جرأت اپنے اندر نہیں رکھتا۔ یہ سب ایک عظیم ترین گناہ کے مرتکب اور سخت ترین سزا کے مستحق ہیں۔

خودداری اور عزت نفس یہ وہ اخلاقی وصف ہے جس سے انسان اپنی عزت، اپنے مرتبہ اور اپنی حیثیت کی حفاظت کرتا ہے۔ معاشرتی زندگی کے تمام حالات میں انسان کو اپنی حیثیت اور عزت کے محفوظ رکھنے کے لیے اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس میں یہ وصف نہ ہوگا اس میں نہ نظر کی وسعت ہوگی نہ خیال کی رفعت، نہ اخلاق کی بلندی اور نہ لوگوں کی نگاہوں میں [illegible] کی عزت ہوگی۔

یہ عزت اور وقار سب سے پہلے تو خدائے عز و جل کی بلند و برتر ذات کے لیے سزاوار ہے۔ جو تمام عزتوں کا منبع و مرکز ہے۔ اور اس کے وسیلے سے انسان کو جو عزت حاصل ہوتی ہے وہی سچی عزت ہے۔

منافقوں کو خطاب کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے

ولله العزة ولرسوله وللمؤمنين ولكن المنافقين لا يعلمون (منافقون - ۸)	اور عزت تو اللہ کے لیے ہے اور اس کے رسول کے لیے اور ایمان والوں کے لیے لیکن منافق نہیں جانتے۔

اس آیت نے مسلمانوں کو ایمان کی وہ عزت بخشی ہے جو کبھی چھینی نہ جا سکے گی۔ اس لیے ہر مسلمان کا سر ہر باطل کے سامنے اونچا رہنا چاہیے۔ اور اس کو اپنی دینی خودداری کو ہر وقت محسوس کرنا چاہیے۔ اور اس لیے اس کو بہترین اخلاق کا نمونہ بن کر سامنے آنا چاہیے۔ تعلیم محمدی کے اثر سے صحابہ کرام کے دل اس صحیح خودداری کے احساس سے ہمیشہ معمور رہتے تھے۔ چنانچہ جب وہ قیصر و کسریٰ کے مقابلہ میں صف آرا تھے تو ان کی اسلامی خودداری کا یہ عالم تھا کہ معمولی سے معمولی مسلمان اُس وقت کی دنیا کے ان سب سے بڑے بادشاہوں کے دربار میں بے دھڑک گھستا چلا جاتا تھا۔ اور پوری دلیری، جرأت اور آزادی کے ساتھ گفتگو کرتا تھا۔ مسلمان جب تک اپنے اس اسلامی شعار پر قائم رہے۔ ان کی اولوالعزمی اور بلند ہمتی کی ساری دنیا معترف رہی۔

بعض لوگ غلط فہمی کے باعث خودداری کے استعمال و اظہار کو کبر و غرور میں شمار کرنے لگتے ہیں۔ علامہ شہاب الدین آلوسی نے اپنی شہرۂ آفاق تفسیر روح المعانی میں مذکورہ بالا آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں شیخ ابو حفص سہروردی کا یہ قول نقل کیا ہے:-

العزة غیر الکبر لأن العزة معرفة	عزت نفس (خودداری) غرور سے الگ چیز ہے
الانسان بحقیقة نفسه واکرامها	کیوں کہ خودداری میں اپنی ذات کی حیثیت
من أن لا یضعها لأقسام عاجلة	کو جاننے اور اس کو اس سے بالاتر سمجھنے
دنیویة کما أن الکبر جهل الانسان	اور بچانے کا نام ہے کہ وہ دنیا کی فانی
بنفسه وانزالها فوق منزلتها	چیزوں کے لیے پستی میں اتر جائے اور غرور
فالعزة ضد الذلة کما	اپنی ذات کی اصلی حیثیت کو فراموش کر جانے اور اسکو
أن الکبر ضد التواضع	اس کی جگہ سے بلند کرنے کو کہتے ہیں پس عزت
(روح المعانی ۲۸/۱۰۲)	نفس "خودداری" "ذلت" کی ضد ہے جس طرح کہ غرور
	و تکبر تواضع و خاکساری کی ضد ہے۔

امام فخر الدین رازی نے معمولی تغیر کے ساتھ اس قول کو نقل کرنے کے بعد مزید لکھا ہے:

فلا یحل للمؤمن أن یذل نفسه	کسی مومن کے لیے اپنی ذات کو گرانا جائز نہیں
.... العزة تشبه الکبر من	ہے .... خودداری ظاہری شکل و صورت
حیث الصورة وتختلف من حیث	کے لحاظ سے تکبر و غرور کے مشابہ ہے لیکن

الحقیقۃ کاشتباہ التواضع بالضعۃ والتواضع محمود ولکن الضعۃ مذمومۃ کذلک الکبر مذموم والعزۃ محمودۃ

(تفسیر کبیر ۶/۲۹۸)

اصلیت اور حقیقت کے لحاظ سے اُس سے بالکل مختلف ہے جس طرح تواضع وانکساری میں خود کو گرانا اور پست کرنا معلوم ہوتا ہے حالانکہ تواضع کی صفت قابل ستائش ہے اور خودی کو پست کرنا قابل مذمت چیز ہے اس طرح عزت و تکبر قابل مذمت اور خودداری قابل تعریف وصف ہے۔

استاذ الاساتذہ علامہ سید سلیمان ندوی نے سیرت جلد ششم میں لکھا ہے کہ "یہ خودداری عین شرافت ہے۔ جس میں یہ وصف نہیں لوگوں کی آنکھوں میں اس کا وقار نہیں۔ اسلام میں صفائی ستھرائی کا جو حکم دیا گیا ہے اس میں ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ گندگی کی وجہ سے انسان دوسروں کی نظروں میں حقیر نہ معلوم ہو۔ ایک شخص حضور اکرم کی خدمت میں نہایت کم حیثیت کپڑے پہن کر آیا۔ فرمایا تمھارے پاس کچھ مال ہے؟ اس نے کہا اونٹ، بکری، گھوڑے، غلام سب کچھ ہیں۔ ارشاد ہوا کہ جب خدا نے تم کو مال دیا ہے تو خدا کے فضل و احسان کا اثر تمھارے جسم سے بھی ظاہر ہونا چاہیے۔ (سیرت ۶/۵۴۰)

فقر و فاقہ کی حالت یا حرص و طمع کے موقع پر انسان سے جو خودداری ظاہر ہوتی ہے اس کا نام شریعت کی اصطلاح میں تعفف اور استعفاف ہے اور قرآن نے اصحاب صفہ کے اس وصف سے متصف ہونے کا ذکر نہایت ستائش انداز میں کیا ہے۔

للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ لا یستطیعون ضربا فی الارض یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف تعرفھم بسیماھم لا یسئلون الناس الحافا

(البقرہ ع ۳۷)

صدقہ تو ان حاجتمندوں کا حق ہے جو اللہ کی راہ میں محصور (یعنی گھرے ہوئے) بیٹھے ہیں۔ ملک میں کسی طرف جا نہیں سکتے ناواقف لوگ ان کی خودداری کی وجہ سے ان کو مالدار سمجھتے ہیں۔ تم ان کو ان کی صورت سے پہچان لوگے۔ (کہ وہ ضرورتمند ہیں) وہ لپٹ کر لوگوں سے نہیں مانگتے۔

سوال یعنی مانگنے کی سب سے متبذل صورت گداگری ہے۔ اور اسلام نے اس کی نہایت شدت سے ممانعت کی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص ہمیشہ بھیک مانگتا رہتا ہے وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرہ پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہوگا۔ یہ اس کی اس حالت کی تمثیل ہوگی کہ دنیا میں اس نے اپنی خودداری کو قائم نہیں رکھا اور اپنی عزت و آبرو گنوا دی۔

اسی طرح تنگدستی کی حالت میں دوسروں سے اعانت کی درخواست کرتے پھرنا بھی خودداری یا کم از کم کمال خودداری کے منافی ہے۔ جو ایک ایمانی صفت اور ایمان کا تقاضا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کے لیے خداداد نعمتِ ایمان وہ عزت و دولت ہے۔ جس کے مقابلہ میں ساری نعمتیں اور دولتیں ہیچ ہیں، مومن حقیقی خدا کے سوا کسی کی طرف رخ نہیں کرتا۔ وہ کسی کے سامنے نہیں جھکتا وہ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ اور ایک مسلمان کی حیثیت سے وہ اپنا پایہ ساری دنیا سے بلند سمجھتا ہے۔ اور یقین رکھتا ہے کہ عزت و ذلت صرف خدا کے ہاتھ ہے اس خودداری کو قائم رکھنا اسلام کی عزت و سربلندی کو قائم رکھنا ہے۔ اور اس لطیف تعلیم کا یہ اثر ہے کہ آج بھی جب ہم کسی مسلمان کو پست کردار دیکھتے ہیں تو یہ کہکر اس کی اسلامی خودداری کو بیدار کرتے ہیں کہ "مسلمان ہو کر ایسا کرتے ہو" یعنی اسلام کی نعمت سے بہرہ ور شخص ایسی دناءت اور پستی کا کام کس طرح کر سکتا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ انسان کے اپنے مقام سے گرنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کا رشتہ خالق کائنات سے کٹ جاتا ہے۔ یہ خود فراموشی کی لعنت لازمی نتیجہ ہوتی ہے خدا فراموشی کا چنانچہ قرآن میں یہ حقیقت نہایت واضح الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے۔

ولا تکونوا کالذین نسوا اللہ فانسٰھم انفسھم (الحشر ع ۳)	اور نہ ہو جاؤ ان لوگوں کی طرح جنھوں نے خدا کو فراموش کر دیا۔ تو اللہ نے انھیں خود فراموشی میں مبتلا کر دیا۔

(باقی)

عربی سے ترجمہ

مستشرقین اور اسلام

از جناب عبد العزیز قاری - استاذ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

تحریک استشراق کا آغاز پانچویں صدی عیسوی سے چودھویں صدی کے اختتام تک کا زمانہ مسیحی یورپ کا ایک خاص زمانہ ہے، جسے یہ لوگ "قرون وسطیٰ" کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اپنی تاریخ کا ایک تاریک دور شمار کرتے ہیں۔ اس میں یہ مسیحی قومیں کلیسا کے استبداد کے نیچے دبی ہوئی ایک نہایت سخت اور وحشت آمیز زندگی گزارتی رہی تھیں۔ لیکن اسی دور میں ایک اہم واقعہ پیش آیا جو ان قوموں کے لیے رحمت ثابت ہوا کہ غربی یورپ کے جنوب میں ایک کھڑکی کھل گئی جس کے ذریعہ ان کو اسلامی تہذیب کا چہرہ دیکھنا نصیب ہوا۔ یہ واقعہ مسلمانوں کا اندلس میں پہنچنا اور وہاں اسلامی تہذیب کا ایک شاندار محل تعمیر کر دینا تھا جو چودھویں صدی عیسوی کے آخر تک، یعنی پوری سات صدیوں تک اپنا جلال و جمال دکھاتا رہا۔

اسلامی تہذیب کے اس مشاہدہ نے یورپین قوموں کی زندگی پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ اندلس اُن کے لیے ایک عظیم ثقافتی مرکز بن گیا جہاں وہ علم و حکمت کا فیض پانے کے لیے چاروں طرف سے ٹوٹتی تھیں۔ یہاں علم و حکمت کا دریا کس شان سے بہہ رہا تھا؟ اس کا تصور کرنے کے لیے صرف ایک شہر قرطبہ کا ذکر کافی ہے کہ اس میں پچاس ہزار محلات اور اعلیٰ درجہ کے مکانات تھے جو لاکھوں مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں سے آباد تھے۔ کتابوں کے نسخے تیار کرنے والی خوش نویسی کی صرف ایک دوکان کا یہ حال تھا کہ ایک سو ستر باندیاں اس میں نقل مخطوطات کا کام کرتی تھیں۔ خلیفہ کے محل کا کتب خانہ چار لاکھ کتابوں پر مشتمل تھا۔ اسلامی تہذیب کے اس مرکز کے بارے میں خود ایک اندلسی عیسائی فاضل بلاسکو ابانیز کی کتاب "کلیسا کے سامنے" اس کا بیان ملاحظہ ہو۔

اندلس کو مسلمانوں نے صرف دو سال میں فتح کر لیا تھا جب کہ اسے واپس لینے کی جد و جہد سات
صدیوں میں انجام کو پہنچی۔ لیکن کیوں؟ اس لیے کہ در اصل یہ فتح ہتھیاروں کی رہینِ منت نہیں تھی بلکہ ایک
جدید تہذیب کی کارگزاری تھی جس نے زندگی کے تمام شعبوں کو اپنے آغوشِ رحمت اور سایۂ لطافت میں
لے لیا تھا۔ اس تہذیب کے فرزند اپنے پورے دورِ حکمرانی میں کسی وقت بھی حریتِ ضمیر کے احترام سے
خالی نہیں ہوئے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو کسی قوم کو حقیقی عظمت عطا کرتی ہے۔ انھوں نے اپنے حدودِ سلطنت
میں پوری کشادہ دلی کے ساتھ عیسائیوں کے کلیساؤں اور یہودیوں کے معبدوں کی بقا کا حق بھی تسلیم کیا۔
ان کی مسجدوں کو ادیانِ سابقہ کی ان عبادت گاہوں سے کسی قسم کا خوف نہیں لاحق ہوا۔ اور بغیر کسی حسد
اور ان پر چھا جانے کے جذبہ کے وہ اپنے درمیان میں اور پہلو بہ پہلو ان کے وجود کا احترام کرتی رہیں۔ یہ آٹھویں
صدی عیسوی سے پندرھویں صدی تک کا وہ زمانہ ہے جبکہ شمالی یورپ کی قومیں دینی فتنوں اور وحشیانہ
باہمی جنگوں کا شکار بنی ہوئی اپنے پسماندہ ملکوں میں وحشی قبائل کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ یہ وہ دور جس میں
انگریز، سیکسن اور جرمن عوام جھونپڑیوں میں رہتے اور ان کے شاہان و اشراف تنگ و تاریک قلعوں میں
چٹانوں کے نیچے سکونت یا بنیز رشان جتاتے تھے، جن کے شاگرد پیشہ بحری زرہیں پہنے اور ما قبل تاریخ
کے انسان والی خوراک کھاتے تھے۔ اس دور میں اندلسی عرب اپنے وسیع محلات تعمیر کرتے اور اعلیٰ
معیار کے حمام بناتے تھے جو علم و ادب، شعر و نغمہ اور مسائلِ تاریخ پر تبادلۂ خیالات کی محفل کا بھی کام
دیتے تھے۔[1]

اس کے علاوہ یورپ نے ایک دوسری کھڑکی اسلامی دنیا کی طرف اپنے ہاتھ سے کھولی۔ اور یہ اُن
کی صلیبی جنگیں تھیں، جو عالمِ اسلام کی سرزمین پر لڑی گئیں۔ ان جنگوں میں شریک ہونے والے صلیبی یورپ
لوٹے تو مسلمانوں کی کتنی ہی عادتیں، ان کے پہناوے، طور طریقے ان کا فنِ حرب اور فنِ تعمیر اپنے ساتھ
لائے۔ اس کے علاوہ جو سفارتی رابطے مسلمانوں اور عیسائی مملکتوں کے درمیان عثمانی خلافت تک قائم
ہوئے وہ بھی اسلامی ثقافت اور تہذیب کے بہت سے تحفے ان قوموں تک پہنچانے کا ذریعہ بنے۔
ان عوامل کے نتیجے میں یورپین قوموں پر اسلامی تہذیب کے اثرات کا پہلا اہم ظہور جس
شکل میں ہوا وہ یہ تھی کہ عیسائی سلاطین نے کلیسا کے شکنجے سے گلو خلاصی کے لیے سوچنا شروع کر دیا۔

[1] یورپی تمدن پر عربوں کا اثر - (عربی) از عباس محمود العقاد ص ۱۱۵-۱۱۶

کلیسا کا پنجہ ان کی گردنوں میں اس طرح پیوست تھا کہ اگر کلیسا کا پروانۂ رضامندی ان کو حاصل ہو جاتا تھا تب تو یہ چین سے حکومت کر سکتے تھے لیکن اگر کلیسا کسی سے ناراض ہو گیا اور اُس پر کفر کا فتویٰ صادر کر دیا گیا تو لوگ اُٹھ کر اس کی حکومت پارہ پارہ کر دیتے تھے۔

سلاطین ہی کی طرح ان قوموں کے مفکرین کی بھی آنکھیں اسلامی تہذیب کی تاثیر سے کھلیں اور کلیسا کے خلاف نکتہ چینی کی ایک رو بیدار ہوئی۔ یہی رو تھی جس نے نظام کلیسا کو پھاڑ کر کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کے دو فرقوں میں تقسیم کر دیا۔

کلیسا کے مرکز روم نے اس تنقیدی تحریک کی روک تھام کے لیے وہ جابرانہ نظام قائم کیا جو کلیسا کے خلاف کھڑے ہونے والے ہر شخص کو زندہ جلا دینے تک سے دریغ نہیں کرتا تھا۔ یہ دینی و فکری استبداد کی وہ بدترین شکل تھی جس نے نہ صرف کلیسا کے خلاف نفرت کا پارہ اونچا کر دیا بلکہ جس دین کا کلیسا علمبردار تھا اُس سے بھی نفرت کی آگ کتنے ہی دلوں میں بھڑک اٹھی اور یہاں سے یورپ میں لادینیت کی داغ بیل پڑی۔

الغرض کلیسا کا جبر و استبداد اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا اور اُسے اپنے تحفظ کے کچھ اور طریقے سوچنے پر مجبور ہونا پڑا۔ یہ دوسرا طریق کار تھا جس نے استشراق کی داغ بیل ڈالی۔ یعنی یہ محسوس کر کے کہ اس مخالفانہ رو کا سرچشمہ عالم اسلام یعنی مشرق ہے اپنے آدمیوں کو مشرقی زبانیں، خاص کر عربی سیکھنے اور مشرقی و اسلامی علوم کا مطالعہ کرنے پر لگانے کا فیصلہ کیا گیا تاکہ ان کا توڑ کیا جا سکے، چنانچہ اہل کلیسا ہی تھے جنھوں نے استشراق (مشرقی علوم اور زبانیں سیکھنے) کا آغاز کیا۔ اور ان کے سوا کوئی دوسرا اُس وقت اس لیے ہو بھی نہیں سکتا تھا کہ اُس وقت یورپ میں تنہا یہی پڑھنے لکھنے والا طبقہ تھا۔ یونیورسٹیوں اور تعلیم گاہوں پر اسی کا راج تھا۔ چنانچہ یہ لوگ عربی زبان کی تحصیل پر لگ گئے اور عربی زبان و علوم کے مطالعہ کا اولین مرکز ویٹکن (پاپائے روم کے دارالسلطنت) میں قائم ہوا۔ جہاں سے مسلمان فقہا اور دانشوروں سے مناظرہ کرنے والے لوگ نکلنا شروع ہوئے۔

ویٹکن سے آغاز کے بعد یہ دائرہ وسیع کیا گیا اور دوسرے درجے کے کلیساؤں کے مدارس میں بھی عربی اور بعض دوسری مشرقی زبانیں شامل نصاب کر دی گئیں۔ اسپین، فرانس اور اٹلی کی یونیورسٹیوں میں مستقل شعبۂ السنۂ شرقیہ کے قائم کیے گئے ان میں پیرس یونیورسٹی کو خاص طور سے اس تعلیم کا سب سے

بڑا مرکز بنایا گیا۔

چودھویں صدی عیسوی میں پاپائے روم پنجم نے اس دائرے کو اور وسعت اور اہمیت دی اور عربی، عبرانی اور کلدانی زبانوں کے لیے آکسفورڈ اور بولون یونیورسٹی میں بھی مستقل شعبے قائم کیے جانے کے احکامات جاری کیے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ ان دونوں یونیورسٹیوں نیز پیرس یونیورسٹی اور ویٹکن یونیورسٹی میں بھی ان تینوں زبانوں کے دو دو پروفیسر مقرر ہوئے۔ ان کے ذمہ تعلیم کے علاوہ ان زبانوں کے متون کا ترجمہ بھی کرنا تھا۔

بہرحال ہمیں یہ بتانا ہے کہ استشراق کی تحریک ویٹکن سے شروع ہوئی اور مستشرقین کے پیش رو اہل کلیسا اور مسیحی علماء تھے۔ یہی ایک عرصہ تک اس تحریک کے نگراں اور سربراہ کار تھے۔ اور دوم یہ کہ ان کا مقصد کلیسا کا دفاع اور اُن لوگوں کا توڑ کرنا تھا جو اسلامی تہذیب کی روشنی سے فکر و خیال کی ایک نئی لہر پاکر کلیسا کے فکری استبداد اور لامحدود اقتدار کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

اسی بنا پر استشراقی تحریک میں عربیات کا مطالعہ ایک عرصہ تک ان ہی محدود مقاصد کے دائرے میں بند رہا۔ چنانچہ عربی زبان کو بجائے ایک ایسی مستقل تہذیب کی زبان کے جس نے یورپ کو علوم و افکار کا ایک نیا سرمایہ عطا کیا تھا محض ایک سامی زبان کی حیثیت سے پڑھا یا جاتا تھا۔ یورپ میں انقلاب آگیا۔ عالم اسلام اپنی بالاتر حیثیت کھو کر یورپ کے پنجۂ استعمار میں گرفتار ہو گیا مگر مستشرقین کا مطالعۂ عربیات اسی انداز پر چلتا رہا۔

اس میں تبدیلی اُس وقت آئی جب عالم اسلام میں استعمار کے پنجہ سے نکلنے کی تحریک شروع ہوئی اور ایک نئے انقلاب کے آثار رونما ہونے لگے۔ اس مرحلہ پر آکر ضرورت محسوس کی گئی کہ اس مطالعہ کا نہج بدل کر اسے نئے تقاضوں کے مطابق کیا جائے۔ یہاں سے مستشرقین کے کام کا دائرہ وسیع ہوا۔

مستشرقین کا مطالعہ عربیات و اسلامیات

جہاں تک عربیات اور اسلامی موضوعات کے سلسلے میں ماخذ کا استیعاب کرنے، مواد و معلومات جمع کرنے اور انھیں ترتیب و تنسیق سے آراستہ کرنے کا تعلق ہے مستشرقین کا کام بلاشبہ اس معاملے میں لائق تحسین ہے اور اس کے دو خاص سبب ہیں۔ (۱) یورپ کی علمی ترقی جس نے ایسے کاموں کا ایک خاص سلیقہ اُسے عطا کر دیا ہے۔ (۲) یہ کہ عالم اسلام پر اُس کے تسلط نے تمام علمی اور ثقافتی خزانے بھی اُس کی دسترس

بس کر دیے۔ اس حاکمانہ دسترس کے ماتحت اُس نے مستشرقین کے ایماء پر عالم اسلام کی یہ قیمتی دولت بھی جہاں تک ہو سکا لوٹ کر اپنے گھر میں بھر لی۔ ہم بغیر کسی شبہ کے کہہ سکتے ہیں کہ عربی اور اسلامی کتب خانہ کے ۹۰ فی صدی قیمتی اور اہم مخطوطات اس لوٹ میں یورپ اور امریکا کے کتب خانوں کی زینت بن گئے۔ خدا بھلا کرے خلافت عثمانیہ کا کہ اُسے اس صورت حال کا احساس ہوا تو اپنے آخری دنوں میں اس نے اپنے محروسہ ممالک سے مخطوطات کا ذخیرہ ترکی میں منتقل کر لیا اور اس طرح کوئی ۱۰ فیصدی ذخیرہ بچ رہا۔

بہرحال علمی ترقی اور مطالعہ و استفادہ کے ترقی یافتہ طریقوں کی دریافت کے علاوہ مسلمانوں کے علمی ذخیرے پر یہ غاصبانہ قبضہ تھا جس کی بدولت مستشرقین نے اسلامی اور عربی موضوعات پر اپنے کاموں کے سلسلے میں جمع و ترتیب کا بہت اعلیٰ معیار پیش کیا۔ اور ہمیں یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ ہم اس معاملے میں اُن کے نمونے سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ جہاں تک اس مطالعہ میں ان کے اپنی آراء داخل کرنے اور اپنے زاویۂ نظر سے اسلامیات اور عربی زبان کے مسائل کی تشریح و تفسیر کرنے کا تعلق ہے اُسے ہم علمی لحاظ سے اس قدر قابل تنقید پاتے ہیں کہ مجموعی اعتبار سے ان کے کاموں کا کوئی علمی وزن نہیں رہتا۔ کیونکہ:۔

(۱) کسی بھی علمی یا تاریخی مسئلہ پر اظہار رائے میں صحیح نتیجہ تک پہنچنے کے لیے ارباب بحث و نظر کو یہاں چند شرائط مسلم ہیں۔

یہ کہ اگر کسی انسان کے اعمال و افعال سے بحث ہے تو انسانی خصوصیات اور نفسیات کی پوری سلیم النظری کے ساتھ رعایت اس بحث میں ملحوظ رہے۔ اگر کسی قوم کی تاریخ کا کوئی واقعہ زیر بحث ہے تو اس قوم کی طبعی خصوصیات اور مزاج بھی پیش نظر رہے اور اس کی پوری تاریخ کا بھی شعور ہو۔ اگر کسی ثقافت اور شریعت کے مسائل سے بحث کی جا رہی ہو تو اس ثقافت اور اُن کے نسائص اور اس شریعت کے اساسی تصورات اور امتیازات پر نگاہ ہو۔ اس لیے کہ ایک [illegible] اور بیرون اسلام ثقافت دوسری ثقافت سے مختلف مزاج اور معیار رکھتی ہے جیسے نظر [illegible] ہے۔ ہمارے [illegible] رادی عجیب عجیب قسم کے فیصلے صادر کر سکتا ہے۔

علیٰ ہذا قوموں کے ادبی اور فنی مذاق و معیار بھی مختلف ہیں۔ ایک چیز جو ایک جگہ داخل محاسن ہے دوسری جگہ معائب میں شمار ہو سکتی ہے۔ اس لیے کسی زبان کی ادبیات سے بحث اُسی وقت بامعنیٰ ہو سکتی ہے جب بحث کرنے والا اہل زبان کا ذوق تنقید بھی رکھتا ہو۔ اب اگر کوئی انگریز کسی عربی ادب پارے پر اپنے

انگریزی ذوق و معیار کے ماتحت حکم لگانے لگے تو اس نقد و حکم کی کوئی علمی قیمت نہیں۔

یہ مسلمات ہی نہیں بدیہیات میں سے اب ان شرائط کو مستشرقین کے ادبی مطالعوں اور بحثوں میں تلاش کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یکسر مفقود ہیں ان کی تصنیفات ہر خواہشمند کی دسترس میں ہیں عربی کا ذوق آشنا عربی آسانی سے جان سکتا ہے کہ ان کے تمام تبصروں میں عرب ذوق سے ناآشنائی بول رہی ہے۔ وہ اس معاملے میں کتنے مجبور اور اپنے ذوق کے کیسے اسیر ہیں، اس کا اظہار خود انہی میں سے بعض کی زبانوں سے بھی ہوا ہے۔ سان کے ایک عرب شاگرد، ڈاکٹر صفا خلوصی نے اپنے ایک مقالے میں[1] لکھا تھا کہ "ایک مستشرق استاد نے جواب اس دنیا میں نہیں ہیں ان سے ایک بار کہا کہ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ عربی شعر کا حقیقی ذائقہ پانے کے لیے آدمی کو عربوں میں پیدا ہونا چاہیے۔ سو اگر تم سے ممکن ہو تو ایک کتاب ہمارے لیے انگریزی میں لکھ دو کہ جو عربی شعر کا واقعی ذائقہ پانے میں مددگار ہو سکے۔ یہ ایک عظیم خدمت ہوگی"۔

عربی زبان و ادب کے بعد اسلامی عقائد و شریعت اور اسلامی تاریخ و ثقافت کے میدان میں ان حضرات کا کام دیکھیے تو اور بھی غضب پائیے گا۔ اور اس کی بھی وجہ ظاہر ہے کہ جب مستشرقین اہل اسلام ہی کو نہیں بلکہ سارے ساکنانِ مشرق کو اس یورپین نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ مغربی قومیں ہر بات میں برتر اور مشرقی کمتر ہیں تو ان سے کسی انصاف اور حقیقت پسندانہ تجزیہ کی توقع ہی کیسے کی جا سکتی ہے۔ مشہور مستشرق گب نے اپنی کتاب (WHITH .R ISLAM) میں مسلم اقوام کو قوت فکریہ کے اعتبار سے کمتر قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ان میں کلیات کے فہم کی صلاحیت نہیں پائی جاتی بلکہ کسی بھی چیز کا ادراک وہ اسکی جزئیات ہی کے واسطے سے کر پاتی ہے[2]۔

مستشرق حضرات اپنی یورپیت کے کیسے اسیر ہیں اس کا اندازہ کرنے کے لیے صرف یہ ایک مثال کافی ہے کہ ان حضرات کے یہاں یورپی تاریخ کی جو تین دور[illegible] تقسیم ہے۔ قرون اولیٰ، قرون وسطیٰ اور عہد نشأۃ ثانیہ، اسی تقسیم کو وہ تمام دوسری قوم[illegible] مستشرقین کے کام[illegible] پر بھی منطبق کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ بدیہی طور پر ایک غلط انداز فکر ہے، ہر قوم [illegible] اپنے ادوار و مراحل ہیں اس میں تابع ہونے کا کیا سوال؟

(۲) اس ذہنیت کے علاوہ ان کی سب سے بڑی مصیبت ان کی نصرانیت ہے۔ آج بھی بیشتر مستشرقین کلیسا اور مذہبی

---

[1] مجلۃ الاذاعۃ البریطانیا۔ شمارہ ۲۹۵۔ مئی ۱۹۶۳ء

[2] الاستشراق والمستشرقون ما لہم وما علیہم از مصطفیٰ السباعی

طبقہ سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ باقی تھوڑے بہت یہودی ہیں۔ نصرانیت کی موروثی اسلام دشمنی نے ان سب کو اسلام اور عربوں کے بارے میں کس طرح بے انصافی میں جکڑ رکھا ہے اس کا حال ہماری زبان میں نہیں انہی میں کے ایک نامور گستاؤلی بان کی زبان سے سنئے! اپنی کتاب "تمدن عرب" میں لکھتے ہیں:۔

"اس بیان کے بعد شاید ہمارے ناظرین دریافت کریں گے کہ جس وقت عربوں نے یورپ کے بے انتہا کچھ کیا تو پھر اس زمانہ کے وہ علماء جن میں ظاہرا مذہبی تعصب نہیں معلوم ہوتا ان خدمات کا اعتراف کیوں نہیں کرتے؟ بجنسہ یہی سوال مجھے بھی پیش آیا تھا اور میری رائے میں اس کا ایک ہی جواب ہے وہ یہ کہ فی الواقع ہماری رائے کی آزادی اصلی نہیں ہے بلکہ ظاہری ہے اور بعض مسائل پر ہم ہرگز جس آزادی سے چاہتے ہیں غور نہیں کر سکتے۔ ہماری شخصی فطرت کے ہمیشہ دو حصے ہیں۔ ایک وہ حصہ جو ذاتی تحقیقات اور دماغی اور اخلاقی ماحول کے ذریعہ سے پیدا ہوا ہے۔ اور دوسرا قدیم حصہ جس کو وراثت کے اثر نے منجمد کر دیا ہے۔ اور جو بلا محسوس ہوئے ہمارے خیالات میں بین اثر پیدا کرتا ہے......۔ یہی غیر محسوس حصہ فطرت انسانی کا ہے جو اکثر لوگوں میں غالب ہے اور ان میں پرانے اعتقادات کو نئے ناموں سے قائم رکھے ہوئے ہے۔ یہی ان کے خیالات کا اصلی مدار ہے اور یہ خیالات بظاہر ان کو اس درجہ آزاد معلوم ہوتے ہیں کہ وہ ان کو عزت کی نظر سے دیکھنے پر مجبور ہیں۔

سچ یہ ہے کہ پیروان اسلام زمانۂ دراز سے یورپ کے بدترین دشمنوں میں محسوب ہوئے ہیں۔ اگر چارلس مارٹل کے وقت میں جنگ صلیبی کے زمانہ میں یا قسطنطنیہ کے سامنے ان کے ہتھیاروں نے ہمارے دلوں میں تہلکہ نہیں پیدا کیا تو ان کے مدارج اعلیٰ تمدن نے ہمیں ذلیل وخوار کیا اور گو یا بہت ہی قلیل زمانے سے ہم ان کے تسلط کے پنجہ سے نکلے ہیں۔

وہ موروثی تعصب جو ہمیں اسلام اور پیروان اسلام سے ہے زمانہ دراز سے جمع ہوتا آتا ہے اور ہماری فطرت کا ایک جزو ہو گیا ہے۔ ہمارے یہ تعصبات اس قدر جبلی اور اسی قدر مستحکم ہیں اگرچہ بعض وقت وہ دبا کیوں نہ دیے جائیں جیسے یہودیوں کے تعصبات عیسائیوں سے۔

اس موروثی تعصب میں جو ہمیں اسلام کے برخلاف ہے اگر ہم اس دوسرے تعصب کو

شریک کرلیں جسے ہماری کم بخت تعلیم نے سالہا سال سے ہمارے ذہن نشین کر دیا ہے کہ
کل قدیم علوم وادب صرف یونان و روم سے منشعب ہوئے ہیں تو بخوبی ہماری سمجھ میں آجائے گا
کہ تمدن یورپ کی تاریخ میں عربوں کے حصے سے کیوں انکار کیا جاتا ہے۔

بعض اشخاص کو اس خیال سے ہمیشہ شرم آتی [illegible] عیسائی یورپ کی وحشیانہ معاشرت
سے نکلنے کا باعث ایک کافر قوم تھی۔ یہ خیال اس قدر [illegible]ناک ہے کہ اس سے انکار کرنا
بہت ہی آسان ہو جاتا ہے۔[۱]

ایک نامور مستشرق ہی کے اتنا کچھ کہہ دینے کے بعد ہمیں اپنی طرف سے مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں
رہ جاتی۔ البتہ موقع کی مناسبت سے ایک اضافہ [illegible] موقع فراہم کرتی ہے کہ مستشرقین کی ایک اچھی خاصی
تعداد ہے جس کی آنکھوں سے [illegible]
گئی مگر [illegible] عربی زبانوں سے پردہ اٹھ گیا اور اسلام اور پیغمبر اسلام کی صداقت ان پر پوری طرح کھل
[illegible] یورپین [illegible] کی نفسیاتی گرہ نے حق کو دیکھ لینے کے باوجود اسے مان لینے کی جرأت
اُن میں نہ پیدا ہونے دی۔ فرانسیسی مستشرق رینان کا قول ہے جو گستاؤلی بان ہی نے تمدن عرب میں
نقل کیا ہے کہ:۔

"میں کبھی کسی مسجد میں نہیں داخل ہوا مگر یہ کہ ایک لرزہ خیز ہیبت کی کیفیت مجھ پر
طاری ہو گئی اور بڑی حسرت میں نے محسوس کی کہ میں مسلمان نہیں ہوں۔"

یہ قرآن کی زبان میں "سمعنا وعصینا" ہی کی تو ایک مثال ہے۔

(۳) مستشرقین اپنی حریت فکر کے ساتھ جودت عقل و فہم کے بھی دعویدار ہیں جیسا کہ مسلم عقلیت
سے متعلق مسٹر گب کے ریمارک سے اور ظاہر ہو چکا۔ مگر وہ اسلامیات کے مطالعہ میں جس عقلیت سے کام
لیتے ہیں اس کا حال یہ ہے کہ وہ حدیث و شریعت کا مطالعہ کرتے ہیں اور نتائج مطالعہ پیش کرتے ہیں تو
ماخذ اور مصدر بناتے ہیں ابو الفرج اصفہانی کی کتاب الاغانی کو، ابن عبد ربہ کی کتاب العقد الفرید کو
اور کہیں کہیں ان سے بھی زیادہ عجیب قسم کے مصادر و ماخذ کو جن کا کوئی پایہ ان مباحث میں نہیں۔ پھر ہر
فن کی کچھ اصطلاحات اور رموز و قواعد ہوتے ہیں جن کی حقیقت سے آگاہ ہونے یا ان کے [illegible] کی تربیت
[illegible] سے کرلے کے

[۱] تمدن عرب (اردو) مطبوعہ آگرہ [illegible] ص ۵۲۲-۵۲۳ نوٹ: یہ ترجمہ ہم نے مضمون نگار
کے بجائے گستاؤلی بان کی اصل کتاب کے اردو ترجمہ از مولانا سید علی بلگرامی سے نقل کر دیا ہے۔ چنانچہ [illegible] دیا گیا ہے۔

نہ پانے کی صورت میں آدمی صحیح مآخذ تک پہنچنے کی صورت میں بھی صحیح نتائج تک نہیں پہنچ سکتا۔ چنانچہ یہ حدیث و فقہ کے مباحث میں [illegible] مآخذ سے بھی کام لیتے ہیں تو انھیں روایتوں کے مراتب میں فرق، صحیح اور موضوع میں تمیز اور [illegible] و مرجوح میں [illegible] ترجیح کے قواعد سے آگاہی نہیں ہوتی اس لیے عجیب عجیب گل کھلاتے ہیں۔

اسی طرح تاریخ اسلام میں ان کی عام طور پر دوڑ الامامۃ والسیاسۃ، بدائع الظہور، وقائع الدہور بلکہ الف لیلۃ ولیلۃ جیسی کتابوں تک ہے۔ ابن جریر، ابن کثیر اور ابن اسحاق کی کتابوں کو ہاتھ لگاتے ہیں تو وہاں بھی سقیم و صحیح کے فرق سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

سیدھی سی بات ہے کہ ایک منصف مزاج اور نیک [illegible] آدمی اسلام کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے کبھی ابوجہل کے پاس نہیں جائے گا۔ ٹھیک جس طرح مریم علیہا السلام کے بارے [illegible] ہر کسی کو صداقت کی تلاش ہو تو وہ یہود کا رُخ اس کام کے لیے نہیں کرے گا، لیکن یہ گرانقدر اور بالاتر عقلیت [illegible] کے دعویدار اسلامیات کے معاملے میں سیدھی سادی عقل کے تقاضوں کی بھی پروا نہیں کرتے۔

ہم ہی نہیں کہہ رہے۔ خود آج کے ایک مستشرق کا اعتراف ہے کہ اسلامی موضوعات پر فیصلے صادر کرنا ان حضرات کا اپنی حد سے تجاوز ہے جس کے نتیجے میں شتر گربگی کا ظہور لازم ہے۔ مصطفیٰ السباعی مرحوم نے اپنی کتاب "السنۃ ومکانتھا فی التشریع" میں مسٹر آربری (صدر شعبہ مطالعہ اسلامیات و عربیات کیمبرج یونیورسٹی) کا یہ قول نقل کیا ہے جس کے مخاطب خود سباعی مرحوم ہی تھے کہ

"ہم مستشرق اسلام سے متعلق اپنی بحثوں میں اکثر غلطیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ ہم کو ان مباحث میں نہیں پڑنا چاہیے۔ یہ میدان آپ لوگوں ہی کا ہے"

مستشرقین کے حوالوں کی کمزوری یا بے محلی اور علم و فہم کی نارسائی کے سلسلے میں مثالیں بہت دی جا سکتی ہیں لیکن میں یہاں دو مثالوں پر اکتفا کروں گا۔

۱۔ ہندوستان سے شائع ہونے والے "الثقافۃ الاسلامیۃ" نامی مجلے میں "کتب مغازی اور ان کے مؤلفین" کے سلسلہ مضامین میں جرمن مستشرق جوزف ہورووٹس نے ایک جگہ ضمنی طور پر مسلم علماء و فقہاء اور ذوق [illegible] نے لکھا ہے کہ

[illegible] اب جو یہ پتہ چلتا ہے کہ علماء، فقہاء کی ایک بڑی جماعت [illegible]

معاشرے میں کتنی صاحب ذوق واقع ہوئی تھی۔ چنانچہ عبداللہ بن عمر کی روایت سے صاحب اغانی رقمطراز ہے کہ وہ خود فرماتے ہیں: میں ایک مرتبہ حج کے لیے [illegible] تھا۔ پس ایک حسین عورت بھی حج کو جاتی ہوئی ملی جو شہوت انگیز باتیں کر رہی تھی۔ میں چلا تو راستے [illegible] ہے۔ نہ اُس کے قریب گیا اور کہا کہ او خدا کی بندی تو حج کو جا رہی ہے۔ [illegible] میں نے اپنی [illegible] مذاجرہ بالکل کھول دیا جو سورج کی شرماتا تھا اور بولی گو یہ خدا کا خوف نہیں؟ اس پر اُس نے اپنا [illegible] ہوں جن کے بارے میں عرجی نے کہا ہے کہ: [illegible] ہوئی کہ چچا جان! میں اُن عورتوں میں سے

من اللاء لم یحججن یبغین حسبۃ ولکن لیقتلن البریٔ المغفلا

(ان عورتوں میں کہ جو رضائے الٰہی کے لیے حج کو نہیں جاتیں بلکہ اُن کا مقصدِ سفر نیک اور سادہ دل لوگوں کی متاع دل و جاں کو لوٹنا [illegible] جی کی زیارت [illegible] ہوتا ہے)

ابن عمر کہتے ہیں: کہ اس پر میں نے کہا اچھا جانے دو، میں خدا سے دعا کروں گا کہ ایسے چہرے کو آگ کا عذاب نہ دے۔[1]

ہم اپنے علماء و فقہاء کے متعلق شعری ذوق سے منکر نہیں۔ یقیناً ان میں سے بہت سے بڑا معیاری ذوق رکھتے تھے۔ مگر جس نوعیت کا یہ واقعہ مذکور ہوا ہے۔ اس کے لیے اغانی کی روایت پر اعتماد ایک غیر ذمہ دار آدمی ہی کر سکتا ہے۔ ایک طرف عبداللہ بن عمرؓ کی وہ شخصیت ہے جس کا مخصوص مزاج تقویٰ و اتباع سنت تاریخ اسلام کی ایک مسلّم اور متفق علیہ حقیقت ہے دوسری طرف یہ اُس سے جوڑ نہ کھانے والا واقعہ۔ علاوہ ازیں یہ بھی پیش نظر رکھئے کہ علماء اسانید و رجال میں بعض حضرات صاحب اغانی (ابوالفرج اصفہانی) کے اتنے سخت ناقد ہیں کہ اُسے "اکذب الناس" بتاتے ہیں۔[2]

دوسری مثال گولڈزیہر کی ہے۔ ان صاحب نے اپنی کتاب تفسیر اسلامی کے مختلف مذاہب" میں معتزلہ کے اس انداز تاویل پر کلام کرتے ہوئے کہ وہ کس طرح اپنے اعتقادات کا تحفظ تفسیر میں کیا کرتے تھے، شریف مرتضیٰ معتزلی کی مثال دی ہے کہ آیت "وجوہٌ یومئذٍ ناضرۃ الیٰ ربھا ناظرۃ" جمہور کی تفسیر کے مطابق جو خدا کی رویت اور قائلین تشبیہ کی دلیل نکلتی ہے اس کے مقابلے میں [illegible]

[1] [illegible]

[2] میزان الاعتدال مطبعۃ الحلبی۔ مصر۔ ۳: ۱۲۳

Regd. No. LW/NP-10

VOL. 41 N
FEBRUARY 1976

31, Naya Gaon West
Lucknow (U.P.)
Phone : 25547

تیسرا انتخاب نمبر
ماہنامہ
الفرقان
لکھنؤ
مدیر
محمد منظور نعمانی
قیمت
5/-

اپریل، مئی، جون سنہ ۱۹۷۶ء

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

تیسرا انتخاب نمبر

گذشتہ فائلوں کے منتخب مضامین

مدیر

محمد منظور نعمانی

غیر ممالک سے
سالانہ: دو پونڈ
(بذریعہ بحری ڈاک)

چندہ:-
سالانہ: ۱۵/-
عام شمارہ کی قیمت ۱/۵۰

(مولوی) محمد منظور نعمانی اڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس، باغ گو گے نواب لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان، ۳۱۔ نیا گاؤں مغربی نظیر آباد لکھنؤ سے شائع کیا۔

فہرست مضامین

ضروری دفتری اطلاعات

یہ نمبر اپریل، مئی، جون ۱۹۷۶ء کا مشترکہ شمارہ ہے۔ اس کے بعد جولائی کا شمارہ انشاء اللہ ۱۰ جولائی تک شائع ہوگا۔

"یہ تیسرا انتخاب نمبر" بھی پہلے دو انتخاب نمبروں (بابت ۱۹۷۴ء و ۱۹۷۵ء) کی طرح اپنی خاص نوعیت اور دستاویزی اہمیت کی بنا پر خریداروں کی موجودہ تعداد سے کچھ زیادہ چھپوایا گیا ہے (اسکی قیمت بھی ۵/ روپے ہی)۔ جو صاحب صرف یہ نمبر طلب کرنا چاہیں وہ اسکی قیمت کے ساتھ دو روپے رجسٹری فیس ضرور ارسال فرمائیں ـــــ جو حضرات اس نمبر سے خریداری شروع کرنا چاہیں گے انھیں یہ خاص نمبر خریداری کے حساب ہی میں پیش کیا جائے گا۔

خصوصی رعایت۔ الفرقان کے "انتخاب نمبر" کے سلسلے کی تینوں خاص اشاعتیں ایک ساتھ طلب کرنے پر محصول ڈاک (مع رجسٹری فیس) دفتر کے ذمّہ ہوگا۔ آپ صرف پندرہ روپیہ ارسال فرماکر ساڑھے چھ سو صفحات پر مشتمل تینوں ضخیم نمبر حاصل کر سکتے ہیں۔

ناظم دفتر الفرقان، ۳۱- نیا گاؤں مغربی (نظیر آباد) لکھنؤ ۱۰

سخنہائے گفتنی

بسم اللہ، والحمد للہ، والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد رسول اللہ وآلہ وصحبہ ومن والاہ۔

اللہ کی مدد اور اُس کی توفیق سے الفرقان کا تیسرا انتخاب نمبر ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

الفرقان کا پہلا شمارہ محرم سنہ ۱۳۵۲ھ (مارچ سنہ ۱۹۳۴ء) میں بریلی سے شائع ہوا تھا، اس بنا پر قمری حساب سے اسکی عمر کا یہ چوالیسواں سال ہے اور شمسی حساب سے تینتالیسواں —— جیسا کہ پہلے اور دوسرے انتخاب نمبر میں بھی ذکر کیا جا چکا ہے، اب سے قریباً چار سال پہلے جب اسکے اجرا پر چالیس سال پورے ہونے والے تھے، تو یہ خیال دل میں پیدا ہوا کہ اس طویل مدت میں مختلف موضوعات اور مسائل پر بہت سے ایسے مضامین شائع ہوئے ہیں جن کی آج بھی ویسی ہی ضرورت ہے اور ان میں وہی افادیت ہے جو اُس وقت تھی جب وہ لکھے گئے تھے، مگر اب وہ پرانے فائلوں میں مدفون ہو کر بالکل نسیاً منسیا ہو چکے ہیں اور الفرقان کے موجودہ ناظرین میں شاذ و نادر ہی وہ حضرات ہوں گے جن کی نظر سے وہ گزرے ہوں —— اُس وقت یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ایسے تمام مضامین کا انتخاب کر کے ایک خاص نمبر کی شکل میں اُن کو پھر شائع کر دیا جائے —— لیکن جب اس نقطۂ نظر سے گزشتہ چالیس سالہ فائلوں کو دیکھا گیا تو اندازہ ہوا کہ یہ سب مضامین ایک نمبر میں نہیں سما سکتے بلکہ متعدد نمبر شائع کرنے ہوں گے۔ چنانچہ یہی طے کر لیا گیا —— اس فیصلہ کے مطابق "پہلا انتخاب نمبر" اب سے دو سال پہلے سنہ ۱۹۷۴ء کے اسی موسم میں اور "دوسرا انتخاب نمبر" گزشتہ سال

۱۹۷۵ء کے انہی دنوں میں شائع ہوا تھا۔[لہ] اب اللہ کی توفیق سے یہ تیسرا انتخاب نمبر "نذرِ ناظرین کیا جا رہا ہے — اللہ تعالیٰ اس کو اپنے بندوں کی فکری وعملی اصلاح کا ذریعہ اور ہمارے لئے مغفرت و رحمت کا وسیلہ بنائے۔

اس تیسرے انتخاب نمبر میں اب سے ۱۵، ۱۶ سال پہلے تک کے (۱۳۸۰ھ م ۱۹۶۰ء تک کے) الفرقان میں شائع شدہ وہ مضامین لے لئے گئے ہیں جن کا اس انتخابی سلسلہ میں شائع کرنا مفید سمجھا گیا — اب یہ سلسلہ اس تیسرے انتخاب نمبر پر ختم کردیا گیا ہے۔

اس سلسلۂ انتخاب میں وہ تعزیتی مضامین بالکل نہیں لئے گئے ہیں جو اکابرِ دین وملت یا اپنے اقارب و اعزہ کی وفات پر ادارہ کی طرف سے الفرقان میں وقتاً فوقتاً لکھے گئے تھے۔ ناظرین کرام میں سے بعض مخلصین نے مشورہ دیا ہے کہ وہ تمام مضامین بھی اسی طرح ایک مستقل نمبر میں شائع کردیے جائیں — ابھی اس سلسلہ میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکا ہے۔ دنیات کے سلسلے کے مضامین کو دیکھنے کے بعد اگر مناسب اور مفید سمجھا گیا تو انشاء اللہ آئندہ سال اسی موسم میں چوتھا انتخاب نمبر شائع ہوگا جو صرف اُن مضامین پر مشتمل ہوگا جو دنیات کے سلسلے میں الفرقان میں کبھی لکھے گئے ہیں — واللہُ الموفق

الفرقان کا حال

الفرقان کی یہ بڑی خوش نصیبی ہے کہ اس کے ناظرین عموماً وہ لوگ ہیں جو اس کے صرف "خریدار" نہیں ہیں بلکہ اس کو دینی خدمت کا ایک سلسلہ سمجھ کر اس سے محبت وہمدردی رکھتے ہیں اور ان کی خریداری در اصل للّٰہی تعاون ہی کی ایک شکل ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے اور اپنے خاص فضل سے نوازے۔

اب سے چند مہینے پہلے (جنوری ۱۹۷۶ء سے) الفرقان کا بدل اشتراک (سالانہ چندہ) بارہ روپے کے بجائے پندرہ روپے کردیا گیا تھا۔ الحمدللہ اس کے تمام ناظرین اور معاونین نے اس کو بخوشی قبول فرمالیا۔ اس اضافہ سے اس کی گنجائش ہوگئی کہ الفرقان میں رف اخباری کاغذ کے بجائے سفید چکنا کاغذ استعمال ہونے لگا۔

لہ پہلے اور دوسرے انتخاب نمبر کی کچھ کاپیاں دفتر الفرقان میں اب بھی موجود ہیں۔ شائقین طلب فرما سکتے ہیں قیمت، پانچ روپے (فی شمارہ)

اور اسکی ترتیب و تیاری کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے لئے ایک باصلاحیت عزیز کا وقت بھی حاصل کر لیا گیا، اور اس کی وجہ سے الحمد للہ بہت سہولت ہو گئی۔

پچھلے سال مولینا عتیق الرحمان سنبھلی کے قیام انگلستان کے زمانہ میں وہاں کے بعض مخلصین کی جدوجہد سے بہت سے حضرات نے الفرقان جاری کرایا تھا، اس وقت ان حضرات سے سالانہ چندہ بحری ڈاک کیلئے ایک پونڈ اور ہوائی ڈاک کیلئے ڈھائی پونڈ کے حساب سے وصول ہوا تھا، لیکن چند ہی مہینے کے بعد ہماری حکومت نے خاصکر بیرونی ڈاک کے محصول میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ـــــ اب الفرقان کے ایک عام شمارہ پر بحری ڈاک کیلئے تیس کے بجائے اسی پیسے کا ٹکٹ لگانا ہوتا ہے اور ہوائی ڈاک کے لئے انگلستان کے واسطے ۲/۲۰ کے ٹکٹ لگائے جاتے ہیں ـــــ اور دوسری طرف پونڈ کی قیمت اب بہت کم ہو گئی ہے، اس صورتِ حال کی وجہ سے بیرونی ممالک کے سالانہ بدل اشتراک میں اضافہ ناگزیر ہو گیا ہے لہٰذا اب الفرقان کے بیرونی معاونین کو بحری ڈاک سے الفرقان طلب کرنے کے لئے دو پونڈ اور ہوائی ڈاک سے منگانے کے لئے چار پونڈ سالانہ ادا کرنے ہوں گے۔

محصول ڈاک میں جس غیر معمولی اضافہ کا ذکر سطور بالا میں کیا گیا ہے، اس سے الفرقان کے پاکستانی معاون بھی اس طور پر متاثر ہوں گے کہ اس اضافہ کی وجہ سے پاکستان کے لئے الفرقان کے سالانہ زرِ تعاون کی شرح بیس کے بجائے اب پچیس روپے سالانہ ہو گئی ہے ـــــ اُمید ہے کہ پاکستانی احباب و مخلصین اب الفرقان سے اپنے تعلق کی تجدید کے لئے **سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ، لاہور** کو اپنا زرِ تعاون اسی نئی شرح کے حساب سے روانہ فرمائیں گے۔ (ادارہ)

خریداروں سے ضروری گذارش

الفرقان کے اکثر خریدار حضرات دفتر سے رابطہ قائم کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ دینا بھول جاتے ہیں جس سے تعمیل میں بیحد دشواری اور تاخیر ہوتی ہے براہ کرم خطوط اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری (جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے) ضرور لکھئے تاکہ طرفین زحمت سے محفوظ رہیں۔

* جواب طلب امور کیلئے جوابی کارڈ یا ۵۰ پیسے کے ڈاک ٹکٹ ضرور ارسال کیجئے، بصورت دیگر جواب نہ ملنے کی شکایت کا حق نہ ہوگا۔

(منیجر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

ہماری اِس دُنیا کے بہت سے ملکوں کا حال یہ ہے کہ اُن کی آبادی بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے جس کی وجہ سے اُن کے اربابِ حکومت ہراساں اور فکرمند ہیں کہ اگر آبادی میں اضافہ کی رفتار یہی رہی تو مستقبل میں سخت مشکلات پیش آئیں گی اور پوری آبادی کیلئے زندگی کی ضروریات پوری نہ ہوسکیں گی۔ اس لئے قریب قریب اُن سب ملکوں میں سرکاری سطح پر یہ کوشش کسی نہ کسی درجہ میں ہو رہی ہے کہ آبادی کے اضافہ پر کنٹرول کیا جائے اور ایسی تدبیریں عمل میں لائی جائیں جن کے نتیجہ میں آبادی میں اضافہ بے حساب اور غیر متوازن نہ ہو —— فیملی پلاننگ (خاندانی منصوبہ بندی) اِسی کوشش کا عنوان ہے —— ہندوستان و پاکستان بھی انہی ملکوں میں سے ہیں اور خاصی طویل مُدت سے اِن دونوں ملکوں میں یہ کوشش جاری ہے اور اس مد پر ان کا کروڑوں روپیہ خرچ ہوتا رہا ہے، لیکن ابتک ان کوششوں کا انداز صرف ترغیبی رہا ہے۔

ہمارے مُلک میں ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد سے جب بہت سے سرکاری کاموں میں تیز رفتاری آئی تو خاندانی منصوبہ بندی کے اِس کام کو بھی تیزی سے چلانے اور مقررہ نشانے تک جلدی پہونچ جانے کی کوشش شروع ہوئی۔ اور اِس کیلئے خاص طور پر "نس بندی" کے طریقہ پر زور دیا جانے لگا، جو ایک طرح کا آپریشن ہے۔

اگرچہ مرکزی حکومت کی طرف سے اس سلسلہ میں —— جہاں تک ہمیں معلوم ہے —— جبر و زبردستی کا رجحان ظاہر نہیں کیا گیا، لیکن بعض ریاستی حکومتوں یا اُن کے وزراءِ اعلیٰ کی طرف سے دو یا تین بچّوں کے بعد جبریہ نس بندی اور اس کے قانونی لزوم اور خلاف ورزی کی صُورت میں قید اور بھاری جُرمانے تک کے اعلانات

اور بیانات اخباروں میں آئے اور ملک کے مختلف حصوں میں ایسے واقعات بھی اس سلسلہ میں ہوئے یا اُن کی شہرت ہوئی جس کی وجہ سے بہت سے مقامات کے عوام میں ایک عجیب طرح کی دہشت اور سراسیمگی اور حکومت کے خلاف سخت ناراضی اور بیزاری کی فضا پیدا ہو گئی، اور ہم جیسوں نے محسوس کیا کہ ایمرجنسی کے اقدام سے اشیائے ضرورت کی قیمتوں میں کمی اور عوام کے لئے دوسری بہت سی سہولتیں پیدا ہونے کی وجہ سے حکومت اور حکومتی پارٹی کانگریس پر اُن کے اعتماد میں جو اضافہ ہو گیا تھا، جبریہ نس بندی سے متعلق بعض ریاستوں کے اعلانات اور اس سلسلہ کے واقعات کی شہرت نے اس کو بہت نقصان پہونچایا

ہم کو حیرت تھی کہ اس کُھلی ہوئی حقیقت کو کیوں نہیں محسوس کیا جا رہا ہے کہ نس بندی کو قانون کے ذریعہ لازم قرار دینا اور پولیس وغیرہ کے ذریعہ اس پر جبری عمل درآمد کا اقدام غیر تعلیم یافتہ یا کم تعلیم یافتہ عوام، کسانوں، مزدوروں اور دیہات کے باشندوں کو ـــــ جن کی تعداد ملک میں یقیناً بہت زیادہ ہے ـــــ حکومت اور کانگریس سے کس قدر دُور کر دے گا، اور مخالف عناصر کے ہاتھ میں کیسا کارگر ہتھیار دے دے گا اور سیاسی لحاظ سے یہ سودا کسی وقت کتنا مہنگا پڑے گا!

خدا کا شکر ہے کہ اخباری روایت کے مطابق ۳۰ اپریل کو وزیر اعظم نے کنبہ بندی کی اہمیت اور ضرورت پر حکومتی نقطۂ نظر سے زور دینے کے ساتھ یہ وضاحت بھی فرما دی کہ **"اس سلسلہ میں جبر خارج از ممکنات ہے"۔** ـــــ (قومی آواز لکھنؤ یکم مئی ۱۹۷۶ء)

اُمید ہے کہ اس کے بعد ملک کی کسی ریاست میں بھی یہ غلطی نہیں کی جائے گی اور اگر کی گئی تو یقیناً کانگریس کو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچے گا ـــــ یہ کوئی باریک سیاسی نکتہ اور مشکل سے سمجھ میں آنے والا منطقی نازک مسئلہ نہیں ہے بلکہ عوام کی حالت اور اُن کے احساسات سے واقفیت رکھنے والوں کیلئے آنکھوں سے نظر آنے والی حقیقت ہے۔

اسی مسئلہ (خاندانی منصوبہ بندی اور اُس کیلئے نس بندی) سے متعلق صوبۂ یوپی کے سابق وزیر اعلیٰ آنجہانی سمپورنانند جی کے چھوٹے بھائی مسٹر بری پورنانند ورما کا ایک مکتوب لکھنؤ کے انگریزی روزنامہ "پانیر" کے شروع مئی کے ایک شمارہ میں شائع ہوا ہے، جس میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو اس مسئلہ سے متعلق بعض اہم نکتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ موصوف نے اس میں منجملہ دوسری باتوں کے

یہ بھی لکھا ہے ــــــــ

"میری گذارش یہ ہے کہ ہماری حکومت ویسک ٹومی (نس بندی) کے عمل پر آخر اتنا زور کیوں دے رہی ہے! کیا ہمارے علم میں یہ تازہ ترین سائنٹیفک حقیقت نہیں آچکی ہے کہ یہ آپریشن دماغ کو کند کر دیتا ہے، پیوٹری گلینڈز کو متاثر کرتا ہے اور اس کے اثرات مابعد بہت ضرر رساں ہوتے ہیں۔ یوروپ میں اور دنیا کے دوسرے متعدد ملکوں میں یہ عمل صرف زیادہ عمر والوں کے لئے مخصوص رہتا ہے جو اپنی مردانہ قوت کو بہتر بنانا چاہتے ہیں۔ اس قسم کا آپریشن اگرچہ قوتِ مردانگی کو کچھ عرصہ کیلئے بڑھا دیتا ہے لیکن آگے چل کر اس کے اثرات اتنے ضرر رساں ہوتے ہیں کہ اب ہندوستان کے سوا ہر ترقی یافتہ ملک نے اس کے استعمال کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ، کناڈا، فرانس اور سوویت روس میں ویسک ٹومی کو ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔"

مسٹر پری پورنا نند ورما کا یہ انتباہ یا مشورہ ملک اور عوام کے خیر خواہوں کیلئے ہرگز نظر انداز کر دینے کے لائق نہیں ہے۔

فیملی پلاننگ اور بالخصوص اُس کی شکل نس بندی کے آپریشن سے متعلق خاص کر مسلمانوں کے سامنے جو اسلامی شریعت کی پیروی اور پابندی کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتے ہیں، یہ سوال بھی آتا ہے کہ ہماری شریعت میں یہ جائز بھی ہے یا نہیں۔؟

جہاں تک ہمیں معلوم ہے اسلامی شریعت کے ماہرین اور مستند اصحابِ فتویٰ کی عام رائے اس بارے میں یہ ہے کہ کسی شخص کیلئے اپنے خاص حالات اور اپنی جائز مصلحت کی بنا پر یہ تو جائز ہے کہ اولاد کی تعداد کو محدود رکھنے کے لئے وہ عزل یا کسی اور جائز مانع حمل تدبیر یا دوا کا استعمال کرے مگر اس مقصد کیلئے نس بندی جیسے عمل جراحی کے ذریعہ تولیدی صلاحیت ہی سے اپنے آپ کو محروم کر لینا (جو اُس کے خالق و پروردگار کا ایک خاص عطیہ ہے اور جس سے بہت سے مقاصد وابستہ ہیں) جائز نہیں ــــ بہرحال نس بندی کو لازمی قرار دینے کا مسئلہ اس لحاظ سے بھی قابلِ غور ہے۔

آخر میں ہم ان تمام حکومتوں کے ذمہ داروں سے جو آبادی کے اضافہ سے ہراساں اور فکرمند ہیں اور اس کی وجہ سے خاندانی منصوبہ بندی کو ناگزیر سمجھتے ہیں ـــــــ اگر ہماری کمزور آواز کسی طرح ان تک پہونچ سکے ـــــــ یہ بھی عرض کریں گے کہ وہ انسان کی اجتہادی و ایجادی صلاحیت اور کارکردگی اور زمین کی مزید پیداواری صلاحیت سے کیوں مایوس ہیں؟ انھوں نے کیوں اور کس دلیل سے سمجھ لیا ہے، کہ انسان زمین سے پیداوار حاصل کرنے کے لئے آج جو طریقے اور ذرائع استعمال کر رہا ہے آئندہ اس میں اب کوئی ترقی نہ ہوگی! اور زمین سے جو پیداوار آج حاصل کی جا رہی ہے اُس سے زیادہ حاصل ہی نہ کی جا سکے گی؟ حالانکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ صرف گزشتہ دس پندرہ برسوں میں خود ہمارے ملک میں پیداوار بڑھانے کی صلاحیت میں اور پہلے سے زیادہ پیداوار زمین سے حاصل کرنے میں کتنی ترقی ہوئی ہے اور برابر ہو رہی ہے۔ جن کھیتوں میں زیادہ سے زیادہ ۴-۵ من فی بیگھہ گیہوں پیدا ہوتا تھا، اب ان میں ۱۵ من تک پیدا ہو رہا ہے۔ جن کھیتوں سے سال میں صرف ایک فصل لی جاتی تھی، اب اُن سے تین تین فصلیں لی جا رہی ہیں، اور اس سے زیادہ کے امکانات سامنے ہیں۔ اور زمین کے علاوہ سمندر میں بھری ہوئی بے حد و بے حساب خوراک کو اپنی گرفت میں لینے اور قابلِ استعمال بنانے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ پہلے کپڑا صرف کپاس یا اُون یا ریشم سے تیار ہوتا تھا، اب طرح طرح کے مصنوعی ریشوں سے خود اپنے ملک میں کپڑے تیار ہو رہے ہیں اور ہمارے بازار اُن سے پٹے پڑے ہیں۔ زمین کی پیداوار جدید ترین طریقوں سے دس بیس گُنے تک بڑھ جانے کے امکانات نظر آ رہے ہیں اور ترقی یافتہ ملکوں نے اُن امکانات کو بڑی حد تک تجربہ بنا دیا ہے۔ ان حالات میں آبادی کے بڑھنے سے فکر اور گھبراہٹ کا کیا جواز ہے۔؟

کافی عرصہ ہوا ملک کی عظیم شخصیت ونوبا بھاوے جی نے اسی مسئلہ کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ "آدمی کا جو بچہ پیدا ہوتا ہے وہ کھانے کے لئے اگر ایک منہ لیکر آتا ہے تو کام کرنے کے لئے دو ہاتھ بھی لاتا ہے"۔ میں اس پر یہ اضافہ کروں گا کہ وہ ضرورت کے مطابق نئی نئی باتیں سوچنے اور نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے کی صلاحیت والا دماغ بھی لے کر آتا ہے جس کا ظہور آج ہمیشہ سے زیادہ وسیع پیمانہ پر ہو رہا ہے۔

بہر حال یہ بات سوچنے کی ہے کہ اس وقت دُنیا میں جو ترقیاں ہو رہی ہیں اُن کو دیکھتے ہوئے انسان کی صلاحیت اور اس کے پیدا کرنے والے کی دین سے مایوس ہونے کا کیا جواز ہے۔؟

راقم سطور نے فیملی پلاننگ اور برتھ کنٹرول ہی کے متعلق ایک محقق کے مضمون میں پڑھا تھا، کہ

"روسی سائنس دانوں کی ایک ٹیم نے اندازہ لگایا ہے کہ دنیا کی زیر کاشت آسکنے والی زمین سے اتنی غذا پیدا کی جاسکتی ہے جو ساڑھے نو کھرب انسانوں کی ضروریات کے لئے کافی ہو۔"

اور اس وقت عملاً صورت یہ ہے کہ زمین پر انسانوں کی تعداد جدید ترین اندازے کے مطابق صرف ساڑھے تین ارب یا اس سے کچھ زائد ہے۔

مبارک اور خوش کن:

۱۵ مئی کے روزناموں میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بعض ٹوٹے ہوئے رشتوں کو پھر سے قائم کرنے کے لئے پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں دونوں ملکوں کے نمائندوں کی جو کانفرنس ہو رہی تھی وہ کامیابی پر ختم ہوگئی اور باہم سفارتی تعلقات قائم کرنے اور واگھا۔ اٹاری سرحد پر ریل کا راستہ کھولنے نیز ایک دوسرے کے علاقہ پر سے پرواز اور فضائی رابطے پھر سے قائم کرنے کا فیصلہ ہو گیا ——— دونوں ملکوں کے عوام کے لئے خاص کر مسلمانوں کیلئے یقیناً یہ فیصلہ خوش کن ہے۔

کاش دونوں ملکوں کے ذمہ داروں کو اس طرف بھی توجہ کرنے کی توفیق ملے کہ ادھر جب سے دونوں ملکوں کے درمیان ڈاک کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا ہے محصول ڈاک کی شرح میں اتنا غیر معمولی اضافہ کر دیا گیا ہے، جس کا انسانی نقطہ نظر سے کوئی جواز نہیں۔ تقسیم کے بعد مدتِ دراز تک دونوں ملکوں کے درمیان محصول ڈاک کی شرح وہی تھی، جو اندرون ملک کے لئے تھی اور دونوں ملکوں کے درمیان باہمی رشتوں کی جو نوعیت ہے اس کا تقاضا یہی ہے ———
لیکن اب صورت حال یہ ہے کہ پاکستان بھیجے جانے والے سادہ کارڈ پر ایک روپیہ پانچ پیسے کا ٹکٹ لگتا ہے اور لفافہ پر دو روپے کا۔ الفرقان کے جس عام شمارہ پر اندرون ملک کے لئے صرف دو پیسے کا ٹکٹ لگتا ہے اس پر پاکستان کے لئے اسّی پیسے کا ٹکٹ لگانا ہوتا ہے ——— قریباً یہی شرح پاکستان میں ہے ——— دونوں ملکوں کی خاص نوعیت، مخصوص تاریخ اور ان کے کروڑوں عوام کے باہمی رشتوں اور تعلقات کے لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ محصول ڈاک کی شرح میں یہ بے حساب زیادتی بڑی بے دردانہ ہے۔ کاش دونوں ملکوں کے ذمہ دار حضرات خالص انسانی نقطہ نظر سے اس مسئلہ پر بھی غور کریں، اور عوام کے نمائندے اس طرف توجہ دلائیں۔

ترانۂ نعت

(از جناب عمر انصاری صاحب)

تیری خاطر میرے شاہ دیدہ و دل فرشِ راہ
آ کہ تا حدِ نگاہ منتظر ہیں مہر و ماہ
اشہد ان لا الٰہ اشہد ان لا الٰہ

نازشِ کون و مکاں تاجدارِ انس و جاں
عرش تیرا آستاں خُلد تیری جلوہ گاہ
اشہد ان لا الٰہ اشہد ان لا الٰہ

شافعِ روزِ جزا تاجدارِ انبیاء
مجتبےٰ و مصطفےٰ اے رسولوں کے شاہ
اشہد ان لا الٰہ اشہد ان لا الٰہ

کیوں نہ ہوں قربان ہم تجھ پہ اے شاہِ اُمم
دشمنوں پر بھی کرم دوستوں پر بھی نگاہ
اشہد ان لا الٰہ اشہد ان لا الٰہ

روبرو تیرے شہا مہر کیا ہے، ماہ کیا
یہ بھی تیرا نقشِ پا وہ بھی تیری گردِ راہ
اشہد ان لا الٰہ اشہد ان لا الٰہ

تیرا قرآں بے مثال تیرا ایماں لازوال
تیری ذاتِ باکمال شانِ وحدت کی گواہ
اشہد ان لا الٰہ اشہد ان لا الٰہ

اُف رے وہ عالم ترا منبعِ جود و عطا
پھولوں سے دامن بھرا پھر بھی کانٹوں سے نباہ
اشہد ان لا الٰہ اشہد ان لا الٰہ

دل ہو بیتاب و حزیں سبز گنبد کے مکیں
تیری فرقت میں کہیں آنہ جائے لب تک آہ
اشہد ان لا الٰہ اشہد ان لا الٰہ

پھر ترے در پر عمرؔ آ گیا ہے لوٹ کر
اے جمالِ منتظر پھر ادھر کوئی نگاہ
اشہد ان لا الٰہ اشہد ان لا الٰہ

(الفرقان ربیع الاول [illegible])

قرآن کا تذکیری مطالعہ

وصیتِ ابراہیمیؑ

عتیق الرحمٰن سنبھلی

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ۚ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ۭ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝

(سورۂ بقرہ رکوع ۱۶)

(ترجمہ) اور کون روگردانی کرے گا طریقِ ابراہیمی سے بجز اس شخص کے جو بیوقوف بنالے اپنے آپ کو۔ ہم نے تو اپنا خاص بنایا تھا اس کو دنیا میں، اور لاریب کہ وہ آخرت میں بھی صالحین میں سے ہے!

جب کہا اس سے اس کے رب نے کہ حکم برداری کر! تو بولا کہ میں حکم بردار ہوں پروردگار عالم کا! اور پھر اسی کی وصیت کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے بھی کہ بیٹو! اللہ نے چن کر دیا ہے تم کو دینِ اسلام بس نہ موت آئے تم کو مگر مسلمانی پر!!

یہی ملتِ ابراہیمی ہے جس کی ہدایت ہمیں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ملی اور آپ کی رہنمائی اپنے جدِ امجد کی اس میراث کی طرف خود پروردگارِ عالم نے فرمائی اور دو ٹوک الفاظ میں اس حقیقت کے اظہار کا حکم آپ کو دیا کہ

اِنَّنِىْ هَدٰىنِىْ رَبِّىْٓ اِلٰى صِرَاطٍ — مجھ کو دکھایا ہے میرے رب نے ایک سیدھا

مُسْتَقِيْمٍ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ○ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ○

(الانعام غ ۲۰)

راستہ، کہ وہ ایک دین ہے مستحکم، جو ملت ہے ابراہیم کی جس میں ذرا بھی کجی نہیں۔ اور وہ نہیں تھے شرک کرنے والوں میں سے۔ (آپ فرما دیجیے) کہ میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا سب خالص اللہ ہی کا ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور اسی کا مجھ کو حکم ہوا ہے اور میں سب سے اول ماننے والا ہوں۔

اس اظہار و اعلان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام جس حکم برداری کا اصطلاحی عنوان ہے اُس کی وسعتوں میں کس طرح انسانی زندگی کا ایک ایک نفس سمایا ہوا ہے۔ کہ پوری زندگی حکم برداری ہی کے خطوط پر گردش کرتے ہوئے موت سے ہم آغوش ہونی چاہیے اور نماز، روزہ و حج ہی کو نہیں، زندگی کے ہر ہر لمحے، حتیٰ کہ موت کو بھی "لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" کی شانِ حنیفی کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔

الغرض ہم مسلمانوں نے جس دین کو اپنے لیے پسند کیا ہے۔ یا مسلمان کہلانے کی بنا پر جس دین سے وابستگی ہمارے ذمہ لازم آتی ہے، قرآن بتاتا ہے کہ وہ اصلاً طریقِ ابراہیمی (یا ملت ابراہیمی) ہے۔ جس سے اعراض اور بے رخی سفاہت اور خود فریبی کے سوا کچھ نہیں، اور بالفاظ دگر جس کی پیروی حقیقت پسندی و دانشمندی کا سب سے واضح معیار! ـــ اس لیے کہ اس کی پیروی میں ایک طرف دنیاوی زندگی میں پروردگار عالم کی اصطفائیت (پسندیدگی) مضمر ہے، دوسری طرف یہ پیروی حیات اخروی میں نجات و فلاح کی ضمانت دیتی ہے ـــ اور اللہ کی دی ہوئی عقل سے کام لینے والا کوئی انسان، جو اس حقیقت کا یقین رکھتا ہو کہ اس تمام کائنات کی خالق اور فرماں روا وہی ایک ذات ہے جس کو اللہ کہا جاتا ہے وہ، دنیا اور آخرت کی اس خوش نصیبی کو کسی قیمت پر بھی نہیں چھوڑ سکتا۔

طریقِ ابراہیمی کی کچھ جوہری تفصیل تو ہمیں سورۂ انعام کی مذکورۂ بالا آیت سے معلوم ہوتی ہے۔ لیکن سورۂ بقرہ کی وہ آیتیں جو سرِ عنوان ہیں اُن سے ایک اور اُسوۂ ابراہیمی بھی سامنے آتا ہے۔ اور وہ ہے اولاد کو دینِ حق پر قائم رکھنے کی فکر۔ جس کا بیان ان الفاظ میں ہوا ہے۔

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝

اور وصیت کی اسی (ملّت) کی ابراہیم نے اپنی اولاد کو اور یعقوب نے بھی کہ اے میرے بیٹو! اللہ نے چن دیا ہے تمھارے لیے دین اسلام۔ بس نہ موت آئے تم کو مگر حالت مسلمانی و حکم برداری پر

اس اُسوۂ ابراہیمی کو سامنے رکھ کر جائزہ لیجیے کہ آپ کا طریقہ اپنی اولاد کے بارے میں کیا ہے؟ آپ اُس دینِ حق پر اپنی اولاد کو کاربند بنانے کی ترغیب دیتے ہیں جس کو اللہ نے اپنی خاص رحمت سے آپ کی اولاد کا پیدائشی (یا مادری) دین بنایا ہے؟ آپ انسانی کوشش کی حد تک اس کا بندوبست کرتے ہیں کہ "نہ مرے وہ مگر حالت مسلمانی و حکم برداری پر"یا آپ کی کوششیں (از اول تا آخر اس کی دنیا بنانے پر مرکوز ہوتی ہیں اور دین کا سوال آپ سراسر بخت و اتفاق کے حوالے کرکے چھوڑ دیتے ہیں؟——
اور ذرا دیکھیے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ آپ اولاد کو اُس کی دنیا کی خاطر کسی ایسے ماحول میں بھی جھونک دینے سے دریغ نہ کرتے ہوں جہاں قسمت ہی ہے کہ اس کا دین سلامت رہ جائے، اور نصیب ہی ہے کہ اس کی پیدائشی مسلمانی کچھ سخت جانی دکھا جائے؟

اگر خدانخواستہ آپ کا معاملہ یہی ہے تو غور کیجیے کہ یہ بھی وہی "سفاہتِ نفس" ہے یا نہیں جس کا ذکر قرآن کے حوالہ سے اوپر آیا ہے؟— اس سے بڑھ کر سفاہتِ نفس اور خود فریبی دوسری کیا ہو سکتی ہے کہ ایک انسان اولاد کی دنیا کی خاطر خود اپنی اور اولاد کی آخرت کو خطرہ میں ڈالے!— اگر ایمان ہے کہ ابراہیم کا طریقہ ہی عقلِ خداداد کا تقاضا ہے اور اس سے انحراف سراسر سفاہت و عقل فروشی، تو ابراہیم نے اولاد کے باب میں یہ طریق ہدایت بنا کیا ہے۔

رَبَّنَآ اِنِّىْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِىْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِىْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ - (ابراہیم ع ۶)

پروردگارا! میں نے آباد کر دیا ہے اپنی اولاد کو تیرے محترم گھر کے قریب بن کھیت وادی میں۔ پروردگار! اس لیے کہ وہ نماز قائم کریں۔

آج سچ مچ کی بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کو لے جا کر ڈال دینے کا کسی سے مطالبہ نہیں لیکن دینی تعلیم و تربیت کی وادی جو فی زمانہ مادی اعتبار سے غیر نفع بخش ہونے کی بنا پر بھی "وادیٔ غیر ذی زرع" ہی نظر آتی ہے، اگر اولاد کو کی حقیقہ دین پر قائم رکھنے کی مخلصانہ خواہش ہو تو ایک حد تک اس وادی

میں داخل کیے بغیر چارہ نہیں اور ابراہیمؑ کے اسوۂ "وصیت" کی پیروی کا حق درحقیقت اس کے بغیر ادا نہیں ہو سکتا۔

اور یہ وادی بے آب و گیاہ ہونے کے باوجود وہ وادی ہے کہ اس کے مخلص مکینوں کی طرف ساکنانِ عالم کے دل کھنچتے اور سرسبز وادیوں کے رُخ مڑتے ہیں، اولاد ابراہیمؑ کے ساتھ یہی ہوا اور آج تک اس کا حیران کن اور ایمان آفریں منظر ہمارے سامنے ہے۔ ابراہیمؑ کی راہ پر گامزن ہو کر کوئی ضائع نہیں ہوتا۔ "فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِىْ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ" کے وہ دعائیہ الفاظ جو اولاد کو وادیٔ غیر ذی زرع میں ڈالتے وقت ابراہیم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی زبان سے نکلے تھے۔ ان کلماتِ دعا نے قیامت تک کے پیروانِ ابراہیمؑ کو اپنی حفاظت میں لے لیا ہے — اور — ایمان رکھیے کہ یہ راہِ ابراہیم پر چلنے والوں کے لیے خدا کی تقدیر بن گئے ہیں!!

اور صرف یہی نہیں کہ اس طریق ابراہیمی کی اقتداء میں ایک وادیٔ "غیر ذی زرع" میں بسائی جانے والی اولاد کو زندگی کی ضمانت حاصل ہے بلکہ اس وادی سے پوری دنیا کی روحانی زندگی کا چشمہ پھوٹتا ہے۔ ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو روحانی زندگی کے بقا کی خاطر ایک وادیٔ بے آب و گیاہ میں بسایا تو دنیا کی روحانی مُردنی کے وقت میں اسی بے آب و گیاہ وادی نے ایک مسیحا پیدا کیا۔ آج دنیا پھر ایک بار روحانی موت کے دروازہ پر پہونچا چاہتی ہے اس کی حیاتِ تازہ کا سامان وہی لوگ کریں گے جو اس مسیحا کے دین کی بے آب و گیاہ وادی کو آباد کریں گے۔

پس کون ہے جو اس عزت سے سرفراز ہونا چاہے۔

اور کون ہے جو طریق ابراہیمی میں رغبت کا ثبوت دینا چاہے۔

وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابُ — اور وہی لوگ ہیں درحقیقت جن کے پاس عقل ہے اور سرمایۂ دانش ہے۔

(الفرقان بابت محرم ۱۳۸۰ھ)

عتیق الرحمٰن سنبھلی

سورۂ ابراہیم کا ایک تاثر

عالم انسانیت کی بہاریں، مادّی ہوں یا روحانی، نظر بظاہر، صدقہ ہوتی ہیں اولوالعزم افراد کی قربانیوں کا۔ یہ قربانیاں آرام و راحت کی بھی ہوتی ہیں، مال و دولت کی بھی، جسم اور جان کی بھی، اور جذبات و خواہشات کی بھی۔ انسانی نفوس اگر ان قربانیوں کا حوصلہ نہ کریں تو انسانیت کا یہ چمن یکسر بہار نا آشنا ہو کر رہ جائے، نہ علم و فکر کو ترقی نصیب ہو۔ نہ تمدن کوئی نیا رنگ پائے۔ نہ تہذیب کے رخ پر نکھار آئے۔ نہ روح ارتقاء کا کوئی نیا میدان پائے اور نہ مادہ کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو ظہور کا موقع میسّر آئے، یہ سب کچھ اگر ہوتا ہے اور عالم انسانیت کو نت نئی بہاروں سے ہم کنار ہونے کا موقع ملتا ہے تو ظاہراً صرف اس لیے کہ کچھ لوگ ہوتے ہیں، جو مال و دولت کی، جسم اور جان کی یا جذبات و خواہشات کی قربانی پیش کرتے ہیں اور یہ قربانیاں بہاروں کو کھینچ بلاتی ہیں۔

ایسی ہی ایک قربانی تھی جو سیکڑوں برس قبل مسیح مشرقِ وسطیٰ کے ایک سہ نفری خاندان نے دی تھی —— یہ خاندان تھا، باپ بیٹا اور ماں —— اس خاندان کی قربانی نے، انسانیت کو اس عالمگیر اور جانفزا بہار کا تحفہ دیا۔ جو خزاں کے ہزار حملوں کے باوجود آج تک کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے اور انسانیت کو طلب ہے، طلب نہیں تو احتیاج ہے، کہ ایک بار پھر اس کی تجدید ہو۔

اس قربانی کا ذکر قرآن مجید میں اس انداز سے آیا ہے:۔

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ   اے پروردگار! میں نے بسایا ہے اپنی اولاد

بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ۔ (سورۂ ابراہیم ع ۶)	کا کچھ حصہ ایک بے آب و گیاہ وادی میں تیرے مقدس گھر کے پاس۔ پروردگار یہ اس لیے کہ یہ قائم کریں نماز۔

یہ کہنے والے ابراہیمؑ تھے۔ یہ واقعہ کی تفصیل کسی حد تک لوگوں کو معلوم ہی ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) جب وطن اصلی عراق سے ہجرت فرما کر سرزمین شام میں سکونت پذیر ہو گئے، تو جناب باری سے حکم ہوا کہ اپنی ایک حرم حضرت ہاجرہ اور ان کے اکلوتے، شیر خوار بچے کو سیکڑوں میل دور اس وادیٔ غیر ذی زرع میں لے جا کر بسا دیں، جہاں آج اللہ کا پاک "گھر" خانہ کعبہ ہے، اس وقت نہ وہاں یہ "گھر" تھا نہ کوئی اور گھر۔ پہاڑوں سے گھرا ہوا ایک چٹیل میدان تھا۔ زیست کے ہر سامان سے محروم۔ اور ہلاکت کے سامانوں سے بھرپور۔ حضرت ابراہیم نے تعمیل حکم کی۔ اللہ کی قدرت نے اس خشک اور بے آب و گیاہ وادی میں زیست کے سامان پیدا کیے۔ حتیٰ کہ وہ شیر خوار بچہ (اسمٰعیل علیہ السلام) کام کاج کی عمر کو پہنچ گیا —— اب ابراہیم علیہ السلام کو ایک دوسرا حکم ملا۔ کہ جا کر اس وادی میں اللہ کا "گھر" بنائیں۔ اس کی طرف قرآن میں یوں اشارہ کیا گیا ہے:۔

وَاِذْ بَوَّأْنَا لِاِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا (الحج ع ۴)	اور جب ہم نے ٹھیک کر دی ابراہیم کے لیے "گھر" کی جگہ (اور حکم دیا کہ صرف میرے نام سے بناؤ) نہ شریک کرو میرے ساتھ کسی اور کا نام۔

باپ بیٹوں نے مل کر یہ "گھر" بنایا، قرآن نے اس تعمیری کام کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيلُ۔ (بقرہ ع ۱۵)	اور جب اٹھا رہے تھے ابراہیم اور اسمٰعیل اس گھر کی بنیادیں۔

"گھر" بن گیا اور حضرت اسمٰعیل اس کے جوار میں رہنے لگے۔ اللہ نے ان کی نسل کے لیے بھی انتظام فرما دیا تھا۔ ہو سکتا ہے ان سے نسل بھی شروع ہو چکی ہو جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے پروردگار کو خطاب کر کے یہ عرض کیا کہ "پروردگار میں نے اپنی یہ اولاد یہاں اس لیے بسائی ہے کہ ان کے دم سے نماز قائم ہو۔"

ظاہر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو خود سے یہاں لاکر نہیں بسایا تھا کہ اُن کے پیش نظر اپنا سوچا ہوا کوئی مقصد ہوتا۔ یقیناً یہ مقصد اللہ ہی کا متعین کردہ تھا۔ اور ابراہیم علیہ السلام کے قول کا مطلب یہ تھا کہ پروردگار تو نے جس مقصد (یعنی اقامت صلوٰۃ) کے لیے مجھے اس "نو آبادکاری" کا حکم دیا تھا میں نے اس کی تعمیل کر دی ہے۔

"لیقیموا الصلوٰۃ" کا کیا مطلب ہے؟ کیا صرف یہ کہ "یہ لوگ نماز پڑھیں" اور اللہ کی عبادت کریں؟ اس کے لیے اتنے پاپڑ بیلنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کام کیا سرزمین شام میں نہیں ہو سکتا تھا؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے باقی متعلقین کیا یہ کام نہیں کرتے تھے جو ان کی اسی شاخ کے لیے شام میں عبادت الٰہی کا میدان تنگ ہو گیا تھا؟ یقیناً "اقامت صلوٰۃ" کا صرف یہ مطلب نہیں تھا۔

پھر اس کا مطلب کیا تھا؟ اس عقدے کو بعد کے واقعات کھولتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ یہ دراصل دنیا میں ایک انقلاب کی داغ بیل تھی۔ پوری انسانی آبادی میں شرک اور جاہلیت کے جراثیم پھیل چکے تھے اور بندگی کا نظام جس کی صحیح تعلیم انسان کو ابتدائے آفرینش سے ملتی رہی تھی۔ ان جراثیم سے اس درجہ فاسد ہو گیا تھا کہ اس فساد کو دور کرنے کی کوئی کوشش کارگر نہیں ہو رہی تھی۔ انبیا آتے اور کرۂ پیش ایک محدود تعداد کی اصلاح کرتے کرتے ان کا وقت پورا ہو جاتا۔ ان جراثیم کا استیصال کرنے کے لیے ایک پوری نئی نسل کی ضرورت تھی۔ جس کی نیو اس فاسد ماحول سے باہر پڑے۔ اور جو تمام بُرے اثرات سے بچ کر بندگی کے صحیح نظام کے ماتحت پروان چڑھے۔ پھر اس کے مسکن کو اظہار عبدیت کا عالمی مرکز قرار دے کر گرد و پیش کی تمام انسانی آبادیوں کو اس مرکز سے وابستہ کیا جائے[1] اور مناسب وقت آنے پر اس نو آباد نسل کے ذریعہ اس مرکز سے

---

[1] چنانچہ ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا تھا:-

وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ۔ وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ ۔ (الحج ع ۴)

اور پاک رکھ میرا گھر طواف کرنے والوں قیام کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے۔ اور پکار دے لوگوں میں کہ وہ چلیں اس گھر کی طرف۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

عالمی ہدایت کا کام لیا جائے۔

چنانچہ مشیت الٰہی کے اس غیبی فیصلہ کی طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے دعا کے پیرایہ میں یوں ایک لطیف اشارہ بھی کرا دیا گیا تھا۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ	اے پروردگار ہمارے! اور اٹھا ان میں ایک
يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ	رسول انھیں میں کا۔ جو تلاوت کرے ان پر
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ	تیری آیات۔ اور سکھائے ان کو کتاب اور
إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ	پکی باتیں، اور سنوارے ان کا ظاہر و باطن
(بقرہ ۔ ع ۱۵)	بے شک تو ہی ہے اصل زبردست (اور) حکمت والا۔

یہ "ایک رسول کی بعثت" یہی اس انقلاب کا نقطۂ آغاز تھی۔ جس کی داغ بیل ایک وادی بے سبزہ و آب میں اولاد ابراہیم کو بسا کر اور "بیت محرم" بنا کر ڈالی گئی تھی۔ جب وقت آگیا اور دنیا ایک عالمی دعوت کے لیے تیار ہوگئی، تو مشیت کا یہ فیصلہ بھی جس کی طرف ابراہیمؑ کی زبان اشارہ کر گئی تھی، وجود کے سانچے میں ڈھل گیا، اور ٹھیک اسی "گھر" کے جوار سے وہ رسولِ خاتم الرسل مبعوث ہو کر دنیا کے سامنے آگیا جس کو اس انقلاب کا آغاز اور کارِ رسالت کا اتمام کرنا تھا۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ	وہی اللہ ہے جس نے اٹھایا امیوں میں سے
رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ	ایک رسول کہ تلاوت کرتا ہوا ان پر اس کی آیات
وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ	اور سنوارتا ہوا ان کو نیز تعلیم دیتا ہوا ان کو کتاب
وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ	اور حکمت کی۔ اگرچہ وہ اس سے پہلے ضلال مبین
لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ۔ (جمعہ ع ۱)	میں گرفتار تھے۔

اس رسول نے مبعوث ہو کر یہی کام شروع کیے جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔ اور جب

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور ساتھ اس آوازۂ حق کے اثر کی نوید بھی سنا دی گئی تھی۔

يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ	چلے آئیں گے تیری طرف پیادہ پا، اور سوار لیے
يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ (ایضاً)	ہر ہر دور دراز رستے سے۔

اس کے تزکیہ و تعلیم سے اس نسل کی ایک تعداد اس "ضلال" کے زنگ سے پاک صاف ہوگئی جو امتدادِ زمانہ نے اس پر لگا دیا تھا، تو اس "رسولِ اُمّی" کے وجود میں آئی ہوئی بہار کا دروازہ ساری دنیا پر کھل گیا۔

اِن فیض یافتگانِ رسول سے کہا گیا:۔

وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ۔ (الحج ع ۱۰)

اور حق ادا کرو اللہ کی راہ میں سعی و محنت کا اس نے منتخب کیا ہے تم کو۔ اور دین میں تمہارے لیے کوئی تنگی اور پریشانی کی بات بھی نہیں رکھی۔ یہ تمہارے باپ ابراہیم ہی کا تو طریقہ ہے۔ اُسی نے نام رکھا تمہارا "مسلمین" پہلے بھی اور اس کتاب میں بھی۔ (تم کو اللہ نے جس غرض سے منتخب کیا ہے وہ یہ ہے) کہ سکھائے تم کو رسول اور تم سکھاؤ باقی دنیا کو۔

اور انھوں نے اس فرمانِ عالی کی ایسی تعمیل اور منشاءِ الٰہی کی ایسی تکمیل کی کہ یا تو صرف اللہ کی بندگی کرنے والا اور بندگی کے ڈھنگ پر زندگی بسر کرنے والا مشکل سے کہیں چھپا چھپا ملتا تھا یا اب عالمِ انسانی کے ہر خطہ پر صدائے اشہد ان لا الٰہ الا اللہ گونج اٹھی۔ اور اس زور سے گونجی کہ وقت کی ساری صدائیں اس کے سامنے پست ہوگئیں۔ انھوں نے زندگی کو بندگی کے سانچہ میں ڈھالا، اور اس سانچہ کو عام کرنے کے لیے دنیا میں اس طرح پھیلے کہ

دشت تو دشت دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

انکی اس جد و جہد سے معمورۂ حیات شرک کی ظلمتوں سے نکلا، نظامِ بندگی کے ظاہری اور باطنی فساد سے جو زندگی کا پورا نظام بگڑا ہوا، اور اس درجہ بگڑا ہوا تھا کہ انسانیت کے لیے ننگ و عار ہو رہا تھا، ان کی کوششوں نے اُسے ایک نئے نظام سے بدلا جو انسان کے لیے قیامت تک باعثِ مجد و شرف ہے۔

دنیا کی یہ یادگار بہار، صدقہ تھی ایک خاندان کی قربانی کا! —— ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ

اور ہاجرہ کی قربانی کا! —— اس بہار کا شباب عرصہ ہوا ختم ہو چکا ہے، بلکہ اب تو اس کے آثار و نشان تک خزاں کی زد میں ہیں۔ خود وہ امت جسے اس قربانی نے پیدا کیا تھا، اقامت صلوٰۃ کی بلندی سے گر چکی ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ کا وصف توحید اور عبدیت کی جس روح سے وابستہ تھا، سرد ہو چکی ہے۔ اور اس سردی کے جو نتائج بڑے پیمانہ پر بعثتِ خاتم الرسل سے پہلے، خود اولادِ ابراہیم میں ابھر آئے تھے، چھوٹے پیمانہ پر کچھ ویسے ہی نتائج اس امت میں رونما ہو چکے ہیں۔ باہر کی دنیا میں پرانے شرک کا بازار بھی گرم ہے۔ اور اس سے زیادہ باعث فساد وہ نیا شرک و کفر ہے جو نو تراشیدہ "بتوں" کے باعث وجود میں آیا ہے، اور پوری دنیا کو، حتیٰ کہ کبھی کبھی "امت مسلمہ" کو بھی، اپنے حلقہ اثر میں لیتا جا رہا ہے، آخرت کا تو ذکر کیا، اس بے راہ روی کی وجہ سے دنیا ہی میں انسان کی بےچینی اور پریشانی کا جو حال ہے وہ سامنے ہے۔ نتائج کی اس خوفناکی نے اچھے اچھے خدا فراموشوں کو روحانی انقلاب کی باتیں کرنے پر مجبور کر دیا ہے —— مگر اس روحانی انقلاب کے لیے ویسی ہی قربانی درکار ہے جس کی طرح ابراہیم اور اُن کے خاندان نے ڈالی تھی۔ اور جس کی ذمہ داری اب ملت ابراہیمی کے نام لیواؤں پر عائد ہوتی ہے۔ اس قربانی کا راستہ یقیناً وادیٔ غیر ذی زرع، سے ہو کر گزرتا ہے اور اس ہری بھری، آرام و آسائش کے وسائل سے پٹی ہوئی دنیا میں رہتے ہوئے ان سب کو تج دینے کا تہیہ کر لینا ہوگا۔ مگر ابراہیمؑ کی وہ دعا بھی اس راہ کے ہر راہرو کے ساتھ موجود ہے، جو انھوں نے اپنی اولاد کو اس راہ میں ڈال کر کی تھی۔

فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِىْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ۔ (ابراہیم)	بس کر دے تو کچھ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل۔ اور مہیا فرما ان کے لیے زمین کی پیداوار شاید کہ یہ شکر کریں۔

اس دعا کے اثر سے مکہ کی وادیٔ غیر ذی زرع آج تک فیض یاب ہو رہی ہے۔ اور گواہی دے رہی ہے کہ اللہ اپنی راہ میں قربانی کا حوصلہ دکھانے والوں کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔

(الفرقان جمادی الاولیٰ ۱۳۷۹ھ)

محمد منظور نعمانی

عبادتِ نبویؐ

[ذیل کا مقالہ ماہنامہ "فاران" کراچی کے سیرت نمبر کے لیے لکھا گیا تھا بعد میں اسے الفرقان میں بھی شائع کیا گیا۔ فاران کے نمبر کے لیے لکھتے وقت ناسازئ طبع کی بنا پر اس مقالہ کی تکمیل نہیں کی جا سکی تھی، خیال تھا کہ اگر بعد میں توفیق و فرصت میسر آئی تو الفرقان میں اس کی تکمیل کر دی جائے گی۔ مگر افسوس اس کی نوبت نہ آسکی۔]

اَللّٰهُمَّ اَلْهِمْنِيْ رُشْدِيْ وَقِنِيْ شَرَّ نَفْسِيْ

ناظرین کو جیسا کہ عنوان سے معلوم ہو چکا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "عبادت" پہ لکھنا ہے اس لیے سب سے پہلے عبادت کی حقیقت کے متعلق کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔ "عبادت" کا اصل مادہ (ع ب د) ہے اور اصل عربی زبان میں اس کے معنی تذلل، انقیاد و اطاعت اور غلامی کے ہیں۔

لیکن جو عبادت دین کی ایک خاص اصطلاح ہے اور جس معنی میں عبادتِ نبویؐ اس مقالہ کا عنوان ہے۔ اس سے مراد وہ مخصوص تعظیمی اور تعبدی اعمال ہوتے ہیں جو کسی ہستی کو انتہائی مقدس اور بالاتر اور کن فیکونی اختیار و تصرف کا مالک سمجھ کر اس کی رضا اور عنایت حاصل کرنے کے لیے کئے جاتے ہیں۔ جن کا کرنے والا ان کے ذریعہ اپنے اس معبود کی انتہائی عظمت و قدوسیت اور اس کے حضور میں اپنے جذبۂ عبدیت اور اپنے عجز و تذلل کا مظاہرہ کرتا ہے۔

اہل علم اس حقیقت کو خوب جانتے ہیں کہ بہت سی اصطلاحات ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا مفہوم عام طور سے صحیح سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ان کی منضبط اور جامع مانع تعریف مشکل ہوتی ہے۔ "عبادت" بھی ان ہی دینی اصطلاحات میں سے ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ عام اہل علم بلکہ بہت سے عوام بھی عبادت کا مطلب صحیح سمجھتے ہیں۔ اور اپنی بول چال میں اس کو صحیح معنی ہی میں استعمال کرتے ہیں لیکن

اس کی منضبط اور جامع مانع تعریف تلاش کرنے والے کو کتابوں میں بھی مشکل سے ملتی ہے۔ بہت عرصہ ہوا حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ سے سنا تھا کہ عبادت کی جیسی منضبط اور منقح تعریف حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں کی ہے ایسی کسی اور مصنف کی کتاب میں نظر سے نہیں گزری۔ کچھ دن ہوئے اس عاجز کو اس کی ضرورت پیش آئی کہ عبادت کی منضبط اور جامع مانع تعریف معلوم کی جائے۔ اپنی دسترس کی حد تک بہت سی کتابوں کی ورق گردانی کی۔ لیکن واقعہ یہی ہے کہ حجۃ اللہ البالغہ کے باب "حقیقۃ الشرک" میں حضرت شاہ صاحبؒ نے جو کچھ اس سلسلہ میں حوالہ قلم فرمایا ہے۔ اس عاجز نے بھی اسی کو سب سے زیادہ منقح اور منضبط پایا۔ اوپر کی سطروں میں عبادت کے اصطلاحی مفہوم کی وضاحت میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ گویا حضرت شاہ صاحبؒ ہی کے بیان کی ترجمانی یا تلخیص ہے۔

الغرض عبادت سے مراد وہی خاص تعظیمی اور تعبدی اعمال ہیں جن کو ہمارے عرف عام میں "عبادت" کہا اور سمجھا جاتا ہے اور جن کے ذریعہ عابد اپنے معبود کے سامنے اپنی عبدیت اور بندگی کا مظاہرہ کرتا ہے، تاکہ اس کی رضا و عنایت اور اُس کا قرب اُس کو حاصل ہو۔

البتہ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے، عبادت کے معنی مطلق انقیاد و اطاعت اور غلامی کے بھی ہیں۔ اور اس لحاظ سے جو کام بھی اللہ کے حکم کی تعمیل میں اور اس کی رضا جوئی اور اخروی ثواب کی خاطر کیا جائے۔ اس کو اللہ کی عبادت کہا جاسکتا ہے۔ اگرچہ مذکورۂ بالا اصطلاحی معنی کے لحاظ سے وہ عبادت نہ ہو۔ لیکن یہ لفظِ عبادت کا دوسرا اطلاق اور دوسرا استعمال ہے اور دونوں کو ایک سمجھ لینا یا دونوں کے فرق کو نظر انداز کردینا بھاری غلطی ہے۔ جس سے بہت سی غلطیاں بلکہ گمراہیاں بھی پیدا ہوسکتی ہیں!

ان دونوں میں ایک واضح اور عام فہم فرق یہ بھی ہے کہ فرمانبرداری اور اطاعت اللہ کے حکم کے تحت دوسروں کی بھی ہوسکتی ہے، بلکہ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور اولوالامر کی اطاعت کا خود اللہ کی طرف سے حکم ہے۔ اسی طرح اولاد کو ماں باپ کی فرمانبرداری کا اور بیوی کو شوہر کی اطاعت و تابعداری کا حکم ہے لیکن عبادت کی جو اصطلاحی حقیقت اوپر بیان کی گئی ہے اور عرف میں جس کو عبادت کہا جاتا ہے۔ وہ کسی حال میں اور کسی نیت اور کسی تاویل سے بھی اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں کی جاسکتی۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اللہ کا حکم یا اُس کے قرب کا وسیلہ سمجھ کر ہی غیر اللہ کی عبادت

کرے (اگرچہ وہ غیر اللہ نبی و رسول ہی کیوں نہ ہوں)، وہ بلاشبہ مشرک ہوگا!

اصطلاحی عبادت کی حقیقت اور عبادت و اطاعت کے فرق کو سمجھنے کے لیے اس پر بھی غور کیجیے کہ انسان کے تعلقات اور معاملات کی مختلف نوعیتیں ہیں۔ ایک تعلق وہ ہے جو اولاد کو مثلاً ماں باپ سے یا ماں باپ کو اولاد سے ہوتا ہے۔ ایک تعلق وہ ہے جو بھائی سے یا ایک عزیز سے دوسرے عزیز کو ہوتا ہے۔ ایک تعلق وہ ہے جو بیوی کو شوہر سے یا شوہر کو بیوی سے ہوتا ہے۔ ایک تعلق وہ ہے جو محکوم کو حاکم سے یا رعیت کو راعی سے ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک تعلق وہ ہے جو کسی قوم کے عوام کو اپنے محبوب لیڈروں سے یا کسی مخلص مرید کو اپنے دینی محسن اور مربی یعنی اپنے شیخ سے ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک تعلق وہ ہے جو ایک اُمتی کو اپنے نبی سے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب تعلق بھی ایک درجہ کے نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بعض بعض سے اہم اور اعلیٰ ہیں۔ لیکن ان سب سے اعلیٰ و بالا تعلق وہ ہے جو عبد یا عابد کو اپنے الٰہ اور معبود سے ہوتا ہے اور یہ در اصل خالص قلبی اور روحی تعلق ہوتا ہے۔ (اور عبودیت اسی تعلق کا عنوان ہے) بس عابد اپنے اس تعلق کو اپنے معبود کے حضور میں جن تعظیمی اور تعبدی اعمال سے ظاہر کرتا ہے۔ ان ہی کو "عبادت" کہا جاتا ہے۔ اور انسان کے تمام اعمال میں عبادت اسی لیے اعلیٰ اور اشرف ہے کہ اس کے ذریعہ دل اور روح کے مقدس ترین تعلق (عبدیت) کو ظاہر کیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ خصوصیت اطاعت و فرمانبرداری کو یا کسی دوسرے عمل کو حاصل نہیں ہے!

عبادت کا اسی طرح کا ایک دوسرا امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کے علاوہ جو دوسرے اعمال نیکی اور ثواب کے کام ہیں۔ مثلاً اخلاقِ حسنہ اور معاشرتِ عادلہ یا مثلاً نبوت کی نیابت اور دین کی نصرت کے سلسلہ کے کام دعوت و تبلیغ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور جہاد فی سبیل اللہ وغیرہ۔ اگرچہ یہ سب بھی اللہ تعالیٰ کے اوامر ہیں اور اپنے اپنے درجہ میں ان سب کی بڑی اہمیت ہے۔ لیکن ان سب میں یہ بات مشترک ہے کہ ان کے عمل کے وقت بندہ کا رخ غیر اللہ کی طرف ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ بس اتنا ہی تعلق ہوتا ہے کہ باتوفیق بندہ ان کاموں کو بھی اللہ کے حکم سے اور اُس کی رضا جوئی میں کرتا ہے۔ لیکن عبادت میں بندہ کے ظاہر و باطن کا رخ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتا ہے اور اس میں کسی دوسرے کا کوئی حصہ اور کسی حیثیت سے بھی کسی کی کوئی شرکت نہیں ہوتی!

عبادت کی حقیقت اور اس کے امتیاز کو سمجھنے کے لیے اس کے موضوع و مقصد پر بھی غور کر لینا چاہیے۔

عبادت کا موضوع و مقصد

انسان اس دنیا میں دو مختلف حیثیتوں کا حامل ہے ایک حیثیت اس کی یہ ہے کہ دوسرے حیوانوں کی طرح اس کے ساتھ بھی حیوانی تقاضے اور بہیمی خواہشات لگی ہوئی ہیں اور اس حیثیت سے وہ گویا ایک بڑھیا اور ترقی یافتہ حیوان ہے۔

اور دوسری حیثیت اس کی یہ ہے کہ اس میں ملکوتیت اور نورانیت کا بھی عنصر ہے۔ جو در اصل ملاءِ اعلیٰ کا لطیفہ ہے اور اس کی محبت اور چاہت کا مرکز اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس ہے۔ اور اس حیثیت سے انسان اس زمین میں گویا عالم بالا کی ایک روحانی اور نورانی مخلوق ہے۔ اب انسان کی سعادت اور فلاح کا دارو مدار اس پر ہے کہ اس کی دوسری حیثیت پہلی حیثیت پر غالب اور حاکم رہے جس کے نتیجہ میں زمین پر رہنے، بسنے اور اپنے فطری بہیمی تقاضوں کو پورا کرتے رہنے کے باوجود اللہ تعالیٰ سے اس کا محبت و عبدیت کا تعلق اور ملاءِ اعلیٰ سے اس کی مناسبت پوری طرح قائم رہے۔ بلکہ اس جہت میں وہ برابر ترقی کرتا رہے اور اس کا خاص ذریعہ عبادات ہی ہیں۔ اور دین میں عبادات کے ایک خاص نصاب کی لازمی تشریع اور کثرتِ عبادت کی ترغیب کا یہ خاص راز ہے۔ اور بلاشبہ اگر عبادت صرف رسمی اور بے روح نہ ہو تو اس کی یہ تاثیر اور افادیت بالکل بدیہی ہے!

اس کے قریب اور اس سے ملتی جلتی ایک دوسری بات یہ بھی ہے کہ انسان کی فطرت میں روحانیت اور ملکوتیت کا حصہ اور خدا طلبی کا جذبہ ودیعت رکھا گیا ہے۔ اس کا قدرتی تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس کو ملاءِ اعلیٰ سے اور اپنے ربِ قدوس سے وہ قرب میسر ہو جو اس عالم میں ممکن ہے۔ اور اس کا ذریعہ اس دنیا میں عبادات ہی ہیں۔ اذا قام احدکم یصلی فانہ یناجی[1]

---

[1] یہ ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تم میں کا کوئی شخص جب نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنے پروردگار سے اپنے دل کی باتیں کرتا ہے۔

ربہ" اور "ابیت عند ربی"؛ جیسے ارشادات نبویؐ اسی حقیقت کے اشارات ہیں۔

عبادات کے متعلق یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا۔ ناظرین نے اس سے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی ہوگی کہ "عبادت" جو دین کی خاص اصطلاح ہے اور جس کا غیر اللہ کے لیے کسی نیت اور کسی تاویل سے کرنا بھی شرک ہے۔ اس سے وہی خاص تعظیمی اور تعبدی اعمال مراد ہیں جو عابد اپنے معبود کے حضور میں اپنی عبدیت کے اظہار کے لیے کرتا ہے اور جن کو عرف عام میں "عبادت" کہا جاتا ہے۔ نیز یہ بھی سمجھ لیا ہوگا کہ انسان کے تمام اعمال میں عبادت ہی سب سے زیادہ عظیم الشان عمل ہے۔ کیونکہ وہ عابد کے اس مقدس قلبی اور روحی جذبہ کی عملی شکل ہے جو سارے تعلقات اور جذبات سے بالاتر ہے۔ اسی لیے اس میں کسی غیر کی شرکت کی کسی تاویل اور کسی نیت سے بھی گنجائش نہیں اور ظاہر ہے کہ انسان کے دوسرے اعمال کی یہ نوعیت نہیں ہے!

اس مسئلہ کی وضاحت اور تفصیل میں اس عاجز نے یہ چند سطریں لکھنا اس لیے ضروری سمجھا کہ ہمارے اس دور میں "عبادت" کی حقیقت اور اس کے اصطلاحی مفہوم کے متعلق بعض حلقوں میں چند ایسی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں جو بعض دوسرے بنیادی مسئلوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ بلکہ یہ عاجز اس موقع پر یہ اعتراف اور اعلان کرنا بھی ضروری سمجھتا ہے کہ چند روز ہوئے "الفرقان" کے ایک بہت پرانے پرچے میں خود اپنی ایک تحریر ایسی نظر پڑی جس سے اس مسئلہ میں ناظرین کو غلط فہمی ہو سکتی ہے۔ عبادت چونکہ دین کی ایک اہم اور بنیادی اصطلاح ہے۔ اس لیے ہماری کسی تعبیری غلطی سے اگر اس کے متعلق غلط تصور قائم ہو جائے تو توحید جیسے دین کے مرکزی مسئلہ کے متعلق تصور غلط ہو سکتا ہے اور اسی سلسلہ کی غلطیوں کے بعض بڑے عبرتناک نمونے خود اس عاجز نے دیکھے ہیں اور اسی چیز نے یہاں ان سطروں کے لکھنے پر مجبور کیا۔ ویتوب اللّٰہ علی من تاب۔

عبادت کی مذکورۂ بالا تشریح و تنقیح سے ناظرین نے یہ بھی سمجھ لیا ہوگا کہ اس مقالہ کا موضوع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا کونسا گوشہ ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس موضوع پر

لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا حال بیان فرمایا ہے کہ، رات دن میں میرا وقت اپنے پروردگار کے پاس گزرتا ہے۔

اگر تفصیل سے لکھا جائے تو خاصی ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ لیکن اس وقت تو "فاران" کے سیرت نمبر کے لیے چند صفحہ کا ایک مضمون لکھنا ہی پیشِ نظر ہے۔ اور لکھنے والا اپنے لیے یہ آسان اور بہتر سمجھتا ہے کہ ایک مجلاتی مقالہ کی محدود گنجائش کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت سے متعلق کچھ متفرق مرویات اور معلومات کو بس یکجا کر کے ناظرین کی خدمت میں پیش کر دے۔ آئیے! اب اصل موضوع شروع کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فطری ذوقِ عبادت

اوپر کی تمہیدی سطروں میں جیسا کہ ایک جگہ اشارہ کیا جا چکا ہے

عبادت ہر پاکیزہ روح کی غذا اور ہر قلب سلیم کے لیے آرام اور چین کا وسیلہ ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس باب میں جو حال تھا اس کا کچھ اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید کا نزول جب شروع بھی نہیں ہوا تھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عبادت کا بلکہ کسی حبیبۂ کا بھی کوئی حکم آپ کو نہیں ملا تھا تو آپ خود اپنے اندرونی جذبے اور تقاضے سے مجبور ہو کر سب سے الگ اور یکسو ہو کر مکہ کی آبادی سے کافی فاصلہ پر جبلِ نور کی بہت اونچی ایک چوٹی کے غار میں جا جا کر عبادت کیا کرتے تھے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہ میں آغاز نبوت کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی جو مفصل روایت ہے۔ اس کے الفاظ ہیں" وکان یخلو بغار حراء فیتحنّث فیہ وھو التعبد اللیالی ذوات العدد"۔ جس کا مطلب یہی ہے کہ آپ سب سے یکسو ہو کر غار حراء میں کئی کئی دن معتکف رہتے تھے۔ اور اس تنہائی کے عالم میں صرف اللہ کی عبادت[1] میں مصروف رہتے تھے۔ یہاں تک کہ گھر بھی کئی کئی دن کے بعد تشریف لاتے تھے۔

میرے نزدیک آپ کے ذوقِ عبادت کا اندازہ کرنے کے لیے نبوت اور نزول قرآن سے پہلے کا آپ کا یہ معمول ہی کافی ہے۔

اس کے بعد نبوت کا دور شروع ہو گیا اور رسالت کی ذمہ داریاں آپ پر عائد ہو گئیں۔ جن کے

---

[1] کسی روایت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس عبادت کا طریقہ کیا تھا۔ شارحین حدیث نے مختلف اقوال ذکر کیے ہیں۔ لیکن وہ سب قیاسات ہی ہیں۔ کوئی واضح اطلاع کسی کے پاس نہیں ہے!

لیے آپ کو وقت کا بڑا حصہ درکار تھا، نیز آپ کی زندگی کو اب اُمت کے لیے یعنی مستقبل کی پوری انسانی نسل کے لیے اسوہ اور نمونہ بھی بننا تھا۔ اس لیے اب اس کی تو گنجائش نہیں رہی کہ سب سے الگ تھلگ رہ کر حرا، جیسے کسی غار میں ہمہ وقت اپنے پروردگار کی یاد اور عبادت میں آپ مصروف رہ سکیں چنانچہ اس کے بعد وحی الٰہی کی رہنمائی میں آپ کی عبادت کا ایک ایسا معتدل اور متوازن نظام قائم ہو گیا جس کے ساتھ سارے پیغمبرانہ کام بھی انجام پاتے رہیں اور امت کے لیے اس کی تقلید اور پیروی میں زیادہ زحمت اور مشقت بھی نہ ہو۔ دیکھنے والا اگر صحیح نظر رکھتا ہو تو آپ کی حیات طیبہ اس کو ایک نہایت جامع اور حسین و متوازن پیغمبرانہ زندگی نظر آئے گی جس میں نماز، روزہ، اعتکاف، صدقات و قربانی عمرہ، حج اور اذکار و دعوات جیسی تمام عبادات اپنی اپنی جگہ مختلف رنگ و بو رکھنے والے نہایت حسین و جمیل پھولوں کی طرح درخشاں ہیں۔ پھر ان سب میں چونکہ نماز سب سے اہم اور اکمل ہے۔ اس لیے آیئے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز ہی کی کچھ باتیں کریں

نماز آپ کی روح پاک کی غذا دل کا چین اور آنکھوں کی ٹھنڈک

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کو نماز میں جو کیفیت اور لذت حاصل ہوتی تھی اور روح پاک کو جو لطیف و لذیذ غذا ملتی تھی، بلاشبہ اس کا ادراک احساس تو ان ہی بندگانِ خدا کا حصہ ہے جنھوں نے اس دولت سے کوئی حصہ پایا ہو اور اس کا کچھ ذائقہ کبھی چکھا ہو۔ "ذوق ایں مے نہ شناسی بخدا تانہ چشی" لیکن ہم جیسے عوام بھی "قرۃ عینی فی الصلوٰۃ"[1] اور "قم یا بلال ارحنی بالصلوٰۃ"[2] جیسے آپ کے ارشادات سے اس کا کچھ نہ کچھ اندازہ کر ہی سکتے ہیں۔ جو خوش نصیب بندے اس دولت سے کچھ بہرہ ور ہوئے ہیں انھوں نے اپنی یافت اور اپنے تجربہ کے مطابق اس اجمال کی تفصیل بھی اپنے کلمات میں کی ہے۔ مثلاً امام ربانی مجدد الف ثانیؒ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:۔

"نماز است کہ راحت دہ بیماران است" "ارحنی یا بلال" رمزیست ازیں ماجرا و

---

[1] نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ یہ ایک حدیث کا ٹکڑا ہے۔ [2] کبھی کبھی نماز کا وقت آ جانے پر آپ حضرت بلالؓ سے یہ فرمایا کرتے تھے۔ مطلب یہ ہوتا تھا کہ بلالؓ اٹھو نماز شروع کر کے میرے دل کو چین و راحت پہنچاؤ۔

"قرۃ عینی فی الصلوٰۃ" اشارہ ایست باین تمنی...... مصلی کہ از حقیقت نماز آگاہ است در وقت اداء صلوٰۃ گویا از نشاء دنیوی برآید و در نشاء دنیوی کائنے در آید لاجرم درین وقت دولتے کہ مخصوص بآخرت است نصیبے ازاں فراہم گیرد وحظے از اصل بے شائبہ ظلیت بدست مے آرد۔ (مکتوب ۲۶۱ جلد اول)

(نماز ہی بیماران عشق ومحبت کا چین وآرام ہے۔ حضورؐ کے ارشاد "ارحنی یا بلال" میں اسی طرف اشارہ ہے، اور "قرۃ عینی فی الصلوٰۃ" میں بھی اسی مدعا کا اظہار ہے...... جو نماز پڑھنے والا نماز کی حقیقت سے آشنا ہے وہ نماز ادا کرتے وقت گویا اس دنیا کے دائرہ سے نکل کر ایک دوسرے عالم میں پہنچ جاتا ہے۔ پھر اس کو اُس دولت عظمیٰ میں سے کچھ حصہ مل جاتا ہے جو آخرت کے ساتھ مخصوص ہے یعنی "اصل بے شائبہ ظلیت" کا ایک گونہ وصال ولقا میسر ہو جاتا ہے۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

ان احدکم اذا قام فی الصلوٰۃ	تم میں سے کوئی جب نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو
فانما یناجی ربہ۔ الحدیث	اس وقت وہ اللہ تعالیٰ سے وہ اپنے دل کی باتیں
(جمع الفوائد بحوالہ صحیحین ونسائی عن انس)	کرتا ہے۔

اس حدیث میں جس کیفیت کو "یناجی ربہ" کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یقیناً اس کا اعلیٰ ترین درجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کی حالت میں حاصل ہوتا تھا۔ اور غور کر کے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہر چیز سے زیادہ پیارے اپنے رب سے اس بلا واسطہ مخاطبہ اور مکالمہ میں آپؐ کو کیسی لذت اور حلاوت ملتی ہوگی۔ اس کیفیت کے سمجھنے میں بھی امام ربانی ہی کا ایک اشارہ ہماری کچھ رہنمائی اور مدد کر سکتا ہے۔ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:۔

"بدانند کہ رتبۂ نماز در رنگ رتبۂ رویت است در آخرت، نہایت قرب در دنیا در نماز است ونہایت قرب در آخرت در حین رویت" (مکتوب ۱۳۰ ج ۱)

(معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا میں نماز کا درجہ ومقام وہی ہے جو آخرت میں دیدار الٰہی کا ہے۔ اس دنیا میں بندہ کو مولا کا انتہائی قرب نماز ہی میں حاصل ہوتا ہے اور آخرت میں انتہائی قرب دیدار کے وقت نصیب ہوگا۔)

نماز کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبی تعلق کا اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ

ہجرت سے پہلے طائف میں اور بعد کو احد کے معرکہ میں دشمنوں کے ہاتھ سے سخت سے سخت تکلیفیں پہنچنے پر بھی آپؐ نے ان موذیوں کے حق میں بددعا نہیں فرمائی بلکہ ان کی ہدایت اور انجام بخیر ہی کی دعا کی۔ لیکن غزوۂ احزاب میں جب دشمنوں نے ایک دن آپؐ کو نماز عصر پڑھنے کی مہلت نہ دی اور آپؐ کی وہ نماز اس دن قضا ہوگئی۔ تو اتنی سخت بددعا زبان مبارک سے نکلی کہ اس سے سخت بددعا کسی کے لیے شاید سوچی بھی نہیں جا سکتی۔ حدیث کی کتابوں میں آپؐ کی اس بددعا کے الفاظ یہ نقل کیے گئے ہیں:۔

حبسونا عن صلوٰۃ الوسطیٰ صلوٰۃ العصر ملأ اللہ بیوتھم و قبورھم نارا۔ (بخاری ومسلم)

ان لوگوں نے ہمیں آج عصر کی نماز نہیں پڑھنے دی۔ اللہ ان کے گھروں اور ان کی قبروں کو آگ سے بھر دے۔

نماز میں روح پاک کو جو لذت وحلاوت ملتی تھی۔ اس کا اندازہ کرنے کی ایک راہ یہ بھی ہے کہ آپؐ کے فیض یافتہ بعض صحابہ کرام کی اس حالت سے اس کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اس سلسلہ کے بہت سے قابل ذکر واقعات میں سے صرف ایک واقعہ یہاں یاد کر لیجیے۔ جو سنن ابی داؤد اور مسند احمد میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غزوہ میں خطرہ کے ایک موقع پر رات کو پہرہ دینے کے واسطے دو صحابیوں کو متعین فرمایا۔ ان میں سے ایک مہاجر تھے دوسرے انصاری۔ ان صاحبوں نے ڈیوٹی کو نصفا نصف تقسیم کر لیا۔ یعنی طے کیا کہ ہر ایک آدمی آدھی رات پہرہ دے اور دوسرا اس وقت سوئے۔ انصاری صحابی نے رات کے پہلے حصہ میں پہرہ دینا شروع کیا اور مہاجر ساتھی قرارداد کے مطابق سو گئے۔ پھر ان انصاری بزرگ نے خالی جاگنے کے بجائے یہ بہتر سمجھا کہ نماز میں مشغول رہ کر یہ وقت گزارا جائے۔ چنانچہ انھوں نے نماز شروع کر دی۔ دشمن کی جانب سے کوئی شخص آیا اور اس نے آدمی کھڑا دیکھ کر تیر مارا اور جب یہاں کوئی حرکت نہ ہوئی اور نہ کوئی آواز نکلی تو شاید یہ سمجھ کر کہ نشانہ خطا ہو گیا دوسرا اور پھر اسی طرح تیسرا تیر مارا۔ اور یہاں ہر تیر ان کے جسم میں پیوست ہوتا رہا اور یہ اس کو جسم

یں سے نکال نکال کر پھینکتے رہے اور نماز میں مشغول رہے۔ پھر اطمینان سے رکوع کیا، پھر سجدہ کیا اور نماز پوری کر کے مہاجر ساتھی کو جگایا۔ انہوں نے اٹھ کر دیکھا کہ ایک نہیں تین تین جگہ سے خون جاری ہے۔ انہوں نے ماجرا پوچھا اور کہا کہ تم نے مجھے شروع ہی میں کیوں نہیں اٹھا دیا۔ ان انصاری بزرگ نے جواب دیا کہ میں نے ایک سورۃ (سورۂ کہف) شروع کر رکھی تھی۔ میرا دل نہ چاہا کہ اس کو ختم کرنے سے پہلے رکوع کروں۔ لیکن پھر مجھے یہ خطرہ ہوا کہ اگر اسی طرح پے در پے تیر لگتے رہے اور میں یونہی مرگیا تو حضورؐ نے پہرہ داری کی جو خدمت ہمارے سپرد کی تھی وہ فوت ہو جائے گی۔ اس خیال سے میں نے رکوع کر دیا۔ اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا تو سورہ ختم کرنے سے پہلے رکوع نہ کرتا اگرچہ مر ہی کیوں نہ جاتا۔"

تیر پہ تیر کھانے اور تین جگہ سے خون کا فوارہ جاری ہو جانے کے باوجود ان انصاری بزرگ کا نماز میں مشغول رہنا اور نماز کو مختصر کرنے کا بھی ارادہ نہ کرنا، نماز کے اندر کی جس لذت و حلاوت کا پتہ دیتا ہے یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ اس میں اپنے ان انصاری خادم سے بدرجہا زیادہ تھا۔ بلکہ جو کچھ ان کو ملا تھا یا اُمت میں کسی کو بھی ملا ہو وہ آپ ہی کے فیض اور نسبت کا ایک ذرہ تھا۔

دن رات میں آپ کتنی نمازیں پڑھتے تھے

اوپر جو کچھ لکھا گیا اس کے سامنے آجانے کے بعد اس میں تو کسی کو شبہ نہیں رہ سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوقات میں آپؐ کی روح پاک کے لیے سب سے زیادہ لذّت و سرور کا اور قلب مبارک کے لیے انتہائی راحت و فرحت کا وقت وہی ہوتا تھا جب آپؐ نماز میں مشغول ہوتے تھے۔ اس لیے قدرتی طور پر آپؐ کے قلب و روح کی خواہش یہی ہوگی کہ ہمہ وقت یا زیادہ سے زیادہ اوقات آپ نماز ہی میں مصروف رہیں۔ لیکن جیسا کہ اوپر بھی عرض کیا جا چکا ہے چونکہ منصب رسالت کے فرائض و وظائف، دعوت و تبلیغ، تعلیم و تربیت اور ارشاد و ہدایت وغیرہ کی انجام دہی کے لیے آپؐ کے اوقات کا خاصکر دن کے وقت کا بڑا حصہ درکار تھا۔ نیز

آپؐ کی زندگی کو اُمت کے لیے نمونہ بھی بننا تھا۔ اس لیے آپ کے لیے ضروری ہو گیا کہ نماز میں صرف اتنے وقت مشغول رہیں کہ فرائض رسالت بھی پوری طرح ادا ہوتے رہیں اور اُمت کے لیے آپؐ کی تقلید و پیروی بھی بہت مشکل نہ ہو۔

نیز اس سے ملتا جلتا ایک اور سبب نماز جیسی عبادات میں آپؐ کے زیادہ مشغول نہ رہ سکنے کا یہ بھی تھا کہ اگر آپؐ ایسا کرتے یعنی اپنے اوقات کے بڑے حصہ میں نماز میں مشغول رہتے تو آپؐ کی محبت اور تقلید میں یقیناً صحابہ کرام بھی ایسا ہی کرتے اور حکمت تشریع کا یہ اصول ہے کہ اگر پیغمبر اور اس کے متبعین کوئی عبادت اہتمام اور پابندی سے کرنے لگیں تو وہ اس اُمت پر فرض کر دی جاتی ہے۔ پس اُمت پر فرض ہو جانے کے اندیشہ کی وجہ سے بھی آپؐ نے نفل نمازوں کی کثرت اور پابندی میں احتیاط فرمائی۔

بہر حال ان وجوہ سے دل کی چاہت کے باوجود آپؐ نفل نمازیں خاص کر دن کے اوقات میں بہت زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ گویا یہ آپؐ کا نرالا مجاہدہ تھا کہ دل کی طلب اور خواہش تو زیادہ سے زیادہ وقت نماز جیسی عبادات میں مشغول رہنے کی تھی لیکن مذکورہ بالا اسباب و مصالح کی وجہ سے اپنے اس شوق کو آپؐ پورا نہیں کر سکتے تھے اور اس طرح آپؐ نے اپنے دل کی چاہت کو اللہ تعالیٰ کی مرضی اور امت کی عام مصلحت پر قربان کر دیا تھا۔

میل من سوئے وصال و میل او سوئے فراق ۔۔۔ ترک کام خود گرفتم تا بر آید کام دوست

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز چاشت کی مختلف موقعوں پر بڑی بڑی فضیلتیں بیان فرمائیں۔ لیکن خود پابندی سے آپؐ نے یہ نماز نہیں پڑھی۔ اس کا سبب بیان کرتے ہوئے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایک اصولی بات فرمائی ہے۔ صحیح بخاری میں ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

ان کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیدع العمل وھو یحب ان یعمل بہ خشیۃ ان یعمل بہ الناس فیفرض علیھم۔

(باب تحریض النبیؐ علی قیام اللیل والنوافل)

اسی کو حافظ ابن القیمؒ زاد المعاد میں لکھتے ہیں:۔

وقد کان یترک کثیراً من العمل وھو یحب ان یعملہ خشیۃ المشقۃ علیھم۔[۱]

۱؎ زاد المعاد ص ۱۹۲ ، [illegible]

اور آپؐ ترک فرما دیا کرتے تھے، بہت سے اعمال حالانکہ وہ اعمال آپؐ کو بہت محبوب ہوتے تھے صرف اُمّت کی دقت کے خیال سے۔

بہرحال یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے آپؐ دل کی چاہت کے باوجود نفل نمازیں بہت زیادہ نہیں پڑھ سکتے تھے۔ محققین نے تمام روایات کی چھان بین کے بعد لکھا ہے کہ اہتمام اور پابندی سے آپؐ شب و روز میں صرف چالیس رکعت نماز پڑھتے تھے۔ سترہ رکعت فرائض پنجگانہ، اور دس یا بارہ رکعت رواتب (یعنی مؤکدہ سنتیں) جن کی تفصیل یہ ہے کہ فجر سے پہلے دو رکعت، ظہر سے پہلے دو رکعت یا چار رکعت (دونوں ثابت ہیں) ظہر کے بعد دو رکعت، مغرب کے بعد دو رکعت، عشاء کے بعد دو رکعت۔ یہ کل دس یا بارہ ہوئیں۔ اور تہجد مع تین رکعت وتر کے گیارہ رکعت یا تیرہ رکعت (دونوں ثابت ہیں) ان کی میزان چالیس ہوئی۔ الغرض دن رات میں یہ چالیس رکعتیں تو آپؐ عموماً اہتمام اور پابندی سے ادا فرماتے تھے[1]۔ ان کے سوا نوافل میں نماز چاشت اور زوال آفتاب کے وقت کی چار رکعتیں پڑھنا بھی متعدد صحابہ نے روایت کیا ہے۔

ان کے علاوہ خاصکر دن میں زیادہ نوافل جیسا کہ عرض کیا گیا۔ آپؐ اسی لیے نہیں پڑھتے تھے کہ امت پر زیادہ بوجھ نہ پڑ جائے۔ نیز ذاتی اور خانگی ضروریات اور منصب رسالت کے دوسرے کاموں سے دن میں آپؐ کو زیادہ مہلت بھی نہیں ملتی تھی۔ اسی کو قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:-

إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ۝

آپؐ کی رات کی نماز

رات چونکہ عام طور سے خلوت میں یعنی گھر کے اندر گزرتی تھی اور دوسرے کاموں سے رات میں فراغت و فرصت بھی ہوتی تھی۔ اس لیے رات کی نماز یعنی تہجد آپؐ اکثر بہت طویل پڑھتے تھے۔ یہاں تک کہ آپؐ کے پاؤں پر ورم آجاتا تھا۔ صحیحین میں حضرت مغیرہؓ بن شعبہ سے مروی ہے:-

قام النبي صلى الله عليه وسلم حتى تورمت قدماه فقيل له لم تصنع هذا وقد غفر لك ما تقدم من ذنبك وما تاخر قال افلا اكون عبداً شكوراً۔ (جمع الفوائد مشکوٰۃ)

[1] زاد المعاد ص ۳۱۴-۳۱۵ برحاشیہ زرقانی جلد اول

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمایا۔ یہاں تک کہ آپ کے دونوں پاؤں ورم کر آئے آپ سے عرض کیا گیا کہ آپ اتنا قیام کیوں فرماتے ہیں درآنحالیکہ آپ کی تو اگلی پچھلی سب چیزوں کی معافی دے دی گئی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کیا میں عبد شکور نہ بنوں۔

حضرت حذیفہؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رات کی نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ تو آپ نے چار رکعتوں میں سورۂ بقرہ۔ سورۂ آل عمران۔ سورۃ النساء۔ اور سورۂ مائدہ یا بجائے مائدہ کے سورۂ انعام[1] پڑھیں۔ گویا قریباً سوا چھ سیپارے پڑھے۔ (ابوداؤد)

اور حضرت حذیفہؓ ہی کی ایک روایت میں جو صحیح مسلم میں لکھی ہے یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ رات کی نماز میں آپ نے یہ لمبی لمبی سورتیں اس طرح پڑھیں کہ جہاں کوئی ایسی آیت آتی جس میں اللہ کی تسبیح کا ذکر ہوتا تو وہاں آپ اللہ کی تسبیح کرتے اور جہاں سوال اور دعا کا ذکر آتا تو وہاں آپ دعا کرتے اور جہاں دنیا یا آخرت کی کسی بلا سے پناہ مانگنے کا ذکر آتا تو وہاں آپ اللہ سے پناہ مانگتے۔ نیز اس روایت میں یہ بھی ہے کہ اس نماز میں جس قدر طویل آپ نے قیام کیا اسی کے قریب قریب آپ نے رکوع وسجود بھی کیے[2]۔ اب غور کر کے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ نماز کتنی طویل ہوئی ہوگی۔

اور صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ "ایک رات کو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھنے لگا۔ آپ نے اتنی طویل نماز پڑھی کہ میرے لیے آپ کے ساتھ کھڑا رہنا سخت مشکل ہو گیا اور میرے دل میں ایک برا خیال آنے لگا۔ کسی نے پوچھا کیا برا خیال آنے لگا تھا؟ آپ نے فرمایا۔۔۔۔ یہ کہ میں بیٹھ جاؤں اور آپ کو کھڑا چھوڑ دوں"[3]

صحابہ کی ان روایات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ کی رات کی نماز کس قدر طویل ہوتی تھی۔ لیکن یہ آپ کا ایسا دوامی معمول نہ تھا جس کے خلاف کبھی نہ ہوتا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو امت کے لیے آپ کی تقلید و پیروی سخت مشکل ہو جاتی۔ اس لیے کبھی کبھی آپ ایسا بھی کرتے تھے کہ رات کو کافی آرام بھی فرماتے اور باقی وقت میں تہجد پڑھتے۔ کبھی صرف آخری تہائی رات ہی میں تہجد پڑھتے۔ کبھی پہلے سوتے اور آخر میں اٹھ کر تہجد پڑھتے اور کبھی اس کے برعکس بھی کر لیتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی

---

[1] سورۂ مائدہ اور سورۂ انعام کے بارے میں یہ شک حدیث کے ایک راوی شعبہ کو ہو گیا ہے۔

[2] جمع الفوائد باب صلوٰۃ اللیل [3] جمع الفوائد

کر لیتے کر اُٹھے دو رکعتیں پڑھیں پھر کچھ دیر کے لیے سو گئے پھر اٹھ کر دو رکعتیں پڑھیں۔ اسی طرح بار بار سوئے اور بار بار اٹھ کر نماز پڑھی[1]۔ ایسا آپؐ نے اسی لیے کیا کہ اُمّت کے ضعفا بھی آپؐ کی پیروی کر سکیں۔ ورنہ جیسا کہ عرض کیا گیا آپؐ کا اصل ذوق اور آپؐ کے دل کی چاہت یقیناً یہی ہوگی کہ ساری رات نماز ہی میں کھڑے رہیں۔ اسی میں آپ کے دل کا چین تھا۔ اور اسی میں روح کی راحت اور آنکھوں کی ٹھنڈک تھی ؎

ہمارا شغل ہے راتوں کو رونا یادِ دلبر میں		ہماری نیند ہے محوِ خیالِ یار ہو جانا!

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا۔ کہ رات کی نماز میں کسی آیت پر پہونچکر آپؐ پر کوئی خاص کیفیت طاری ہو گئی اور پھر ساری رات اللہ کے حضور میں کھڑے آپ وہی ایک آیت پڑھتے رہے۔ چنانچہ مسند احمد اور مسند بزار میں حضرت ابوذر غفاریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات کی نماز میں برابر سورۂ مائدہ کے آخری رکوع کی یہی ایک آیت پڑھتے رہے[2]۔

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ (جمع الفوائد)

بعض صحابۂ کرام کا بیان ہے کہ ہم نے دیکھا کہ نماز کی حالت میں گریہ وبکا کے غلبہ سے آپؐ کے سینۂ مبارک سے چکی چلنے کی سی ایک آواز نکلتی تھی۔ سنن ابی داؤد میں عبداللہ بن الشخیرؓ کی روایت کے الفاظ ہیں :۔

رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلي وفي صدره أزيز كأزيز المرجل من البكاء

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے دیکھا اور اس وقت آپ کے سینۂ مبارک سے گریہ کے اثر سے چکی کی سی آواز نکلتی تھی۔ (ابوداؤد باب البکاء فی الصلوٰۃ)

(الفرقان جمادی الثانی ۱۳۷۵ھ)

---

[1] جمع الفوائد [2] قرآن مجید میں یہ آیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک عرض داشت کے ضمن میں آئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے اللہ اگر آپ میری امت کو عذاب میں ڈالنے کا فیصلہ کریں تو آپ کو اس کا پورا حق ہے۔ آپ مالک ہیں، وہ آپ کے بندے ہیں اور اگر آپ ان کو اپنے کرم سے بخش دیں تو آپ ایسا بھی کر سکتے ہیں کہ آپ زبردست اور حکیم و دانا ہیں۔

افادات مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

تلخیص و ترتیب: عتیق الرحمٰن سنبھلی

جہانے را دگرگوں کرد، یک مردِ خود آگاہے

ذیل کا مضمون مولانا مرحوم کی کتاب "مقالاتِ احسانی" کے ایک
باب سے مرتب کیا گیا تھا۔ ع

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم وغیرہ کی تصنیف سے آخرت طلبی کا جو صور پھونکا تھا، اور جس بری طرح عالمِ اسلامی کو اس کے اندرونی اضمحلال کے خلاف جھنجھوڑا تھا، اس کے کیا اثرات ہوئے؟ مولانا گیلانیؒ نے تاریخ کی روشنی میں ان اثرات کی جستجو کی ہے۔ اور سب سے پہلے ایوانِ خلافت و وزارت پر نگاہ ڈالی ہے کہ یہاں کے نقشے میں بھی امام کی اس چیخ و پکار کے بعد کوئی تغیر نظر آتا ہے یا نہیں؟

مولانا فرماتے ہیں کہ دیکھو ۴۵۰ھ جو امام کا سنہ ولادت اور خلیفہ مقتدر باللہ العباسی کا دورِ خلافت ہے اس میں شاہانہ کروفر اور اظہارِ شان و ثروت کا یہ عالم تھا کہ قسطنطنیہ سے رومیوں کی جو سفارت قیدیوں کے تبادلے اور صلح کی گفتگو کے لیے بغداد آئی تھی، مقتدر باللہ سے ملنے کے لیے جب اس کے ارکان دار الخلافہ کی طرف روانہ ہوئے تو

> .... پہلے اس حاجب (عرض بیگی) کے محل کے سامنے پہنچے جس کا نام قصر الفشوری تھا۔ حاجب کے محل کی شان و شوکت دیکھ کر سفراء کچھ اس درجہ مبہوت ہوئے کہ اسی محل کو انھوں نے سمجھا کہ خلیفہ کا مکان ہے، ان کی غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا، وہ آگے بڑھے سامنے وزیر کا قصر نظر آیا۔ اُن کو پھر یہی خیال

بنا کہ یہ نہیں تو ضرور یہی خلیفہ کا مستقر ہے، مگر کہا گیا کہ یہ وزیر کا گھر ہے، وہ آگے روانہ ہوئے ان لوگوں کو اس طریقے سے دار الخلافہ میں داخل کیا گیا کہ چاروں طرف پہلے وہ گھوم لیں۔ حالت یہ تھی کہ دار الخلافہ کے اطراف و جوانب اس کے مختلف ابواب اور مقامات پر ۳۸ ہزار پردے پڑے ہوئے تھے، جن میں بارہ ہزار پانچ سو پردے تو خالص زرکش دیبا اور حریر کے تھے۔ درمیان میں جو فرش فروش بچھائے گئے تھے ان کی تعداد بائیس ہزار تھی۔ دار الخلافہ کے احاطہ میں (جو خود ایک مستقل دنیا کی حیثیت رکھتا تھا) مختلف مقامات میں جنگلی جانوروں کی قطاریں بکھری ہوئی تھیں جو لوگوں سے مانوس تھے ...... مختلف قسم کے درندے، (شیر بھیڑیا وغیرہ) بھی زنجیروں میں بندھے ہوئے اپنے اپنے نگہبانوں کے ساتھ کھڑے تھے۔

سفارت والوں کو پھر اس کوٹھی میں لے جایا گیا جس کا نام "دار الشجرہ" (درخت والا محل) تھا۔ اس کے احاطہ میں ایک طویل و عریض تالاب تھا جس میں صاف و شفاف پانی ہر وقت چھلکتا رہتا تھا۔ تالاب کے وسط میں ایک اچنبے سے بھرا ایک درخت تھا۔ یہ مصنوعی درخت تھا جس میں بڑی بڑی بارہ ڈالیاں اور ہر ڈالی میں بے شمار شاخیں اور ٹہنیاں تھیں۔ ان شاخوں پر مختلف قسم کے پرندے اور چڑیاں طلا اور نقرہ (سونے چاندی) سے ڈھال کر بنائی گئی تھیں، اور یہی حال اس درخت کی شاخوں اور ٹہنیوں کا تھا یعنی ان میں بعض سونے سے بنائی گئی تھیں اور بعض چاندی سے ......

"دار الشجرہ" کے بعد سفیروں کو اس محل میں لوگوں نے پہنچایا جس کا نام "الفردوس" تھا۔ اس قصر میں فرش فروش اور ظروف و آلات کی جو کثرت تھی ان کا شمار مشکل ہے، صرف اس کی دہلیزوں پر طلائی کڑیوں سے بنی ہوئی دس ہزار زرہیں لٹک رہی تھیں، اس کے بعد آبنوسی جڑاؤ تخت پر سفراء نے مقتدر باللہ کو جلوہ افروز پایا جس پر زریں جھالروں کی کامدار مخملی مسند پڑی ہوئی تھی۔ تخت کے داہنی جانب اور بائیں جانب بھی خاص سلیقہ سے مختلف جواہر سے بنے ہوئے جالے کے نو نو عدد لٹکے ہوئے تھے جن کی جگمگاہٹ سے آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں، دن کی روشنی کو بھی ان کی روشنی مات کر رہی تھی۔"

انقلاب لیکن اسی مسندِ خلافت پر امام غزالی کی وفات کے پچیسویں سال المقتفی باللہ کا لقب اختیار

کرکے جو شخص آتا ہے اس کے متعلق تاریخ بتاتی ہے کہ اس نے آتے ہی دارالخلافہ کا نقشہ یوں بدل دیا کہ:۔

"دارالخلافہ بغداد کا اپنے سارے فرش فروش، خیمہ وخرگاہ، پردے وسراپردے دواب چوپائے اور دوسرے جانوروں سے بالکلیہ تخلیہ ہوگیا صرف چار گھوڑے اور دارالخلافت میں پانی پہنچانے کے لیے کل آٹھ خچر اصطبل میں باقی تھے۔"

خلیفہ منتخب ہونے سے پہلے اس کا زیادہ وقت دینی مشاغل میں صرف ہوتا تھا۔ دینی علوم کی کتابیں کھنگالتا رہتا تھا، یا قرآن کی تلاوت کرتا رہتا تھا، پھر جب خلیفہ منتخب ہوا تو زہد وعبادت وتقویٰ وطہارت کی خصوصیتوں میں اس کے کسی قسم کی کمی نہ ہوئی...... عدل وانصاف کے چمن میں پھر بہار اس کے عہد میں آئی، نیکی کے ابواب پھر کھل پڑے۔

اسی کے ساتھ ساتھ

مقتفی کے زمانہ میں بغداد اور عراق پھر خلیفہ کے قبضۂ اقتدار میں واپس ہوا۔ ورنہ مقتدر باللہ کے زمانہ سے صورت حال یہ ہوگئی تھی کہ خلیفہ کا صرف نام تھا اور حکومت ان سلاطین اور ملوک کی قائم تھی جنھوں نے جبراً خلیفہ کو اپنا تابع فرمان بنا لیا تھا۔

مولانا گیلانی فرماتے ہیں ——— "اور بات صرف مقتفی ہی کی حد تک اگر محدود ہوتی تو استثنا اور شذوذ کے دعوے کی گنجائش بھی پیدا ہوسکتی تھی (مگر) واقعہ یہ ہے کہ امام غزالی کے بعد پے در پے پچاس ساٹھ برس کا زمانہ بغداد کی خلافت پر ایسا گزرا ہے کہ اسی خلافت کی گدی پر بیٹھنے والوں کے پہلو کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ان پچھلوں میں غیر معمولی انقلابی رنگ کیسے پیدا ہوگیا تھا، مقتفی کا حال تو آپ پڑھ ہی چکے ہیں، مقتفی کے بعد اسی کا بیٹا یوسف، مستنجد باللہ کے نام سے تخت خلافت پر امام غزالی کی وفات کے ٹھیک پچاس سال بعد متمکن ہوا۔ سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے:

مستنجد عدل اور نرم مزاجی کی خصوصیتوں سے موصوف تھا۔ سارے عراق سے ناجائز محصولوں کو اس نے اٹھا دیا تھا۔

(اور) ابن اثیر کا فیصلہ تو اسی مستنجد کے متعلق یہ ہے کہ

کان احسن الخلفاء سیرۃً عباسی خلفاء میں رعیت کے ساتھ بہترین سلوک

مع الرعیۃ (ص ۱۳۵ ج ۱۱) کرنے میں مستنجد بہت اچھا خلیفہ تھا۔

مستنجد کے بعد اُس کا بیٹا حسن المستضئ باللہ کے نام سے سریرآرائے خلافت ہوا۔ اس سے بڑھ کر المستضئ کے متعلق شہادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ ابن جوزی جیسے بگڑے دل آدمی جو دوسروں پر جرح و تنقید کرنے میں ناز کی شہرت کے مالک ہیں، بخاری تک کے رواۃ پر نکتہ چینی سے ابن جوزی نہیں چوکتے۔ مستضئ کو انہوں نے خود دیکھا تھا اور بہت قریب سے دیکھا تھا، ان کی مجلس وعظ میں، اکثر شریک بھی ہوتا تھا، بہرحال منتظم میں اپنی چشم دید گواہی ابن جوزی ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:-

اظہر من العدل والکرم	عدل و کرم کا اظہار المستضئ نے جس پیمانے
مالم نرہ فی اعمارنا۔	پر کیا ہم لوگوں نے ساری زندگی میں اس کی
(ص ۲۵۱ ج ۴)	نظیر نہیں دیکھی۔

ابن اثیر نے (اسی کا حال لکھتے ہوئے) آخر میں مشہور عربی فقرہ (لکھا ہے)

فعاش حمیداً ومات سعیداً	بس بڑی ہردلعزیزی کے ساتھ اس نے
رضی اللہ تعالیٰ عنہ	زندگی بھی گزاری اور وفات بھی اس کی سعادت
(ص ۱۴۳ ج ۱۱)	کے حالات کے ساتھ ہوئی۔

ایک عربی شعر بھی ابن اثیر نے مستضئ کے ذکر کو ختم کرتے ہوئے درج کیا ہے:-

کان ایامہ من حسن سیرتہ مواسم الحج والاعیاد والجمع

یعنی اپنی سیرت و کردار سے مستضئ نے ایک ایسا حال پیدا کر دیا تھا کہ اس کی حکومت کا زمانہ گویا حج، عید اور جمعہ کے دن تھے، یعنی ہر روز روزِ عید اور ہر شب شب برات کی کیفیت تھی۔

حالانکہ یہی بغداد تھا، وہ اغزالی سے پہلے بلکہ خود ان کے عہد کے حالات کتابوں میں پڑھیے عیاروں اور طراروں، لصوص یعنی چوروں اور بٹ ماروں کے دھاوے صبح و شام ہوتے رہتے تھے۔ دینی اور آئینی زندگی سے گریز کا رجحان روز بروز عباسی خلفاء میں بڑھتا چلا جا رہا تھا یہ اس کا لازمی نتیجہ تھا، جیسا کہ میں نے لکھا بھی ہے اور لوگوں کو معلوم بھی ہے کہ ممالک عباسیہ کے مختلف جہات و اقطار میں ملوک و سلاطین کے زور آور بننے میں خلفاء کی ان ہی کمزوریوں نے امداد بہم پہنچائی تھی۔

کیا یہ انقلاب بے سبب تھا، لیکن اچانک غزالی کے بعد ذمہ داری کا یہ احساس ان ہی خلفاء

میں کیسے بیدار ہو گیا۔ اور امن و امان کا جو قصہ بغداد کی سرزمین کے لیے افسانہ بن چکا تھا۔ اسی بغداد کو عید کے ان دنوں اور شب برات کی ان راتوں میں سانس لینے کا موقع جو ملا تو لوگوں نے اس انقلاب کے سبب کو کیوں نہ تلاش کیا؟

سچی بات تو یہ ہے کہ یہی ملوک و سلاطین جن کو عباسی خلفاء کی کمزوریوں نے زور حاصل کرنے کا موقع عطا کیا تھا خود اُن کی حالت بھی غزالی کے بعد اور غزالی سے پہلے اتنی مختلف ہو گئی ہے کہ اسی اختلاف کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔"

ان ملوک و سلاطین کی حالت پہلے سے کس درجہ مختلف ہو گئی تھی۔ اس کا اندازہ کرانے کے لیے مولانا نے پچھلی تاریخ کے کچھ ورق اُلٹے ہیں۔ جن میں اسراف و فضول خرچی اور عشرت پسندی کے وہ نمونے نظر آتے ہیں کہ شاید تخیل کی رسائی بھی ان واقعات سے آگے ہونی مشکل ہے۔ اس کے مقابلہ میں مولانا کہتے ہیں کہ ذرا غزالی کے ۵۰ سو سال بعد دیکھو اسی بغدادی خلافت کا ایک متوسل سلطان نور الدین زنگی کے نام سے نظر آتا ہے۔ طویل و عریض زرخیز علاقے اس کے زیر نگین ہیں۔ شوکت کا یہ عالم ہے کہ حرمین اور یمن تک میں اس کا نام خلیفہ کے نام کے ساتھ خطبوں میں پڑھا جاتا ہے۔ لیکن زندگی کا ڈھنگ یہ ہے کہ

"شام کے شہر حمص میں تین دوکانیں تھیں (جنھیں نور الدین زنگی نے مال غنیمت کے حصہ سے خریدا تھا) ان ہی تینوں دوکانوں کے کرایہ کی آمدنی ملکہ کے لیے نور الدین نے مختص کر دی تھی۔ سالانہ کُل بیس دینار اس ذریعہ سے ملکہ کو ملتے تھے۔"

(ابن اثیر)

ملکہ نے نور الدین سے تنگی کی شکایت کرتے ہوئے اس مشاہرہ میں اضافہ چاہا۔ جواب میں نور الدین نے کہا:۔

"میرے پاس اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ باقی میرے قبضہ میں حکومت کی جو آمدنی ہے سو اس میں مسلمانوں کا میں صرف خزانچی ہوں۔ میں اس مال میں خیانت کر کے جہنم کی آگ میں تمہارے لیے گھس نہیں سکتا۔"

اس وسیع وعریض سلطنت کے مالک سلطان نے اپنی پوری آخری بیماری اس چھوٹی سی کوٹھری میں گزاردی جس میں وہ عبادت کے لیے خلوت اختیار کیا کرتا تھا۔ اور بالآخر اسی میں جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

مولانا فرماتے ہیں:۔

"اور ایک نورالدین ہی کیا، اسی کا شاہزادہ اسماعیل جو باپ کے بعد حلب کا حکمراں تھا۔ کُل (۱۹) سال کی عمر میں اس بے چارہ کی قولنج کے مرض سے وفات ہوئی۔ میں تو دنگ ہو کر رہ گیا، جب مورخین کی کتابوں میں یہ واقعہ پڑھا کہ عین ریعانِ شباب میں حکومت کی باگ حالانکہ اس کے ہاتھ میں آئی تھی، لیکن وہی شراب جس سے ملوک وسلاطین امراء واعیان تو خیر، سچی بات تو یہ ہے کہ نوکل جیسے متعصب دیندار بادشاہوں تک کی مجلسِ نشاط جس کے دور سے خالی نہ ہوتی تھی، لیکن شاہزادہ اسماعیل جب قولنج میں مبتلا ہوا تو اطبّا نے یہ طبّی تجویز پیش کی کہ تھوڑی سی شراب استعمال کیجیے۔ مرض کا ازالہ ہو جائے گا۔ اطبّاء اصرار کر رہے تھے، مگر نوجوان شاہزادہ نے کہا:۔

لا افعل حتّٰی أسئل الفقهاء میں فقہاء سے جب تک نہ پوچھ لوں گا نہ کروں گا

آخر فقہاء بلائے گئے، شافعی مذہب کے علماء نے بالاتفاق جواز کا فتویٰ دیا۔ اس نے حنفی فقہاء کو خطاب کیا، آپ لوگ کیا فرماتے ہیں۔ لکھا ہے کہ صاحب بدائع علامہ ابوبکر کاسانی مشہور حنفی امام نے بھی کہا کہ جس حال میں آپ ہیں شرعاً شراب کا استعمال آپ کے لیے جائز ہے[1]۔ مگر اس پوچھ گچھ کے بعد جو بجائے خود اس عہد کے ایک شہزادے اور وہ بھی نوجوان شہزادے سے کچھ کم اعجوبہ خیز نہیں ہے، سننے کی بات یہ ہے کہ شافعی وحنفی علماء کے ان فتوؤں کے باوجود شاہزادے نے پوچھا کہ

"میری موت کی مقررہ مدت اگر آچکی ہے تو شراب پینے سے کیا وہ ٹل جائے گی؟"

اس کا جواب جو ہو سکتا ہے وہی دیا گیا۔ یعنی قرآن جس چیز کو مؤجل قرار دے چکا ہے، جس میں

---

[1] اصل یہ ہے کہ جب تک بدل مل سکتا ہے امام ابوحنیفہ شرعی محرمات کا دواءً استعمال بھی جائز نہیں سمجھتے۔ مگر ان کے سوا عام ائمہ فقہاء حتیٰ کہ خود امام صاحب کے تلامذہ بھی دواءً استعمال کی اجازت دیتے ہیں۔ خواہ بدل سے علاج ممکن ہو یا نہ ہو۔ (منہ)

گھڑی بھر کے لیے بھی تقدیم و تاخیر کا کسی کو اختیار نہیں دیا گیا ہے۔ بھلا دوا اور علاج سے اس کو کون ٹال سکتا ہے۔

شاہزادے نے اس جواب کو سُن کر جو کہا حوصلہ کی بلندی، ایمانی برد و سکینت کی یہ کتنی اثر انگیز و عجیب و غریب مثال ہے اس نے علماء کو خطاب کرتے ہوئے اپنے دل کی بات کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔

ایسی چیز جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہو اسے استعمال کر کے خدا کی قسم میں اللہ سے ملاقات نہیں کروں گا۔ (خمر در صفحہ ۲۵۹ ج ۲)

مؤرخین نے لکھا ہے :۔

مات ولم یشربہٗ رحمہما اللہ تعالیٰ	شاہزادہ اسماعیل مرگیا اور شراب نہیں استعمال کی۔ خدا کی رحمت ان پر نازل ہو۔

سُلطان صلاح الدین ایوبی پر تعلیمات غزالیہ کا اثر

سُلطان نورالدین زنگی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد صلیبی حروب کی قیادت جس عالمگیر شہرت رکھنے والے بادشاہ صلاح الدین ایوبیؒ کے حصے میں آئی، مولانا فرماتے ہیں کہ ذرا اس کے حالات بھی دیکھیے کہ کس قدر حیرت انگیز ہیں۔

امام غزالی کی وفات کے ستائیس سال بعد امام صلاح الدین کی ولادت ہوئی۔ اُن کی مجاہدانہ زندگی سے تو خیر دنیا واقف ہے، میں اس وقت یہ ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ اتنی عظیم سلطنت کے تاجدار ہونے کے باوجود ذاتی حال اس سلطان کا یہ تھا کہ وفات کے بعد اُن کے ذاتی خزانے کا جب جائزہ لیا گیا تو

ماخرج غیر دینار صوری واربعین درھما ناصریۃ	ایک صوری اشرفی اور چالیس ناصریہ درہم کے سوا اور کچھ نہ نکلا۔[1]
(ابن اثیر ج ۱۲ ص ۳۴)	

---

[1] ابن اثیر نے تو صرف درہم و دینار کے متعلق لکھا ہے مورخ ابوالفدا جو اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ان کا بیان ہے کہ لم یخلف عقاراً ولا داراً (سلطان نے کوئی غیر منقولہ جائداد زمین وغیرہ کی شکل میں چھوڑی) نہ کوئی ذاتی مکان چھوڑا۔

ایک طرف (امام غزالی ہی کی صدی کا کچھ بیشتر کا) عضد الدولہ تھا جو چاہتا تھا کہ روزانہ اس کے خزانہ میں دس لاکھ درم جب تک داخل نہ ہوں گے دم نہ لے گا، دوسری طرف صلاح الدین کا یہ حال ہے کہ اپنے خزانے میں کچھ نہ چھوڑوں گا! ـــــ بقول ابن اثیر فاطمیوں کے مصری خزانہ کا صلاح الدین تنہا وارث ہوا تھا، مگر ان ہی کی شہادت ہے کہ

ففرقہا جمیعاً (ج ۲ ص ۳) سلطان نے سارا خزانہ تقسیم کر دیا۔

یا یک وہ کیفیت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر چڑھنے والے خطبا، اور علماء تک بھی غیر شرعی لباس سے پرہیز نہ کرتے تھے، علماء دین کے خچروں تک کے گلوں میں طلائی طوق پڑے رہتے تھے۔ یا ایک حال صلاح الدین کا تھا کہ

لم یلبس شیئاً مما ینکرہ الشرع ایسی کوئی چیز کبھی نہ پہنی جسے شریعت نے ناجائز ٹھیرایا ہو۔

مولانا فرماتے ہیں کہ

آخر آپ ہی بتائیے کہ بحث و اتفاق کے نیچے آدمی کہاں کہاں تک پناہ ڈھونڈے، اور مسلسل پیش آنے والے ان واقعات کی جو غزالی کے بعد اسلامی تاریخ میں ملتے ہیں کیا توجیہ کرے ـــــ یہ جو کچھ ذکر ہوا مشرقی اسلامی دنیا کے خلفاء و سلاطین کا تھا، لیکن جب مغربی دنیائے اسلام (اندلس اور مغربی افریقہ) کے دینی انقلاب میں ـــــ جس کا امام غزالی کے بغداد سے ہزاروں میل کا فاصلہ تھا، لوگوں کو امام غزالی کا ہاتھ نظر آتا ہے (جیسا کہ ابن خلدون نے روایت بیان کی ہے کہ "محمد بن تومرت جو مغرب میں موحدین کی دینی حکومت کا حقیقی بانی تھا امام غزالی ہی نے اس کو ایک ملاقات میں ایک طاقتور دینی سلطنت کے قیام پر آمادہ کیا تھا) اور ہم اس مغربی حکومت کا یہ رنگ دیکھتے ہیں کہ موحدین کا دوسرا بادشاہ جس کا نام یوسف بن عبدالمومن تھا، صحیح بخاری اس کو زبانی یاد تھی، جہاد کی حدیثیں خود املا کراتا تھا ساری زندگی یورپ کے عیسائی سلاطین سے اسلامی علاقوں کو واپس لینے میں اس کی گزری۔ اس کے بعد اس کا بیٹا یعقوب جانشین ہوا، جس کے متعلق دلیافعی کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

"شریعت کو پوری طاقت سے اس نے پکڑا تھا، معروف کا حکم دیتا تھا، منکرات کو اس نے

روک دیا تھا۔ اس معاملہ میں بڑا دلیر تھا، کسی جھجک کے بغیر وہ ان امور کو انجام دیتا تھا۔"

مغربی افریقہ کے سوا اندلس پر بھی اس نے دوبارہ اسلامی اقتدار قائم کر دیا تھا، بے تحاشہ دولت کا مالک تھا مگر باایں ہمہ بالاتفاق مورخین کا بیان ہے کہ

کان یلبس الصوف ویقف للمرأة	بال کے بنے ہوئے کپڑے استعمال کرتا، معنی کمبل پوش
والضعیف فیاخذ لہم حقہم	تھا، معمولی عورت اور کسی غریب کمزور کے لیے بھی
من کل ظالم عنیف	کھڑا ہو جاتا تھا، اور بڑے سے بڑے ہیکڑی
(الیافعی ج ۳ ص۲۰۳)	دکھانے والے ظالموں سے حق دلا کر رہتا تھا۔

جب مغربی سلاطین تک کے ان حالات میں لوگوں کو امام غزالی کی کار فرمائی نظر آتی ہے، تو آخر میرے پاس اس اثر کو بے بنیاد ٹھہرانے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے جب مشرق کے ان خلفاء و سلاطین و ملوک کے ان حالات میں مجھے غزالی کی روح کار فرما نظر آتی ہے —— واقعہ یہ ہے کہ غزالی کے بعد کے خلفاء، ملوک وسلاطین کے ان طبقات میں غیر معمولی انقلاب کی جن موجوں کو ہم متلاطم پاتے ہیں ان کے متعلق اس بات کا ثابت کرنا تو مشکل ہے کہ براہ راست امام کے کارندوں نے ان لوگوں کو متاثر کیا تھا، بلکہ محمد بن تومرت کے ساتھ بھی امام غزالی کے جن تعلقات کا لوگ تاریخوں میں تذکرہ جن الفاظ میں کرتے ہیں اُن سے عام تاریخی یقین کا پیدا ہونا بھی دشوار ہے، اور ذکر بھی اس واقعہ کا اتنا سرسری طور پر دوسرے واقعات کے ضمن میں کر دیا گیا ہے کہ عوام ہی نہیں خواص تک کو بھی اس کی خبر نہ پہنچ سکی، اس لیے مولانا فرماتے ہیں کہ میرا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ یہ نتائج عملاً امامؒ کی مادی کوششوں سے وابستہ تھے بلکہ

> کہنا صرف یہ ہے کہ غزالی کے دل سے ایک آواز نکلی تھی، ان کے سامنے یہ قلقلانہ تھا کہ کس کو سنا رہے ہیں، خلفاء کو یا سلاطین کو، اُمراء کو یا وزراء کو عوام کو یا خواص کو، بس وہ صرف سنانا چاہتے تھے اور امید قائم کی ہوگی کہ سننے کی جس میں صلاحیت ہوگی اپنے اپنے ظرف کے مطابق اس کو سنے گا۔ اور فائدہ اٹھائے گا۔ اور یہی واقعہ پیش آیا بھی۔"

خلفاء، وسلاطین کے بعد وزراء

آپ کے سامنے اب تک تو اُن خلفاء و ملوک ہی کی مثالیں گزری ہیں جو یکے بعد دیگرے مشرق و

مغرب میں غزالی کے بعد نمایاں ہوتے رہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا غزالی کے سامنے کوئی خاص طبقہ نہ تھا۔ سارے مسلمانوں کے لیے ان کا خطاب عام تھا۔ بس اب ذرا خلافت و سلطنت کے بلند زینوں سے نیچے اتر کر بھی دیکھیے۔

وزیر ابن ہُبیرہ یہ اسی خلیفہ مقتفی باللہ کے وزیر ہیں جس کا تذکرہ گزر چکا ہے، امام غزالی کی وفات کے کل ۴۰ سال بعد خلافتِ عباسیہ کے وزیر اعظم کے عہدے پر سرفراز ہوئے ہیں۔ نام تو ان کا یحییٰ تھا۔ ہُبیرہ جو اُن کے دادا تھے ان ہی کی طرف منسوب ہو کر ابن ہبیرہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ بارگاہ خلافت سے جیسا کہ اس زمانہ میں عام دستور ہو گیا تھا، طویل و عریض القاب ارکانِ حکومت کے نام کے آگے پیچھے لگائے جاتے تھے، ابن ہبیرہ کو بھی

وزیر العالم، العادل، عون الدین، جلال الاسلام، صفی الامام، شرف الانام معز الدولہ، عماد الأمۃ، مصطفی الخلافۃ، تاج الملوک والسلاطین، صدر الشرق والغرب، سید الوزراء،

کا لمبا چوڑا خطاب ملا تھا، مگر جو حالات کتابوں میں اُن کے ملتے ہیں اُن کو دیکھ کر یہی خیال گزرتا ہے کہ خود ابن ہبیرہ کے قلب میں نہ ان الفاظ کا کوئی وزن تھا اور نہ اس عہدے پر سرفرازی کے بعد آدمی جس جاہی و مالی اقتدار کا مالک ہو جاتا تھا اس اقتدار کی وقعت و قیمت بھی ان کی نگاہ میں پرِ پشہ سے زیادہ نہ تھی۔ ابن جوزی، ابن ہبیرہ کے صرف دیکھنے والے ہی نہیں بلکہ اُن کے حلقہ درسِ حدیث میں بیٹھنے والوں میں سے ایک ہیں۔ بڑی تفصیل سے عباسی خلافت کی اس عجیب و غریب شخصیت کا انھوں نے تذکرہ کیا ہے۔ دو واقعے سننے کے لائق ہیں۔

(۱)

صحاح ستہ کی حدیثوں کی شرح میں انتہائی تدقیق و تحقیق سے الافصاح نامی ایک کتاب خود ابن ہبیرہ نے تصنیف کی تھی۔ اسی کا درس وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر سرفراز ہونے کے بعد ایک دن دے رہے تھے۔ مالکی مذہب کے ایک فقیہ نے خواہ مخواہ ایک مسئلہ میں الجھنا شروع کیا علماء کا حلقہ تھا ہر ایک فقیہ کو سمجھاتا تھا۔ فن کی معتبر کتابیں لا لا کر دکھلائی جا رہی تھیں، مگر فقیہ کا اصرار اپنی بات پر جاری رہا۔ قدرتاً ابن ہبیرہ کو اس اصرار بیجا پر غصہ آ گیا اور زبان سے بے ساختہ یہ فقرہ نکل گیا

بھیمۃٌ انت اما تسمع ھؤلاء یشھدون والکتب المصنفۃ وانت تنازع وتفرق المجلس
(شذرات ج ۴ ص ۱۹۳)

تم نرے جانور ہو۔ کیا سن نہیں رہے ہو یہ تمام لوگ کس بات کی شہادت دے رہے ہیں اور کتابوں سے کیا معلوم ہوتا ہے، مگر تم ہو کہ جھگڑتے ہی چلے جارہے ہو، اور مجلس میں گڑبڑ پیدا کر رہے ہو۔

کہنے کو تو ابن ہبیرہ نے اس وقت ان کو "جانور" کہدیا، لیکن اس کے بعد ان کے شریف نفس میں ذمہ داری کا احساس جب بیدار ہوا تو پھر کس حال میں وہ مبتلا ہوئے؟ یہی سننے کی بات ہے۔

لکھا ہے کہ اس دن کی مجلس تو ختم ہوگئی لیکن دوسری مجلس میں جب لوگ جمع ہوئے اور قاری نے قرأت کرنی چاہی تو ابن ہبیرہ نے اس کو روک دیا اور مالکی فقیہ کی طرف خطاب کر کے کہنا شروع کیا کہ کل آپ کے ہمراہ بیجا نخواہ ایک ایسے لفظ کو میری زبان پر جاری کر دیا کہ جب تک آپ اسی لفظ سے مجھ کو مخاطب نہ کر لیں گے درس شروع نہیں ہو سکتا "آخر آپ کو بہیمہ (جانور) کہنے کا مجھے کیا حق تھا؟ میں اپنے اندر کوئی ترجیحی وجہ نہیں پاتا" —— مجلس سناٹے میں آگئی۔ خلافت عباسیہ کا وزیر اعظم اکابر و امراء کے ساتھ ایک معمولی مولوی کے سامنے قصور کا اعتراف کر کے یہ استدعا کر رہا ہے کہ مجھے "بہیمہ" یعنی جانور آپ جب تک نہ کہہ لیں گے میرے دل کو چین نہ ہوگا۔ بیان کیا گیا ہے کہ اہل مجلس پر رقت طاری ہوگئی۔ لوگ رونے لگے۔ مالکی فقیہ بھی حد سے زیادہ شرمندہ تھا۔ وزیر سے کہہ رہا تھا کہ قصور تو میرا تھا۔ مجھے معذرت پیش کرنی چاہیے، مگر ابن ہبیرہ چلا چلا کر

القصاص! القصاص!! بدلہ! بدلہ!!

کے لفظ دہراتے چلے جاتے تھے۔

آخر چند لوگ آگے بڑھے اور عرض کیا کہ ہم لوگوں کی رائے ہے کہ مالکی فقیہ کو آپ مالی شکل میں کچھ معاوضہ ادا کر دیں، مگر فقیہ کو اس سے بھی انکار تھا، بہت سمجھانے بجھانے پر بیچارہ سو اشرفیوں کے لینے پر آمادہ ہوگیا۔ اور یوں بات رفع دفع ہوئی۔

(۲)

طالب العلمی کے زمانہ میں ایک دن سڑک پر چلے جارہے تھے پھٹے حال تھے، ایک سپاہی نے بھل کا ایک ٹوکرا اٹھانے کا حکم دیا۔ اور انکار کرنے پر ایک تھپڑ اس زور سے رسید کیا کہ ابن ہبیرہ کی داہنی

آنکھ کی روشنی جاتی رہی، لیکن زندگی بھر اس کا تذکرہ کسی سے نہیں کیا۔ اتفاقاً وزارت عظمیٰ کے زمانہ میں بجرم قتل وہی شخص گرفتار ہو کر ابن ہبیرہ کے سامنے لایا گیا، انھوں نے خوں بہا ادا کر کے مدعیوں کو روانہ کر دیا۔ اور اس کو بھی پچاس اشرفیاں دے کر رخصت کیا، لوگوں نے اس غیر معمولی سلوک کی وجہ پوچھی، تب کہا کہ میری داہنی آنکھ کی روشنی جو غائب ہے، اس کا علم غالباً آپ لوگوں کو نہ ہوگا ـــــ قتل کے اسی مجرم کا یہ کرتوت ہے۔ پھر قصہ سنایا، اور آخر میں بولے کہ بدی کا بدلہ نیکی سے دینا چاہیئے، اس پر عمل کرنے کے لیے دل بے چین ہو گیا، اسی لیے اس کے ساتھ میں نے یہ خصوصی برتاؤ کیا۔

قاضی فاضل

غزالی کے بعد وزراء کے طبقہ میں ابن ہبیرہ اِن حالات میں تنہا نہیں ہیں، بلکہ کافی تعداد ایسے وزراء کی پائی جاتی ہے، کم از کم سلطان صلاح الدین کے وزیر باتدبیر قاضی فاضل سے کون ناواقف ہے، ابن عماد نے شذرات میں اُن کے متعلق لکھا ہے:۔

كان نزهاً عفيفاً نظيفاً	بڑے پاکباز، پارسا اور باصفا بزرگ تھے۔ لذتوں
قليل اللذات، كثير الحسنات	کا حصہ اُن کی زندگی میں بہت کم تھا۔ نیکیوں اور
دائم التهجد ملازم القرآن	بھلائیوں کی اُن کے یہاں کثرت تھی تہجد کے پابند
والاشتغال بعلوم الادب	اور قرآن کے ساتھ دائمی وابستگی رکھتے تھے، نیز ادبی
(ص ۳۲۵ ج ۴)	علوم میں مشغول رہتے تھے۔

مالی حالت یہ تھی کہ علاوہ وزارت عظمیٰ کی تنخواہ کے ہندوستان اور مغرب میں وسیع پیمانہ پر اُن کا تجارتی کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ جاگیریں الگ تھیں۔ صرف ایک گاؤں ترنجہ نامی سے ابن عماد نے لکھا ہے کہ پچاس ہزار اشرفی آمدنی ہوتی تھی، مگر اس تمام آمدنی میں قاضی فاضل کا اپنا حصہ کتنا تھا؟

یہی ابن عماد لکھتے ہیں:۔

كان لباسه لايساوي دينارين۔	دو اشرفی بھی اُن کے لباس کی قیمت نہ ہوتی تھی۔

سواری جب نکلتی تو ایک غلام کے سوا کوئی ساتھ نہ ہوتا، بکثرت قبرستان جاتے، جنازوں کے ساتھ چلتے اور مریضوں کے گھر جا کر عیادت کرتے۔

محمد منظور نعمانی

صحبتے با اولیاء

(حدیث کے درس و مطالعہ کے سلسلے میں اصحاب حال، ارباب دل کے بعض ایسے واقعات، نظر سے گزرتے ہیں جن میں دلوں کی زندگی کا بڑا سامان ہوتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس فیض صحبت میں ناظرین الفرقان کو بھی شریک کر لیا جائے۔ اس امت کی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری ہوئی ہے کہ کسی اچھی بات کے پہنچانے والے سے زیادہ نفع اُن بندوں نے اٹھایا جن کو پہنچانے والے نے وہ بات پہنچائی اور سنائی۔)

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

(۱)

امام ترمذی نے رات کے نوافل یعنی تہجد سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات بیان کرتے ہوئے اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث اپنی سند سے روایت کی ہے کہ:-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی نیند کے غلبہ کی وجہ سے (یا دوسرے کسی ایسے ہی سبب سے) رات کو تہجد نہیں پڑھ سکتے تھے تو اُس روز دن میں (اس کے عوض) بارہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے"[1]

---

[1] دراصل یہ ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے۔ پوری حدیث صحیح مسلم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تہجد ہی کے بیان میں مروی ہے۔ نیز صحیح مسلم ہی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے رسول اللہ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت صدیقہؓ سے اس کے روایت کرنے والے سعد بن ہشام ہیں اور اُن سے روایت کرنے والے زُرارہ بن اَوفیٰ تابعی ہیں۔ امام ترمذی کا دستور ہے کہ حسب موقع وہ راویانِ حدیث کا کچھ تعارف بھی کراتے ہیں۔ چنانچہ اس موقع پر زرارہ بن اوفیٰ کے متعلق امام ترمذی نے اپنی سند سے بہز بن حکیم کا یہ بیان نقل کیا ہے۔

"یہ زرارہ بن اوفیٰ بصرہ کے قاضی تھے، وہاں بنو قشیر کی مسجد میں نماز بھی پڑھایا کرتے تھے، ایک دن فجر کی نماز میں (سورۂ مدثر پڑھتے ہوئے) یہ آیت پڑھی "فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ فَذَٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ" (جس کا مطلب یہ ہے کہ جب قیامت کا صور پھونکا جائے گا تو وہ دن بڑا ہی سخت اور کٹھن دن ہوگا) اس آیت کے پڑھتے ہی روح جسم سے پرواز کر گئی اور بے جان ہو کر محراب ہی میں گر پڑے"۔ ــــــــ (واقعہ کے راوی بہز بن حکیم فرماتے ہیں کہ) جن لوگوں نے اُن کی میت کو مسجد سے اٹھا کر ان کے گھر پہنچایا تھا ان میں مَیں بھی تھا۔

یہ واقعہ جیسا کہ اوپر بتایا گیا امام ترمذی نے اپنی پوری سند کے ساتھ بہز بن حکیم سے روایت کیا ہے۔

(۲)

حافظِ حدیث شیخ الاسلام ابو نصر مروزی نے بھی "قیام اللیل" میں اس طرح کے متعدد واقعات نقل کئے ہیں ــــــــ فرماتے ہیں کہ

"اللہ کا کوئی بندہ قرآن مجید پڑھ رہا تھا کوئی صاحب دل سُن رہے تھے، پڑھنے والے نے یہ آیت پڑھی "رُدُّوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ" (جس کا مطلب ہے کہ قیامت کے دن لوگ پیش کیے جائیں گے اپنے حقیقی مالک کے حضور میں) تو سننے والے بزرگ کی ایک چیخ نکلی اور زمین پر گر کے تڑپنے لگے اور روح اپنے قالب کو وہیں چھوڑ کے اُسی دم اپنے حقیقی مالک

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی اس بارہ میں مروی ہے کہ رات کو سوتے رہ جانے کی وجہ سے جس شخص کا رات کا معمول کلاً یا جزءً فوت ہو جائے وہ اگر صبح کو فجر اور ظہر کے درمیان اس کو پڑھ لے تو اس کو وہی ثواب ملے گا جو رات کو پڑھنے کا ملتا ــــ ۱۲

کے حضور میں پہنچ گئی۔

(۳)

"اسی طرح کسی صاحب دل نے سنا کہ اللہ کا کوئی بندہ یہ آیت پڑھ رہا ہے
"یاایُّھا الذین آمنوا قُوا انفسکم واھلیکم نارًا وقودُھا النّاسُ والحجارۃ"
(اے ایمان والو خود اپنے کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ کی آگ سے بچانے کی فکر کرو
جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں) تو ان کا پتہ پھٹ گیا اور وہیں جاں بحق ہو گئے۔"

(۴)

"عمرو بن عتبہ تابعیؒ نے رات کو اپنے گھر میں نماز پڑھنی شروع کی یہاں تک کہ اس آیت پر پہنچے "وَأَنذِرْهُمْ يَوْمَ الْآزِفَةِ إِذِ الْقُلُوبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كَاظِمِينَ" (آپ ان کو عنقریب آنے والی قیامت کے دن سے ڈرایئے جبکہ کلیجے منہ کو آئیں گے اور (غم سے) گھٹ گھٹ جائیں گے) تو روتے روتے گر پڑے اور دیر تک نماز پڑھنے کے قابل نہ ہو سکے، جب حالت کچھ درست ہوئی تو پھر نماز شروع کی پھر وہی آیت پڑھی اور پھر گر پڑے، راوی کا بیان ہے کہ صبح تک ان کی یہی کیفیت رہی نماز نہیں پڑھ سکے بلکہ رکوع تک بھی نہیں پہنچ سکے۔"

(۵)

ایک دوسرے مشہور تابعی ثابت بنانیؒ کے متعلق یہی شیخ الاسلام ابو نصر مروزی نقل فرماتے ہیں۔ کہ

"اُن کی آنکھوں میں تکلیف تھی معالج نے کہا کہ آپ ایک بات کی ذمہ داری لے لیں آپ کی آنکھ بالکل اچھی ہو جائے گی، انھوں نے پوچھا کس بات کی ذمہ داری لے لوں؟ معالج نے کہا بس یہ کہ آپ روئیں نہیں! انھوں نے فرمایا کہ آنکھ اگر روئے نہیں تو اُس سے کیا فائدہ۔" (قیام اللیل)

(الفرقان ربیع الاول ۱۳۷۵ھ)

ربیع الاول کے مبارک موقع پر

مجلس کی پیش کش

محسنِ عالم مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تازہ ایک اہم تقریر جس میں تاریخی حقائق و واقعات کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحیح معنی میں رحمت عالم اور محسنِ انسانیت ہیں اور آپ کا احسان نسلِ انسانی اور تمدن و تہذیب پر ناقابلِ فراموش اور ناقابلِ انکار ہے۔ اردو ایڈیشن ۵۰/ انگریزی ۱/۵۰

منصبِ نبوت اور اسکے عالی مقام حاملین مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنی اس شاہکار کتاب میں بنی نوع انسان اور تمدنِ انسانی پر نبوت کے احسانات، انبیاء کرام کی امتیازی خصوصیات، نبوت کے پیدا کردہ ذہن و مزاج اور طریقۂ فکر، نبوت کے تیار کردہ انسانی نمونوں پر نبوت محمدیؐ کے لازوال اور لافانی کارناموں، ختم نبوت کی ضرورت و اہمیت، اسکے دوررس، عمیق اور انقلاب انگیز اثرات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت: ۱۴ چودہ روپے

مقالاتِ سیرت از۔ ڈاکٹر محمد آصف قدوائی۔ سنجیدہ اور شگفتہ انداز میں سیرتِ محمدیؐ کے مختلف پہلوؤں کا خلاصہ اور عطر، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مقدمہ کے ساتھ۔ قیمت۔ چھ روپے

عربی میں نعتیہ کلام از ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی عصرِ نبویؐ سے لیکر موجودہ صدی تک کے مشاہیر عرب نعت گو شعراء کا تعارف۔ اُن کے نعتیہ کلام کا نمونہ مع ترجمہ و تبصرہ اور صحابہ کرام کے جذباتِ محبت کی تشریح۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے تعارف اور مقدمہ کے ساتھ۔
قیمت:۔ دس روپے

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

اسلامی رواداری اور مساوات و بے نفسی
کا
ایک دل آویز مرقع

وہ ایک طرف بیٹھے زار و قطار رو رہے تھے

تذکرۂ رحمانیہ ص ۲۹۱

یہ زار و قطار رونے والے صاحب اردو زبان کی سب سے بڑی انقلابی نظم (مسدس حالی) کے مصنف مولانا الطاف حسین حالی تھے، ان کے استاذ شیخ حضرت مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی کا انتقال ہو رہا تھا، نزع کا عالم طاری تھا، سعادت مند شاگرد اس حال کو دیکھ کر بے قابو ہو گیا اور ڈھاڑیں مار کر رونے لگا۔ اسی زمانہ میں اخبار میں مضمون بھی لکھا تھا۔ ان الفاظ کے بعد کہ۔

"نہایت افسوس ہے کہ پانی پت ایک ایسے بزرگ سے خالی ہو گیا جو نہ صرف پانی پت کے لیے بلکہ تمام مسلمانوں کے باعث فخر تھا"

مولانا حالی کے ذمہ دار قلم کی اس شہادت کی قدر و قیمت کا اندازہ کیجیے، لکھا ہے کہ

"جس کا مثل آئندہ زمانہ میں پیدا ہونا محالات عادیہ میں معلوم ہوتا ہے"

آخر میں عربی کے اس مشہور مثالی شعر کو مولانا نے اس موقع پر درج کیا ہے کہ

وما کان قیس هلکہ هلك واحد
ولکنه بنیان قوم تھدما

خود ہی ترجمہ بھی اس شعر کا اردو میں بایں الفاظ فرمایا ہے۔

"قیس کا مرنا ایک آدمی کا مرنا نہ تھا، بلکہ وہ قوم کی بنیاد تھی، جو گر گئی"۔

("تذکرہ رحمانیہ ص۲۶۷)

قاری صاحب کیا تھے، کن کن کمالات و صفات سے سرفراز تھے، جاننے والوں کے لیے شاید اس سلسلہ میں اتنا لکھنا کافی ہو سکتا ہے کہ سیدنا شاہ عبدالعزیز کے نواسے حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب کے ارشد تلامذہ میں ایک غیر معمولی ممتاز ہستی اپنے زمانہ میں قاری صاحب کی بھی شمار ہوتی تھی۔ جیسا کہ معلوم ہے نسبی طور پر خانوادۂ ولی اللّٰہی کی علمی و عملی خصوصیتوں کے آخری چشم و چراغ شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ ہی تھے۔ غدر سے پہلے ہندوستان اپنی زبوں حالیوں میں جس حد تک پہونچ چکا تھا، شاہ صاحب ان کے دیکھنے کی تاب نہ لا سکے۔ انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں وطن (سرزمین ہند) کو سلام کر کے ہجرت کی نیت سے حجاز پہونچے، اور خاک پاک حجاز ہی میں آسودہ ہوئے۔ مکۂ معظمہ کے مشہور مقبرہ "جنت معلی" میں محو خواب ہیں۔

قاری صاحب کی علمی جلالت شان کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی حکیم الامت حضرت مرشد تھانوی جیسے بزرگوں نے تبرکاً قاری صاحب سے حدیث کی اجازت حاصل کی تھی ان ہی اجازت حاصل کرنے والوں میں ایک طرف نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مغفور بھی نظر آتے ہیں، اور دوسری طرف قاری صاحب کے حلقۂ افادہ میں شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی کو بھی ہم پاتے ہیں۔ لکھا ہے کہ

"مولانا (حالی) نے حضرت (قاری صاحب) سے صحاح ستہ کی کتابیں پڑھی تھیں"۔

("تذکرہ رحمانیہ ص۲)

جس کے معنی یہی ہیں کہ ہم وطنی کے علاوہ مولانا حالی نے قاری صاحب کو بہت قریب سے دیکھا تھا، اور اپنے ان ہی ذاتی مشاہدات و تجربات کی بنیاد پر کم از کم ان کا ذاتی احساس کہیے یا خیال یہی تھا کہ اب دنیا ان نمونوں کو شاید کبھی نہ دیکھ پائے گی جن کی نمائندگی قاری صاحب نور اللہ ضریحہ کا وجود کر رہا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ قاری صاحب کے زمانہ میں جدید نظام تعلیم کے اسکولوں اور مدرسوں سے ملک روشناس ہو چکا تھا۔ لیکن قاری صاحب ان نئے اسکولوں کو کس نظر سے دیکھتے تھے اسکے لیے یہی کافی ہے کہ بجائے "تعلیم گاہوں" کے ہمیشہ ان اسکولوں کو وہ

"مجہلے"

کے نام سے موسوم کرتے رہے۔ (دیکھئے ان کی سوانح عمری)

بہر حال ان کی تربیت و تعلیم اوّل سے آخر تک پرانے نظام ہی کے تحت ہوئی تھی، ان ہی پرانے خیال والے مسلمانوں میں وہ پیدا بھی ہوئے۔ ان ہی کے حلقہائے درس و تدریس میں لکھا پڑھا، اور ساری زندگی اسی ماحول میں گزار دی۔ لیکن باوجود اس کے کر کر کے جو کچھ وہ دکھاتے رہے اس کا اندازہ آپ کو ان چند خاص نمونوں سے ہوگا، قاری صاحب کے صاحبزادے مولٰنا عبدالسلام راوی ہیں، ریل کے سفر میں وہ اپنے والد ماجد کے ساتھ تھے۔ "ڈبہ" جس میں قاری صاحب سوار ہوئے بھرا ہوا تھا، زیادہ تعداد ہندو مسافروں کی تھی، قاری صاحب کی خاص شکل و صورت کو دیکھ کر خود بخود مسافروں نے خواہش کی کہ

"آپ تنگ ہو کر نہ بیٹھیں، ہماری طرف پاؤں پھیلا لیجئے۔"

جواب میں اپنے مذہب (اسلام) کا حوالہ دیتے ہوئے وقت کا ایک محدث ان ہی ہندو ہمسفروں سے یہ کہہ رہا تھا۔

"میرا مذہب اجازت نہیں دیتا کہ کسی انسان کے چہرے کی بے ادبی کروں، ہم ہر شخص کے چہرے کا احترام کریں گے۔" (تذکرۂ رحمانیہ ص۲۱)

اسی لیے باوجود اجازت، بلکہ اگر حضرت والا پاؤں پھیلا دیتے تو شاید ان کے ہمسفروں کو مسرت ہی ہوتی، لیکن "انسانیت" کے احترام کی تعلیم مذہب کی طرف سے اس کو جو ملی تھی، اسی پر اصرار کرتے ہوئے سفر کو پورا فرمایا، لکھا ہے کہ سفر کے ان رفیقوں سے حضرت نے یہ بھی ارشاد فرمایا۔

"تمہیں اختیار ہے جس طرح چاہو بیٹھو، مگر میں اپنے اصول کے خلاف نہیں کروں گا۔"

سفر میں جس کا یہ حال تھا۔ حضر میں اس کے ہم وطنوں کو اس رنگ میں اگر پایا گیا تھا تو اس پر تعجب کیوں کیجئے، لکھا ہے کہ

"جس گلی یا بازار سے گزرتے اور کوئی ہندو حقہ پیتا ہوتا تو حضرت کو دور سے آتا دیکھ کر حقہ اٹھا دیتا یا اِدھر اُدھر ہو جاتا۔"

وہ امی عادت پانی پت کے ان ہی عام باشندوں کی یہ تھی۔

"جب آپ (قاری صاحب) بازار میں سے گزرتے تو ہندو آپکو جھک جھک کر سلام کیا کرتے تھے۔" (ﷺ)

جس دن حضرت والا کا انتقال ہوا، تو لکھا ہے کہ

"ہندوؤں نے اپنی دوکانیں اور کاروبار بند کر دیئے اور بہت رنج و غم کا اظہار کیا۔"

صبح و شام دیکھنے والے جس پانی پت میں انہی جان افروز روح پرور نظاروں کا تماشا کر رہے تھے۔ اس وقت مسلمانوں کا پانی پت سے سیاسی اقتدار کا دبدبہ اٹھ چکا تھا، مسلمان اور ہندو دونوں تیسری بیرونی طاقت کے نیچے دبے ہوئے تھے۔ مگر اس وقت تک "انسانیت" کے احترام کا جو درس اسلام نے دیا تھا، ابھی یہ سبق ان کو یاد تھا، حافظہ سے اس قسم کی قرآنی آیتوں کا اثر مٹا نہیں تھا، مثلاً ارشاد ہوا ہے۔

وقل لعبادی یقولوا التی ھی احسن ان الشیطان ینزغ بینھم (سورۂ بنی اسرائیل)	اور کہہ دو میرے بندوں سے بولا کریں ایسی باتیں جو اچھی ہوں، الشیطان چھیڑ خانی کرتا رہتا ہے باہم ان میں۔

جس کی تفسیر میں قاضی بیضاوی لکھتے ہیں۔

یقولوا التی ھی احسن الکلمۃ التی ھی احسن ولا یخاشنو المشرکین	"بولا کریں ایسی باتیں جو اچھی ہوں" کا مطلب یہ ہے کہ ایسی بات زبان سے نکالیں جو اچھی ہو، اور مشرکین کے ساتھ سخت کلامی سے کام نہ لیں۔

مگر بجائے "الانسان" کے احترام کے، یورپ سے "قوم پرستی" کی بلا نازل ہوئی، پھر وہی پانی پت تھا، اس کا وہی آسمان تھا اور اس کی وہی زمین تھی، دیکھنے والوں نے جو کچھ وہاں دیکھا تھا اور اس وقت تک دیکھ رہے ہیں، وہ بھی سب کے سامنے ہی ہے۔[1]

---

[1] تاہم اس گئے گذرے زمانہ میں بھی اللہ کا ایک بندہ اس وقت تک ایمان و استقامت کا عملی درس اسی پانی پت میں دے رہا ہے۔ یہ ہمارے کرم فرما مولانا لقاء اللہ صوفی ہیں ۱۲

اور ہندو تو خیر محکومیت میں مسلمانوں کے اس وقت ساتھی تھے۔ آپ کو سُن کر حیرت ہوگی کہ انگریز جو حکومت سے محروم کر کے مسلمانوں کے سینوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ سروں سے وہ خونیں سیلاب بھی گذر چکا تھا جس کا نام عہد شکن حکومت نے غدر رکھ چھوڑا تھا، جو آسمان پر تھے وہ زمین پر پٹکے جا رہے تھے۔ دِلّی میں بیٹھ کر جس وقت یہ الفاظ غالب کا قلم شاید خون کے حرفوں میں لکھ رہا تھا۔

بسکہ فعّال ما یرید ہے آج	ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے	زہرہ ہوتا ہے آبِ انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے	گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہرِ دہلی کا ذرہ ذرہ خاک	تشنۂ خون ہے مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک	آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا	وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ	سوزشِ داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم	ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

خطوط میں ایک خط غالب ہی کا ہے جس میں لکھا ہے۔

"معزول بادشاہ کے ذکور، جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپیہ مہینہ پاتے ہیں، اُناث میں جو پیر زن ہیں وہ کٹنیاں، اور ......

امرائے اسلام میں اموات گنو!

پھر طویل فہرست ان کی درج کر کے آخر میں لکھا ہے۔

"قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر، اور بہادر گڈھ، بلب گڈھ، اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ کی ریاستیں مٹ گئیں، شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنر مند آدمی کیوں پایا جائے۔"

(اردوئے معلی ص۳۲۲)

لیکن جن انگریزوں نے مسلمانوں کو پایہ تخت دلّی سے نکالا تھا اور اس طریقہ سے نکالا تھا کہ بقول غالب

"یہاں (دِلّی میں) باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔"

اور آخر اس خطرہ پر تحریر ختم کی ہے کہ دلّی میں

"ابھی دیکھنا چاہیے مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں۔" (ص ۲۶)

اسی دلی سے کچھ فاصلہ پر باندا کی ریاست جہاں اس زمانہ میں حضرت قاری صاحب ممدوح کا ایک مدرسہ تھا، بیان کیا گیا ہے کہ

"جب بغاوت زوروں پر تھی، تو چھتیر انگریز مرد و زن تلاش امن میں حضرت (قاری صاحب) کے پاس آئے۔"

جس قوم کی حکومت نے مسلمانوں کو ان کے گھروں سے باہر نکالا تھا' اسی ظالم قوم کے افراد امن لینے کے لیے اسلامی اخلاق کے ایک قدیم نمونے کے سامنے آتے ہیں' مذہبی جنون (فنیٹی ازم) کا بہتان مسلمانوں کے جن غریب مُلّاؤں کے سر تھوپا گیا ہے اور آج تک تھوپا جا رہا ہے، آنکھیں کھول کر دیکھئے وہی مُلّا کھڑا ہوتا ہے۔ لکھا ہے۔

"ان سب (انگریزوں) کو اپنا مدرسہ (قاری صاحب نے) دے دیا۔"

صرف یہی نہیں کیا' یہ انگریز مدرسہ میں اتارے جا رہے تھے اور طلبہ و علماء جن کا مدرسہ سے تعلق تھا ان کو خطاب کر کر کے قاری صاحب فرماتے جا رہے تھے:

"ان مظلوم اور بے کس انگریزوں کی مدد و حفاظت اور خاطر و مدارات لوجہ اللہ بموجب حکم خدا اور رسول کرو۔"

پناہ مانگنے والوں نے پناہ مانگی ہے۔ ان کو اپنی ذاتی رائے کی بنیاد پر نہیں اللہ اور اس کے رسول (علیہ السلام) کے ارشاد کے مطابق پناہ دی جاتی ہے۔ یہ اسلامی کردار تھا جس کا نمونہ نازک ترین گھڑیوں میں اسلام اور اسلام کے ایک فینٹک مُلّا کی طرف سے پیش ہوا تھا، اور اس کے مقابلہ میں سلف رسپکٹ یا خودداری پر فخر کرنے والے انگریزوں کو اسی مدرسہ میں دیکھا گیا تھا کہ

"ڈنکن نامی ایک انگریز اپنی بیوی اور ناکتخدا لڑکی سمیت چھ ماہ مدرسہ میں پناہ گزیں رہا وہ، یعنی مسٹر ڈنکن، اور اس کی بیوی اور اس کی لڑکی، تینوں مسلمان ہو گئے تھے۔"

لیکن جب امن و امان قائم ہو گیا تو بیان کیا گیا ہے کہ چھ مہینے تک مسلمان ہونے کا اعلان کرنے والا یہی انگریز دو تین سال بعد قاری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، معلوم ہوا کہ اپنے آبائی دین کی طرف واپس ہو گیا، قاری صاحب نے دریافت فرمایا کہ

"پھر اس وقت تم نے مسلمان ہونے کا اعلان کیوں کیا تھا"

جواب میں اسی "خوددار" انگریز نے اقرار کیا تھا کہ

"محصور یا جان کا خوف تھا اس لیے مسلمان ہو گیا تھا"

حالانکہ ڈنکن کے سوا آپ دیکھ چکے انگریزوں کی کافی تعداد، باوجود عیسائی رہنے کے قاری صاحب ہی کے مدرسے میں پناہ لیے ہوئے زندہ رہی، سب کی خورش و پوشش کا جہاں تک امکان میں تھا نظم کیا گیا۔ سوانح نگار نے لکھا ہے اور صحیح لکھا ہے کہ

"یہ اس کی (ڈنکن) کی غلطی تھی، مسلمان ہو جانے کے لئے حضرت نے کسی پر کوئی جبر نہیں کیا تھا، اور نہ مسلمان ہو جانے والوں کے ساتھ بہ نسبت دوسرے انگریزوں کے کوئی خاص رعایت و سلوک آپ کرتے تھے" (ص ۱۲)

یہ ڈنکن کی اخلاقی کمزوری تھی کہ بغیر ضرورت کے نفاق کے اس طریقہ کو اس نے اختیار کر لیا تھا جو اسلامی نقطۂ نظر سے کفر سے بھی زیادہ بدتر ہو، بالجبر مسلمان بنانے کا الزام مسلمانوں پر لگانے والے یہ شاید بھول جاتے ہیں کہ جبراً اسلام قبول کرنے والا، یعنی دل سے تو اسلام کا منکر ہو، اور زبان سے اس کی صداقت کا اقرار کرلے، ایسا آدمی کافر ہی نہیں، منافق بن جاتا ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ بجائے کافر کے کسی کو منافق بنا لینا، یہ مسلمانوں کے نزدیک دین کا نیک کام کسی حیثیت سے بھی ہو سکتا ہے، لیکن آپ یہی کہتے چلے جاتے ہیں۔ اسی کو جو دیوانے ہیں باور بھی کر لیتے ہیں۔

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان انگریزوں کو اللہ اور اس کے رسول علیہ السلام کے منشاء کے مطابق اپنے مدرسہ میں پناہ دی تھی، یہ دعویٰ صرف زبان ہی سے نہیں کیا گیا تھا، بلکہ اس کے سوا اور کسی قسم کی پوشیدہ غرض اور مصلحت آپ کے سامنے نہ تھی، قدرت کی طرف سے اس کے امتحان کا بھی ایک دلچسپ نظم ہو گیا۔ اسی کتاب میں لکھا ہے کہ قیام امن کے بعد انگریزی حکومت تک جب خبر کسی طرح پہونچی، کہ باندا میں انگریزوں کی کافی تعداد مسلمانوں کے ایک مُلّا کی بدولت قتل ہونے سے محفوظ ہو گئی۔ تو علاقہ کے کمشنر صاحب کے نام حکومت کا پروانہ پہونچا، جس کی نقل کمشنر نے حضرت قاری صاحب کی خدمت میں باندہ بھجوائی اس میں کمشنر صاحب نے لکھا تھا۔

"ایک لاکھ روپے سالانہ کی جائداد کے آپ مستحق سمجھے گئے ہیں"

حکم دیا گیا تھا کہ اس انعام کے حاصل کرنے کی درخواست دیجئے۔ مولٰنا حالی صاحب نے چودھویں صدی اخبار (راولپنڈی) میں جو مضمون قاری صاحب کی وفات پر لکھا تھا، اسی میں اس انعام کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کیا ہو کہ

"حضرت نے کمشنر کے پاس جانا یا جائداد کا لینا دونوں باتیں نامنظور فرما دیں۔"

ایک انگریز جو پناہ گزینوں میں تھا اور اسی کی کوشش سے یہ صورت پیش آئی تھی، وہ خود حاضر ہوا، لیکن اس کے شدید اصرار پر بھی بس اسی قدر فرماتے ہوئے خاموش ہو گئے۔

"لانرید منکم جزاءً ولا شکوراً (یعنی نہ بدلہ ہی کے لیے میں نے یہ کیا تھا اور نہ اس کے لیے کہ تم اس کا گن گاؤ گے) ہم نے تمہاری خدمت کسی دنیوی طمع اور لالچ سے نہیں کی تھی، بلکہ ہمارے نزدیک اس وقت تمہاری امداد اور اعانت مذہباً و اخلاقاً لازمی و ضروری تھی، اور انسانی ہمدردی کا تقاضا تھا کہ مصیبت زدوں کو حتی الوسع ہم بچاتے، مجھے حکومت سے کسی صلہ کی ضرورت نہیں، اور تمہاری ذاتِ خاص سے بھی کچھ نہیں چاہتا، مجھے معاف رکھو۔"

مولانا حالی مرحوم نے لکھا ہے کہ اس تقریر کو سُن کر انگریز کے لیے کوئی چارہ کار اس کے سوا نہ تھا کہ

"نہایت ادب کے ساتھ سلام کر کے رخصت ہو گیا۔" (تذکرہ رحمانیہ ص۲۵)

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ اس زمانہ کا قصہ ہو جب مسلمانوں کی تمام تباہیوں میں سب سے زیادہ اہم معاشی تباہیوں کے قصے تھے اور یہ ایک لاکھ کی جاگیر اس زمانہ کے کچھ ہی دن بعد دس پندرہ لاکھ کی آمدنی والی جائداد بن جاتی تھی، لیکن اللہ کے کچھ بندے اس زمانہ میں بھی تھے جو یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں پر معاش کے دروازے ایک ایک کر کے بند ہوتے چلے جاتے ہیں، مگر ان ہی حالات میں لاکھوں روپے کی جائداد کی بھی کوئی قدر و قیمت ان کی نظر میں نہ تھی، ان کی نگاہ صرف "الرزاق ذو القوۃ المتین" کے مواعید نحن نرزقک والعاقبۃ للتقوی (ہم تجھے روزی پہونچائیں گے، اور آخری انجام تو بس تقوی ہی کا ہے) پر تھی، غدر کے اس ہنگامہ کے بعد اسی دنیا میں حضرت قاری صاحب کو اپنی ناسوتی زندگی کے کم و بیش تقریباً "چالیس سال" گزارنے پڑے۔ یکے بعد دیگرے دو شادیاں آپ کی ہوئیں،

بکثرت بال بچے ہوئے، پانی پت کے خوشحال گھرانوں میں آپ کا بھی شمار ہوتا تھا، اچھا کھاتے، اچھا پہنتے، اچھا پہنتے رہے، اور خدا کا وعدہ "نحن نرزقک" پورا ہوتا رہتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ معلوم ہوتا ہو کہ رزق میں اتنی کافی کشائش کی گئی تھی، کہ دس پانچ کے سوا کبھی کبھی لوگوں کو لکھے پڑھے بغیر قاری صاحب نے ہزار ہزار روپے تک بطور قرض دیے۔ لطافت اور نفاست پسندی آپ کے جبلّی اقتضاؤں کے لازمی اجزا تھے۔ ٹیڑھی بچھی ہوئی چارپائی کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ذہنی نظام مختل ہو جاتا ہو اگر کوئی چیز بے ترتیب نظر آتی ہو، ایک طرف طبعی لطافت پسندی کا حال یہ تھا کہ لوٹے کی ٹونٹی سے پانی پینے والوں کو آپ ٹوک دیا کرتے تھے، فرماتے کہ پیالہ میں پانی نکال کر پینا زیادہ مناسب اور بہتر ہو۔ لیکن ان ہی قاری صاحب کا یہ قصہ بھی لوگ نقل کرتے ہیں کہ ایک مسلمان بھنگی عبد اللہ نامی پانی پت میں تھا، نماز کے لیے مسجد بھی آتا تھا، مسلمان اس کو روک تو نہیں سکتے تھے، لیکن لکھا ہو کہ مسجد کے لوٹوں کو چھپا دیا کرتے تاکہ عبد اللہ ان میں وضو نہ کرنے پائے۔ اس حال کا احساس قاری صاحب کو بھی ہوا۔ بیان کیا ہو کہ ایک دن مسجد میں جب لوگ بھرے ہوئے تھے، آپ نے آواز دی۔

"میاں عبد اللہ! کوئیں سے تازہ پانی کا ایک لوٹا بھر کر لاؤ۔"

عبد اللہ نے حکم کی تعمیل کی، اس کے لائے ہوئے پانی سے قاری صاحب نے وضو کیا۔ پھر ایک دن یہ کر کے بھی دکھایا کہ عبد اللہ بھنگی کو پکار کر بلا رہے ہیں، اور فرما رہے ہیں کہ بھئی! ذرا پانی تو پلاؤ۔" عبد اللہ نے بھی غضب ہی کر دیا۔

انگلیاں ڈبوتا ہوا ایک پیالہ بھر لایا، قاری صاحب نے فرمایا کہ بھائی! یہ پانی تو زیادہ ہو، کچھ تم پہلے پی لو، چند گھونٹ جب عبد اللہ پی چکا تو اسی کے جھوٹے پانی کو جو پیالہ میں رہ گیا تھا، مسجد کے مسلمانوں کے سامنے قاری صاحب کو دیکھا گیا کہ بخندہ پیشانی نوش فرما رہے ہیں۔

آج چھوت چھات کے خلاف کوششوں کا ایک سلسلہ ہو جو ملک کے طول و عرض میں جاری ہو، لیکن درد کی یہ داستان کسے سنائی جائے، کہ بنی نوع انسانی کے آخری پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وفادار غلام، اسی ملک میں کیسے کیسے نمونے کر کر کے لوگوں کو دکھا رہے تھے، دھتکاری ہوئی انسانیت کو جو گلوں سے لگا رہے تھے، جو گرائے گئے تھے ان ہی کو وہ اٹھا رہے تھے، اُف ان ہی پر الزام لگایا جا رہا ہو کہ دوسروں کو اپنے نیچے دبائے ہوئے تھے۔

الغرض ہندو مسلمان انگریز ادیبوں نبیوں کے متعلق یہ اور اسی قسم کے مثالی نمونوں کا ایک دراز سلسلہ تھا جسے تقریباً (۸۰) سال کی عمر تک حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ اسی ہندوستان میں پیش فرماتے رہے، مولٰنا حالی جو ان کے خاص عقیدت مند تلامذہ میں ہیں۔ ارقام فرماتے ہیں کہ ہر جمعہ کو بڑوالی مسجد میں وعظ کہنے کا دستور تھا، قاعدہ تھا کہ وعظ کہتے ہوئے فرماتے:

"باقی انشاء اللہ آئندہ ہوگا"

لیکن آخری جمعہ جس کے بعد دنیا نے پھر آپ کا وعظ نہ سنا، ختم وعظ کے بعد خلاف دستور یہ فقرہ سنا گیا۔

"باقی بشرط زندگی"

مسجد سے گھر آئے، ہیضہ کا دورہ پڑا، شہر میں ہنگامہ برپا ہو گیا، مقامی اطباء کے سوا دیکھا گیا کہ سرہانے پر حضرت والا کے مہاراجہ پٹیالہ کے معالج خصوصی ڈاکٹر کریم اللہ بیٹھے ہوئے ہیں، آنکھیں قاری صاحب نے کھول دیں، ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر فرمانے لگے۔

"کیوں نہ ہو آخر محبت ہی تو ہے"

دلی سے بھی دوا آئی، یونانی اور ڈاکٹری مشورے کے تحت علاج میں زور جتنا ممکن تھا، لگایا گیا دوشنبہ کا دن تھا، عصر سے کچھ پہلے پیر بقاء اللہ صاحب کا بیان ہے کہ مولٰنا حالی تو زار و قطار رو رہے تھے، اور میں نے دیکھا کہ قاری صاحب کا رشتہ ناسوتی ہیکل سے ٹوٹ گیا۔

"میں نے فوراً حضرت کے دونوں قدم چوم لیے"۔ (۲۹۱)

یوں اللہ کا یہ بندہ ۱۳ ستمبر ۱۸۹۶ء مطابق ۵ ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ کو جہاں سے آیا تھا، چلا گیا۔ اب مسلمان ان ہی پرانے مدرسوں کے ان نمونوں کو ان لوگوں میں تلاش کر رہے ہیں جن میں کہ بجائے انسانیت کے اپنی قوم، اپنے وطن، اپنی زبان، الغرض اپنی خودی کے عشق کی آگ بھڑکا دی گئی ہے۔ کلچر کے لفظ کا ایک خوش نما لفافہ ہر قوم کے ہاتھ میں تھما دیا گیا ہے، حق و ناحق، راستی، و ناراستی، بھلائی اور برائی کے سارے معیار ختم کر دیے گئے ہیں، "کلچر کے اس لفافہ میں جو کچھ بند ہے، چونکہ ہمارا ہے، اسی لیے اس پر اصرار بھی ہمارا فطری حق ہے، آج افریقہ کے صحرائی مردم خور باشندے بھی "کلچر" کے اسی لفافے میں بند کر کے اپنے آبا و اجداد کی ساری ناکردنیوں کو کردنی قرار دینے پر اصرار کر رہے ہیں۔

مسلمانوں میں بھی کلچری مسلمانوں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا ہے، خوش خیالوں کا ایک گروہ ان کو دیکھ دیکھ کر شاید وقتی خوش فہمیوں کا شکار ہو رہا ہے، سمجھا جاتا ہو کہ "اسلامیات" یا "مسلمیات" پر خدا کا شکر ہے اب ہمارے اندر بھی فخر کرنے والے پیدا ہو گئے ہیں، لیکن کلچریت کی وجہ سے اسلام کی صداقت پر اصرار سوچنا چاہیے واقعی اسلام کی صداقت پر اصرار ہے اللھم انی اعوذ بک من الفتن ما ظہر منہا وما بطن۔

(الفرقان رجب ۱۳۷۲ھ)

حضرت مولینا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

(از : مولینا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی)

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے تعزیتی جلسہ کی تقریر

[۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۶ھ (۵ دسمبر ۱۹۵۷ء) کو دیوبند میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے طویل علالت کے بعد وفات پائی۔ لکھنؤ میں اس کی اطلاع پہنچنے پر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعزیتی جلسہ ہوا اس میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے جو تقریر فرمائی تھی وہ اہتمام سے قلمبند کی گئی تھی اور مولانا کی نظر سے گزرنے کے بعد جمادی الاولیٰ ۷۷ھ کے الفرقان میں شائع ہوئی تھی۔ ناظرین کرام ذیل میں اس تقریر کو ملاحظہ فرمائیں۔]

مولانا نے خطبۂ مسنونہ کے بعد فرمایا :-

مجھے اپنی اس زندگی میں جس چیز کا بار بار تجربہ اور مشاہدہ ہوا ہے یہ ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ نایاب اور مشکل کام انسان کا بروقت پہچاننا ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے تخیل اور تجربہ کے مطابق اپنے زمانہ کے مشاہیر کا ایک نقشہ اور ایک خیالی تصویر تیار کر لیتا ہے اور اس کو عام دیتا ہے ، یہاں تک کہ ایک عارف کو کہنا پڑا ہے ؎

ہر کسے از ظن خود شد یار من ۔۔۔ وز درون من نہ جست اسرار من

لیکن بعض صورتوں میں انسان کا پہچاننا اور مشکل ہو جاتا ہے : ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب اس پر کچھ اس طرح کے حجابات پڑ جاتے ہیں جو عام لوگوں میں معروف ہوں اور جو رواجی ہوں ، جن کا اپنا ایک خاص ڈھانچہ ہوتا ہے ، ایسی صورت میں انسان کا پہچاننا اور مشکل ہو جاتا ہے ،

مثلاً اگر کوئی شخص اہل دنیا کے لباس میں رہتا ہے تو اندر سے وہ خواہ کچھ بھی ہو لوگ اس کی اصل حقیقت سمجھنے کے قابل نہیں ہو سکتے، ہماری نگاہیں حجابات سے پار نہیں ہونے پاتیں۔

مولانا مدنی جن کے نام کے ساتھ کل تک زبان مدظلہ العالی کہنے کی عادی تھی اور اس وقت ہم رحمۃ اللہ علیہ کہنے پر مجبور ہو رہے ہیں، کے سمجھنے میں ایک اور آہنی حجاب حائل ہو گیا ہے یہ ان کی سیاسی حیثیت تھی، جیسا کہ کہا جاتا ہے اور آئندہ بھی کہا، لکھا اور شائع کیا جاتا رہے گا، مولانا جنگ آزادی کے بہت بڑے قائد اور رہنما تھے۔ لوگوں کے نزدیک یہ بہت بڑی بات ہوگی اور شاید مولانا کی انتہائی تعریف اور مدح سمجھی جائے گی، لیکن ایسا نہیں ہے، مولانا کی اصل صورت و حیثیت اس کے پیچھے مستور رہی ہے اور اس حجاب نے بڑے بڑے لوگوں کی نگاہوں سے ان کو اوجھل رکھا ہے۔

اصل تو یہی ہے کہ جس نے پیدا کیا ہے وہ جانتا ہے کہ کون کیا ہے الا یعلم من خلق وھو اللطیف الخبیر لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو دوسری حیثیتوں کے جاننے کا تھوڑا بہت موقع ملتا ہے، ایسے لوگوں کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ان حجابات کو اٹھائیں اور اس شخص کی اصل صورت اور حیثیت کو سامنے لائیں، میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے بھی اس کا تھوڑا بہت موقع ملا ہے اور میں اپنے لیے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ مولانا کی زندگی کے کچھ پوشیدہ گوشے جن کو مجھے دیکھنے، سمجھنے اور جاننے کا موقع ملا ہے ان لوگوں تک پہونچاؤں جو مولانا کو اب تک کچھ اور سمجھتے رہے ہیں، میں اس وقت آپ کو سامنے رکھ کر اپنی اس آواز کو دور دور تک پہونچانا چاہتا ہوں؛

مولانا اس وقت وہاں ہیں جہاں ہماری مدح و ستائش کی ان کو ضرورت نہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا ہی میں اس مقام پر پہونچا دیا تھا جہاں انسان مدح و ذم سے بے نیاز ہو جاتا ہے، اس کا تذکرہ میں اس وقت اس لیے کر رہا ہوں کہ اس کی خود ہمیں ضرورت ہے ہمیں ان کی زندگی پر نظر ڈالنی چاہیے اور اس کے مفید پہلوؤں کو اپنانا اور ان سے سبق لینا چاہیے، دوسری بات یہ ہے کہ جو باتیں میں عرض کروں گا یہ وہ ہیں جو میرے ذاتی مشاہدہ میں آئیں، ان میں کوئی مبالغہ نہیں ہے، کوئی رنگ آمیزی نہیں ہے، اس لیے کہ ان واقعات کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔

ان کی زندگی کا سب سے پہلا امتیاز اور اعلیٰ وصف اخلاص اور للّٰہیت ہے، افسوس یہ ہے کہ الفاظ کثرت استعمال سے اپنی قیمت اور وزن کھو دیتے ہیں، اخلاص بھی انھیں لفظوں میں سے ہے، ہر معمولی دیندار اور ذرا پابند صوم و صلوٰۃ آدمی کو ہم مخلص کہہ دیتے ہیں، ہمارے نزدیک آدمی کی سب سے پہلی تعریف مخلص ہوتی ہے، حالانکہ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مخلص ہونا انسان کی آخری اور انتہائی تعریف ہے۔ ان صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی للّٰہ رب العالمین کے مقام پر پہونچنا آسان نہیں ہے، یہ مقام نبوت کا پرتو ہے، میں نے مولانا کی زندگی میں اس جوہر کو بہت نمایاں دیکھا، ایسا کام جو اخلاص ہی پر مبنی ہو اور جو عام طور پر محض اللہ ہی کے لیے کیا جاتا ہو، اور جس میں کوئی دنیاوی اور مادی نفع نہ ہو مثلاً نماز پڑھنا، اس میں اخلاص کا قائم رکھنا زیادہ مشکل نہیں، اگرچہ یہ بات بھی پورے وثوق سے نہیں کہی جاسکتی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایسے کاموں میں بھی محض خال خال اور چند ہی ایک صحیح معنی میں مخلص کہے جانے کے مستحق ہوتے ہیں، لیکن جو کام اکثر و بیشتر بلکہ تمام تر دنیاوی نفع اور فائدہ کے لیے کیے جاتے ہوں، جہاں غیر مخلصین کا مجمع ہو وہاں اخلاص کا قائم رکھنا بڑا مشکل ہے۔ نماز اخلاص کے ساتھ پڑھنا آسان ہے، لیکن تجارت، مزدوری، کتابوں کا لکھنا اور شائع کرنا اخلاص کے ساتھ بہت مشکل کام ہے، اور اسی لیے اللہ نے ایسے لوگوں کا خاص طور پر ذکر فرمایا ہے جو ایسے اعمال میں اپنے اخلاص کو قائم رکھتے ہیں،

رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ واقام الصلوٰۃ

مولانا کی عظمت کا راز یہ نہیں تھا کہ وہ کوئی بڑے مقرر تھے، میں آپ کے سامنے صاف کہتا ہوں کہ مولانا کوئی جادو بیان اور شعلہ بار مقرر نہیں تھے، بلکہ وہ بقدر ضرورت ہی تقریر کرتے تھے۔ لوگ مولانا کے سامنے اس لیے نہیں جھکتے تھے کہ وہ کوئی بڑے مصنف تھے، مولانا کا شمار ملک کے نامور و ممتاز مصنفین میں نہیں، ہر شخص ان کے سامنے چھوٹا نظر آتا تھا اس لیے نہیں کہ دنیا میں ان کا جیسا کوئی عالم نہیں، میں اس کے کہنے میں کسی معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتا اور نہ اس میں مولانا کی کوئی تنقیص ہے، بہت بڑا عالم ہوجانا کوئی بڑا کمال نہیں، جو ذرا محنتی، ذہین اور فہیم ہو اور اس کو مطالعہ کا موقع ملے ایک بڑا عالم بن سکتا ہے،

مولانا کی بڑائی کا راز یہ ہے کہ وہ سرتاپا اخلاص تھے۔ وہ اپنے ہر کام میں اور ہر وقت مخلص تھے۔ ان کا ادنیٰ سے ادنیٰ اور معمولی سے معمولی اور غیر دینی سے غیر دینی کام اخلاص کے ساتھ ہوتا تھا، ان کی ساری سیاسی جدوجہد محض ابتغاء رضوان اللہ تھی، وہ صرف اس لیے اس میں منہمک رہے کہ وہ اس کو رضائے الٰہی کا ذریعہ سمجھتے تھے، وہ اس سے قرب الٰہی چاہتے تھے۔ وہ ان کے لیے "سلوک" بن گیا تھا، یہ ان کے لیے جہاد تھا اور وہ اس میں شرکت سے محض تقرب بالجہاد چاہتے تھے، جس نیت سے وہ رات کو تہجد پڑھتے تھے، آپ یقین کریں کہ اسی نیت سے وہ اسٹیج پر تقریر کرتے تھے، وہ وہاں اس نیت کے ساتھ مشغول رہتے تھے جس نیت سے وہ نوافل پڑھتے تھے، جو ثواب ان کو تہجد کی آٹھ یا دس رکعتوں میں ملتا ہوگا وہ ان کو رات کے کسی جلسہ کی شرکت میں ملتا ہوگا۔ جس طرح مجاہد میدان جنگ میں جاتا ہوگا اسی نیت سے وہ جیل خانے جاتے رہے ہوں گے، یہ آسان کام نہیں، یہ مقام وہ ہے، جو صرف اہل اللہ کو بھی نہیں؛ کاملین اولیاء اللہ ہی کو حاصل ہوسکتا ہے۔ ایک منٹ کے لیے اپنے کو ایسے ماحول میں اللہ کے قریب سمجھنا مشکل ہوتا ہے چہ جائیکہ وہاں انھوں نے گھنٹوں، دنوں، مہینوں اور سالوں اپنے کو اللہ کے ساتھ مشغول رکھا، اس کی علامت یہ ہے کہ ان کو ان کی یہ سیاسی مشغولیت ان کیفیات سے دور نہیں کرتی تھی جو اس سے علاحدہ ہوتی تھیں، جس اسٹیج پر وہ ہوتے تھے وہاں اکثر وہ لوگ بھی ہوتے تھے جنھیں نماز کا بالکل خیال بھی نہیں ہوتا تھا اور بعض اوقات اکثریت غیر مسلموں کی ہوتی تھی لیکن وہ جلسہ سے اٹھ کر کسی مسجد میں تشریف لے جاتے، وہاں اگر نماز ہوچکی ہے، کسی دوسری مسجد میں تشریف لے جاتے، جہاں جماعت ملتی وہاں پڑھتے، کہیں نہ ملتی تو اپنی علاحدہ جماعت کرتے، یہ ایک مثال ہے۔ اس طرح کے سیکڑوں واقعات ہیں جو ان کی زندگی میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کے اخلاص وللہیت اور اللہ کے ساتھ انتہائی تعلق اور مشغولیت کی دلیل ہیں، اور میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ یہ آسان کام نہیں یہ ان کی زندگی کا پہلا جوہر ہے جس نے ان کو وہ بلندی عطا کی جو ان کے سیاسی معاصرین میں کسی کو نہیں ملی۔

اس اخلاص کی ایک بڑی علامت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی اس سیاسی جدوجہد میں شروع سے حصہ لیا اور اس وقت تک حصہ لیتے رہے جب تک اس کی ضرورت تھی، لیکن جب ضرورت

پوری ہو گئی اور وقت اور موقع آیا اس محنت کی قیمت وصول کرنے کا، تو انھوں نے ہاتھ کھینچ لیے ایک وقت ہوتا ہے مزدوری کا، ایک مزدکا، مزدوری پوری کی، مسلسل کی اور محنت ومشقت سے کی، لیکن اجرت وہاں کے لیے اٹھا رکھی جہاں وہ اب ہیں، جب آزادی کا درخت لگایا جا رہا تھا اور اس کی آبیاری کے لیے خون پسینہ کی ضرورت تھی، وہ پیش پیش تھے، لیکن جب اس درخت کے پھل کھانے کا وقت آیا اس وقت وہ اللہ کا بندہ اتنی دور جا بیٹھا جہاں اس کی ہوا بھی نہ لگ سکے، وہ آزادی سے پہلے بھی ایک مدرس تھے اب بھی وہی مدرس رہے، پہلے بھی ایک مختصر سی تنخواہ پاتے تھے اب بھی وہی پاتے رہے، آزادی کی جد وجہد کے رفیقوں اور ہم سفروں میں وہی ایک شخص تھے جن کا دامن دنیاوی منفعت کے داغ اور آلودگی سے پاک رہا اور بلا واسطہ اور بالواسطہ وہ کسی طرح اپنے صاحب اقتدار و با اختیار رفیقوں کے ممنون نہیں ہوئے۔

۲۔ مولانا کی زندگی میں دوسرا نمایاں وصف ان کا عزم و عالی ہمتی تھی مسلمانوں میں بالعموم اور طبقۂ علماء میں بالخصوص قوت ارادی کی بڑی کمی نظر آتی ہے، دماغی اور ذہنی حیثیت سے بڑے بڑے ممتاز لوگ ہوں گے اور ہیں، لیکن یہ جوہر نایاب ہے، دینی وعلمی حلقہ میں مولانا جس چیز میں ممتاز تھے وہ بلند حوصلگی ہے، جس چیز کو رضائے الٰہی کے لیے ضروری سمجھا اس کو انھوں نے بڑی خوش دلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ جھیلا اور برداشت کیا بلکہ دعوت دی خواہ وہ کیسی ہی تکلیف دہ صبر آزما اور ہمت شکن ہو، انھوں نے اس وقت کئی کئی برس جیل کاٹے ہیں جب جیل جانا آسان کام نہیں تھا، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی بڑی چیز اور بظاہر زیادہ سخت چیز کا مقابلہ کر لیتا ہے، لیکن بعض چھوٹی چھوٹی باتوں سے قدم ڈگمگا جاتے ہیں، حکومت سے ٹکر لینا اور اس کی سختیوں اور مظالم کو برداشت کرنا آسان ہے لیکن بعض گھریلو معاملات اور گھریلو تعلقات کے سامنے پاؤں پھسل جاتے ہیں، لیکن مولانا نے ہر چیز کا مقابلہ کیا، انھوں نے کوئی کام اپنی زندگی میں اس لیے چھوڑ نا کیا معنی ملتوی نہیں کیا کہ وہ مشکل ہے، ہم آپ سب جانتے ہیں کہ وہ کثرت سے سفر کرتے تھے، سیاسی و غیر سیاسی، دینی و غیر دینی حلقہ میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے ان کے برابر سفر کیے ہوں، پھر ان سفروں میں لوگوں سے ملنا، باتیں کرنا، تقریریں کرنا، معمولات کا پورا کرنا، جو لوگ مولانا سے قریب رہتے ہیں وہ ان کے جوہر سے کسی قدر واقف ہیں۔ لوگوں کی دل جوئی اور محبین کی خوشی کے لیے

بڑے بڑے مشکل اور طویل سفر اپنے ذمہ لے لیتے، جگہ جگہ گھیرتے اور عزیزوں اور دوستوں کی فرمائشیں پوری کرتے، نہ بڑھاپا ان کے لیے رکاوٹ تھا، نہ بیماری، نہ مصروفیت، پھر مختلف بلکہ متضاد مشاغل اور ذمہ داریوں کا جمع کرنا بغیر اعلیٰ درجہ کے عزم اور قوت ارادی کے ممکن نہ تھا، مولانا کو وہ عزم اور طبیعت کا استقلال ملا تھا جو ملکوں اور قوموں کی زندگی میں بڑے بڑے تغیرات پیدا کر دیتا ہے، مگر افسوس کہ اس سے پورا فائدہ نہ اٹھایا جا سکا،

۳۔ دینی انہماک اور دینی مصروفیت: اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ان سے کچھ قریب رہے ہیں، ایسا مسلسل اور انتھک کام کرنے والا، اور نہ اکتانے اور نہ گھبرانے والا انسان کم نظر آیا ہوگا، واقعہ یہ ہے کہ جو مولانا کی مصروفیت کو دیکھتے تھے وہ گھبرا جاتے تھے اور پریشان ہو جاتے تھے کہ مولانا اتنا کام کیسے کرتے ہیں، سیکڑوں آدمیوں سے ملنا، درجنوں مہمانوں کی خاطر مدارات کرنا، ایک ایک سے اس کے مطلب اور ضرورت کی بات کرنا، حتیٰ کہ تعویذ چاہنے والوں کو تعویذ دینا، پھر اسی میں حدیث کے درس کی تیاری کرنا اور کئی کئی وقت، صبح شام، ظہر بعد، عشاء بعد دیر رات تک درس دینا، اور درس بھی ایسا عالمانہ و فاضلانہ جو ان کے منصب کے مطابق تھا، پھر خطوط کا جواب دینا، جب تک خود لکھ سکنے کے قابل رہے خود ہی جواب لکھتے رہے، آخر میں دوسروں سے لکھوانے لگے تھے، لیکن پھر بھی بہت سے خطوط اپنے قلم سے لکھتے، میرا خیال ہے کہ دینی شخصیتوں میں سے کسی کے پاس اتنی ڈاک نہ آتی ہوگی جتنی مولانا کے پاس آتی تھی اس لیے کہ مولانا کی حیثیت سیاسی لیڈر کی بھی تھی، شیخ طریقت کی بھی تھی اور ایک عالم دین کی بھی تھی، مہمانوں کا اکرام کرنا، ایک ایک شخص کی طرف خصوصی توجہ، اس کی ضرورت پوری کرنا اور وہ بھی پوری بشاشت، انبساط و انشراح کے ساتھ، کرامت نہیں تو اور کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ دینی امور میں اتنا انہماک و سرگرمی، یا تو میں نے مولانا الیاس صاحبؒ میں دیکھی یا مولاناؒ میں، مولانا الیاسؒ بس اپنے رنگ میں اور مولاناؒ میں اپنے رنگ میں، رات کو دس بجے کہیں سفر سے واپس آئے، اسی وقت طلبہ کو اطلاع ہوئی کہ درس ہوگا، کیسی نیند، کہاں کا تکان، پورے نشاط کے ساتھ درس دیا، اسی میں طلبہ کے سوالات کے جوابات، اور وہ بھی غیر متعلق سوالات کے جوابات ــــ آپ تعجب سے سنیں گے کہ حج کے سفر سے واپس آئے ہیں جس سفر کے بعد مہینوں لوگ تھکن اتارتے ہیں، اور کس طرح آئے ہیں کہ راستہ میں

ہر بڑے اسٹیشن پر متعلقین و محبین سے مصافحہ کرتے، مزاج پوچھتے، ملاقات کرتے آئے ہیں، آتے ہی حکم ہوا کہ سبق ہوگا، بتائیے سیاسی لیڈروں میں یہ واقعہ مل سکتا ہے کہ مشاہیر عصر میں؛ بغیر انتہائی تعلق مع اللہ کے یہ ممکن نہیں، یہ ہیں وہ کرامتیں جو بڑی بڑی حسی کرامتوں سے بدرجہا بلند ہیں۔

مولانا کا چوتھا بڑا وصف ان کی آدمیت اور انسانیت ہے، آدمیت ایک خاص لفظ ہے اور خاص معنی میں بولا جاتا ہے، معمولی بات نہیں ع

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ جب کسی کی بڑی تعریف کرتے تو فرماتے "وہ نسخۂ آدمیت" ہے ایک شخص کی وفات ہوئی تو فرمایا "مروند و آدمیت بخاک بروند" آج مولانا کے بارے میں بھی یہی جملہ بجا طور پر دوہرایا جا سکتا ہے، مولانا کی اس صفت و خصوصیت کا اندازہ ان کے مکارم اخلاق سے ہوتا ہے، دوسروں کو حتیٰ کہ معاندین و مخالفین تک کو نفع پہونچانے کی کوشش کرتے، خود تکلیفیں برداشت کر رہے ہیں لیکن دوسروں کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کی فکر کر رہے ہیں، ایسا بھی ہوا ہے کہ کوئی مہمان تھکا ماندہ کہیں سے آیا ہوا رات کو سو رہا ہے اور مولانا اس کے پیر دبا رہے ہیں، مہمان کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ یہ پیر دبانے والے مولانا ہو سکتے ہیں، اور یہی نہیں جنھوں نے ان کو تکلیفیں پہونچائیں، مولانا نے ان کے ساتھ سلوک و احسان کیا اور ہمیشہ نفع رسانی اور خدمت کی فکر میں رہتے، اور جب بھی اور جس طرح بھی موقع ملا ہے اس کو آرام و نفع پہونچایا ہے، دوسروں سے اگر اس کو کام پڑا ہے تو سفارش کی ہے، خود جا سکے تو جا کر کی ہے۔ پیغام کے ذریعہ سے ممکن ہوا تو پیغام بھیجا ہے، جس کے جیسے حقوق ہوتے، اور جس کا جیسا مرتبہ ہوا اور جس کو جیسی ضرورت ہوئی اسی کے شایان شان پورا کیا ہے، براہ راست ان مخالفین کو ضرورت پڑی تو ان کی ضرورت پوری کی اور اگر ان کے عزیزوں میں سے کسی کو ضرورت ہوئی ہے تو ان کی کار برآری کی اور ان کے واسطے سے اپنے ان معاندین کی راحت رسانی کی، انھوں نے اپنے مخالفین و معاندین کو معاف بھی کیا، ان کے لیے دعائیں بھی کرتے تھے، ان کا عمل وہ تھا جو کسی عارف نے کہا ہے۔

ہر کہ مارا یار نہ بود ایزد او را یار باد	ہر کہ مارا رنج دادہ راحتش بسیار باد
ہر کہ در راہ من خار نہد از دشمنی	ہر گلے کز باغ عمرش بشگفد گلزار باد

ہماری آپ کی بدقسمتی تھی کہ ہم نے جانا نہیں کہ وہ کیسے باطنی مراتب پر فائز تھے اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جو اس کوچہ سے واقف ہوں، اور جو اس کا احساس رکھتے ہوں، وقت کے عارفین واہل نظر کی زبان سے میں نے ان کے لیے بڑے بلند کلمات سنے ہیں، اور ان سب کو ان کی عظمت وبلندی کا معترف اور ان کی مدح وتوصیف میں رطب اللسان پایا ہے، مولانا اپنے زمانہ میں ڈاکٹر اقبالؒ کے ان اشعار کا کامل نمونہ ومصداق تھے ؎

تر دیں ما را خبر او را نظر او درون خانہ ما بیرون در
ما کلیسا دوست ما مسجد فروش او ز دست مصطفےٰ پیمانہ نوش
ما ہمہ عبد فرنگ او عبدہ او نگنجد در جہان رنگ و بو

ڈاکٹر صاحب نے کبھی کہا تھا ؎

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل یا خاک کی آغوش میں تسبیح ومناجات

مولانا کا عمل پہلے مسلک پر تھا، یہ واقعہ ہے کہ وسعت افلاک میں مولانا کی زندگی تکبیر مسلسل تھی۔

یہ میں کہوں گا کہ مولانا معصوم نہیں تھے، ایسا نہیں ہے کہ ان سے کوئی غلطی نہ ہوئی ہو اور ضروری نہیں کہ ان کی تمام سیاسی اور اجتہادی آراء ونظریات میں ان سے اتفاق کیا جائے، لیکن یہ میں ضرور کہوں گا کہ جو کچھ انھوں نے کہا یا کیا محض رضائے الٰہی اور حمیت دینی میں، ان کے لیے کوئی دنیاوی محرک یا مصلحت نہ تھی۔

مولاناؒ کا چھٹا بڑا وصف ان کا اپنے بزرگوں، اساتذہ اور شیوخ سے عاشقانہ تعلق ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ ان کی شخصیت کی کنجی ہے، اور ان کی ساری زندگی اور اس کے اہم اور عظیم واقعات کا راز یہ ہے، یہ چیز ایسی تھی جو ان کے رگ وپے میں سرایت کر گئی تھی، ان کا یہ تعلق ان کو بعض ایسی چیزوں پر آمادہ کر دیتا تھا جو ان کے عام اخلاق وصفات کے خلاف ہوتیں، اور بعض دفعہ سمجھ میں نہ آتیں کہ یہ کیسے ہوا، یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ مولانا اپنی بڑی سے بڑی توہین اور اذیت برداشت کر سکتے تھے مگر اپنے اکابر واسلاف اور شیوخ واساتذہ کی تنقیص اور ان کا استخفاف برداشت نہ کر سکتے تھے، بعض مرتبہ یہ چیز ان کی شدید بیزاری ومخالفت کا سبب بن جاتی، آخر میں اپنے اسلاف کی امانت کی حفاظت اور ان کے نقش

طرز پر چلنے اور ان کے مسلک پر قائم رہنے کا جذبہ بہت شدید ہو گیا تھا، اور وہ اس راستہ سے بال بھر ہٹنا گوارا نہیں کرتے تھے، اسی طرح سے خلافِ شریعت فعل کے دیکھنے کا تحمل نہیں رہا تھا، اور یہ تاثر ان کے عام اخلاق پر بھی غالب آ گیا تھا۔

مولانا کا ایک بہت بڑا کارنامہ جس کی اہمیت کا احساس بہت کم لوگوں کو ہے یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں اور اس کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کے بقا و قیام کا ایک بڑا ظاہری سبب مولانا ہی کی ہستی تھی، یہ وہ وقت تھا کہ بڑے بڑے کوہ استقامت جنبش میں آ گئے تھے، سب یہی سمجھتے تھے کہ اب ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہیں، مسلمانوں کی تاریخ میں دو ہی چار ایسے دور گزرے ہیں جب مسلمانوں کے اور اسلام کے بقا کا سوال آ گیا ہے۔ ۱۹۴۷ء کا ہنگامہ ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں اسی نوعیت کا تھا، اصل مسئلہ سہارنپور کے مسلمانوں کا تھا، سارا دار و مدار ان پر تھا، یہ اپنی جگہ چھوڑتے تو یوپی کے مسلمانوں کے قدم لغزش میں آ جاتے، اور سہارنپور کے مسلمانوں کا انحصار سارا کا سارا دو ہستیوں حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری مدظلہ اور حضرت مولانا مدنیؒ پر تھا، اس وقت مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ جمنا کے کنارے ہونا تھا لیکن یہ دو صاحبِ عزم مجاہد بندے وہاں جمے رہے، اور انھوں نے گھٹنے ٹیک دیے، ایک رائے پور کی نہر کے کنارے بیٹھ گیا اور ایک دیوبند میں، آپ کو معلوم ہوگا کہ رائے پور و دیوبند مشرقی پنجاب کے ان اضلاع سے جہاں کشت و خون کا ہنگامہ گرم تھا، متصل ہیں، لیکن یہ اللہ کے بندے پورے عزم و استقلال کے ساتھ جمے رہے اور انھوں نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ اسلام کو یہاں رہنا ہے اور رہے گا، انھوں نے کہا مسلمانوں کا یہاں سے نکلنا صحیح نہیں، اگر تم مشورہ چاہتے ہو تو ہم مشورہ دیتے ہیں اور اگر فتوے کی ضرورت ہے تو ہم فتویٰ دینے کو تیار ہیں کہ یہاں سے اس وقت مسلمانوں کا نکلنا درست نہیں، اس وقت جو ہندوستان میں اسلام و مسلمان قائم ہیں یہ انھیں بزرگوں کا احسان ہے، ہندوستان میں اس وقت جو مسجدیں قائم ہیں اور ان میں جو نمازیں پڑھی جا رہی ہیں اور پڑھی جاتی رہیں گی یہ ان کا طفیل ہے، ہندوستان میں جتنے مدرسے اور خانقاہیں قائم ہیں اور ان سے جو فیوض و برکات صادر ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے انھیں کے رہینِ منت ہوں گے، اور اس سب کا ثواب ان کے اعمال نامے میں لکھا جاتا رہے گا، اس سلسلہ میں

مولانا حسین احمد صاحبؒ نے سارے ملک کا دورہ بھی کیا۔ ایمان آفریں اور ولولہ انگیز تقریریں کیں، اور اپنے ذاتی اثر و رسوخ، اپنی تقریروں اور خود اپنے طرز عمل سے مسلمانوں کو اس ملک میں رہنے، اپنے ملک کو اپنا سمجھنے اور حالات کا مقابلہ کرنے پر آمادہ کیا۔

یہ بات میں اور واضح کردوں کہ مولانا کے بارے میں لوگوں کو یہ بڑا مغالطہ ہے کہ وہ موجودہ حالات سے کلی طور پر مطمئن تھے، قریب کے لوگ جانتے ہیں کہ مولانا کے سینہ کے اندر کیسا درد و سوز کیسے اسلامی جذبات اور کیسی دینی حمیت موجزن تھی، اور ان کے اندرونی احساسات کیا تھے، مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ ان کو مولانا کے ان جذبات اور اندرونی احساسات اور امت اسلامیہ اور اس کے مسائل کے ساتھ گہرے تعلق اور درد و سوز کا اندازہ نہ ہوسکا، اور مولانا کی زندگی کا یہ پہلو جتنا روشن اور معروف ہونا چاہیئے تھا روشن اور عام طور پر معروف نہ ہوسکا، آزادی کے بعد جو خلاف توقع حالات و تغیرات اس ملک میں پیش آئے، انھوں نے مولانا کی طبیعت کو بہت افسردہ کردیا تھا، ان کی عمر کا بہترین زمانہ اور ان کی بہترین قوتیں انگریزی حکومت کا مقابلہ کرنے میں صرف ہوچکی تھیں اور اس معرکہ میں وہ کامیاب ہوچکے تھے، اب ان کی ضعیفی افسردگی اور بے تعلقی کا زمانہ تھا، آخر میں ان کی تقریروں کا موضوع اور دعوت صرف ذکر کی تلقین کرنا، خاتمہ کی فکر کی طرف متوجہ کرنا تعلق مع اللہ اور ایمان باللہ کو مضبوط سے مضبوط کرنا دینی شعائر کا احیا، اور سنت نبویہ کی کثرت سے ترویج و اشاعت رہ گئی تھی۔ انھوں نے اپنے عالی مرتبہ شیوخ و اساتذہ سے تعلق مع اللہ، استقامت علی الشریعت اور باطنی مشغولیت کی جو دولت حاصل کی تھی، تمام اسفار و مشاغل و ہجوم خلائق درس و تدریس کی مصروفیت اور آخر آخر میں علالت کی شدت میں بھی وہ اسی میں مشغول تھے، اور روز بروز وہ ہر چیز پر غالب آتی جارہی تھی، زندگی کے آخری ایام تک نماز کھڑے ہوکر اور با جماعت ادا کی، یہ ناچیز آخری بار ۲۵ نومبر کو یعنی وفات سے صرف گیارہ روز پہلے حاضر ہوا، سخت تکلیف اور بے حد ضعف تھا، یہ وہی دن تھا جس دن ڈاکٹر صاحب نے تفصیلی معائنہ کرکے یہ کہا تھا کہ مولانا صرف اپنی قوت ارادی سے زندہ ہیں، اور ہمارا فن اس علالت کے سامنے ناکام ہے، اس روز بھی مولانا نے ظہر کی نماز کھڑے ہوکر اور باہر آکر جماعت کے ساتھ ادا کی مولانا کی خدمت میں

جب حاضری ہوئی تو پوری بشاشت اور استقلال کے ساتھ گفتگو فرمائی۔ ایک کتاب کے پہونچنے کا ذکر کیا، میں نے عرض کیا مجھے معلوم ہوتا کہ علالت و ضعف اس درجہ تک پہنچ گیا ہے تو کبھی اس کے پیش کرنے کی جرأت نہ کرتا، فرمایا کیوں؟ میں نے تو کئی صفحات کا مطالعہ کیا، اور نفس کتاب ہی بڑی نعمت ہے، اسی مجلس میں ایک مخلص نے جو باہر سے ملنے آئے تھے روتے ہوئے کہا کہ دنیا خالی ہوتی جا رہی ہے، فرمایا نہیں، دنیا میں بہت لوگ ہیں! انھوں نے عرض کیا کہ ہمیں دوسروں سے کیا تعلق؟ فرمایا ہمیں تو امت محمدی سے تعلق ہے۔

مولانا نے امت محمدی کی خدمت میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، انھوں نے اپنے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اور اپنے اسلاف سے جو امانت، اور ذمہ داری پائی تھی اس کو پورا کر گئے، ان کو نہ ستائش کی تمنا ہے، نہ صلہ کی پرواہ، نہ مدح و توصیف کا انتظار ہے نہ ناسپاسی اور ناشناسی کا گلہ، وہ مسلمانوں کو خطاب کر کے کہہ سکتے ہیں۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے — میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم — سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

(الفرقان بابت جمادی الاولیٰ ۱۳۹۰ھ)

ٹیلی گرام
BATRANS
بمبئی
آندھرا
ٹرانسپورٹ
کمپنی
ٹرانسپورٹ کنٹریکٹرس
ٹیلی فون — 320169
322027
۱۱۲، بھنڈاری اسٹریٹ، بمبئی ۳

محمد منظور نعمانی

اُمتِ مُسلمہ کا مقصدِ وجود اور تبلیغی جدوجہد

ایک تبلیغی اجتماع کی تقریر

الحمد للّٰہ الذی ھدٰنا لھٰذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدٰنا اللّٰہ لقد جاءت رسل ربنا بالحق۔

میرے دینی بھائیو اور دوستو! میں پہلے آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں، اور اس کا جواب بھی آپ کی طرف سے میں خود ہی دوں گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ میرا جواب آپ کے ضمیر کے بالکل مطابق ہو گا اور آپ اُس سے بالکل متفق ہوں گے۔

وہ سوال یہ ہے کہ "امتِ مسلمہ" یعنی دنیا میں مسلمان کہلانے والوں کی جو ایک وسیع قوم ہے جس کے ہم اور آپ افراد ہیں اُس کے وجود کا مقصد کیا ہے، اور وہ اس دُنیا کی کس ضرورت اور کس کمی کو پورا کرنے کے لیے پیدا کی گئی ہے؟

یہ سوال بالکل واضح ہے لیکن اگر اس کے باوجود بعض بھائیوں کو اس کا سمجھنا مشکل ہو رہا ہو تو انھیں اُصولی طور پر پہلے اس بات کو سمجھ لینا چاہیے کہ اس دنیا میں جو چیز بھی ہے اس کے وجود کا کوئی نہ کوئی خاص مقصد ضرور ہے، اور اس کی قدر و قیمت اسی وقت تک رہتی ہے جب تک کہ اس سے وہ مقصد پورا ہو۔ اگر وہ اپنا مقصد پورا کرنے کے لائق نہ رہے یا پورا نہ کرے تو اس کی وہ قدر و قیمت باقی نہیں رہتی —— میرے سامنے یہ میکروفون ہے، آپ جانتے ہیں کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ بولنے والے کی آواز اس کے ذریعہ دور تک پہونچ جائے، یہ اسی ضرورت کو پورا کرتا ہے، اب اگر اس میں کوئی ایسی خرابی آجائے کہ یہ مقصد اس سے پورا نہ ہو سکے تو پھر اس کی کوئی قیمت نہیں، اسی طرح

بجلی کے یہ بلب جو یہاں لگے ہوئے ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ ان سے روشنی کی ضرورت پوری ہو۔ اب اگر کوئی بلب ان میں سے فیوز ہو جائے اور وہ روشنی دینے کے لائق نہ رہے تو وہ کوڑے پر پھینک دیا جائے گا اور کوئی دو پیسے میں بھی اسے خریدنے پر تیار نہ ہوگا ——— یہی حال دنیا کی ساری چیزوں کا ہے، کہ ہر چیز کسی خاص مقصد کے لیے ہے، اور اس کی قدر و قیمت جب ہی تک ہے جب تک اس سے وہ مقصد پورا ہو۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس وضاحت کے بعد سب بھائیوں نے میرے اس سوال کا مطلب سمجھ لیا ہوگا، اب ذرا اس کے جواب پر غور کیجیے!

یہ تو ظاہر ہے کہ ہم اس دنیا میں صرف کھانے پینے اور نسل بڑھانے کے لیے نہیں پیدا کیے گئے ہیں۔ یہ سب کام تو جانور بھی کرتے ہیں اور ہم سے زیادہ کرتے ہیں ——— اسی طرح دنیا کے لیے نئی نئی ایجادیں کرنا اور تمدن کو ترقی دینا، یا تجارت اور زراعت، اور صنعت وغیرہ کے ذریعہ دنیا کی دولت میں اضافہ کرنا اور ضروریات کی پیداوار بڑھانا بھی ہمارے وجود کا اصل مقصد نہیں ہو سکتا۔ یہ سارے کام غیر مسلم بھی ہمیشہ کرتے رہے ہیں اور آج بھی کر رہے ہیں، اور اگر آج دنیا میں مسلمان نہ رہیں تو ان میں سے کوئی کام بھی بند نہ ہوگا ——— اس دنیا میں بہت سے ایسے علاقے اور ایسے ملک ہیں جہاں مسلمانوں کی آبادی نہیں ہے، لیکن وہاں بھی یہ سارے کام ہو رہے ہیں۔ خود ہمارے ملک میں مشرقی پنجاب کے اکثر ضلعے تقسیم کے بعد سے مسلمانوں سے بالکل خالی ہو گئے ہیں، لیکن وہاں ان میں سے کوئی کام بھی رکا نہیں پڑا ہے۔ تجارت کا بازار گرم ہے، کارخانے دھوم سے چل رہے ہیں۔ کھیتیاں ہو رہی ہیں۔ نئے نئے فارم قائم ہو رہے ہیں، بند باندھے جا رہے ہیں، نہریں نکالی جا رہی ہیں، غرض کہ مسلمانوں کے نہ ہونے سے ان میں سے کوئی کام بھی نہ تو بند ہوا ہے اور نہ اس میں کوئی خاص کمی آئی ہے، اس لیے میری یہ بات صحیح ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کو مسلمانوں کے وجود کا مقصد کہا جا سکے ——— پھر آخر اس امت کے وجود کا کیا مقصد ہے، اور یہ دنیا کے کس مرض کی دوا ہے؟

اس اہم سوال کے جواب میں میں اپنی طرف سے اور آپ کی طرف سے عرض کرتا ہوں کہ اس امت کے وجود کا اصل مقصد یہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلۂ نبوت ختم ہو جانے

کے بعد یہ دنیا میں نبیوں والے کام کو جاری رکھے یعنی اس کے وجود سے دنیا میں ایمان اور خدا پرستی والی زندگی کی شمع روشن رہے اور یہ اس کے فروغ کے لیے اور انسانوں کو اللہ کی بندگی والی مبارک زندگی میں لانے کے لیے اور ان کو "عباد اللہ الصالحین" بنانے کے لیے جد و جہد کرتی رہے۔

اس امت کے اسی مقصد وجود کا اعلان قرآن مجید میں ان الفاظ میں فرمایا گیا ہے: كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۔

دوسری جگہ ارشاد ہے ــــــ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ۔

ان آیتوں کا حاصل اور مدعا یہی ہے کہ اس دنیا میں مسلمانوں کے وجود کا مقصد بس یہ ہے کہ وہ خود ایمان اور ایمان والی زندگی کے حامل ہوں اور انسانی دنیا کو اللہ کے اس نور سے منور کرنے کے لیے جد و جہد کرتے رہیں۔

صحابۂ کرام نے اس مقصد کو خوب سمجھا تھا، وہ جب روم و ایران کے شاہی درباروں میں اسلام کے سفیر بن کر گئے اور وہاں ان سے پوچھا گیا کہ تمہارے یہاں آنے کا اصل مقصد کیا ہے اور کیا غرض تم کو یہاں لے کر آئی ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ ہم خود نہیں چلے آئے ہیں، بلکہ اللہ نے ہم کو اس کام کے لیے اٹھایا اور کھڑا کیا ہے کہ ہم اللہ کے بندوں کو دوسروں کی پرستش سے نجات دلا کر خدائے واحد کا پرستار بنائیں اور جو نور ہدایت اور جو خزینۂ سعادت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے ہم کو مل گیا ہے اس میں ہم اللہ کے سب بندوں کو شریک کریں۔ بس یہی ہمارے یہاں آنے کا مقصد و باعث ہے، اور اللہ نے ہمیں اسی کے لیے کھڑا کیا ہے اور اب بس یہی ہمارا مقصد حیات ہے۔

صحابۂ کرام کا یہ صرف زبانی بیان اور قال ہی نہیں تھا، بلکہ یہی ان کا حال بھی تھا، میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص ۲۴ گھنٹے بھی ان میں سے کسی کے ساتھ رہتا تو ان کے بارہ میں یہی شہادت دیتا کہ انھوں نے اپنے وجود اور اپنی زندگی کا مقصد بس یہی سمجھا ہے وہ اسی سانچہ میں اپنے کو ڈھال لیا ہے۔

غزوۂ بدر کے انتہائی نازک موقع پر جبکہ اُمتِ مسلمہ کے صفحۂ ہستی سے مٹ جانے کا خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے جو خاص دعا کی تھی اُس سے بھی یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا میں اس اُمت کے وجود کا مقصد بس یہی ہے کہ اس کے ذریعہ دنیا میں ایمان اور عبدیت والی زندگی کی شمع روشن رہے۔ اور اللہ کے در پر اس کے بندوں کے جھکنے اور جھکانے کا کام دنیا میں جاری رہے، حدیث و سیرت کی کتابوں میں ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں اس دن عرض کیا۔

اَللّٰهُمَّ اِنْ تُهْلِكْ هٰذِهِ الْعِصَابَةَ لَنْ تُعْبَدَ فِى الْاَرْضِ بَعْدُ

آپ کی اس دعا کا مطلب یہ تھا کہ اے اللہ! تین سو سے کچھ اوپر آپ کے یہ بندے جو اس وقت میرے ساتھ ہیں، انھوں نے میری دعوت پر ایمان اور خدا پرستی والی زندگی کے اصول کو قبول کر لیا ہے اور دنیا میں اس کو رواج دینا اور پھیلانا اپنا مقصد حیات بنا لیا ہے، اب اگر تو نے آج ان کی کوئی خاص مدد نہ فرمائی اور ان کا طاقتور دشمن ان کو مٹانے کے ارادہ میں اگر کامیاب ہو گیا تو دنیا کا کوئی کام تو بند نہ ہوگا، تجارتیں بھی ہوتی رہیں گی، کھیتی باڑی بھی ہوتی رہے گی، حکومتیں بھی چلتی رہیں گی، زمین اور آسمان بھی اپنی جگہ قائم رہیں گے، چاند اور سورج کی روشنی بھی رہے گی، جیسا ہے یہ سب کچھ یوں ہی ہوتا رہے گا، لیکن اے میرے اللہ! ایمان اور خدا پرستی والی وہ زندگی جس کے لیے تو نے مجھے بھیجا ہے وہ دنیا میں نہ رہے گی۔ اور یہ دنیا اس مقدس دولت سے ہمیشہ خالی رہے گی (لَنْ تُعْبَدَ فِى الْاَرْضِ بَعْدُ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا نے اس بات کو واضح کر دیا کہ دنیا میں آپ کی اُمت کا مقصد بعثت یہ ہے کہ ایمان اور خدا پرستی کا نور دنیا میں رہے اور پوری دنیا کو اس نور سے منور کرنے کے لیے جد و جہد ہوتی رہے، گویا یہ اُمت اس دنیا کی بس اسی ضرورت اور اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے وجود میں آئی ہے، اور یہی اس اُمت کی وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے اس کو دنیا میں رہنے کا حق ہے۔ اور وہ اللہ کی خاص نصرت اور حفاظت کی مستحق ہو سکتی ہے۔ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے اس نازک موقع پر اللہ تعالیٰ کے حضور میں یہ نہیں عرض کیا کہ اے اللہ میرے یہ ساتھی مدینہ میں اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر آئے ہیں اگر یہاں ان کے دشمن اپنے بُرے ارادوں

میں کامیاب ہو گئے تو ان کے بچے یتیم ہو جائیں گے، ان کی عورتیں بیوہ ہو جائیں گی، اور کوئی ان کی دیکھ بھال والا نہ رہے گا۔ آپ نے اللہ سے یہ بھی عرض نہیں کیا کہ ان کو دنیا میں حکومتیں کرنا ہیں اور ترقی کی نئی نئی راہیں کھولنی ہیں، انسانوں کے معیارِ زندگی کو بلند کرنا ہے، علوم و فنون سے دُنیا کے کتب خانوں کو بھرنا ہے، الغرض آپ نے اس نازک موقع پر ان میں سے کوئی بات بھی اللہ کے حضور میں عرض نہیں کی، بس یہی عرض کیا کہ اگر آپ نے اس موقع پر ان کی مدد نہ فرمائی اور یہ اپنی تعداد کی قلت اور سامانِ جنگ کی کمی کی وجہ سے دشمن کی تلواروں کا شکار ہو گئے تو ایمان اور خدا پرستی کا چراغ گل ہو جائے گا۔ اور آپ کی بنائی ہوئی یہ دُنیا اس کی روشنی سے محروم رہے گی!

بہرحال قرآن مجید کی آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے طرزِ عمل سے یہ بات بالکل متعین ہو جاتی ہے کہ دنیا میں مسلمان کہلانے والی اس اُمت کے وجود کا مقصد بس یہی ہے کہ اس کے ذریعہ دُنیا میں ایمان اور عبدیت والی وہ زندگی قائم رہے اور رواج پائے جس کو قائم کرنے اور رواج دینے کے لیے اللہ کے سارے نبی آتے رہے ہیں۔ اور اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جب تک اس اُمت میں یہ بات رہے اس کی مدد کرنا اور دنیا میں حوادث سے اس کی حفاظت کرنا اللہ کے ذمہ حق ہے، اور اس کا واسطہ دے کر آڑے وقتوں میں اللہ سے مدد مانگی جا سکتی ہے ـــــ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر اُمت کسی وقت اپنی اس خصوصیت کو کھو دے تو پھر دنیا میں اس کے باقی رہنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں، اور اگر وہ بالفرض دُنیا سے مٹ جائے تو دُنیا کی رونق میں اس سے کوئی کمی نہ آئے گی، اور دنیا کا کوئی کام بھی بند نہ ہو گا۔

اب میں عرض کرتا ہوں کہ ہم اور آپ غور کریں کہ اس لحاظ سے اس وقت اس اُمت کا کیا حال ہے اور وہ اپنے اس مقصد کو کہاں تک پورا کر رہی ہے؟

سب سے پہلے ایمان کو لیجیے، دین کی اور قرآن مجید کی خاص زبان میں ایمان جس حقیقت کا نام ہے، یہ واقعہ ہے کہ اس اُمت کی غالب اکثریت اس سے خالی ہے، اور بجائے ایمان کے بس ایک بے جان عقیدہ ہے جس میں اتنی طاقت بھی نہیں ہے کہ آدمی سے فرائض ادا کرا سکے اور فسق و فجور

کہ اللہ و رسول پر، اور اسلام کے حق ہونے پر ان کا عقیدہ ہے اور زبان سے ان سب باتوں کا اقرار بھی ہے، لیکن وہ فرائض و ارکان کے بھی پابند نہیں ہیں، اور جن گناہوں کو قرآن و حدیث میں ایمان کے بالکل منافی قرار دیا گیا ہے وہ ان کی زندگی کا جز بنے ہوئے ہیں، اگر ان کے دلوں میں حقیقی ایمان و یقین ہوتا تو ان کی حالت یہ نہ ہوتی۔

اور ایمان یقین تو خیر دل کے اندر کی چیز ہے جس کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی نہیں سکتے لیکن ظاہری اعمال اور زندگی کے اسلامی طور طریقے جو ہر شخص دیکھ سکتا ہے، ان سے بھی اس امت کی غالب اکثریت خالی ہے۔ آپ میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ اہتمام اور پابندی سے فرض نمازیں ادا کرنے والے اور فکر کے ساتھ اور صحیح طریقہ سے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کرنے والے آج اس مسلمان قوم میں سو میں پانچ بھی نہیں ہیں۔ اسی طرح اخلاق و معاملات وغیرہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں اللہ و رسول کے احکام کی پابندی کرنے والوں کا تناسب نماز اور زکوٰۃ ادا کرنے والوں سے بھی کم ہے، بلکہ حق اور انصاف کی بات یہ ہے کہ اس لحاظ سے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں اب کوئی فرق نہیں رہا ہے جتنی بداخلاقیاں اور معاشرت و معاملات وغیرہ میں جتنی گندگیاں اور خرابیاں مختلف غیر مسلم طبقوں میں ہیں، آج کی مسلمان قوم میں وہ سب موجود ہیں۔ بلکہ بعض حیثیتوں سے مسلمانوں کا نمبر دوسروں سے کچھ آگے ہی ہے۔

اب مسلمان قوم کی زندگی کے اس نقشہ کو دیکھ کر اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ وہی امت ہے جو دنیا میں اس لیے آئی تھی کہ اس کے ذریعہ ایمان اور خدا پرستی کا نور پھیلے۔

میرے بھائیو، اور بزرگو! میں اس سے ناواقف نہیں ہوں کہ اس گئی گذری حالت میں بھی مسلمانوں میں ایک تعداد اللہ کے ایسے بندوں کی موجود ہے جو اس دور میں ایمان اور خدا پرستی کا نمونہ ہیں اور جنہوں نے اس مقصد کو اور اس سلسلہ کی اپنی خاص ذمہ داری کو نہیں بھلایا ہے، بلکہ الحمدللہ میں نے خود اللہ کے ایسے بندوں کو دیکھا ہے، لیکن ان کا تناسب مسلمان قوم میں اب آٹے میں نمک کے برابر ہے، اور میری گفتگو عام قوم کے بارے میں ہے۔ اور مسلمانوں کی عام حالت وہی ہے جو میں نے ابھی ذکر کی ہے۔ اور جس سے آپ سب حضرات بھی واقف ہیں۔ اگر کسی بستی میں دو چار نیک بندے بھی رہتے ہوں، اور باقی پوری بستی بدمعاشوں کی ہو تو اس بستی کو نیکوں کی بستی نہیں کہا جائے گا بدمعاشوں ہی کی بستی کہا

جائے گا، اسی طرح مسلمانوں میں بہت تھوڑی سی تعداد میں اللہ کے جو ایسے بندے ہیں جن کی زندگی اس اُمّت کے مقصد سے آج بھی مطابقت رکھتی ہے ان کی وجہ سے پوری اُمّت کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اپنے مقصد کو پورا کر رہی ہے، بلکہ قوم کی عام حالت کے لحاظ سے یہی کہا جائے گا کہ یہ اپنے مقصد و مقام سے بالکل بیگانہ ہو گئی ہے۔ اور اب اس کے وجود سے بجائے خیر اور بھلائی پھیلنے کے شر میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اور اس لیے بالکل بجا طور پر اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی خاص نصرت اور حفاظت سے محروم کر دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا کسی قوم اور کسی اُمّت سے کوئی رشتہ نہیں، اس کے ہاں قدر و قیمت بس ایمان کی اور ایمان والے اعمال و اخلاق کی ہے۔

بہرحال مسلمان قوم کو اس انحراف اور بگاڑ کی پہلی سزا تو اس دنیا میں یہ ملی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی سرپرستی اور حمایت سے محروم ہو گئی ہے اور دُنیا میں اس کا کوئی وزن نہیں رہا ہے، یہ بات میں کسی خاص علاقہ اور ملک کے مسلمانوں کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں، میری صاف رائے یہ ہے کہ اس معاملہ میں تمام ملکوں کے مسلمان قریب قریب برابر ہی ہیں، بس ۱۹-۲۰ یا ۱۸-۲۰ کا فرق ہو گا، کسی ملک کے مسلمانوں کو بھی اللہ تعالیٰ کی وہ سرپرستی اور حمایت اب حاصل نہیں ہے جس کا وعدہ قرآن مجید میں ایمان اور خدا پرستی کی حامل اور علمبردار اُمّت کے لیے جا بجا کیا گیا ہے، اور جو صحابہ کرام کو حاصل تھی۔ جس کی وجہ سے پوری دنیا اُن کے لیے مسخر ہوتی چلی جا رہی تھی ——— یہ سزا تو اُمّت کو اپنی غفلت اور بد اعمالی کی اس دنیا میں مل چکی ہے اور آخرت کی سزا اس سے ہزاروں گنی زیادہ سخت ہو گی، قرآن مجید میں جا بجا فرمایا گیا ہے۔ "وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ" "وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَدُّ وَأَبْقَىٰ" "وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَخْزَىٰ" یعنی آخرت کا عذاب بہت تکلیف دہ اور بہت سخت ہے۔ بہت دیرپا ہے، بہت رسوا کرنے والا ہے ——— میرے بھائیو! قبر کی ایک رات کا عذاب ساری عمر کی تکلیفوں سے زیادہ سخت ہو گا، اور دوزخ کے عذاب کا ایک لمحہ ساری زندگی کے عیش و آرام کو بھلا دے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جہنم میں سب سے ہلکے درجہ کا عذاب یہ ہو گا کہ آدمی کو آگ کی جوتیاں پہنا دی جائیں گی، جس کی وجہ سے سر میں اس کا بھیجا اس طرح پکے گا جس طرح ہمارے گھروں میں چولھے پر ہانڈی پکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں رکھے، ہم میں کون ہے جو ایک لمحہ بھی اس عذاب کو برداشت

کر سکے گا۔

اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا اَللّٰھُمَّ اَجِرْنَا مِنَ النَّارِ!

بہرحال اس اُمت کی اکثریت میں جو خدا فراموشی اور آخرت کی طرف سے جو غفلت اور بے فکری اور زندگیوں میں جو فسق و فجور ہے جس کی سزا ہم کو اس دنیا میں بھی مل رہی ہے، اگر مرنے کے بعد قبر میں اور دوزخ میں بھی ان جرائم کا وہ عذاب بھگتنا پڑا جس کی خبریں قرآن و حدیث میں دی گئی ہیں تو وہ اتنا سخت ہوگا جس کا یہاں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا ——— ہاں دنیا اور آخرت کی سزا میں اتنا فرق ضرور ہے کہ دنیا میں کسی قوم اور اُمت کی بدکرداری اور بداعمالی کا خمیازہ پوری قوم کو اجتماعی طور سے بھگتنا پڑتا ہے۔ لیکن قیامت اور آخرت میں ہر شخص کو صرف اس کے اپنے ہی عمل کی جزا و سزا ملے گی، اور وہاں معاملہ بالکل انفرادی ہوگا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ۔

میرے بھائیو! دنیا اور آخرت کی ان سزاؤں کے علاوہ مسلمان قوم کے اس عمومی بگاڑ کا ایک تیسرا نتیجہ جس پر ہمیں خون کے آنسو بہانے چاہئیں یہ ہے کہ ہماری یہ بگڑی ہوئی زندگی، دنیا کے لیے اسلام کی طرف آنے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی ہے ——— دنیا اس مسلمان قوم ہی کو اسلام کا نمونہ اور نمائندہ سمجھتی ہے اور اسی کا حال دیکھ کر اسلام کے بارہ میں رائے قائم کرتی ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج بھی جبکہ دنیا کو زندگی کے کسی صحیح نظریہ اور نظام کی تلاش ہے اور غور و فکر کرنے والے غور و فکر کر رہے ہیں اسلام یعنی ایمان اور خدا پرستی کے اصول پر غور کرنے کا سوال ان کے ذہنوں میں نہیں اٹھتا۔ اگر مسلمان دنیا میں ایمان اور خدا پرستی کا صحیح نمونہ ہوتے اور دنیا انھیں دیکھ کر اسلام کو سمجھ سکتی تو یہ ممکن نہ تھا کہ قومیں اس سے دور ہی دور رہتیں اور اس کے بارہ میں غور کرنے کی بھی ضرورت نہ سمجھتیں۔

میرے بھائیو اور بزرگو! بات ہے تو بڑی کڑوی اور میرے اور آپ کے لیے بڑی تکلیف دہ، لیکن ہے بالکل سچی اور اس موقع پر کہنے کی۔ اس لیے دل پر پتھر رکھ کر کہتا ہوں کہ اسلام کا کوئی دشمن دنیا کو اسلام کی طرف اور خدا کی طرف آنے سے اتنا نہیں روک سکا۔ جتنا کہ مسلمان قوم کی بگڑی ہوئی اس زندگی نے روکا ہے۔ گویا اب صورت حال یہ ہے کہ ایمان اور خدا پرستی کی جس زندگی کو دنیا میں پھیلانا اس اُمت کے وجود کا خاص مقصد تھا، آج یہی اُمت اس کے راستہ میں دیوار بن گئی

کھڑی ہو گئی ہے ــــ اس دنیا میں بڑے بڑے حادثے ہوئے ہیں، طوفان آئے ہیں، زلزلے آئے ہیں، قحط پڑے ہیں، طاعون اور کالرا جیسی مہلک وبائی بیماریاں آئی ہیں، جنہوں نے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو ختم کر دیا ہے لیکن یہ حادثہ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت کی اکثریت ایمان اور خدا پرستی کی دولت سے خود محروم ہو کر پوری انسانی دنیا کی بھی اس سے محرومی اور دوری کا ذریعہ بن گئی ہے، ان سب حادثوں سے بڑا حادثہ ہے ــــ "فلیبك علی الاسلام من كان باكیا"

اس کے بعد میں عرض کرتا ہوں کہ ہماری زندگیوں کا جو حصہ گزر چکا اب اس کو تو واپس نہیں لایا جا سکتا؛ اس کے لیے تو اللہ تعالیٰ سے بس معافی اور مغفرت ہی مانگی جا سکتی ہے، اور اگر ہم سچے دل سے توبہ و استغفار کریں تو یقیناً اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا اور بخشنے والا ہے ــــ لیکن زندگی کا جو وقت باقی ہے اس کے بارے میں ہمیں سوچ سمجھ کے فیصلہ کرنا چاہیے کہ اس کو ہم کس طرح گزارنا چاہتے ہیں ــــ ایک صورت تو یہ ہے کہ خدا نخواستہ ہم اس بگاڑ پر راضی اور مطمئن ہو جائیں؛ اور خدا فراموشی اور نفس پرستی کی زندگی کو شعور اور ارادہ کے ساتھ اپنا لیں، اور دنیا کی دوسری قوموں کی طرح دنیا طلبی اور دنیا پرستی ہی کو اپنی زندگی کا مقصد اور مصرف بنا لیں ــ مجھے یقین ہے کہ آپ میں سے کوئی بھی اپنے لیے یہ فیصلہ نہیں کرے گا، یہ فیصلہ تو در اصل مرتد ہونے کا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ کے دین اور طریقہ سے اپنا تعلق منقطع کرنے کا فیصلہ ہو گا اور کسی ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان کہلانے والے کے متعلق بھی یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے لیے ایسا فیصلہ کر سکے گا مسلمانوں کا بگاڑ بے شک حد کو پہونچ چکا ہے، لیکن یہ سارا بگاڑ غفلت اور ضعف ایمان کا نتیجہ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اللہ و رسول اور اسلام پر ان کا عقیدہ نہ رہا ہو، اور ان کے دلوں میں انکار آ گیا ہو، گرے سے گرے فاسق فاجر مسلمانوں کا حال بھی یہی ہے کہ وہ اللہ و رسول اور اسلام سے تعلق توڑنے کو سوچ بھی نہیں سکتے ــــ اس لیے یہ مسئلہ طے شدہ ہے کہ ہم اور آپ اور پوری مسلمان قوم اپنی موجودہ بگڑی ہوئی زندگی پر راضی اور مطمئن نہیں ہو سکتے۔ جب بھی فکر اور سنجیدگی کے ساتھ اس سوال کو اٹھایا جائے گا تو سب کے دلوں کی آواز یہی ہو گی کہ ہم نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ایمان اور خدا پرستی والی زندگی چھوڑ کے اور خدا فراموشی اور نفس پرستی کی زندگی اختیار کر کے خودکشی کی ہے اور اپنے کو برباد کیا ہے، اور

ہمیں اب بھی وہی زندگی پسند ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے۔

بہرحال جہاں تک عام مسلمانوں کے عقیدہ اور دل کے جذبہ کا تعلق ہے مجھے پورا اطمینان اور یقین ہے کہ وہ بالکل یہی ہے اور اس بارہ میں ان سے کوئی نیا فیصلہ کرانے کی اور دلائل سے منوانے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ سے دعاؤں کے ساتھ تن من دھن سے اس کوشش میں لگ جانے کی ضرورت ہے کہ ہم میں اور اس پوری امت میں پھر وہ ایمان والی زندگی پیدا ہو جائے جس کے لیے دنیا میں یہ اُمت پیدا کی گئی تھی۔

بھرے بھائیو اور بزرگو! — یہ کام جس کا نام "تبلیغ" پڑ گیا ہے اور جس کے کرنے والوں کا نام آپ سے آپ "تبلیغی جماعت" مشہور ہو گیا ہے، اور جس کے سلسلے میں یہ اجتماع ہو رہا ہے، در اصل یہی کوشش اور اسی مقصد کے لیے دوڑ دھوپ ہے — شاید آپ میں سے بہت سے بھائی جو اس کام کی حقیقت سے پوری طرح واقف نہیں ہیں اس طرح کے اجتماعات سے یہ سمجھتے ہوں کہ ان اجتماعوں اور تقریروں کا نام تبلیغ ہے اور یہی وہ کام ہے جس کی تبلیغ کے نام سے ہم کو دعوت دی جاتی ہے، اور ان اجتماعوں میں شرکت ہی تبلیغی کام میں شرکت ہے، تو میں صفائی سے بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ "تبلیغ" کے لفظ کے لغوی اور عرفی معنی کچھ بھی ہوں، لیکن ہم جس تبلیغ کی دعوت دیتے ہیں اور "تبلیغی جماعت" کا جو اصل موضوع ہے وہ جلسہ یا تقریر نہیں ہے بلکہ ایک عمل اور زندگی کا ایک طریقہ ہے، ان اجتماعات میں تقریروں کے ذریعہ اُس کی دعوت دی جاتی ہے اور لوگوں کو اس پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ بہرحال یہ اجتماع اور یہ تقریر خود وہ تبلیغ نہیں ہے۔ تبلیغ والا عمل تو اُس وقت شروع ہوگا جب اس اجتماع کے ختم ہونے کے بعد آپ اس عمل کے لیے جماعتی شکل میں کہیں کو نکل جائیں گے اور اپنے دن اور اپنی راتیں ان ہدایات کے مطابق گزارنے کی کوشش کریں گے جو یہاں اس سلسلہ میں آپ کو دی جائیں گی — آپ میں سے جو بھائی اصول کی پابندی کے ساتھ کبھی تبلیغی جماعتوں میں پھرے ہیں وہ تو جانتے ہیں کہ جس تبلیغ کی ہم دعوت دیتے ہیں اس کا مطلب کیا ہے اور جنھیں ابھی اس کا موقع نہیں ملا ہے وہ پوری طرح جب ہی سمجھ سکیں گے جب اس کا تجربہ کر لیں گے۔

میں کبھی کبھی کہا کرتا ہوں کہ بہت سے لوگوں کے لیے یہ "تبلیغ" کا لفظ بھی اس کام کے سمجھنے میں حجاب بن جاتا ہے۔ کیونکہ تبلیغ کے معروف معنی کسی بات کے پہونچانے کے ہیں، اور یہ پہونچانا

عام طور سے، یا تقریر سے ہوتا ہے یا تحریر سے لیکن تبلیغی جماعت والے اپنے جس کام کو تبلیغ کہتے ہیں وہ نہ تقریر ہے نہ تحریر، بلکہ جیسا کہ ابھی میں نے عرض کیا تھا وہ ایک زندگی ہے جو کچھ اصولوں کی پابندی کے ساتھ خاص مشاغل میں گزاری جاتی ہے ——— اسی طرح ایک غلط فہمی یہ بھی ہو کہ جماعت سازی اور انجمن بازی کے اس دور میں تبلیغی جماعت کے لفظ سے بہت سے بھائی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی کوئی اسی طرح کی انجمن یا جماعت ہے جیسی کہ اس زمانے میں بنا کرتی ہیں، جن کے ممبران ہوتے ہیں۔ ارکان ہوتے ہیں اور چند عہدہ دار ہوتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہو کہ یہ ایسی کوئی جماعت نہیں ہو، بلکہ میں کہا کرتا ہوں کہ یہ بس ایسی جماعت ہے جیسی ہر مسجد میں پانچ وقت نماز کی جماعت ہوتی ہے۔ اللہ کے جو بندے نماز کے لیے وقت پر جمع ہو گئے اور انھوں نے مل کر نماز ادا کر لی، بس وہ ایک جماعت ہو گئی، بالکل یہی معاملہ ہو، یہ تبلیغ ایک دینی عمل ہے۔ اس کے لیے اللہ کے بندوں کو پکارا جاتا ہے، بلایا جاتا ہے۔ جو بندے وقت پر تیار ہو گئے اور ایک جماعت بن کر اس دینی عمل کے لیے چل دیے بس وہی ایک جماعت بن گئی اور جب وہ عمل ختم ہو گیا اور اپنے دوسرے کاموں میں لگ گئے تو وہ جماعتی حیثیت بھی ختم ہو گئی اور بس مسلمان ہی مسلمان رہ گئے۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، تبلیغ کے لفظ اور تبلیغی جماعت کے لفظ سے جو غلط فہمی بہت سے بھائیوں کو ہوتی ہے اس کو دور کرنے کے لیے یہ چند لفظ میں نے درمیان میں کہہ دیے، ورنہ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اُمتِ مسلمہ میں ایمان اور خدا پرستی والی زندگی پیدا کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر ایک جدوجہد کی ضرورت ہے، اور تبلیغ کے نام سے یہ جو کام ہو رہا ہے یہ در اصل یہی جدوجہد ہے ——— ہمارے جو بزرگ اس کام کے اصل داعی ہیں اور جن سے اللہ تعالیٰ اس زمانہ میں یہ کام لے رہا ہے اور جنھوں نے ہر طرف سے یکسو ہو کر اسی کام کو اپنی زندگی کا اصل کام بنا لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اُمتِ مسلمہ کے ظاہر و باطن میں جس تبدیلی کی ضرورت ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ عام مسلمانوں کو اس کی دعوت دی جائے کہ وہ اپنے اپنے موجودہ ماحول اور مشغلوں سے نکل کر ایک خاص مدت صرف اُن کاموں اور ان مشغلوں میں مصروف رہ کر گزاریں جن سے ایمان پیدا ہوتا اور بڑھتا ہو۔ اور جن سے ایمان والی زندگی کی تعمیر اور ترقی ہوتی ہے ——— وہ چیزیں یہ ہیں۔

(۱) کلمہ شریف سے تعلق بڑھانا، کلمہ شریف کی عظمت دل میں بٹھانا، کلمہ شریف کی حقیقت کو

دل میں اتارنا اور جمانا، اور اس کے تقاضے کے مطابق زندگی گزارنا۔

(۲) نمازیں اہتمام اور فکر سے پڑھنا، صحیح طور سے اور خشوع و خضوع سے پڑھنے کی عادت ڈالنا، نماز سے اپنا تعلق بڑھانا، یعنی پانچ وقت کی جن نمازوں کے ہم عادی ہیں اُن کے علاوہ تہجد اور اشراق و چاشت وغیرہ ان نفل نمازوں کی عادت ڈالنا جن کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی ترغیبیں دی ہیں اور ان کی بڑی بڑی تاثیریں اور برکتیں بتلائی ہیں، اسی طرح اس کی عادت ڈالنا کہ جب کوئی پریشانی اور مشکل پیش آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور آپ کے طریقہ کے مطابق نماز حاجت پڑھ کر اس مشکل کے حل ہونے کے لیے اور پریشانی کے دور ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے —— اسی طرح اس کی عادت ڈالنا کہ جب کسی کام کے بارے میں تردد ہو تو نماز استخارہ پڑھ کے اس بارہ میں اللہ تعالیٰ سے رہنمائی طلب کرلی جائے، اگر شیطان یا نفس کے بہکانے سے کوئی گناہ ہو جائے تو صلوٰۃِ توبہ پڑھ کے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی جائے اور توبہ کرلی جائے —— یہ سب وہ نمازیں ہیں جن کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی اور صحابہ کرام کے معمولات میں تھیں لیکن اب عام امت کو ان نمازوں سے گویا تعلق ہی نہیں رہا ہے —— بہرحال نماز سے تعلق بڑھانے میں یہ سب باتیں شامل ہیں اور ان سب سے ایمان میں اور تعلق باللہ میں وہ ترقی ہوتی ہے جو کسی اور تدبیر سے نہیں ہو سکتی۔

(۳) تیسرا کام اس سلسلہ کا یہ ہے کہ اُن مقدس کلمات کے ذریعہ اللہ کا ذکر کیا جائے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمائے ہیں (مثلاً کلمۂ تمجید، اور استغفار اور درود شریف اور اسی طرح قرآن مجید کی تلاوت) اور اس کے علاوہ اٹھتے بیٹھتے، اترتے چڑھتے، کھانا شروع کرتے وقت اور کھانے کے ختم پر، رفع حاجت کے لیے جاتے وقت اور اس سے فارغ ہو کے، سونے کے لیے لیٹتے وقت اور بستر سے اٹھتے ہوئے، سواری پر چڑھتے وقت اور سواری سے اترتے ہوئے، مسجد میں داخل ہوتے وقت اور مسجد سے نکلتے ہوئے اور اسی طرح دوسرے احوال و اوقات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے اور جس طرح ہر موقع پر اس سے دعائیں کرتے تھے اسی طرح اس ہمہ وقتی ذکر و دعا کی بھی عادت ڈالی جائے۔

(۴) اس کی بھی عادت ڈالی جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری ہدایت کے لیے جو علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے تھے اس کی تحصیل اور اس کے مذاکرہ میں بھی ہمارا کچھ وقت

گزارا کریں، اور علم نبوی میں ہماری یہ مشغولیت صحابہ کرام کے طرز پر ہو، یعنی جو پڑھیں یا سنیں عظمت و احترام اور ادب کے ساتھ پڑھیں اور سنیں، اس پر ایمان لائیں، اس کا یقین دل میں جمائیں، اس پر عمل کریں۔

(۵) پانچواں کام جس کی نکلنے کے اس زمانہ میں خاص طور پر مشق کرنی اور عادت ڈالنی ہو گی اس کا تعلق اخلاق اور حقوق العباد سے ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم اپنے دوسرے بھائیوں کے حقوق ادا کریں، خواہ وہ ہمارے حقوق ادا کریں یا نہ ادا کریں ہم دوسروں کو آرام اور نفع پہنچانے کی کوشش کریں اور نقصان رسانی اور ایذا رسانی سے بچیں خواہ ان کا طرزِ عمل کچھ بھی ہو ــــ یہ بات کہنے میں آسان اور ہلکی ہے میں نے بڑی آسانی سے چند سکنڈ میں کہہ دی لیکن اس پر عمل اور اس کو عادت بنانے میں کامیاب ہونا بڑا مشکل ہے۔ خود قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ۔ یعنی اس میں کامیابی بس ان ہی بندوں کو ہو گی جو اپنے میں صبر کا جوہر پیدا کر لیں گے اور جو بڑے نصیبہ ور ہوں گے۔

بہرحال تبلیغ کے نام پر نکلنے کے زمانہ میں ان سب باتوں کی مشق کرنا اور ان کو اپنی زندگی کی عادت بنانا ہو گا۔

(۶) اور ان پانچ کاموں کے علاوہ ایک چھٹا کام یہ کرنا ہو گا کہ ایمان اور ایمان والے ان اعمال کی دعوت کو لے کر اللہ کے بندوں کے پاس جانا ہو گا اور ان کو بھی اس طرزِ زندگی پر آمادہ کرنے کے لیے ہر طرح کی کوششیں اور ان کی خوشامدیں کرنی ہوں گی، اس دعوت کے لیے عمومی اور خصوصی گشت کا طریقہ بھی استعمال کیا جائے گا اور اجتماعات کے ذریعہ بھی یہ دعوت دی جائے گی، اس سلسلہ میں بعض وقت بڑی نامناسب اور تکلیف دہ باتیں بھی سننی پڑیں گی، بعض مقامات پر کسی غلط فہمی سے مسجدوں سے نکالا بھی جائے گا، اس سلسلہ میں مسلسل سفر کرنے ہوں گے جن میں اپنا خرچ کرنا ہو گا، طرح طرح کی زحمتیں اٹھانی پڑیں گی۔ وقت پر نہ سو سکنے کی، اسی طرح وقت پر کھانا نہ ملنے کی اور عادت و مزاج کے مطابق نہ ملنے کی تکلیفیں خوب پہنچیں گی۔ ساتھیوں میں ہر طرح کے اور ہر مزاج کے ہوں گے۔ اور ہر مزاج کے اور ہر طرح کے مسلمانوں سے واسطہ پڑے گا اور ان سب کے ساتھ اکرام کا معاملہ کرنا ہو گا اس طرح یہ ایک مستقل

مجاہدہ ہو گا۔

(۷) ساتویں خاص بات اس سلسلہ میں ہمارے یہ بزرگ بتلاتے ہیں کہ سب کاموں میں اخلاص کی یعنی اللہ کو راضی کرنے کی نیت کی مشق کی جائے یعنی ذکر و عبادت علمی مذاکرہ اور علم میں مشغولیت اللہ کے بندوں کے ساتھ حسن معاملہ اور ان کا اکرام اور ان باتوں کی دعوت لے کر پھرنا اور اللہ کے بندوں کے پاس جانا اور اجتماعات کرنا اور ان میں کہنا سننا سب صرف اللہ کی رضا اور ثواب کی نیت سے ہو اور ایک مہم بنا کر اس کی مشق کی جائے کہ یہ بات عادت بن جائے۔ یہ بات بھی کہنے میں آسان ہے اور عمل میں بہت مشکل۔

بہرحال تبلیغ کے لفظ سے جس زندگی کی دعوت دی جاتی ہے وہ دراصل یہ زندگی ہے، چار چار مہینے اور ایک ایک چلہ کا وقت اسی لیے مانگا جاتا ہے کہ اس مدت کی مسلسل مشق سے ان چیزوں کا کچھ ذوق پیدا ہو جائے اور کچھ رنگ چڑھ جائے، اور پھر اسی راستہ پر چلتے ہوئے آدمی ترقی کرتا ہے اور اُسے حقیقی ایمان اور عبدیت والی زندگی نصیب ہو جائے۔

بھائیو! اب آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ چند مہینے لگا کے اور تھوڑی سی تکلیفیں اٹھا کے اگر اس دولت کا کوئی حصہ نصیب ہو جائے تو یہ سودا آپ کے لیے نفع کا ہو گا یا نقصان کا ——— عرفی نے تو کہا تھا

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال صد سال می تواں بتمنا گریستن

آخر میں بس ایک بات اور کہتا ہوں ——— امت مسلمہ کے اپنے مقصد و مقام سے ہٹ جانے کا اور اس کے جس بگاڑ کا میں نے ذکر کیا ہے اور جس کو آپ کی آنکھیں بھی دیکھ رہی ہیں یہ واقعہ ہے کہ وہ کوئی آج کا یعنی ہمارے ہی اس دور کا اور ہماری اس صدی کا حادثہ نہیں ہے، بلکہ یہ بگاڑ صدیوں پہلے سے ہم میں آ چکا ہے، لیکن اب تک زمانہ ایسا رہا ہے کہ اس بگاڑ کی وجہ سے ہماری دینی اور دنیاتی حالت گرتی تو رہی مگر اس کے باوجود اللہ رسول پر اور ان کے دین پر ہمارا عقیدہ اتنا باقی رہا کہ ہم اب تک مسلمان رہے اور مسلمان ہیں۔ لیکن الحاد اور مادہ پرستی کی جو طاقتیں اور تحریکیں ہمارے اس دور میں آندھی اور سیلاب کی رفتار سے چل رہی ہیں ان کا مقابلہ یہ بے جان عقیدہ اور اس زمانہ کے مسلمانوں کا یہ نیم جان اور سسکتا ہوا ایمان نہیں کر سکتا۔ فضا میں جب سکون ہو، ہوا بھی نہ چل رہی ہو تو پرندہ کا پر اور درخت سے گرا ہوا سوکھا پتا بھی اپنی جگہ پڑا رہتا ہے۔ لیکن جب

جب آندھیاں اور سیلاب آئیں تو کمزور جڑوں والے درخت بھی اکھڑ کر بہہ جاتے ہیں اور صرف مضبوط جڑ والے درخت ہی اپنی جگہ قائم رہتے ہیں —— میرے بھائیو اور بزرگو! میں کوئی صاحب کشف والہام نہیں ہوں، گنہگار قسم کا ایک عامی مسلمان ہوں، اللہ تعالیٰ نے جو عام سمجھ اور بصیرت بخشی ہے اس کی بنا پر کہتا ہوں اور یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہمارے اس دور کے مسلمانوں میں حقیقی ایمان اور ایمان والی زندگی پیدا کرنے اور عام کرنے کے لیے اگر کوئی خاص جدوجہد وسیع پیمانہ پر اس دور میں نہ کی گئی اور یہ عام امت اسی حال میں رہی جو اس وقت اس کا بگڑا ہوا حال ہے تو یہ بیجان عقیدہ اور یہ ٹوٹا پھوٹا اسلام بھی اس کے پاس باقی نہ رہ سکے گا —— الحاد و مادہ پرستی اور جاہلیت کے آنے والے طوفانوں کے مقابلہ میں اللہ کے وہی بندے دین و ایمان پر قائم رہیں گے جن کے دلوں کو تحقیقی ایمان و یقین نصیب ہوگا اور جن کی زندگی اہل ایمان والی ہوگی —— اور اسی کے ساتھ یہ بھی یقین سے کہتا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق اور مدد سے اس وقت عام مسلمانوں میں ایمان اور ایمانی زندگی پیدا کرنے کے لیے وسیع پیمانہ پر کوئی جدوجہد صحیح طریقہ پر کر لی گئی اور اس کے نتیجہ میں اس امت کی زندگی میں اور اس کے اصل مقصد و منصب میں مطابقت پیدا ہو گئی تو انشاء اللہ پوری انسانی دنیا کے لیے ہدایت کا دروازہ کھل جائے گا اور قرآن مجید کی بات وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ قریبی دور میں پوری ہو جائے گی —— اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو وقت کی رفتار اور اس کا تقاضا سمجھنے کی اور اپنا فرض ادا کرنے کی توفیق دے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(الفرقان جمادی الاخریٰ ۱۳۷۰ھ)
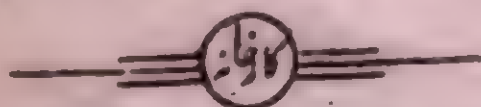
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ایک تقریر

ایک مقدس وقف اور اُس کا متولّی

دوستو! اسلام نے ہمیں یہ بتلایا ہے کہ انسان دنیا میں خدا کا نائب خلیفۃ اللہ اور دنیا کا ٹرسٹی ہے، دنیا ایک وقف ہے اور انسان اُس کا متولی، اس کے ذمہ یہاں کا انتظام اور ہدایت کا کام ہے۔ دنیا میں چھوٹے بڑے بہت سے وقف ہوتے ہیں، یہ سارا عالم، یہ ساری کائنات ایک عظیم الشان وقف (ٹرسٹ) ہے، یہ کسی کی ذاتی ملکیت، یا کسی کے باپ، دادا کی جائداد نہیں ہے کہ جس طرح چاہے کھائے اڑائے۔ اس وقف میں جانور، چرند، پرند، درخت، دریا، پہاڑ، سونا، چاندی، سامان خوراک اور دنیا کی تمام نعمتیں ہیں۔ یہ سب انسان کے حوالے کی گئی ہیں کیونکہ وہ ان کے مزاج سے بھی واقف ہے اور ان کا ہمدرد بھی۔ انسان خود اسی ٹرسٹ کی مٹی سے بنا ہے اور اسی خاک کا ہے اور منتظم کے لیے واقفیت وعلم اور ہمدردی وتعلق دونوں شرط ہیں۔ انسان دنیا کے نفع ونقصان سے بھی واقف ہے اور اس کے اندر اس کی ضروریات بھی رکھی گئی ہیں اس لئے وہ اچھا ٹرسٹی بن سکتا ہے۔

مثال کے طور پر لائبریری (کتب خانہ) کا انتظام وہی اچھا کر سکتا ہے جس کو علم کا شوق ہو اور کتابوں سے لگاؤ اور دلچسپی ہو، اگر کسی کتب خانہ کا انتظام کسی جاہل کے سپرد کر دیا گیا، چاہے وہ کتنا ہی شریف اور اچھا آدمی ہو وہ بہترین لائبریرین نہیں بن سکتا۔ لیکن جس کو علم کا شوق ہوگا اور کتابوں سے مناسبت، وہ اس میں کافی وقت صرف کرے گا۔ اس کے ذخیرہ میں معقول اضافہ کرے گا اور اس کو ترقی دے گا۔

اسی طرح انسان چونکہ اسی دنیا کا ہے اُس کو اس سے دلچسپی بھی ہے اور وہ اس کا ضرورتمند بھی ہے، اس سے واقف بھی ہے اور اس کا ہمدرد بھی، اس کو اسی میں رہنا بھی ہے اور اسی میں مرنا بھی

لہٰذا وہ اس کی پوری دیکھ بھال کرے گا اور خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو ٹھکانے لگائے گا یہ کام اس کے علاوہ اور کوئی اس خوبی سے انجام نہیں دے سکتا۔

جب حضرت آدم کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور زمین میں اپنا نائب بنایا، فرشتے جو پاک اور روحانی مخلوق ہیں جو نہ گناہ کرتے ہیں نہ گناہ کی خواہش رکھتے ہیں۔ بولے کہ اے مالک آپ ایسے کو اپنا نائب بنارہے ہیں جو دنیا میں خون خرابہ کرے گا۔ ہم تیری پاکی بیان کرتے ہیں اور تیری عبادت میں مشغول رہتے ہیں یہ منصب ہم کو عطا فرما۔ خدا نے جواب دیا، تم اس بات کو نہیں جانتے ہو۔ خدا نے آدم اور فرشتوں کا امتحان لیا۔ چونکہ آدم اسی خاک کے تھے اُن کو دنیا استعمال کرنی تھی، اُن کی فطرت کو اس سے مناسبت تھی اس لیے وہ اس کی ایک ایک چیز سے واقف تھے، انھوں نے ٹھیک ٹھیک جواب دیا۔ فرشتوں کو ان چیزوں سے واسطہ نہ تھا اس لیے جواب نہ دے سکے، اس طرح خدا نے دکھا دیا کہ دنیا کے انتظام اور اس وقف کی تولیت کے لیے اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود انسان ہی موزوں ہے۔ بلکہ یہ کمزوریاں اور ضرورتیں ہی اس کو اس منصب کا اہل ثابت کرتی ہیں۔ اگر اس دنیا میں فرشتے ہوتے تو دنیا کی اکثر نعمتیں بیکار ہی ثابت ہوتیں اور ان کی وہ ترقی ہرگز نہ ہوتی جو انسان نے اپنی ضرورت اور خواہش کی بنا پر دی۔

لیکن یہ بھی آپ کو یاد رکھنا چاہئے کہ نائب اور قائم مقام کا فرض ہے کہ قائم مقام بنانے والے کی پوری پوری پیروی کرے، وہ اسکے اخلاق کا نمونہ اور پرتو ہو، اگر میں یہاں کسی کا قائم مقام ہوں تو کامیاب اور وفادار قائم مقام اُسی وقت کہلاؤں گا جب اپنی بساط بھر اس کی نقل کروں اور اپنے اندر اس کے اخلاق پیدا کروں۔ خدا کی نیابت یہ ہے کہ اپنے اندر اس کے اخلاق پیدا کیے جائیں اور اُس کی صفات سے مناسبت ہو۔ ہمیں بتلایا گیا ہے کہ اس کی صفات و اخلاق میں علم، رحمت، شکر، احسان، انتظام، پاکبازی، عفو و درگذر، بخشش و عطا، عدل و انصاف حفاظت و نگرانی، محبت، جلال و جمال، مجرمین سے گرفت و انتقام، جامعیت و وسعت ہے، خدا کے پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کو تعلیم دی کہ خدا کے اخلاق اختیار کرو (تخلقوا باخلاق اللّٰہ) انسان اپنے محدود انسانی دائرے میں اور اپنی تمام بشری کمزوریوں کے ساتھ ان اخلاق خداوندی اور ان صفات اللہ کا پرتو اپنے اندر پیدا کرسکتا ہے وہ کبھی خدا

نہیں ہو سکتا لیکن دنیا میں خدا کے اخلاق کا مظاہرہ کر سکتا ہے اور یہی ایک سچے نائب کا کام ہے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر انسان حقیقی طور پر اپنے کو خدا کا نائب سمجھنے لگے اور اخلاق خداوندی کو اپنی زندگی کا معیار بنائے تو خود اس کی ترقی و بلندی اور اس کے دورِ خلافت و نیابت میں دنیا کی خوش حالی اور سرسبزی کا کیا حال ہوگا؟ مذہب انسان کا بلند ترین اور معتدل ترین تصور بخشتا ہے۔ وہ انسان کو خدا کا نائب اور اس زمین کے انتظام میں اس کا قائم مقام اور اس عظیم الشان وقف کا اس کو متولی قرار دیتا ہے، اس سے بڑھ کر انسان کا اعزاز اور انسانیت کی معراج نہیں ہو سکتی۔

گر انسانوں نے خود دو متضاد تصور قائم کیے۔ کہیں تو انسان کو خدا بنا یا گیا اور اس کی عبادت ہونے لگی اور کہیں جانور سے بدتر سمجھ لیا گیا اور اُس کو گائے بیل کی طرح ہنکا یا جانے لگا۔ بعض انسان خود خدا بن بیٹھے اور بعض اپنے کو جانور سے بدتر سمجھنے لگے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم کو صرف پیٹ سے کام ہے اور صرف نفس دیا گیا ہے، یہ دونوں تصور غلط ہیں بلکہ صریح ظلم ہے، نہ انسان خدا ہے نہ جانور، انسان، انسان ہی ہے لیکن نائب خدا، ساری دنیا اس کے لیے پیدا کی گئی ہے اور وہ خدا کے لیے، ساری دنیا اس کے سامنے جواب دہ ہے اور وہ خدا کے سامنے، یہ زمین یہ دنیا کسی کی ذاتی جائداد نہیں، ایک وقف ہے اور انسان اُس کا متولی۔ اس تصور اور اس عقیدے کے بغیر دنیا کی چول ٹھیک نہیں بیٹھ سکتی۔ تاریخ کی شہادت ہے کہ جب انسان اس راہ راست سے ہٹا اور اپنی حد سے بڑھا اور خدا بننے کی کوشش کی اور اپنے کو دنیا کا حقیقی مالک سمجھا یا اپنے مرتبے سے گرا اور اپنے کو جانور سمجھا یا دنیا کے انتظام اور تولیت سے دست بردار ہوا اور زندگی کی ذمہ داریوں اور فرائض سے اُس نے گریز کیا تو خود بھی برباد ہوا اور یہ دنیا بھی تباہ ہوئی۔

آج یورپ جس کے ہاتھ میں دنیا کی باگ ڈور ہے اور وہ انسانیت کا لیڈر بنا ہوا ہے، اس نے حیوانیت کے درجہ سے بھی ایک قدم آگے بڑھایا، اُس نے انسان کا جماداتی تصور پیش کیا۔ وہ کہتا ہے کہ انسان روپیہ ڈھالنے کی مشین اور ایک کامیاب ٹکسال ہے۔ البتہ اس کے اندر خواہشات ہیں لیکن سراسر حیوانیہ کاشش کہ وہ انسان کو صرف ایک مشین ہی رہنے دیتا جس کے اندر اپنی کوئی خواہش اور ارادہ نہیں۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ وہ مشین بھی ہے اور خود غرض بھی اور مردم آزار بھی۔ یورپ کے اس دورِ قیادت میں سارا عالم ایک بے جان فیکٹری

بنا جاتا ہے جس میں کبھی کبھی بڑا خطرناک ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ اس مشینی دور میں لطیف انسانی جذبات و احساسات، انسان سے ہمدردی، دل کا گداز ڈھونڈھنے سے نہیں ملتا، اس ٹکسال میں کہیں خدا کا نام نہیں، اس کی سچی طلب، دل سوزی نہیں۔ نہ آنکھوں میں نمی ہے نہ دل میں گرمی، نہ انسانیت کی لطافت ہے نہ قلب وروح کی حرارت۔ حالانکہ جس دل میں محبت اور معرفت نہیں وہ انسان کا دل نہیں پتھر کی سل ہے، جس آنکھ میں کبھی آنسو نہ آئے وہ انسان کی آنکھ نہیں نرگس کی آنکھ ہے۔ اب سوائے روپیہ، پیٹ اور اغراض کے کچھ نہیں۔ میں اپنے شہر میں صبح ٹہلنے نکلتا ہوں تو مختلف پارٹیوں اور دوستوں کی ٹولیوں کے پاس سے گزرنا ہوتا ہے، ادھر سے دو آدمی گزرے ادھر سے چار آدمی آئے لیکن برسوں حسرت رہی کہ ان مسلمان اور ہندو بھائیوں سے کچھ اور سنوں لیکن سوائے اس کے اور کچھ سننے میں نہیں آتا کہ آپ کی تنخواہ کتنی ہے؟ آپ کی بالائی آمدنی کیا ہو جاتی ہے؟ آپ کا تبادلہ کہاں ہو رہا ہے، فلاں افسر بدمزاج ہے، فلاں افسر بہت اچھا ہے۔ بیٹے کی شادی میں اتنا خرچ ہوا بیٹی کو اتنا جہیز دیا، ہمارا فنڈ اتنا جمع ہے۔ فلاں کا بنک میں اتنا حساب ہے اور اب تو کرکٹ کا دور دورہ ہے، ہر جگہ کرکٹ کا تذکرہ۔ ہر جگہ کھیلنے والوں پر تبصرہ! میں کھیل کا مخالف نہیں خود بھی کھیلا ہوں اور اس کا ذوق رکھتا ہوں، ورزشوں اور مردانہ کھیلوں کو مفید اور ضروری سمجھتا ہوں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہی زندگی کا ایک موضوع بن کر رہ جائے اور صبح سے شام تک اس کے تذکرہ سے فرصت نہ ہو آپ نے سنا ہوگا کہ پاکستان میں ایک صاحب کا اس خبر سے ہارٹ فیل ہو گیا کہ ایک کھلاڑی ۹۹ رن بنا کر آؤٹ ہو گیا اور سنچری نہ بنا سکا۔ میں نے بعض سفروں میں دیکھا ہے کہ دو دو تین تین گھنٹے تک مسلسل کرکٹ کی ٹیم اور اس کے کھیل پر تبصرہ ہوتا رہا، ایکسی ڈنٹ کے لیے بھی موضوع نہ بدلا۔ انسانو! تم نے دنیا کو کلب بنایا، ٹکسال بنایا، کارخانہ بنایا، جنگ کا میدان بنایا مگر آدمیوں کی بستی نہ بنائی! پہلے ہر گاؤں، ہر قصبے میں، اللہ کے ایسے بندے ہوتے تھے جن سے دل کی پیاس بجھتی تھی، جس طرح زبان کی ایک پیاس ہوتی ہے اسی طرح دل کی بھی پیاس ہوتی ہے، زبان کی پیاس پانی، شربت، سوڈے لیمن سے بجھتی ہے۔ دل کی پیاس سچی اور پاک محبت کی باتوں اور محبوب حقیقی کے تذکرے سے بجھتی ہے۔ روپیہ، دولت اور نفس کی خواہشات کے ذکر سے بھڑکتی ہے، آج ہر چیز کی دوکانیں

ہیں۔ منڈیاں ہیں، بازار ہیں لیکن دل کی دوا اور روح کی غذا نایاب ہوتی جاتی ہے اور کہنے والے عرصہ سے کہہ رہے ہیں ع

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دوکان اپنی بڑھا گئے

آج نہ گھروں میں خدا کا ذکر ہے، نہ دیوں میں، حتیٰ کہ مسجدوں، مندروں میں بھی اس کا ذکر و فکر کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ آج جگہ جگہ ہوا و ہوس اور نا و نوش کا شور برپا ہے۔ رہی سہی کمی، یہ سینما پوری کر دیتے ہیں۔ جو حیوانی جذبات بھڑکانے کا خاص کام کرتے ہیں۔ روح بے قرار ہے۔ اللہ کا بندہ کہاں جائے؟ اگر صرف پیسہ ہی کمانا انسان کا کام ہے اور پیٹ بھر لینا ہی اس کا فرض تھا تو یہ دل انسان کو کیوں دیا گیا۔ دماغ کیوں عطا کیا گیا۔ ایسی بے چین اور بلند پرواز روح کیوں بخشی گئی ایسی گوناگوں اور عجیب و غریب صلاحیتیں کیوں ودیعت کی گئیں؟

یورپ نے انسان کو ایندھن سمجھ لیا، وہ اپنی عزت و خواہشات کے الاؤ میں انسانوں کو لکڑی کوئلہ کی طرح ڈالتا جا رہا ہے۔ امریکہ کی خواہش ہے کہ شمالی کوریا اور کمیونسٹ چین کو بھینٹ چڑھادے روس چاہتا ہے کہ قوم پرست چین کو تباہ کر کے رکھ دے۔ پورا یورپ چاہتا ہے کہ مشرق بعید یا مشرق وسطیٰ جنگ کا میدان بن جائے کسی کو انسانیت کا درد نہیں، کسی کے دل میں انسان کا احترام نہیں۔ سب خدا کی مملکت کے غاصب بننا چاہتے ہیں کوئی خدا کا نائب بننا نہیں چاہتا۔ کوئی اپنے کو اس مقدس وقف کا متولی نہیں سمجھتا۔

ایشیا اور افریقہ میں بھی حکومتوں کی بنیاد ہدایت و رہنمائی کے اصول، انسانوں کی فلاح و بہبود، اخلاقی اصلاح اور انسانیت کی ترقی پر نہیں۔ سب کی بنیاد مالی مسائل اور آمدنی کے وسائل کی ترقی و اضافہ پر ہے، اُن کے نزدیک قوم کی اخلاقی حالت اور انسانی مسئلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اُس کے لیے کوئی مالی نقصان برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں، اگر کسی غلط ادارہ، یا کسی تفریحی صنعت سے اس کو بڑی آمدنی ہوتی ہے اور قوم کے کسی طبقہ یا نئی نسل کو اس سے نقصان پہنچتا ہے تو وہ کبھی اس آمدنی سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں چاہے آئندہ نسلیں بالکل تباہ اور اخلاق بالکل برباد ہو جائیں۔

دوستو! اس وقت ایمان و اخلاق اور انسانیت کا مسئلہ نہ حکومتوں پر چھوڑا جا سکتا

ہے، زرداروں اور تعلیم گاہوں پر، یہ بڑا وسیع اور عالمگیر مسئلہ ہے۔ اس کے لیے ہم سب کو کوشش کرنے کی ضرورت ہے یاد رکھیے جس کام کو افراد اور عوام کرنے کے لیے تیار نہ ہوں اور جس کی اہمیت کا احساس جمہور اور عوام کو نہ ہو وہ کام جتنا بھی آسان ہو عمل میں نہیں آسکتا، اور بڑی سے بڑی حکومت بھی اس کو انجام نہیں دے سکتی۔ اس کے لیے عمومی اور عوامی کوشش کی ضرورت ہے۔ پیغمبروں نے اپنی ذات اور عام افراد کی کوشش سے دنیا میں انقلاب برپا کردیا۔ ہم کو آپ کو ان کے نقش قدم پر چل کر اس کی کوشش کرنی چاہیے خود اپنی اصلاح کرنی چاہیے اور عام اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے، اس کی کوشش کی جائے کہ انسان اس دنیا کو مقدس وقف اور اپنے کو ایک ذمہ دار متولی سمجھنے لگے، وہ اپنے کو اس دنیا میں خدا کی نیابت و خلافت کا اہل ثابت کرے اور اخلاق خداوندی کے ساتھ خدا کی مخلوق کے ساتھ برتاؤ کرے۔ یہی اصلاح کا طریقہ ہے اور اسی میں انسانیت اور دنیا کی نجات ہے۔

(الفرقان شعبان و رمضان ۱۳۹۷ھ)

ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی مرحوم
ترجمہ: سید محمد الحسنی

اسلامی تاریخ میں اوقاف اور رفاہ عام کے ادارے

کسی قوم کی زندگی کے ثبوت اور قیادت کے استحقاق کا سب سے اچھا پیمانہ یہ ہے کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ اس کے افراد میں انسانی ہمدردی اور انسانیت دوستی اپنی اعلیٰ شکل میں اور وسیع پیمانہ پر موجود ہے یا نہیں، انسانیت نوازی اور انسانی ہمدردی کی وہ پاکیزگی اور لطافت جو سوسائٹی کے تمام طبقات پر ابر رحمت بن کر چھا جائے اور اس روئے زمین پر جتنے انسان اور حیوان پائے جاتے ہیں سب اس سے فیضیاب ہوں۔ یہی وہ جوہر ہے جس پر قوموں کی زندگی اور عروج اور بقا و ترقی کا انحصار ہے اور جس کی بنیاد پر ایک قوم کو دوسری قوم پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔

ہماری ملت اس شعبہ میں جس بلندی اور رفعت تک پہونچی ہے اس رفعت تک دنیا کی کوئی اور قوم نہیں پہونچ سکی، جہاں تک گزشتہ زمانوں کا تعلق ہے اس وقت دنیا کی قومیں اور تہذیبیں رفاہ عام اور فلاحی امور کا ایک بہت محدود تصور رکھتی تھیں جو معابد یا مدارس سے آگے نہیں بڑھ پاسکا تھا، جہاں تک موجودہ زمانہ کا تعلق ہے تو اس وقت مغربی قومیں باوجودیکہ وہ اجتماعی اداروں اور فلاحی مراکز کے ذریعہ انسانی ضروریات کو اچھے سے اچھے طریقہ پر پورا کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، پھر بھی وہ انسانی ہمدردی، جذبۂ اخوت و مساوات، خلوص اور پاکیزگی لطافتِ حس اور لطافت خیال کے اس مرتبہ تک نہیں پہونچیں جہاں امت اسلامیہ اپنے دور

عروج میں پہونچ چکی تھی۔

حب جاہ، شہرت پسندی، ہردلعزیزی کی خواہش، یہ وہ چیزیں ہیں جو اکثر اوقات ہم کو مغرب کے رفاہ عام کے کاموں کے پیچھے کارفرما نظر آتی ہیں جب کہ ہماری ملت کو ان کاموں پر ابھارنے والی قوت صرف خدا کی رضاجوئی تھی، خواہ لوگوں کو ان کاموں کا علم ہو یا نہو، اس کی دلیل میں ہم سب سے پہلے صلاح الدین کو پیش کر سکتے ہیں، جنھوں نے اپنی ساری دولت رفاہ عامہ پر خرچ کر دی۔ اور مصر و شام کو ایسے اداروں اور اوقاف سے بھر دیا، لیکن انھوں نے کبھی اس کی خواہش نہیں کی کہ کسی عمارت پر ان کا نام نقش ہو، اس کے برخلاف وہ ان پر اپنے وزراء، دوستوں، اور معاونین کا نام نقش کروایا کرتے تھے۔ اور یہ بے نفسی اور خلوص کی اعلیٰ مثال ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ مغرب میں جو اجتماعی ادارے ہیں، ان سے اکثر اوقات صرف مغربی ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، ان کے دروازے اور لوگوں کے لیے عموماً بند ہوتے ہیں۔ اس کے بالمقابل ہمارے اجتماعی اداروں اور اوقاف کے دروازے ہر انسان کے لیے ہر وقت کھلے رہتے تھے، خواہ اس کا مذہب، زبان اور قومیت کوئی ہو۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ ہم نے عام انسانی بھلائی کے ایسے ایسے شعبوں میں ادارے اور اوقاف قائم کئے جن سے اہل یورپ آج تک ناآشنا ہیں، یہ ایسے لطیف اور نازک شعبے ہیں جن کی تفصیل پڑھ کر حیرت ہوتی ہے، اور صاف نظر آتا ہے کہ امت اسلامیہ میں انسان نوازی اور انسانیت دوستی کا جو شفاف، ستھرا، پاکیزہ، گہرا اور مستحکم تصور ہے وہ دوسری قوموں میں بالکل ناپید ہے۔

قبل اس کے کہ ہم ان چند رفاہی اداروں اور اوقاف پر روشنی ڈالیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اصولوں کا بھی ذکر کرتے چلیں جو امت اسلامیہ کو ایسے اداروں کے قیام پر ابھارنے کے ذمہ دار اور محرک رہے تھے۔

اسلام اپنے پیرووں کو خیر کی اس انداز اور اس قوت کے ساتھ دعوت دیتا ہے جس کے بعد بخل، حرص، خوف اور شیطانی وسوسوں کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، قرآن مجید کا ارشاد ہے۔ اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۔ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ "شیطان تم کو فقر سے ڈراتا، اور

فحاشی کی ترغیب دیتا ہے. اور اللہ تعالیٰ تم سے مغفرت کا وعدہ فرماتا ہے اور اپنے فضل کا، اور اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

وہ ہر با اختیار انسان کے لئے امور خیر میں حصہ لینا ضروری قرار دیتا ہے، خواہ وہ دولتمند ہو یا غریب، جو دولتمند ہے وہ اپنے مال اور اثر و رسوخ کے ذریعہ یہ خدمت کرے، جو غریب ہے، وہ اپنے دست و بازو، اپنے قلب و دماغ، اور اپنی زبان کے ذریعہ یہ خدمت انجام دینے کی کوشش کرے۔

غریب لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک مرتبہ یہی شکایت کی تھی کہ امراء اور دولتمند لوگ صدقہ و خیرات کر کے اجر کے مستحق ہوتے ہیں، اور ہم لوگ اس سے محروم ہیں، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بھلائی صرف مال پر منحصر نہیں ہے، ہر وہ کام جس سے دوسروں کو فائدہ پہونچے عمل خیر ہے، پھر آپ نے فرمایا، تمہارے لیے تسبیح بھی صدقہ ہے اچھائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا بھی صدقہ ہے، راستہ سے اینٹ پتھر، گندگی اور رکاوٹیں دور کرنا بھی صدقہ ہے، دو آدمیوں کے درمیان صلح کرانا بھی صدقہ ہے، کسی آدمی کو اپنی سواری پر بیٹھتے وقت سہارا دینا بھی صدقہ ہے[1]

غرض اس طرح اسلام نے خیر و فلاح اور صدقہ و خیرات کے دروازے تمام انسانوں کے لیے کھول دیے ہیں، خواہ وہ تاجر ہوں یا مزدور یا کسان، طالب علم ہوں یا استاد، بوڑھے ہوں یا جوان، نابینا ہوں یا لاچار، مرد ہوں یا عورت، سب کے لیے صدقہ کرنا اور بھلائی کا کام کرنا آسان کر دیا گیا ہے. بغیر اس کے کہ ان کے اقتصادی حالات ان رفاہ عام کے کاموں میں حصہ لینے اور معاشرہ میں خیر و فلاح کی روشنی پھیلانے میں مانع بنیں، پھر اسلام نے اور بلند ہو کر اس انسانی ہمدردی کی تکمیل کر دی جب اس نے اعلان کیا کہ مذہب اور زبان، قوم و وطن اور رنگ و نسل کے امتیاز کے بغیر ہر شخص کے ساتھ بھلائی کرنا چاہیئے۔

حدیث میں آیا ہے، الخلق کلھم عیال اللہ فاحبّھم الیہ انفعھم لعیالہ[2]

---

[1] بخاری ومسلم [2] طبرانی وعبدالرزاق۔

ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے، اس کو سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کے کنبہ کے لیے سب سے زیادہ مفید ہو۔) پھر یہ دیکھیے کہ اسلام کن کن طریقوں سے انسان کو ان کاموں پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کو یہ یقین دلاتا ہے کہ بھلائی کا جو بھی کام وہ کرے گا اس کا اجر و ثواب سب سے پہلے اسی کو ملے گا۔ "وَمَا تُنفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فَلِأَنفُسِكُمْ"، "مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ" جو صدقہ اور خیرات تم کرو گے اس کا فائدہ تم ہی کو پہونچے گا۔ جس نے کوئی اچھا کام کیا اپنے ہی لیے کیا۔

ہر شخص کو اپنی ذات عزیز ہے۔ ہر انسان میں انانیت کی خو بو کسی نہ کسی درجہ میں ضرور پائی جاتی ہے۔ ایسے شخص کے لیے یہی اسلوب مناسب ہے، جو ایک بخیل کو سخاوت پر آمادہ کر سکے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی "مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً"[1] تو ایک صحابی نے جن کا نام ابوالدحداح تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا کہ کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے قرض بھی لیتا ہے، آپ نے فرمایا! ہاں، انھوں نے کہا یا رسول اللہ دست مبارک بڑھائیے پھر آپ کو گواہ بنا کر انھوں نے اپنا باغ صدقہ کر دیا، ان کے پاس یہی تنہا باغ تھا جس میں سات سو پھلدار کھجور کے درخت تھے پھر وہ اپنی بیوی کے پاس آئے جو بال بچوں کے ساتھ اسی باغ میں مقیم تھیں، اور ان کو اس کارروائی کی خبر دی، انھوں نے سن کر فوراً باغ خالی کر دیا۔ اور کہا، آپ کا سودا بہت کامیاب رہا، ابا الدحداح!

جب یہ آیت نازل ہوئی "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ"[2] (تم نہیں پا سکتے بھلائی یہاں تک کہ خرچ کرو اس میں سے، جس سے تم کو محبت ہے) تو حضرت ابوطلحہ انصاری نے کہا کہ میری املاک میں مجھے سب سے زیادہ محبوب بیرحاء ہے (یہ کنواں تھا جس کا پانی بہت شیریں تھا) اب میں اس کو اللہ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے اس کے اجر کا امیدوار ہوں، آپ منشائے الٰہی کے مطابق اس کا انتظام فرما دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا! ایسا نہ کرو، ایسا نہ کرو، یہ بہت فائدہ والی چیز ہے اصل کو باقی رکھو اور اس کے فائدے کو وقف کر دو۔[3]

---

[1] البقرہ ۲۴۵ [2] آل عمران ۹۲ [3] تفسیر ابن کثیر

چنانچہ یہ صدقہ اسلام میں پہلا وقف تھا۔

وقف وہ سنگ بنیاد تھا جس پر ہمارے تمام اجتماعی اور فلاحی اداروں کی بنیاد رکھی گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اپنی امت کے لیے اس کا نمونہ پیش فرمایا، آپ نے سات باغ وقف فرمائے تھے جس کا اختیار آپ کو بعض مجاہدین نے دیا تھا کہ ان کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ جیسا چاہیں تصرف فرمائیں۔ آپ نے ان کو فقراء، مساکین، مجاہدین اور اہل حاجت کے لیے وقف کر دیا۔ پھر آپ کے بعد عمر بن خطاب نے خیبر میں زمین وقف کی، پھر ان کے بعد حضرت ابوبکر، عثمان، علی، زبیر، معاذ رضی اللہ عنہم اور دوسرے صحابہ کرام نے وقف کیے، شاید ہی کوئی صحابی ایسا رہا ہو جس نے کچھ وقف نہ کیا ہو۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں یہ کام پھر تازہ ہو گیا، جب آپ نے اپنے عہد خلافت میں کچھ زمین وقف فرمائی، اور مہاجرین و انصار کے کچھ لوگوں کو اس کا گواہ بنایا۔ جابر بن عبد اللہ الانصاری کہتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کرام مہاجرین و انصار میں سے کوئی صاحب ثروت اور صاحب استطاعت ہو اور اس نے اپنا مال کچھ وقف نہ کیا ہو، جو نہ خریدا جا سکتا ہے، نہ وراثت میں ملتا ہے، نہ ہبہ ہو سکتا ہے۔ پھر ان کے بعد مسلمان آراضی، باغات مکانات وغیرہ برابر وقف کرتے رہے، جس کی وجہ سے اسلامی سوسائٹی ایسے اداروں اور ایسے اوقاف سے بھر گئی اور ان کی اتنی کثرت ہوئی کہ ان کا شمار مشکل ہو گیا۔

یہ اوقاف اور ادارے دو قسم کے تھے۔

ایک قسم تو وہ تھی جن کی ذمہ دار حکومت ہوتی تھی اور وہی اس کا انتظام کرتی تھی۔ اور ایک قسم ان اوقاف کی تھی جس کو انفرادی طور پر امرا، رؤسا، بیگمات، اور عام دولت مند لوگ قائم کرتے تھے، اس موقع پر ان اوقاف کی تمام قسموں پر روشنی ڈالنا ہمارے لیے مشکل ہے اس لیے ہم چند پر اکتفا کریں گے۔

ان اوقاف اور اداروں میں سرفہرست مساجد ہوتی تھیں، لوگ رضائے الٰہی اور حصول ثواب کے لیے کثرت سے مساجد تعمیر کرواتے تھے۔ بادشاہ بڑی بڑی عالیشان، پرشکوہ مساجد تعمیر کرواتے، اس سلسلہ میں ولید بن عبد الملک نے جامع اموی کی تعمیر پر جس طرح بے حساب اور بے دریغ خرچ کیا، اس کی تفصیلات سن کر آدمی حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔

دوسرے نمبر پر مدارس اور اسپتال تھے جن کے لیے ایک مستقل مضمون درکار ہے۔ اس کے علاوہ سرائے اور ہوٹل جہاں مسافر اور اہل حاجت جب چاہیں ٹھہر سکتے تھے۔ خانقاہیں بھی قائم کی گئی تھیں، جہاں دلجمعی اور یکسوئی کے ساتھ آدمی خدا کی عبادت کر سکے، ان غرباء کے لیے جو مکان خریدنے یا کرایہ پر لینے کی استطاعت

رکھتے ہوں خصوصی مکانات تھے۔ عام گذرگاہوں پر سبیلیں لگتی تھیں تاکہ لوگوں کو پیاس کی تکلیف نہو، عوامی باورچی خانے یا لنگر خانے کا بہت رواج تھا جہاں سے روٹی سالن اور مٹھائی تقسیم کی جاتی تھی، ابھی کچھ عرصہ کی بات ہے دمشق کے تکیہ سلطان سلیم اور تکیہ شیخ محی الدین میں اس کا رواج تھا۔

حجاج کے لیے مکہ میں مکانات وقف کیے جاتے تھے تاکہ ان کو سہولت ہو چنانچہ ان مکانوں کی اتنی کثرت ہوئی کہ پورے مکہ میں صرف اوقاف ہی کے مکانات نظر آنے لگے، بعض فقہاء نے یہ فتویٰ بھی دیا تھا کہ مکہ میں کرایہ پر مکان اٹھانا ناجائز ہے اس لیے کہ وہ سب حجاج کے لیے وقف ہیں۔

غیر آباد راستوں، ویرانوں، صحراؤں میں کنووں کی تعمیر ہوتی تھی تاکہ پانی پینے کے علاوہ وہ لوگوں کی کھیتی باڑی اور مویشیوں کے کام آسکیں، بغداد اور مکہ دمشق اور مدینہ کے درمیان بالخصوص، اور تمام بڑے اسلامی شہروں کے درمیان بالعموم ایسے کنوؤں کی اتنی کثرت تھی کہ مسافروں کو پیاس کا بہت کم سامنا ہوتا تھا۔

لوگ سرحدوں پر فوجی سامان کے ذخیرے بھی وقف کرتے تھے تاکہ غیر ملکی حملہ کا مقابلہ اچھی طرح کیا جا سکے پہلے سے مجاہدین کو ہتھیار، سامانِ حرب اور خوراک وغیرہ ملتی تھی عباسیوں کے عہد میں روم کے حملوں کا مقابلہ کرنا اور صلیبی جنگوں میں مغربیوں کے حملوں کو روکنے میں ان اوقاف کو بڑا دخل تھا۔ لوگ گھوڑے تلواریں، تیر کمان اور دوسرا جنگی سامان بھی مجاہدین کے لیے وقف کرتے تھے جس کی وجہ سے جنگی صنعت اور کارخانوں کے قیام میں بڑی مدد ملی، اور ان کی بہت ہمت افزائی ہوئی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خود یورپین (جنگ بندی کے دنوں میں) ہتھیار خریدنے ہمارے یہاں آتے تھے، اور علماء ان کے ہاتھ ہتھیار بیچنا حرام قرار دیتے تھے، افسوس کہ اب معاملہ بالکل برعکس ہو گیا ہے، اب ہم خود اہل یورپ کے سامنے دست سوال دراز کرتے ہیں اور سخت شرطوں کے باوجود جو ہماری آزادی سالمیت اور وقار کو مجروح کرتی ہیں ان سے معاملہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ کچھ اوقاف ایسے تھے جن کا منافع جہاد کے خواہشمند لوگوں کو اور ان فوجیوں کو جن کی پوری کفالت حکومت نہیں کر سکتی تھی، ملتا تھا، ان تمام باتوں کی وجہ سے ہر شخص کے لیے جو اپنی جان راہِ خدا میں دینا چاہتا ہو اور مرتبہ شہادت حاصل کرنا چاہتا ہو بہت سہولتیں اور آسانیاں پیدا ہو گئی تھیں، اس حالت کا ذرا اپنی موجودہ حالت سے مقابلہ کیجیے۔ آج ہم اسلحہ بندی کا ہفتہ مناتے ہیں، اور فوج کے لیے پبلک سے چندہ وصول کرتے ہیں، اگر ہمارا سیاسی و اجتماعی شعور بیدار، اور ہمارا ایمان پختہ اور سچا ہوتا

تو آج ہم سال میں ایک مرتبہ نہیں روزانہ کارخانے قائم کرتے اور اپنی فوج کو دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور اور منظم فوج بنا سکتے۔

بہت سے اجتماعی ادارے ایسے تھے جو شہر بڑاہوں اور پلوں وغیرہ کی مرمت کے لیے قائم تھے۔ مقبروں کے لیے بھی وقف ہوتا تھا بعض آدمی زمین کا ایک بڑا حصہ مسلمانوں کے عام قبرستان کے لیے وقف کرتے تھے۔

غرباء کی تجہیز و تکفین کے لیے بھی اوقاف تھے۔

اجتماعی کفالت کے لیے جو اوقاف اور فلاحی ادارے تھے ان کو دیکھ کر ہماری حیرت میں اضافہ ہوتا ہے۔ گمشدہ اور لاوارث بچوں کے لیے یتیموں کے لیے خاص مراکز تھے، جہاں ان کی پرورش و پرداخت و نگہداشت اور تربیت کا پورا انتظام تھا۔ لاچار، نابینا اور معذور وا پاہج لوگوں کے لیے ادارے تھے جہاں ان کو پورے احترام کے ساتھ رکھا جاتا تھا اور ان کے قیام وطعام لباس اور تعلیم تک کا انتظام ہوتا تھا۔

قیدیوں کے لیے مراکز تھے جہاں ان کے معیار زندگی بلند کرنے اور ان کی صحت کے لیے ضروری اور مناسب غذا کا انتظام تھا، لاچار اور نابینا لوگوں کے لیے ایک وقف تھا جس میں ان لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے اور ان کی خبر گیری کے لیے آدمی مقرر تھے۔

غیر شادی شدہ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے لیے جن کے والدین ان کی شادی کے مصارف اور مہر وغیرہ برداشت کرنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں اوقاف تھے جس کے ذریعہ ان کی شادی کا انتظام کیا جاتا تھا، کتنا پاکیزہ تھا یہ جذبہ، اور آج کتنے محتاج ہیں ہم اس جذبہ کے!

کچھ اوقاف ایسے تھے جن سے ماؤں کو دودھ اور شکر ملتی تھی، آج ہمارے یہاں دودھ کا جو یونٹ قائم ہے، یہ اس سے بہت عرصہ پہلے کی بات ہے، پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ سب خلوص کے ساتھ اور طلب اجر کے لیے ہوتا تھا، نام و نمود، شہرت اور مقبولیت کے لیے نہیں!

صلاح الدین کے جہاں اور محاسن اور کارنامے ہیں، وہاں اس کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے قلعہ کے ایک دروازہ پر (جو آج بھی دمشق میں دیکھا جا سکتا ہے) دو میزاب (پرنالے) بنائے تھے۔ ایک سے دودھ بہتا تھا، دوسرے سے شربت، ہفتہ میں دوبار ضرورت مند مائیں آتی تھیں اور اپنے بچوں کے لیے جتنا چاہتی تھیں دودھ اور شربت لے جاتی تھیں۔

اس سے زیادہ حیرت انگیز اور لطیف وقف وہ تھا جہاں چینی کے برتن رہتے تھے وہ نوکر جس سے

راستہ میں غلطی سے چینی کا کوئی برتن ٹوٹ جائے وہ اپنے آقا کی ناراضگی سے بچنے کے لیے یہاں سے اسی قسم کا برتن لے لیتا تھا، اور اس کے آقا کو خبر بھی نہیں ہوتی تھی[1]

آخر میں پھر ان اداروں اور اوقاف کی باری آتی ہے جو مریض جانوروں کے علاج معالجہ، ان کی نگہداشت اور پرورش کے لیے تھے، دمشق کا وہ وسیع سبزہ زار جس پر آج اسٹیڈیم قائم ہے ایک زمانہ میں بوڑھے گھوڑوں اور مویشیوں کے لیے وقف تھا جہاں وہ رہتے اور چرتے، یہاں تک کہ ختم ہو جاتے تھے۔

تو یہ کل ۳۰ قسمیں ہوئیں ان رفاہ عام کے اداروں اور اوقاف کی جو ہماری تاریخ کے روشن دور میں بکثرت پائے جاتے تھے، کیا دوسری گزشتہ قوموں میں اس کی نظیر مل سکتی ہے بلکہ اس میں بہت سے ایسے اوقاف ہیں جن کی مثال آج کے "ترقی یافتہ" تمدن میں بھی نہیں مل سکتی، یہ تھا راز ہمارے عروج اور عزت و شوکت کا جب کہ پوری دنیا پر غفلت، جہالت اور پسماندگی کے دبیز اور تاریک پردے پڑے ہوئے تھے۔

یہ تھا راستہ ہمارے عروج اور عزت و شوکت کا جس پر چل کر ہم نے ستم زدہ اور مظلوم انسانیت کے زخموں پر مرہم رکھا تھا، اور اس کو نئی فضاؤں سے آشنا کیا تھا۔

آج ہمارا راستہ کیا ہے اور ہم کس منزل پر ہیں؟

کہاں ہیں وہ مبارک ہاتھ جو یتیم کے آنسو پوچھیں، اور لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھیں، اور ہماری سوسائٹی کو پھر ایک متحد اور ہم آہنگ، ہم عقیدہ و ہم خیال سوسائٹی بنا دیں جہاں بھلائی اور سچائی اور امن و سلامتی کا دور دورہ ہو۔ (الفرقان بابت جمادین ۱۳۸۰ھ)

---

[1] اسی سے مل جلتا بلکہ لطافت حس اور نازک خیالی میں شاید اس سے بھی زیادہ ایک وقف اور تھا جس کا تعلق اسپتال سے تھا اس کا ذکر مصنف نے کتاب کی دوسری فصل کے تحت کیا ہے۔ اسپتال میں ایسے آدمی مقرر تھے جو مریضوں کے وارڈ میں وقتاً فوقتاً جاتے رہیں اور مریض کے پلنگ کے پاس سے گزرتے ہوئے آپس میں یہ سرگوشیاں کریں کہ اب تو اس کی صحت خاصی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ شائد دو ایک روز میں ان لوگوں کو وارڈ چھوڑ دینے کی اجازت مل جائے لیکن اس انداز میں کہ مریض اس کو سن سکے اور اس کی صحت پر اس بات کا نفسیاتی اثر پڑے۔ آج ترقی یافتہ اسپتالوں میں مریضوں کے لیے ہلکی ریکارڈنگ کا انتظام کیا گیا ہے۔ یورپ و امریکہ میں اس سے کچھ آگے بڑھ کر اس کا انتظام کیا جا رہا ہے کہ ٹیلی فون پر ایسی لڑکیاں مقرر کی جائیں جن سے مریض اپنا دل بہلانے کے لیے وقت ضرورت بات کر سکیں، لیکن جتنی ذہانت، لطافت خیال اور انسانی ہمدردی اور محبت ہمیں اسلامی وقف میں نظر آتی ہے وہ موخر الذکر میں مفقود ہے۔ م ح

عتیق الرحمٰن سنبھلی

اجتماعی بہبود کی شاہ کلید

زمانے کے اثرات بھی کیا ہوتے ہیں کہ دو اور دو، چار کی طرح کھلی ہوئی صداقتیں بھی اچھے اچھے سمجھدار لوگوں کے لیے نا قابل فہم بلکہ قابل اعتراض ہو جاتی ہیں! کس قدر واضح اور حقیقت پسندانہ بات ہے کہ جب تک سوسائٹی میں اخلاقی احساس، ذمہ داری کا پاس اور فرائض کا شعور قوی نہو، اجتماعی خوشحالی کے بڑے سے بڑے انقلاب انگیز منصوبے، عظیم سے عظیم ترقیاتی اسکیمیں اور بہتر سے بہتر قانونی تدبیریں اپنے خاطر خواہ نتائج تک نہیں پہنچا سکتیں، جو کچھ کام ہوگا وہ اصل کے مقابلہ میں بہت تھوڑا ہوگا، اور اس سے بہت زیادہ مصارف میں ہوگا جتنے مصارف میں ایک زندہ اخلاقی احساس اور فرائض کے قوی تر شعور کے ساتھ ہو سکتا تھا۔ اس بات کو دوسرے انداز میں یوں کہہ لیجیے کہ انسان کے اجتماعی مسائل کی کلید یہ ہے کہ اسے صحیح معنی میں انسان بنایا جائے۔ اس کی اخلاقی حس اس حد تک بیدار کی جائے کہ وہ اپنے ابنائے جنس کے حقوق پہچانے اور اپنے حقوق میں حد سے تجاوز نہ کرے۔ اس میں فرائض کا ایسا شعور پیدا کیا جائے کہ کوئی بڑے سے بڑا لالچ اور اونچے سے اونچا ذاتی فائدہ اُسے فرض سے انحراف اور اجتماعی مفاد سے روگردانی پر آمادہ نہ کر سکے۔ کتنی صاف اور سیدھی اور دو اور دو، چار کی طرح کھلی ہوئی بات ہے۔ مگر ذرا حیرت نہ کیجیے کہ بعض اچھے اچھے ارباب فہم کے نزدیک یہ رجعت پسندی اور عوامی مسائل سے روگردانی ہے۔ اسلئے کہ اس میں زور ہے اخلاق اور انسانیت پر، درانحالیکہ آج انسان کو ضرورت ہے روٹی اور کپڑے کی، مکان کی، اور سستی دوا اور تعلیم کی!

جنتا کا غم کھانے والے بزرگو! یہ کون کہتا ہے کہ تم زرعی اور صنعتی منصوبے نہ بناؤ، ترقیاتی

اسکیمیں نہ چلاؤ، دولت کی منصفانہ تقسیم کے لیے مفید قوانین بروئے کار نہ لاؤ، اسپتالوں اور تعلیم گاہوں کا جال نہ بچھاؤ؟ ــــــ یہ سب کچھ کرو، اور ضرور کرو، مگر کہنے والوں کا کہنا یہ ہے کہ اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی سمجھو کہ یہ سارے کام صرف چند مخلص اور دردمند لوگوں کے کاغذ پر نقشہ بنا دینے سے نہیں ہو جائیں گے، بلکہ ان کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے لاکھوں اور کروڑوں آدمیوں کی ضرورت ہوگی۔ پھر ان کے نتائج کو عام آدمیوں تک پہنچانے میں بھی لاکھوں افراد ہمیشہ واسطے کی حیثیت سے درکار رہیں گے۔ لہٰذا ناگزیر ہے کہ جس سوسائٹی سے یہ افراد مہیا ہوتے ہیں اس میں کیرکٹر کی بلندی اتنی عام ہو کہ وہ بیک وقت لاکھوں فرض شناس اور باضمیر کارکن فراہم کر سکے۔ بلکہ ان منصوبوں اور اسکیموں کے نتائج کی صحیح تقسیم کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ سوسائٹی میں کم از کم بنیادی اخلاقی اور انسانی احساسات اس قدر عام ہوں کہ لوگ اپنے حقوق اور اپنی ضروریات کی طرح دوسروں کے حقوق اور دوسروں کی ضروریات کو سمجھیں اور (الا ماشاء اللہ) کوئی شخص اپنے قرار واقعی حصہ سے زیادہ حاصل کرنے کے لیے دوسروں کے حقوق کو پامال اور ان کی ضروریات کو نظر انداز نہ کرے۔

ان دونوں باتوں کی ضرورت سمجھنے کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک نہایت قریب کی مثال لے لیجیے۔ آج کل ہمارے صوبے میں غذائی اجناس کی گرانی اور کمیابی کا مسئلہ وقتی طور پر حل کرنے کے لیے غلہ کی سرکاری دوکانوں کا سسٹم جاری کیا گیا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اس اسکیم سے جتنی سہولت اور جتنا فائدہ عوام کو پہنچنا چاہیے تھا وہ نہیں پہنچ رہا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اول تو بہت سے سرکاری اہلکار جن کے ہاتھوں میں ان دوکانوں کے پرمٹ اور لائسنس کا اجراء ہوتا ہے۔ وہ فرض شناس نہیں ہوتے کہ پبلک مفاد کے پیش نظر اپنے اندازہ کی حد تک اچھے سے اچھے آدمی منتخب کریں۔ بلکہ اقربا نوازی اور رشوت خوری کا سلسلہ چلتا ہے۔ پھر سرکاری اہلکاروں کا کام ختم ہو کر دوکانداروں کا کام شروع ہوتا ہے تو ان کا بس چلتا ہے تو بلیک کرتے ہیں یا اچھا مال بچا کر ناجائز منفعت خوری کے لیے رکھتے ہیں اور گھٹیا مال ملا کر سرکاری نرخ کے اکثر فروخت کرتے ہیں۔ اس کے بعد خریدار جنتا کا نمبر آتا ہے تو روزمرہ کی بات ہے کہ بہت سے لوگ عجیب عجیب ہتھکنڈوں سے کئی کئی حصے مارے جاتے ہیں اور بہت سے مستحق اور ضرورت مند محروم رہ جاتے ہیں

یا کم از کم پریشان ہوتے ہیں۔[1] یہ آخر کس چیز کا نتیجہ ہے سوائے اس کے کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں اس اسکیم کا نفاذ ہے وہ فرض شناس اور بے غرض نہیں ہیں، اور عوام جن کی سہولت اور راحت کے لیے یہ اسکیم چلائی گئی ہے ان میں باہمی حقوق شناسی اور انسانیت کے بنیادی تقاضوں کا احساس (یا وقت کی زبان میں کہنا چاہیے کہ اجتماعی شعور) نہیں ہے۔

جب معمولی منافع اور محض ضروریات کے معاملہ میں ہماری سوسائٹی کا حال یہ ہے تو ذرا قیاس کیجیے ان بڑے بڑے منصوبوں اور ترقیاتی اسکیموں کے بارے میں جہاں قدم قدم پر لاکھوں کے وارے نیارے ہو سکتے ہیں جہاں بستیوں کے لیے انتظامات کیے جا سکتے ہیں، جہاں رشوت خوری اور اقربا نوازی کے تحت کھیپ کی کھیپ کھپائی جا سکتی ہیں۔ جہاں ان منصوبوں اور اسکیموں کے نتائج کو عوام تک پہنچانے والے بڑے اور چھوٹے کارکن مستقل طور سے ناجائز روپیہ کما سکتے ہیں اور پھر جہاں پبلک کے افراد ان نتائج کو حاصل کرنے میں دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈال کر وسیع تر منافع کی امید رکھ سکتے ہیں۔

ہمیں حیرت ہے کہ پھر وقت کے دانشمندوں اور عوام کے غم خواروں کو یہ بات کیوں کر بے وقت کی راگنی نظر آتی ہے کہ ہمارے ملک کا بنیادی مسئلہ لوگوں میں اخلاقی اور انسانی حس اور احساس فرض کو بیدار کرنا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ واقعات اور نتائج کی منطق میں بڑی طاقت ہے۔ لیکن اگر یہ منطق بھی عوامی مسائل میں سر کھپانے والوں کو اس بنیادی مسئلہ کی طرف متوجہ نہیں کرتی، اور وہ مصر ہیں کہ وہ اس شاہ کلید (MASTER KEY) سے بے نیاز رہ کر ہی عوام کے مسائل اور مصائب کا حل نکال لیں گے تو اسے ملک کے عوام کی بدقسمتی کے سوا کیا کہیے؟

(الفرقان محرم ۱۳۷۶ھ)

---

[1] حُسنِ اتفاق کہیے کہ ریاستی کونسل کے موجودہ اجلاس میں ۱۱ر اگست کو ریاستی وزیر غذا نے اور ۱۲ر اگست کو متعدد ممبران کونسل نے اس بات کی بہت کھلے الفاظ میں شکایت کی ہے کہ غلہ کی دوکانوں کا الاٹمنٹ نامناسب آدمیوں کو ہوا ہے۔ اور اس کی وجہ سے کافی بدعنوانیاں ہو رہی ہیں۔

ملاحظہ ہو قومی آواز لکھنؤ ۱۲ر اور ۱۳ر اگست ۵۶ء

عتیق الرحمٰن سنبھلی

زندگی میں اطمینان و مسرت کا راز

انسانی زندگی کی پوری تاریخ پر نظر ڈال جائیے، انسانی زندگی کو مسرور و مطمئن بنانے کے جتنے وسائل اور جتنی فکر جس عمومیت اور ہمہ گیری کے ساتھ آج پائی جاتی ہے کسی بھی پچھلے دور میں نظر نہ آئے گی! انسانی زندگی کا کوئی گوشہ آج ایسا نہیں جس میں راحت و سہولت اور آرام و اطمینان کے سامانوں کی بھرمار سائنس نے نہ کر رکھی ہو۔ اور شاید ہی کوئی خطۂ ارض آج ایسا ملے جس میں زندگی کے ان فلسفوں اور ان نظاموں کی گونج نہ ہو جنھیں دردِ انسانی نے جنم دیا ہے! آج تقریباً ہر آزاد ملک کے تمام وسائل اور اس کے شہریوں کی تمام قوتیں حکومت کے نقطہ پر مجتمع ہو کر انسانی مساوات، سماجی انصاف، مصائب سے نجات اور رفاہیت و خوشحالی کے نام پر صرف ہو رہی ہیں۔ اور بین الاقوامی نشستگاہ پر ہر ملک اپنے اس یقین و ایمان کا اظہار کر رہا ہے کہ بین الاقوامی انصاف ہی میں سب کی خیر اور سب کا امن و اطمینان ہے ——— لیکن بین الاقوامی سطح ہو یا ملکوں کی داخلی زندگی کا میدان، جہاں بھی دیکھیئے یہ حقیقت ہے کہ انسانی زندگی جتنی عمومیت کے ساتھ جتنی بے چین، جتنی مضطرب اور جتنی پریشان آج ہے، شاید کبھی نہیں تھی۔

یہ آخر قصہ کیا ہے؟ اور وسائل و فکر کی روز افزونی کے باوجود یہ درد بجائے گھٹنے کے بڑھتا کیوں جا رہا ہے؟

ہو سکتا ہے کسی کو اس قصہ میں پیچیدگی نظر آئے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے بالکل ٹھیک ہو رہا ہے اور نتائج کے اسباب بالکل واضح ہیں۔

اس کائنات کی ہر شے کی فلاح و بہبود اور تعمیر و ترقی کے کچھ فطری اصول و قوانین ہیں۔ ان اصول و قوانین سے انحراف کر کے اگر کوئی چاہے کہ اُسے فلاح و بہبود اور پرسکون زندگی کی منزل

مل جائے تو اس کی فکر میں خواہ وہ زندگی کے شب و روز ایک کر دے اور اس کے ظاہری وسائل سے زندگی کے ایک ایک گوشہ کو معمور کر دے مگر فطرت کی راہ سے ہٹنے کے بعد نہ یہ فکر حسب خواہش نتیجہ تک پہونچ سکتی ہے اور نہ یہ وسائل اپنے مقصد کو پورا کر سکتے ہیں۔

کائنات عالم کی تمام دوسری انواع موجودات اپنی زندگی کے ان فطری اصول و قوانین کی بے چون وچرا پابند ہیں اور ان کے اندر ان سے انحراف کے اختیار وارادہ کا کوئی نام ونشان تک نہیں ہے۔ صرف ایک نوعِ انسانی ہے جس کو خالق کائنات نے اپنی خلافت کے منصب عطا کرنے کی بنا پر اپنے اوصافِ ارادہ و اختیار سے متصف کر کے دوسری تمام انواعِ مخلوقات سے ممتاز کر دیا ہے چنانچہ انسان مجبور نہیں ہے کہ وہ اپنے حرکات و سکنات اور افعال و اطوار میں کسی خاص نظام زندگی کی پابندی کرے۔ مگر اس کی فلاح و بہبود کے لیے بہرحال کچھ فطری اصول و قوانین ہیں، اور کائنات کا یہ بے لاگ قانون اس پر بھی نافذ ہے کہ جو چیز بھی اپنی فلاح و بہبود کے فطری اصول و قوانین سے بے نیاز ہو کر چلے گی وہ چاہے سر پٹخ کر مر جائے، حقیقی اور دائمی فلاح و بہبود سے کسی طور پر بھی ہمکنار نہ ہو سکے گی۔

افراد انسانی کی فطرت میں حرص وطلب اور ہوا و ہوس کا جو مادہ ہے وہ نوعِ انسانی کے کسی فرد سے بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ اور اس کی بڑی اچھی تعبیر ایک حقائق شناس فطرت نے اس طرح کی ہے

"لو کان لابن آدم وادیان من مالٍ لا تبغی ثالثاً"	اگر آدم کے کسی بیٹے کے پاس دو وادیاں بھر کر مال و دولت ہو تو اس کی فطرتِ طلب اس پر بھی قانع نہیں رہ سکتی بلکہ اس کی خواہش ہوگی کہ اس میں ایک کا اضافہ اور ہو جائے۔
(محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)	

بلکہ خود انسان کے خالق کا بیان ہے کہ:۔

اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (قرآن)	بے شک انسان کے اندر حُبِّ مال وجاہ کا بڑا ہی شدید مادہ ہے۔

انسان کی اس فطری افتاد پر نظر کرنے کے بعد، کوئی بھی سوچنے والا انسان اس نتیجہ پر پہونچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر نوعِ انسانی کی مجموعی فلاح و بہبود اور اس کی مجموعی زندگی کی مسرت و خوشحالی مقصود ہے تو ناگزیر ہے کہ افراد کی حرص وطلب کا پیمانہ محدود ہو۔ کیونکہ یہ دنیا اپنی ساری نعمتوں اور ساری دولتوں

کے باوجود نوعِ انسانی کے تمام افراد یا تمام جماعتی یا قومی اکائیوں کی تو کیا ان میں سے دو کی بھی حرصِ اقتدار یا حرصِ مال کے اصل پیمانوں کو پُر کرنے سے قاصر ہے۔

لیکن انسان کا پیمانۂ طلب محدود ہو جائے، یہ تو ممکن نہیں۔ کیونکہ فطرت بدلا نہیں کرتی۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ انسان اس کی فطری لامحدودیت کے علی الرغم اسے کچھ حدود کا پابند کر دے۔

بحث کے اس نقطہ پر پہنچ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے نوعِ انسانی کی مجموعی فلاح اور اس کے ایک پُرمسرت اور پُرسکون تمدن کی اولین فطری بنیاد یا اس کا بنیادی قانون دریافت کر لیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ نوعِ انسانی کے افراد ہوں یا اس کی قومی و جماعتی اکائیاں وہ اپنی لامحدود فطری حرص و طلب کو کچھ حدود کا پابند بنا لیں!

ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج کا انسان، یا کہئے کہ آج کے ناخدایانِ انسانیت اس بنیاد کو وجود میں لانے سے مکمل انحراف کیے ہوئے ہیں۔ اسی لئے ہمیں اس صورتِ حال پر ذرا بھی تحیّر نہیں ہوتا کہ عالمِ انسانیت کی فلاح اور ایک پُرسکون تمدن کی تعمیر کے وسائل اور اس کی فکر کی روز افزونی کے باوجود انسان کو سکون و آرام اور نوعی فلاح میسّر نہیں ہے۔

انسانی فطرت کا مطالعہ اور تجربہ اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ عمومی طور پر انسان اپنی حرص و طلب کے تقاضوں پر اسی صورت میں پابندی عائد کر سکتا ہے کہ اُسے ان تقاضوں کی تکمیل میں خود اپنے کسی بڑے نقصان کا خطرہ یا اس کے ترک میں کسی عظیم تر منفعت اور اعلیٰ درجہ کی تسکینِ طلب کی امید نظر آئے۔ انسانی فطرت کی اس ساخت کے پیشِ نظر، اگر ایک صحت مند تمدن کی انسانی خواہش کوئی غیر فطری خواہش نہیں ہے تو، ضروری نظر آتا ہے کہ کوئی ایسا سامان موجود ہو جس کی بنیاد پر انسان کے اندر یہ امید و بیم پیدا کی جا سکے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس کا پورا سامان موجود ہے، جس کی تفصیل آگے ... آئے گی۔ مگر اس دور کے ناخدایانِ انسانیت نے اپنے علم و آگہی کے زعم میں اس سامان کے وجود کو وہم ٹھیرا کر رد کر دیا ہے۔ اور اس طرح گویا اس بنیاد کو وجود میں لانے کا راستہ ہی سرے سے بند کر دیا ہے جو ایک صحت مند پُرسکون اور خوشحال اجتماعی زندگی کی پہلی شرط ہے۔ کوشش کی گئی کہ اجتماعی مفاد کے نام پر افراد کو اپنی خواہشات قربان کرنے کے لیے آمادہ کیا جائے۔ مگر اس کا حشر سامنے ہے۔ اجتماعی

مفاد پر قربانی دینے کا تخیل اچھا تو بہت معلوم ہوتا ہے، اور اس کی معنوی بلندی کو محسوس کرنے کے بعد آدمی کا جی چاہنے لگتا ہے کہ اپنے عمل کو اس بلندی سے ہمکنار کرے۔ مگر بلند پروازی کی یہ عقلی خواہش جب فطری تقاضوں سے ٹکرائے تو انسان بیچارہ کیا کرے؟ فطرت کا دباؤ تو وہ چیز ہے کہ عام انسان تو کیا اس بلند پروازی کے جو داعی اور فلسفہ طراز ہوتے ہیں وہ بھی اس کے مقابلہ میں عاجز نظر آتے ہیں، اور عجیب عجیب چوردروازوں سے اس کے مطالبات پورے کرتے ہیں ——— انسان کا مستقل طرز عمل دراصل وہی ہو سکتا ہے جو کسی فطری داعیہ سے ہم آہنگ ہو۔ اور اجتماعی مفاد کے لیے قربانی! اس کے لیے انسان کی فطرت میں کوئی داعیہ نہیں ہے!

غرض انسان کے اندر اپنی خواہشات کی قربانی کا جذبہ پیدا کرنے کی یہ غیر فطری تدبیر تو جس کو ناکام ہونا ہی تھا، ناکام ہوئی، اور اب فکر و نظر کا اصل رخ یہ ہو گیا کہ انفرادی حرص و طلب پر باہر سے پابندیاں عائد کی جائیں۔ اس کی تدبیر کئی قانونی جکڑ بندی۔ چنانچہ قانون کے دائرہ کو وسیع سے وسیع تر کرکے پوری انسانی زندگی کو اس کی گرفت میں لیا جانے لگا۔ اور بعض جگہ لیا جا چکا۔

ہمارے اس وقت کے موضوع سے یہ بات تو خارج ہے کہ قانونی جکڑ بندی سے فطری رجحانات جیتے جی ہار مان بھی سکتے ہیں یا نہیں؟ اور تجربہ اس بارے میں کیا بتاتا ہے؟ البتہ اس جگہ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ قانون اگر اپنے مقصد میں سو فیصدی کامیاب بھی ہو جائے اور معاشرہ سے انفرادی حرص و طلب کے وہ تمام مفاسد، وہ تمام ناہمواریاں اور ناانصافیاں دور ہو جائیں جو معاشرہ کو مجموعی حیثیت سے خوشحال نہیں ہونے دیتی تھیں تب بھی کیا قانون میں جکڑی ہوئی زندگی کوئی مسرت، سکون، اطمینان اور چین کی زندگی ہو سکتی ہے؟ ——— اس زندگی کی پوری حقیقت تو وہی لوگ بتا سکتے ہیں جو اس کا پورا تجربہ رکھتے ہوں مگر ہمارے ملک میں بھی چونکہ اس نظام زندگی کی "ابجد" شروع ہو چکی ہے اس لیے تھوڑا بہت تجربہ تو ہمیں بھی ہونے لگا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ یہ نظام زندگی آدمی کو زندگی سے بیزار کرتا ہے؟ دراصل یہ ایک سزا ہے جو انسان کو اس کی ناکردنیوں کی پاداش میں خود اس کے ہاتھوں سے دلائی جا رہی ہے۔ انسان کے خالق نے اس کی نوعی اور اجتماعی فلاح کے لیے بہترین اصول اور کامیابی کی محکم ترین فطری بنیادیں فراہم کی تھیں مگر اس نے زعم علم و عقل میں خالق کو بھی ماننے سے انکار کر دیا اور ان سب چیزوں کو بھی رد کر دیا، اور اب وہ اس کی سزا بھگت رہا ہے۔

انسان کے خالق نے اس کے لامحدود پیمانہ طلب پر، خود اس کے اندر سے پابندی عائد کرلے کا رجحان پیدا کرنے کا کیسا موثر سامان بہم پہونچایا تھا کہ انسان کے لیے حیات جاوید کا فیصلہ فرمایا اور اس عالم زیریں کے ساتھ ایک ایسا عالم بالا تعمیر فرمایا جس میں نوع انسانی کے کسی فرد کو یہ شکایت و حسرت نہ رہے کہ

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اور پھر انسان کو اس کا پتہ دیتے ہوئے آگاہ فرمایا کہ:-

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ

(قرآن)

یہ دوسرا گھر ہم ان لوگوں کے لیے بناتے ہیں جو عالم ارضی میں اپنی برتری جتانے اور فساد پھیلانے کے کام نہیں کرتے اور اچھا انجام اور آگے ملنے والی نعمتیں ان بندوں کے لیے ہیں جو اس دنیا میں پرہیزگاری کی زندگی گزارنے والے ہیں۔

پروردگار عالم کے اس فیصلہ اور اس اعلان سے لوگوں کو آگاہ کرنا اور اس کی حقانیت کا لازوال یقین انسانوں کے دلوں میں بھرنا، دراصل یہی وہ واحد تدبیر ہے جس سے انسان کی نوعی فلاح کی بنیاد اور شرط اول وجود میں آتی ہے —— مجموعی نوعی فلاح اور ایک صحت مند اجتماعی زندگی کی خواہش اگر انسان کی کوئی غیر فطری خواہش نہیں ہے، تو جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں، تقاضائے فطرت ہے کہ اس کی بنیادی شرط کو وجود میں لانے کا کوئی سامان ہونا چاہیے۔ پس اب یا تو اس مذکورہ بالا سامان کو حقیقت مان لیجیے، اور اس سے کام لیجیے، ورنہ کسی دوسرے سامان کا پتہ دیجیے کہ اس کے بغیر انسانی زندگی کے امن و سکون کا مسئلہ سارے خارجی وسائل اور ساری فکرمندیوں کے باوجود لاینحل ہی رہے گا۔

(الفرقان جمادی الثانی ۱۳۷۷ھ)
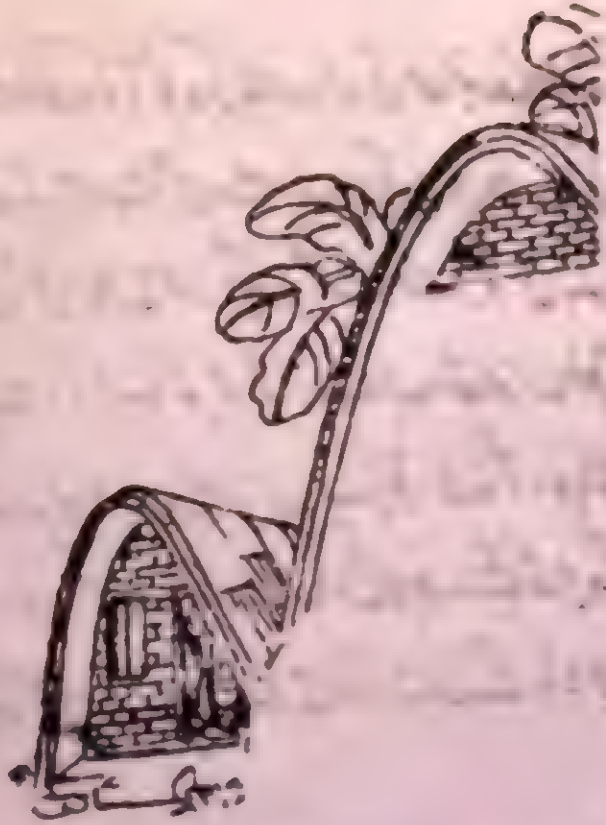
محمد منظور نعمانی

ملک میں دیانت و اخلاق کا مسئلہ

(۱)

ہمارے ملک میں اللہ نے جن لوگوں کو سوچنے والی عقل، سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھیں دی ہیں، وہ اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہو سکتے کہ دیانت و اخلاق کا مسئلہ ہمارے ملک میں بہت زیادہ بگڑا ہوا ہے اور یہ کہ یہ بگاڑ بجائے خود ایک بڑی برائی اور مہلک بیماری ہونے کے علاوہ ملک کی تعمیر و ترقی کی راہ میں بھی بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

لیکن "ملک کے بڑے" کبھی کبھی اپنے بیانوں میں اور پریس کانفرنسوں میں اس مسئلہ کا ذکر جس انداز میں کرتے ہیں اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بگاڑ جس انتہائی خطرناک حد تک پہنچا ہوا ہے اور اس سے ملک کو جتنا عظیم نقصان پہنچ رہا ہے اس کا ان کو صحیح علم و اندازہ نہیں ہے ——— اور اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں، کیونکہ ان کا ذریعہ علم عام طور سے محکموں کی رپورٹیں ہوتی ہیں جن کا حال خاص کر اس باب میں معلوم ہے ——— بہرحال ہمارے نزدیک یہی وجہ ہے کہ اس مسئلہ کو ملک کے ان بڑوں کی بھی خاص فکر و توجہ ابھی تک حاصل نہیں ہو سکی ہے جن کا ملک کے ساتھ خلوص اور جن کی فکرمندی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

یہ ناچیز قریباً ۲۰ سال سے چونکہ سیاست کے میدان سے الگ رہ کر زندگی گزار رہا ہے اس لیے سیاسی جماعتوں کی اصطلاح کے مطابق تو وہ "عوامی آدمی" نہیں ہے لیکن اس لحاظ سے وہ بہت سے عوامی لیڈروں سے بڑا عوامی ہے کہ اپنی زندگی کی ایک خاص نوعیت کی وجہ سے عوام سے تعلق و رابطہ اور ان کے احوال و مسائل اور ان کے دکھ درد سے واقف ہونے کا جتنا موقع اس عاجز

کو ملتا ہے غالباً ان لوگوں میں سے بہت کم کو اتنا ملتا ہوگا، جن کو آج کل عوامی لیڈر یا عوامی آدمی کہا جاتا ہے۔

اور اتفاق سے میں نے ایک ایسے کام کو کچھ اپنا رکھا ہے جس کی وجہ سے مجھے عوام سے اور ان کو مجھ سے ملنے اور قریب رہنے کا بہت زیادہ موقع رہتا ہے۔ علاوہ اس کے میں کثیر الاسفار ہوں اور مدت سے میرا معمول ہے کہ اگر تھرڈ کلاس میں آرام سے سفر کرنے کا موقع ملے تو میں اسی میں سفر کرتا ہوں اور اگر وہاں تنگی اور تکلیف ہو تو سکنڈ کلاس میں (اور اگر اس میں بھی متوسط درجہ کا آرام نہ مل سکے تو پھر اجیب میں پیسے ہونے کی صورت میں) فرسٹ کلاس میں بھی سفر کر لیتا ہوں ——— میرا تجربہ یہ ہے کہ عوام کے مختلف طبقوں کے حالات و خیالات اور ان کی برائی بھلائی کے مطالعہ کا جتنا بے تکلف اور بے پردہ موقع تھرڈ کلاس کے سفر میں ملتا ہے (بشرطیکہ آدمی کو اس مطالعہ سے دلچسپی ہو اور وہ اس کا اہل بھی ہو) اتنا شاید ہی کہیں اور مل سکتا ہو ——— اسی طرح ذرا اونچے کلاس کے لوگوں کے حالات و خیالات معلوم کرنے کا موقع بھی سکنڈ کلاس میں خوب ملتا ہے۔ اور اگر آدمی چاہے تو عوامی مسائل پر غور و فکر کے لیے اس ذریعہ سے بڑا مواد حاصل کر سکتا ہے۔ میں کبھی کبھی سوچا کرتا ہوں کہ ہمارے وزرا اور بڑے لیڈر اگر گاہ بگاہ ملک کے ایک عام شہری کی طرح خاموشی سے تھرڈ کلاس اور سکنڈ کلاس میں سفر کر لیا کریں تو ملک اور عوام کی صحیح حالت سے وہ ذاتی طور پر اور براہ راست اتنے واقف ہو سکتے ہیں جتنے واقف ہونے کی ان کو واقعی ضرورت ہے ——— اس وقت صورت یہ ہے کہ ان بڑوں کی بعض باتوں سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید وہ اس دنیا سے بالکل الگ رہ کر یہاں کے مسائل کو سوچتے ہیں۔

خیر! یہ بات تو جملہ معترضہ کے طور پر زبان قلم پر آ گئی، ورنہ میں عرض یہ کرنا چاہتا تھا کہ چونکہ میں کثیر الاسفار ہوں اور ذہن فطری طور پر اس طرح کے مطالعہ اور غور و فکر کا عادی ہے، اسی نتیجے میں اپنے سفروں سے یہ فائدہ بھی اٹھاتا ہوں۔

آج کی صحبت میں، میں اس سلسلہ کے اپنے کچھ ذاتی تجربات و معلومات اور ان کی بنا پر لگائے ہوئے اپنے کچھ اندازے پیش کرتا ہوں جن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دیانت و اخلاق کا بگاڑ کس حد تک پہونچ چکا ہے، اور ملک کو یہ کتنی مہلک اور خطرناک بیماری لگی ہوئی ہے۔

یوں تو ملک کا کوئی طبقہ بھی ایسا نہیں ہے جو بددیانتی اور ناجائز ذریعوں سے دولت حاصل کرنے کی بری عادت میں مبتلا نہ ہو، لیکن اس میں سب سے بڑھا ہوا نمبر سرکاری ملازمین کا ہے ـــــ مختلف قابل اعتماد ذریعوں سے میرے جو معلومات ہیں ان کی بنا پر میرا اندازہ ہے کہ اس وقت صورت یہ ہے کہ جن محکموں میں بھی سرکاری ملازمین کو رشوت اور خیانت و بددیانتی کے مواقع حاصل ہیں (اور زیادہ تر محکمے وہی ہیں) ان میں قریباً نوے فیصدی ضرور اس گندگی میں مبتلا ہیں۔

میرا ذاتی تجربہ تو صرف ریلوے کے محکمہ کا اور وہ بھی صرف ٹی ٹی صاحبان کا ہے، میں نے ابھی اوپر جیسا کہ عرض کیا ہے میں زیادہ تر سفر تھرڈ کلاس میں کرتا ہوں، لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہاں جگہ کی تنگی جب میرے لیے باعث تکلیف ہونے لگتی ہے تو میں حسب موقع اوپر کے درجے میں منتقل ہو جاتا ہوں، میرا نوے فیصدی سے کچھ زیادہ ہی کا یہ تجربہ ہے کہ جب میں ٹی ٹی آئی صاحب کو تلاش کر کے ٹکٹ کی تبدیلی کے لیے کہتا ہوں تو وہ حساب لگا کے فرما دیتے ہیں کہ "اتنے پیسے ہوئے آپ مجھے یہ پیسے اور اپنا ٹکٹ دیدیجیے، اور منتقل ہو جائیے، میں ٹکٹ بنا کر اگلے اسٹیشن پر آپ کو خود پہنچا دوں گا" ـــــ پھر سفر طے ہوتا رہتا ہے اور میں ان کا انتظار کرتا رہتا ہوں، دو چار اسٹیشن گزرنے کے بعد میں پھر انھیں تلاش کرتا ہوں اور ٹکٹ کے لیے تقاضا کرتا ہوں تو وہ بڑے "اخلاق" سے فرما دیتے ہیں کہ "ابھی تک میں بنا نہیں سکا ہوں، آپ اطمینان سے اپنی جگہ آرام فرمائیں میں بنا کر خود ہی آپ کے پاس پہونچا دوں گا۔" یہاں تک کہ وہ اسٹیشن آجاتا ہے جہاں مجھے اترنا ہے، تو وہ بابو صاحب میرے پاس تشریف لاتے ہیں اور مجھے میرا صرف تھرڈ کلاس کا ٹکٹ واپس کرنا چاہتے ہیں اور جب میں ان سے کہتا ہوں کہ پیسوں کی رسید! تو وہ فرماتے ہیں کہ سفر آپ کا آرام سے پورا ہو گیا اب آپ رسید لے کر کیا کریں گے ـــــ

اس کے بعد میں ان سے کہتا ہوں کہ یہ مجرمانہ حرکت ہے اور چوری ہے اور آپ مجھے بھی اس میں شریک کرنا چاہتے ہیں گویا مجھے بھی چور اور بددیانت سمجھتے ہیں، اور میں آگے کارروائی کرنے کی دھمکی دیتا ہوں تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ حواس باختہ ہو کر میرے پیسے واپس کرنا چاہتے ہیں اور میری خوشامد کرنے لگتے ہیں، پھر میں جب ان سے کہتا ہوں کہ بھائی! میں اوپر کے کلاس

ہی سفر کر چکا اور زائد کرایہ میرے ذمہ واجب ہو چکا اور اس کو ادا نہ کرنا بددیانتی اور چوری ہے اس لیے آپ کو مجھ سے پیسے لے کر رسید کاٹنی ہی ہوگی تاکہ ریلوے کے جو پیسے میرے ذمہ واجب ہو چکے ہیں وہ ریلوے کے خزانے میں پہونچ جائیں، تو وہ مجبور ہو کر رسید بناتے ہیں ——

میں عرض کر چکا ہوں کہ میرا قریباً نوے فیصدی یہی تجربہ ہے۔ میں نے ایسے موقعوں پر اس پر بھی غور کیا کہ ان لوگوں کو سزا دلوانے کے لیے بات کو آگے چلایا جائے، لیکن اس پر میری طبیعت اولاً تو اس لیے آمادہ نہیں ہوئی کہ جن افسروں کے سامنے ان کا معاملہ جائے گا ان کی دیانت اور پاکدامنی کا بھی کچھ اندازہ ہے اور دوسری بڑی وجہ میرے آمادہ نہ ہونے کی یہ ہے کہ دفاتر اور عدالتوں میں اس طرح کے کاموں میں وقت اتنا برباد ہوتا ہے کہ جس کو اپنا وقت ذرا بھی عزیز ہو وہ سخت مجبوری اور اضطرار کے بغیر اس طرح کی کسی کارروائی میں حصہ لینے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتا۔

ریلوے ہی کے محکمہ کا ایک اور عبرتناک واقعہ بھی یہاں قابل ذکر ہے، پچھلے سال کی بات ہے مجھے ایک لائن پر کئی سفر جلدی جلدی کرنے پڑے، ٹی ٹی صاحبان کو میں نے بڑی بے خوفی اور بڑے اطمینان کے ساتھ پیسے بنانے کا کاروبار کرتے دیکھا۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ ان ٹی ٹی آئی صاحبان کے افسر فلاں صاحب ہیں جن کو میں اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر ایک ایماندار اور دیانت دار آدمی جانتا ہوں، میں نے ان سے خود مل کر کہا کہ کیا آپ اس سے واقف نہیں ہیں کہ آپ کی لائن پر یہ کاروبار ایسے دھڑلے سے ہوتا ہے؟ انھوں نے مجھے اپنی کمزوری کے اعتراف کے ساتھ بتایا کہ جب میرا یہاں تبادلہ ہوا۔ تو میں نے اپنے ماتحت ٹی ٹی آئی صاحبان سے اس معاملے میں نجی طور پر صاف صاف بات کی کہ میں چاہتا ہوں کہ کام دیانت داری سے ہو اور رشوت وغیرہ سے ہم آپ اپنے کو بالکل بچائیں، انھوں نے مجھے سوچ سمجھ کے اور سنجیدگی سے جواب دیا کہ آپ تو اپنا طرز عمل جیسا چاہیں رکھیں لیکن ہمارے معاملات میں آپ کے لیے بہتر یہ ہوگا کہ زیادہ مداخلت نہ کریں، ہم آپ کا اور آپ کی بات کا اتنا لحاظ کریں گے کہ جب آپ ساتھ ہوں گے تو ہم کوئی غلط کام نہیں کریں گے، اس سے زیادہ آپ ہمارے پیچھے نہ پڑیں، ورنہ آپ کو نقصان پہنچ جائے گا، —— انھوں نے کہا کہ یہ میری کمزوری ہے کہ میں نے اسی میں اپنی آبرو کی حفاظت اور

ملازمت اور روزی کی خیر سمجھی اور گویا اسی پران سے صلح کرلی۔

انھوں نے میرے دریافت کرنے پر جب تفصیل سے یہ بتایا کہ ان کے ماتحت وہ ڈی ٹی صاحبان ان کو کیا نقصان پہنچا سکتے تھے، تو کسی درجہ میں میں نے بھی اُن بیچارے کو معذور سمجھا۔

اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بعض سرکاری محکموں میں بد دیانتی اور خیانت اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ کسی ایماندار آدمی کے لیے اس محکمہ میں رہنے کی گنجائش نہیں رہی ہے۔ حکومت کے مختلف محکموں میں ملازمت کرنے والے مختلف شہروں کے میرے دوستوں نے اپنی یہ مشکل بارہا مجھ سے بیان کی ہے کہ ان کے محکمہ اور دفتر کے ان کے ساتھی صرف اس لیے ان کے مخالف ہیں کہ وہ رشوت نہیں لیتے ہیں اور اس لیے خواہ مخواہ ان کو اپنے لیے خطرناک سمجھ کر اُن کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں۔

کچھ ہی عرصہ ہوا ایک نیک صالح نوجوان مجھ سے ملے اور انھوں نے بتایا کہ میں نے انجینیرنگ پاس کیا ہے اور پی، ڈبلو. ڈی میں میں نے ملازمت کی کوشش کی تھی اور خدا کے فضل سے وہ کوشش کامیاب بھی ہوگئی ہے اور امید ہے کہ عنقریب ہی مجھے تقرری کی اطلاع مل جائے گی لیکن اس محکمہ میں کام کرنے والوں سے اب مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ عام حالت محکمہ کی یہ ہے کہ چھوٹے بڑے سب افسران اپنی اپنی حیثیتوں کے مطابق ٹھیکہ داروں سے رشوتیں لے کر ان کی بنائی ہوئی عمارتوں کو پاس کرتے ہیں اور ان رشوتوں کے اعتماد پر ٹھیکہ دار عمارتوں میں سامان بھی شرائط کے مطابق نہیں لگاتے، بلکہ رشوتیں اتنی بڑی بڑی دی جاتی ہیں کہ اگر ان رشوتوں کے ساتھ مال بھی صحیح لگایا جائے تو ٹھیکہ داروں کو بجائے نفع کے بہت بڑا نقصان ہو اس لیے ٹھیکہ دار مال صحیح لگا بھی نہیں سکتے، ایسی صورت میں اگر میں دیانت داری سے اپنا فرض انجام دینا چاہوں گا اور ٹھیکہ داروں کے ساتھ ناجائز رعایت نہ کروں گا تو پورے محکمہ کی اور خود افسروں کی دشمنی مول لوں گا اور وہ اپنے مفاد کی حفاظت کے لیے مجھے نکالنا ضروری سمجھیں گے۔ اور اس مقصد کے لیے مجھ پر ہر طرح کے الزام لگائیں گے اور مجھے تنگ کریں گے۔ وہ نوجوان کہتے تھے کہ اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ بجائے اس جگہ کے اب میں کسی اور جگہ کے لیے کوشش کروں۔

اس واقعہ سے ناظرین کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ رشوت خوری کی یہ لعنت سود وسو ماہوار

کی تنخواہ پانے والے بیچارے صرف تھرڈ کلاس کے بابوؤں ہی میں نہیں ہے بلکہ ہزاروں کے حساب سے تنخواہیں پانے والے بہت سے اونچے درجہ کے افسران بھی اس گندگی میں مبتلا ہیں ——
خود اس ناچیز کے علم میں اس کی بعض ایسی بھی حیرت انگیز مثالیں ہیں کہ اگر انتہائی قابل اعتماد ذرائع سے ان کا علم نہ ہوا ہوتا تو خود مجھے بھی ان پر یقین نہ آتا۔

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا اس کا تعلق صرف سرکاری ملازمین سے تھا، اور ہر واقف حال جانتا ہے کہ دوسرے طبقوں کا حال بھی اس سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں ہے، ملک کی عام حالت اور ہمارے عوام کا عام مزاج اس وقت یہی ہے کہ جس شخص کے لیے قانون کی گرفت اور ذلت ورسوائی کے خطرہ سے بچ کر کسی ناجائز طریقہ سے دولت حاصل کرنے کا امکان ہے۔ وہ اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے، اور جن کا یہ حال نہیں ہے وہ بس مستثنیات میں سے ہیں۔

دیانت واخلاق کا یہ غیر معمولی بگاڑ، ظاہر ہے کہ ملک کی تعمیر وترقی کی راہ میں بھی بہت بڑی رکاوٹ ہے، اس لیے خالص ملکی نقطہ نگاہ سے بھی اس مسئلہ کی اہمیت کسی دوسرے ملکی مسئلہ سے کم نہیں ہے۔

ملک کے سچے خیر خواہوں کا فرض ہے کہ وہ اس مسئلہ کی واقعی نوعیت اور اہمیت کو سمجھیں اور اس کا مداوا سوچیں۔ ہم نے جہاں تک غور کیا ہے ہماری رائے یہ ہے کہ اس بگاڑ کا سدھار اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ پورے خلوص اور عزم کے ساتھ اس کو ایک مستقل مہم بنا کر کام نہ کیا جائے۔

بات کافی طویل ہوگئی اس لیے اس کام کے طریقہ اور راستہ سے متعلق جو کچھ ہم کو عرض کرنا ہے وہ انشاء اللہ اب آئندہ صحبت ہی میں عرض کیا جا سکے گا۔

(الفرقان ماہ صفر ۱۳۸۰ھ)

محمد منظور نعمانی

ملک میں دیانت و اخلاق کا مسئلہ

(۲)

[ہمارے ملک میں اخلاق و دیانت کا افلاس و زوال جس خطرناک حد تک پہنچ چکا ہے، پچھلی اشاعت کے ان ہی صفحات میں ہم نے اس کا کچھ تذکرہ کیا تھا ــــــ آج کی صحبت میں حسب وعدہ یہ عرض کرنا ہے کہ اس بگاڑ کا سدھار اور اس مرض کا علاج کس طریقہ سے کیا جا سکتا ہے -]

یہ تو ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں جس طرح کی اور جس درجہ کی رسمی کوششیں اب تک ہوتی رہی ہیں وہ مقصد اور نتیجہ کے لحاظ سے قریب قریب بالکل ناکام رہی ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ مسئلہ کو نئے ڈھنگ سے سوچا جائے ــــــ ہم نے جہاں تک غور کیا ہے اس کا صحیح ترین راستہ تو وہ ہے جو انبیاء علیہم السلام کا طریقۂ اصلاح و تزکیہ رہا ہے۔ یعنی یہ کہ پہلے بندوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا یقین اور اس کے ساتھ عبدیت کا ایک زندہ تعلق اور آخرت کی جزا سزا کا یقین اور وہاں کی فکر پیدا کی جائے اور اس کو بنیاد بنا کر ان کی زندگی کو صرف بد دیانتی اور بد نیتی ہی کی ناپاکی سے نہیں بلکہ ہر قسم کی ناپاکیوں سے پاک کر دیا جائے۔ اس طریقہ سے جو ہر جہتی پاکیزگی اور پاکبازی آتی ہے وہ کسی دوسرے طریقہ سے نہیں آسکتی۔ علاوہ ازیں اُس سے سیرت و اخلاق کی اس اصلاح و درستی کے ساتھ ساتھ جس کی ضرورت ہر خدا ناآشنا اور آخرت کے یقین سے محروم معاشرہ بھی محسوس کرتا ہے، انسان، اللہ تعالیٰ کی ابدی رحمت و عنایت کا مستحق ہو جاتا ہے جو اس کی سب سے بڑی فیروزمندی ہے۔

لیکن اگر مادّی اور حیوانی فلسفۂ حیات اور اس طرح کے دوسرے عوامل نے ہمارے ملک

کے "بڑوں" کے دل و دماغ کو ایسا بنا دیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بتائی ہوئی سچی حقیقتوں پر اور اُن کے طریقہ پر ایمان و یقین کے لیے خدانخواستہ کوئی گنجائش فی الحال ان میں نہیں رہی ہے اور بدقسمتی سے یہ باتیں اُن کے نزدیک غور و فکر کے لائق ہی نہیں ہیں تو پھر کم از کم اتنا تو وہ کر ہی سکتے ہیں کہ صرف دنیوی اور قومی اخلاق کے محدود تصور اور اُس کے بناؤ بگاڑ کے دنیوی نتائج ہی کو سامنے رکھ کر ملک کے مسائل میں اس کو وہ اہمیت دیں جس کا واقعتہً وہ مستحق ہے اور اپنے کو اور عوام کو صرف فریب دینے والی دھرتے کی فضول کوششوں پر قناعت کرنے کے بجائے اس کے لیے اس طرح کی وسیع اور موثر جدوجہد کا چند سالہ ہی ایک منصوبہ بنائیں جو ایسے کسی اہم مسئلہ کے لیے ہونی چاہیے، اور پھر اُس منصوبہ کو بروئے کار لانے کے لیے جو کچھ کرنا ضروری ہو اپنی امکانی حد تک اُس میں کمی نہ کریں ——— اس کام کے سلسلہ میں چند اصولی باتوں کی طرف ہم یہاں بھی اشارہ کرتے ہیں۔

(۱) چور بازاری اور رشوت ستانی وغیرہ بددیانتی کی مختلف صورتیں، اخلاقی اور قانونی جرائم ہونے کے علاوہ ظاہر ہے کہ ملک کے لیے سخت تباہ کن اور اس وقت اس کی ترقی کے راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں اس لیے وہ ملک کے حق میں چوروں کی چوری اور ڈاکوؤں کی ڈاکہ زنی سے بھی زیادہ مضر اور مہلک ہیں، لیکن ہمارے عوام میں اس پہلو کا شعور اتنا کم ہے کہ گویا نہیں ہے ——— اس لئے اس کام کے سلسلہ کی پہلی ضرورت یہ ہے کہ جس طرح جنگ کے موقع پر ملک کی حفاظت کا داعیہ اور دشمن کے خلاف غصہ اور نفرت کا جذبہ عوام کے دلوں میں پیدا کرنے کے لیے وسیع پیمانہ پر پروپیگنڈا کیا جاتا ہے، لگ بھگ اسی پیمانہ پر بددیانتی کی ان سب صورتوں کی نفرت دلوں میں پیدا کرنے کے لیے پروپیگنڈا کیا جائے اور اس میں عوام کو یہ پہلو سمجھانے کی خاص طور سے کوشش کی جائے کہ یہ سخت ترین ملک دشمنی اور غداری بھی ہے۔

(۲) رشوت وغیرہ ناجائز طریقوں سے دولت کمانے والوں میں بلاشبہ ایک تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو اپنی "ضرورت" کے لیے نہیں بلکہ دولت بڑھانے کے لیے ہی یہ پاپ کرتے ہیں، لیکن اسّی نوّے فیصدی وہ ہوں گے جو صرف اس لیے اس راستہ پر چلنا شروع

کرتے ہیں کہ ان کی جائز آمدنی اُن کے بڑھے ہوئے خرچوں کے لیے پوری نہیں ہوتی ـــــ مثلاً ایک بابوجی کی تنخواہ صرف دو سو روپئے ہے لیکن ان کی زندگی کا جو معیار ہے اس کے لیے ضرورت پانچسو روپیہ ماہوار کی ہے، اس لیے ابتداء میں تو وہ صرف اس واسطے رشوت قبول کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ اپنے معیار کے مطابق زندگی کی ضرورتیں کسی طرح پوری کر سکیں ـــــ لیکن خون منھ سے لگ جانے کے بعد پھر بات ضرورت ہی کی حد تک نہیں رہتی ـــــ اس لیے اگر ملک کی خاطر اور اخلاق و شرافت کی خاطر بددیانتی کے اس طوفان کو روکنا ہے تو یہ بھی ضروری ہے کہ معیارِ زندگی کی بلندی کا رجحان جس طرح ملک میں بڑھ رہا ہے (بلکہ دانستہ بڑھایا جا رہا ہے) اُس کی ان مضرتوں اور ہلاکتوں کو سمجھا جائے اور اس کو روکنے کی کوشش کی جائے ـــــ اور اس کی صورت یہی ہے کہ سادہ معاشرت کے اصول کو اپنایا جائے اور اسی کو ملک کا فیشن بنایا جائے ـــــ جاننے والے جانتے ہیں کہ کسی طرزِ زندگی کے فیشن بننے اور عوام میں مقبول ہو جانے کا انحصار و مدار ملک کے سربرآوردہ اور برسرِاقتدار طبقہ کے طرزِ عمل پر ہوتا ہے۔ یہ طبقہ جس طرزِ زندگی کو اختیار کرلے وہ آسانی سے عوام کا فیشن بن سکتا ہے۔ بس اگر ہمارے ملک کے "بڑے" معتدل درجہ کی سادہ معاشرت خود اختیار کرلیں اور عوام میں اس کو مقبول بنانے کے لیے سچے دل اور دیانت داری سے کوشش کریں تو دیکھتے دیکھتے ملک کا فیشن بدل سکتا ہے اور بددیانتی اور رشوت خوری کی سب سے بڑی بنیاد ختم ہو سکتی ہے۔

میرے ایک دوست جنھوں نے گزشتہ سال ہی چین کا دورہ کیا ہے بتاتے تھے کہ پورے ملک نے سادہ اور کم خرچ معاشرت کے اصول کو ایسا اپنایا ہے کہ اب وہاں کسی کو اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے بڑی آمدنی کی ضرورت نہیں اور وہاں سے رشوت وغیرہ کے ختم ہونے میں اس چیز کو بھی بہت بڑا دخل ہے ـــــ وہی دوست بتاتے تھے کہ وزراء تک کا معیارِ زندگی وہی ہے جو ایک متوسط درجہ کے شہری کا ہے، یہاں تک کہ وزراء اپنی نجی ضرورتوں کے لیے بے تکلف عام شہریوں کی طرح اور اُن کے ساتھ بسوں پر سوار ہوتے ہیں ـــــ لیکن ہمارے اکثر وزراء شیروانی اور پاجامہ یا کرتا اور دھوتی تو بیشک کھدر ہی کی پہنتے ہیں (جس کے لیے کسی حد تک مجبور بھی ہیں) لیکن موٹروں، کوٹھیوں اور زندگی کے

دوسرے ٹھاٹھ باٹھ میں وہ کسی لارڈ اور کسی بڑے سے بڑے دولت مند سے کم نہیں ہیں۔
ظاہر ہے کہ ان بڑوں کی معاشرت جب تک یہ ہے، فیشن اور معیار زندگی کے بارہ میں عوام کا رجحان یہی رہے گا جو اب ہے اور اس کے نتیجہ میں عوام کا ایک طبقہ خاص کر سرکاری ملازمین کی بڑی تعداد رشوت خوری اور بددیانتی کو اپنی زندگی کی ضرورت سمجھتی رہے گی اور ملک ان لعنتوں سے کبھی بھی نجات نہ پاسکے گا۔ بات بات میں گاندھی جی کا نام لینے والے اور ملک کے بڑے اگر معاشرت اور معیار زندگی کے بارہ میں گاندھی جی کی منشا کو صرف ۲۵ فیصدی ہی پورا کرنے کا دیانت دارانہ ارادہ کرلیں تو معیار زندگی کی بلندی کے اس بڑھتے ہوئے بحران کی بہت کچھ اصلاح ہو سکتی ہے۔

(۳) مذکورہ بالا اصلاحی کوششوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ بددیانتی، خاصکر خیانت و غبن اور رشوت ستانی کے قانون کو کم از کم منصوبہ کی محدود مدت ہی کے لیے سخت سے سخت کیا جائے، جرم ثابت ہو جانے پر مجرموں کو عبرتناک سزائیں دی جائیں، ان کی دولت ضبط کی جائے، اور اُن کے جرم کی عوام میں پوری تشہیر کر کے اُن کی حیثیت عرفی کو بالکل گرادیا جائے۔

(۴) اس سلسلہ کے مقدمات کی سماعت کے لیے اسپیشل عدالتیں قائم کی جائیں اور اُن کے لیے ایسے جج منتخب کیے جائیں جن کی دیانت داری اور معاملہ فہمی زیادہ سے زیادہ قابل بھروسہ ہو۔ ان عدالتوں کا طریق کار ایسا ہو کہ معاملہ کا فیصلہ جلد سے جلد ہو اور ثبوت یا صفائی میں حصہ لینے والے عوام کا وقت برباد نہ ہو۔

(۵) جس طرح کسی خطرہ کے وقت سی، آئی، ڈی سے خاص پیمانہ پر کام لیا جاتا ہے اسی طرح منصوبہ کی مدت تک ہی کے لیے اس سلسلہ میں سی آئی، ڈی کی سرگرمیوں کو وسیع اور تیز کر دیا جائے

یہ چند اصولی اشارے ہیں۔ اگر ملک کے بڑے جن پر ملک اور قوم کی ذمہ داری ہے خلوص اور دیانت کے ساتھ اس بارہ میں اپنا فرض ادا کرنے کا ارادہ کریں تو وہ خود اس سے بھی زیادہ سوچ سمجھ سکتے ہیں۔

(الفرقان، ربیع الاول ۱۳۸۳ھ)

ٹیلی فون نمبر ۳۲۳۹۷۶
ٹیلی گرام "NASEEBDAR"
اسکو سیلس ڈپو
مینوفیکچررس اینڈ ایکسپورٹرس
سنہری اور قوس قزح جیسی رنگ برنگی چوڑیاں
پلاسٹک کا نفیس سامان
مصنوعی زیورات
اور
عطریات وغیرہ کیلئے
رجوع کیجئے
ASACO SALES
DEPOT
222, Janjikar Street
BOMBAY-3

جناب صوفی نذیر احمد کاشمیری

احیاءِ دین کا جذبہ رکھنے والوں کے لیے ایک لمحۂ فکریہ

چند دقیق اُصولی اشارات

حیاتِ انسانی، اخلاقی و روحانی و طبعی قوتوں کا اس درجہ جامع امتزاج ہے کہ جس کی نظیر سلسلۂ تخلیق میں کہیں نہیں ملتی۔ گزشتہ سالوں میں (غالباً ۵۵ء یا ۵۶ء میں) حیدرآباد میں ہونے والی ایک سائنس کانفرنس میں مسٹر ہکسلے نے اس حقیقت کا مفصل اقرار کیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی تمام وہ دہریے سائنٹسٹ جو بضد ہیں کہ وہ حیاتِ انسانی کے سارے وظائف و اعمال کی تشریح میکنیائی، نباتی یا حیوانی انداز پر کر سکتے ہیں، کسی نہ کسی موقع پر مجبور ہو گئے ہیں کہ وہ انسان کے اشرف و اکرم مخلوقات ہونے کا اقرار کریں۔ لیکن اپنی دہریت کے تعصب میں وہ اس اجمالی اعترافِ حق کی تشریحِ مزید کی طرف نہیں جاتے۔ ان کے نظریوں کی تفصیلی تنقید کو نظر انداز کرتے ہوئے اتنی بات کا اعلان کرنا سلسلۂ تخلیق کی ایک صداقتِ عظیم ہے کہ انسان کا یہ احساس کہ وہ سب سے پہلے انسان ہے اور بعد میں کچھ اور، ان کی تمام میکنیائی، نباتی و حیوانی تشریح کے کلی بطلان پر مشتمل ہے۔ اور یہ احساس، حیاتِ انسانی کا سب سے اصولی و مرکزی ذاتی احساس ہے۔ اس کا باقی تمام احساس و شعور صرف اسی انسانی احساس انانیت پر مبنی ہے۔ انسان، کائنات اور اس کے اندر کی تمام اشیاء کی جو جو بھی قدر و قیمت معین کرتا ہے اس کا تعلق اساسی طور پر صرف اسی انسانی احساس انا کے مقام سے وابستہ ہے اگر یہ مقام معین نہیں تو اس کا ہر محاکمہ باطل ہے۔

(۲) اَنا کا تجزیہ صدر کی چند واضح سطور کے بعد یہ بات ایک بداہتِ ثابتہ کے طور پر کہی جا سکتی ہے کہ سلسلۂ حیات کی سب کڑیوں کے مقابل حیاتِ انسانی نام ہے انسان کے

اخلاقی و روحانی شعور و کردار کا۔ اس شعور و کردار کے علاوہ باقی محرکات و وظائف و اعمال میں انسان کہیں بلاشک حیوان سے کہیں نباتات سے اور کہیں مشین سے مشابہت رکھتا ہے۔ مگر یہ زعم علی الاطلاق باطل ہے کہ ان مشابہتوں سے اس کا نوعی موقف معین کیا جاسکتا ہے یا ان کے ذریعے اس کی نوعی تاریخ کی تشریح کی جاسکتی ہے۔ اس لیے کہ تمام انواع مخلوقات کی تاریخ صرف ان کے نوعی امتیازات سے متعین ہوسکتی ہے۔ تمام انواع کی مابہ الاشتراک باتوں سے کسی بھی نوع کی حقیقت یا تاریخ متعین نہیں کی جاسکتی۔ ان مابہ الاشتراک باتوں پر بنیادی زور دینے اور نوعی خصوصیتوں کو نظر انداز کرنے سے انسان کو بتدریج ہلاکت کی وادی میں پہنچایا جاسکتا ہے اس طریق سے اس کی حفاظت نہیں ہوسکتی۔ گزشتہ دو سو برس سے دہریت انسان کو اسی وادی المہالکین کی طرف لے جارہی ہے۔ کمیونزم اسی دعوت الی الہلاکت کی سب سے خطرناک صورت ہے۔

(۳) کمیونزم کا خلاصہ

(الف) حیاتِ حیوانی کی طرح حیات انسانی کا نوعی نصب العین بھی صرف روٹی اور صنفی تسکین کا سوال ہے۔ لہٰذا مذہب و اخلاق و روحانیت کے نام پر انسانی نصب العین کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے یا کہا جارہا ہے، وہ یا تو مفاد پرست طبقات کی بے ایمانی ہے یا انسانی اوہام پرستی ہے، جسے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی ضرورت ہے۔

(ب) اس نصب العین کے حصول کا سب سے صحیح، سب سے جامع اور ساتھ ہی سب سے آسان طریقہ حیوانی تنازع للبقا کے انداز پر طبقاتی نفرت کو تیز سے تیز کرتے ہوئے طبقاتی جنگ کی صورت پیدا کرنا ہے۔ یہی طبقاتی نفرت پر مبنی طبقاتی جنگ اس نصب العین کے حصول کا سب سے صحیح ذریعہ ہے۔ لہٰذا اس مقام پر بھی (یعنی ذرائع میں) بھی اخلاقی و غیر اخلاقی، روحانی و غیر روحانی اور بالآخر جائز و ناجائز کا سوال پیدا کرنا قدیم مفاد پرست طبقات کی بے ایمانی و دغابازی ہے یا اوہام پرستی ہے جسے بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دینے کی ضرورت ہے۔

(ج) نصب العین اور اس کے حصول کے ذرائع کے علاوہ انسان کے تمام تہذیبی و ثقافتی مظاہر

کی تشریح بھی بخوبی اسی مادی نصب العین کی روشنی میں ٹھیک حیوانی جبلت کے ماتحت کی جاسکتی ہے۔ یہاں بھی تاریخ انسانی کے لیے کسی مخصوص اخلاقی و روحانی بنیاد کو تسلیم کرانا محض فریب کاری، دھوکا دہی یا اوہام پرستی ہے۔ جو مفاد پرست طبقات کی شرارت ہے۔

ان سطور میں نہ صرف کمیونزم بلکہ موجودہ لادین مغربی تمدن کی پوری پوری تلخیص آگئی ہے۔ چونکہ کمیونزم موجودہ مغربی مادیت کی نہایت درجہ منطقیانہ شکل ہے، جو مادی تصور تخلیق کو اپنے منطقیانہ نتائج کے آخری حدود تک پوری دلیری سے لے جانا چاہتا ہے، لہٰذا میں نے اسی کو اس پیراگراف کا ضمنی عنوان بنایا ہے۔ کمیونزم ہر جبر و ظلم سے اس تصور کو عالمگیر کرنے کی نہایت واضح شکل ہے اور لادینی مغربی جمہوریت اس کی نہایت اُلجھی ہوئی شکل ہے۔

(۴) احیائے دین کا نقطۂ آغاز

(الف) اس لادین مادیت کے مقابل دین کے احیاء کی عالمگیر شکل ہرگز کسی صورت یہ نہیں ہوسکتی کہ مذہب کے معاشرتی و معاشی و سیاسی پہلوؤں کو اصولی اہمیت دے کر انھیں کو ایک عام تنظیم کی بنیاد بنایا جائے۔ موجودہ حالات میں یہ صورت محض خلطِ مبحث، تضیع اوقات اور بالآخر ناکامی پر منتج ہوگی۔ اس لادین مادیت کے مقابل احیائے دین کی صحیح صورت اور تحریک صرف یہ ہوسکتی ہے کہ دین کے اساسی ایمان کو اور اسی کے ذریعہ بنیادی اخلاقِ مذہبی کو غایت الغایات درجہ تک بیدار کرتے ہوئے نوع انسانی کو اس باطل تعبیر تاریخ کے مقابل کھڑا کیا جائے۔

یہ طلب کس درجہ مضر ہوگی کہ دنیا میں تو طاعون کا مرض عالمگیر ہو رہا ہو اور خاندانی طبیبوں کا ایک گروہ کھڑا ہو جائے اور کالرے یا تپ دق کے انجکشن مخلوقات کو دینا شروع کر دے اور جب کوئی معقول انسان انھیں اس پر ٹوکے تو اپنے عمل کے جواز میں یہ سند پیش کر دیں کہ بھئی تمھارے ہمارے مشترک بابا کی کتاب طب میں یہ نسخے بھی تو لکھے ہیں۔

(ب) بلاشبہ اگر کل تاریخ انسانی میں کوئی ایسا موڑ آجائے کہ حیات انسانی کے تمام مقاصد کے

ساتھ ان کے مظاہر کی بھی باطنی تشریحات شروع کردی جائیں اور اس کائنات کے اندر بحیثیت خلیفۃ اللہ کے نوع انسانی کے جو فرائض ہیں انھیں نظرانداز کیا جانے لگے تو اس باطنیت کی فضا کو درست کرنے کے لیے انسان کے جو معاشی، معاشرتی و سیاسی حقوق و فرائض ہیں، ان پر اصولاً متوجہ ہونا اور دوسروں کو متوجہ کرنا نہایت صحیح صورتِ اصلاح ہوگی۔ لیکن آج جب کہ کائنات کے ساتھ خود تاریخِ انسانی کی ساری اخلاقی و روحانی معنویت کا کلی انکار کیا جارہا ہے، ایسے لوگ کہ جو معاشرے کی سیاسی و معاشی تنظیم ہی کو اصلِ دین اور مرکزِ دین بتائیں، نہایت درجہ غلط کار، مضر اور گمراہ کن ہوسکتے ہیں۔ اس کے مقابل صحیح طریق کار صرف یہ ہے کہ تعلق باللہ کو اجاگر کرتے ہوئے ایمان مجمل کو ایمان مفصل اور ایمان بالغیب کو شہودی ایمان جیسی پختہ صورت دی جائے۔

(۵) اصولی و فروعی مسائل میں فرق کی ضرورت

(الف) تمام انبیاء کی تعلیم اصولاً متحد رہی ہے۔ مگر معاشرتی و معاشی و سیاسی مسائل میں ان میں غیر معمولی اختلاف رہا ہے۔ حقیقت میں انسانیت کے دینِ واحد کو ادیانِ مختلفہ بنانے کا سبب ہی اصولی مسائل اور فروعی مسائل میں عدم امتیاز اور اس عدم امتیاز کے باعث فروع کو اصل قرار دے کر انھیں مرکزی اہمیت دینا رہا ہے۔

(ب) اب یہ اصولی مسائل کیا ہیں کہ جن کے اتحاد کی بنا پر تمام انبیاء کو دینِ واحد کا نمائندہ کہا جاسکتا ہے۔ یہ معاشی مسائل ہرگز نہیں، یہ معاشرتی مسائل بھی نہیں نہ یہ سیاسی مسائل و قوانین ہیں۔ اس لیے کہ ان میں سے اکثر انبیاء کی تعلیم میں بہت بڑا فرق ہے۔ لہٰذا یہ مسائل تو صرف ذات و صفاتِ باری پر، مقصودیتِ آخرت پر اور تمام سلسلۃ النبوت اخلاقی قدروں پر مشتمل ہیں۔ لہٰذا جسے دین کی اصلِ ثابت کو مضبوط کرنا ہو، اُسے اصولاً انھیں اساسوں کی تقویت و تربیت کرنا ہوتی ہے۔ جس کے بعد شاخ و برگ کا عمل بھی خود سے خود درست اور بارآور ہوتا جاتا ہے۔

(ج) یہ کس درجہ غیر فطری اور غیر اصولی طریق کار ہے کہ توحیدِ ذات و صفاتِ باری میں سے ایک

صفت "رب" کو یا ایک صفت حاکمیت کو لے لیا جائے اور اسے بھی ایک طرف نظریہ ربوبیت یا نظریۂ توحید کہہ کر محسوس البداہت حق کے بجائے منطقیانہ نظریے کے مقام پر لا چھوڑا جائے، دوسری طرف اس کے تقاضوں کو پوری امکانی تفصیل کی حدود تک منضبط کر لیا جائے اور اس پر دین کی کلی تشریح کا لیبل لگا کر اسے سوسائٹی کے سامنے رکھ دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ کُل دین ہے تو پھر اس کا کسی پہلو سے بھی انکار کرنے والے کیا ہوں گے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اہل کتاب کے حکم میں ہو سکتے ہیں۔ اس سے زائد ہونے کا کوئی بھی منطقیانہ امکان نہیں۔

(د) ایسی سب تشریحات کا ایک بنیادی نقص یہ بھی ہے کہ وہ ماضی کے فقیہانہ اختلافات میں کوئی کمی کرنے کے بجائے بیسیوں قسم کے نئے اختلافات پیدا کر رہی ہیں۔ ادھر یقین کی ساری اساس کو نظر انداز کرتی ہوئی ان کی اہمیت کو گھٹا رہی ہیں۔ لہذا اس لحاظ سے بھی یہ تشریحات ہر قسم کی اصولی افادیت سے خالی ہیں۔ ان کا ایک جزوی سا فائدہ یہ ضرور ہے کہ جو لوگ کچھ نہ کچھ دینی احساس رکھتے ہیں مگر موجودہ طوفان انگیز لامذہب حرکت کے مقابل اُن کے اُکھڑ جانے کا خطرہ ہے، ان کے لیے ایک عارضی حفاظت گاہ پیدا ہو جاتی ہے۔ کچھ نہ کچھ ذہنی تربیت بھی ان تشریحات سے ممکن ہے لیکن وہ موجودہ دَور کے دینی و ایمانی انحطاط کا علاج ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتیں۔ اس کا علاج کامل روحانی تربیت کے ذریعے تمام مبادیات دین کو اس درجہ یقینی کر دینے سے ہی ہو سکتا ہے کہ جس کے مقابل یہ کفر ایک سراب محسوس ہونے لگے اور یہ عمل ذہن و دماغ کا نہیں بلکہ قلب و روح کا ہے۔ اس کے لیے ضرورت قلبی و روحانی تربیت کی ہے نہ کہ ذہنی تسکین کی۔ (الفرقان محرم ۱۳۷۳ھ)

ڈاکٹر احمد حسین کمال

اشتراکیت کا مقابلہ کیسے؟

(۱)

ابھی حال ہی میں امریکہ کے ایک ذمہ دار شخص نے جو غالباً صدارت کے بھی امیدوار ہیں کمیونزم پر ایک طویل بیان دیتے ہوئے کہا ہے کہ "اشتراکیت کو سائنسی، اقتصادی اور جنگی میدانوں میں شکست دینا ممکن نہیں ہے اسے تو خیالات ونظریات کے میدانوں میں شکست دے کر ہی کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے" —— سوال یہ ہے کہ آپ اسے خیالات ونظریات کے میدانوں میں کس طرح شکست دے سکتے ہیں۔ اشتراکیت نے تو اپنے خیالات ونظریات کو عمل کا جامہ بھی پہنا رکھا ہے۔ پھر کیا آپ اسے بلا کسی عملی اقدام کے مجرد خیالات ونظریات کے بل بوتہ پر شکست دے سکتے ہیں؟

اشتراکیت الحاد وفسق کی ایک کھلی ہوئی شکل ہے جو مجرد خیالات تک ہی محدود نہیں، بلکہ عملاً ایک وسیع انسانی گروہ کی معاشرتی ومجلسی زندگی کی بنیاد بن چکی ہے۔ اشتراکیت صرف خدا اور آخرت کا ہی انکار نہیں بلکہ ہر ایسے نقطۂ نظر کا انکار ہے جو انسانیت کے وسیع تر روحانی واخلاقی مفادات سے متعلق ہے۔ وہ خاندانی مفادات کا منکر ہے مگر اس لیے نہیں کہ خاندان کا محدود نظریہ قوم وملت کے وسیع تر نظریہ سے ٹکراسکتا ہے بلکہ اس لیے کہ اس سے اشتراکیت کے حلقہ بندانہ مفادات پر براہ راست ضرب پڑتی ہے وہ وطن پرستی اور ملت پروری کا مخالف ہے مگر اس لیے نہیں کہ شاید اس سے عالم گیر انسانیت کو ضرر پہنچتا ہو بلکہ اس لیے کہ اس سے کمیونزم کے جماعتی مفادات کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے، وہ مذہبی گروہ بندیوں کا مخالف ہے مگر اس لیے نہیں کہ اس قسم کی گروہ بندیاں اکثر وبیشتر انسانی بھائی چارے میں حائل ہوتی رہی ہیں

بلکہ اس لیے کہ اس سے کمیونزم کی اصل بنیاد کے نیست و نابود ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اشتراکیت آج تک اپنا کوئی اخلاقی ضابطہ مقرر نہیں کر سکی۔ اس کی بقا و ترقی کا تمام راز اس میں پنہاں ہے کہ اس کے مخالف عمل سے عاری اور اُس کی بنیادی کمزوریوں سے بیشتر ناواقف ہیں۔ انھوں نے اس کی مخالفت بغیر اس کے گہرے مطالعہ کے کی ہے۔ وہ سیاسی، اقتصادی یا مجرد نظریاتی میدانوں میں تو اس کی مخالفت بڑے زور شور سے کرتے رہتے ہیں، لیکن عمل کے میدانوں میں اس سے کوسوں پیچھے ہیں۔

غور کیجیے کہ الحاد و فسق پر مبنی خیالات کی ہی نہیں بلکہ پوری ایک عمل کی دنیا اشتراکیت نے تخلیق کر رکھی ہے، روز بروز اس میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، دنیا کا کوئی ملک اور کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں کا کچھ نہ کچھ عنصر اس کی برادری میں شامل نہ ہو۔ الحاد و فسق کی اس منظم و قائم شکل کا مقابلہ خدا پرستی اور عمل صالح کی منظم صورت سے ہی ممکن تھا، لیکن ان بلند بانگ مخالفین کا طرزِ عمل اس کے قطعی برعکس ہے اور در پردہ اشتراکیت کی قوت کا باعث بن رہا ہے۔ یہ اشتراکیت کی خدا انکاری پر تو چراغ پا ہوتے ہیں، لیکن اپنی کھوکھلی اور زبانی خدا پرستی کی خبر نہیں لیتے۔ وہ اس کی بے دینی ولا دینی کا رونا تو روتے ہیں لیکن اپنی دینداری کی سطحیت کا ہرگز ماتم نہیں کرتے۔ وہ اگر خدا کی منکر ہے تو اس نے انکار کی ایک عملی شکل بھی قائم کر دی ہے اور اس طرح قدرت کے قانونِ ثمرات عمل سے متمتع ہو رہی ہے، لیکن کیا خدا پرستی کی مدعی طاقتیں ایمان سے کہہ سکتی ہیں کہ اپنے بلند بانگ دعووں کے باوجود انھوں نے زندگی کے کس کس شعبے میں خدا پرستی کی عملی شکل قائم کی ہوئی ہے۔ ایک عام آدمی یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ باوجود شدید الفاظی مخالفت کے اشتراکیین و غیر اشتراکیین اپنی سماجی، تہذیبی، ثقافتی، اقتصادی، معاشی اور سیاسی زندگیوں میں ایک سے ہی طور طریقوں پر عامل ہیں۔

ان مسلمانوں کے لیے بھی یہ بات فوری توجہ کی محتاج ہے، جو اپنے آپ کو اور اپنی آئندہ نسلوں کو اشتراکیت سے محفوظ رکھنے کے خواہش مند ہیں کہ آیا وہ صرف زبانی مخالفت تک ہی اپنی اشتراکیت دشمنی کا مظاہرہ کافی سمجھتے ہیں، یا یہ کہ اپنی زندگی کے علمی و عملی تمام پہلوؤں کو اسلامی قالب میں ڈھال کر بروقت اپنے تحفظ و استحکام کا سامان کر لینا ضروری یقین کرتے ہیں۔

اگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کی دوسری غیر اشتراکی اقوام کی طرح محض لفظی مخالفت ہی کافی ہے، اور اپنے فکر و عمل کو تجدد و اباحیت کے آغوش میں دیے رہنے پر راضی و مطمئن ہیں تو پھر انھیں اپنے دینی مستقبل کو خیرباد کہہ دینا چاہیئے، لیکن اگر زمانہ کی روش عام کے خلاف خالص دین کو مضبوطی سے پکڑنے کے لیے وہ تیار ہیں اور اپنی زندگیوں کو اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے آمادہ ہیں تو یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ خواہ مستقبل کی دنیا کا نقشہ کچھ بھی ہو، انشاءاللہ ان کو کوئی گزند پہنچنے نہیں پائے گا اور وہ انشاءاللہ اس وعدۂ الٰہی کو پھر پورا ہوتا ہوا دیکھیں گے کہ "انتم الاعلون ان کنتم مومنین"۔

ان ابتدائی کلمات کے بعد آئیے آج کی صحبت میں ان افکار و نظریات کا مختصر سا جائزہ لیا جائے جن کے بطن سے اشتراکیت نے جنم لیا اور جن کے سہارے پروان چڑھ کر وہ اپنی موجودہ شکل و صورت تک پہنچی۔

اشتراکیت تین سو سال کی اس کشمکش افکار کا نتیجہ ہے جو عقیدۂ تثلیث کے ردعمل کے طور پر یورپ کے ذہنی میدانوں میں برپا رہی، فکر و نظر کا وہ فساد جو علیہ السلام کے نظریۂ تثلیث سے پھیلنا شروع ہو گیا تھا، بالآخر انسان کو ذہنی بغاوت کی ان حدود تک لے گیا جہاں ذمہ داری کے تمام احساسات ختم ہو جاتے ہیں، دنیا میں نیکی و بدی کے بقاء و فروغ کا تمام دار و مدار، عقیدۂ الوہیت پر ہے جو الٰہ واحد کی حقیقت پر مبنی ہو۔ اس عقیدہ میں پہلی ٹھوکر انسان نے تعدد الٰہ کے نظریہ کی شکل میں کھائی۔ چنانچہ تاریخ انسانی کے تمام فسادات فکر و نظر کا اصل سرچشمہ تعدد الٰہ کا نظریہ ہی رہا ہے۔ انسانی فطرت جو بندگی اور تعبّد کا جوہر اپنے خمیر میں رکھتی ہے، اپنے فطری تقاضے پورے کرنے کے لیے کسی کے آگے جھک جانے پر مجبور ہے، اور جب بھی اسے ایک سے زیادہ کے آگے جھکنا پڑا وہ مقام رفیع سے گر گئی۔ عقیدۂ تثلیث بھی تعدد الٰہ کا ہی ایک روپ تھا، جو بہرصورت انسانی فطرت کے خلاف تھا، پاپائیت کے مستبدانہ نظام نے اس نظریہ کو منظم و جابرانہ شکل دی۔ صلیبی جنگوں کے بعد جب یورپ میں علم و فکر کا ایک نیا میدان کھلا تو وہاں کا نوخیز اور بالغ نظر گروہ کسی طرح بھی عقیدۂ تثلیث پر مطمئن نہ رہ سکا۔ اس اضطراب کا نتیجہ ہی لوتھر وغیرہ کی

مذہبی اصلاحات کا دور جدید تھا، جس کے ذریعہ عیسائیت کے نظام پاپائیت میں پہلی بار مستقل رخنہ پڑا، لیکن یہ اصلاحات چونکہ حقیقت پسندانہ نہیں تھیں اس لیے مرض کا صحیح علاج ثابت نہیں ہوئیں، چنانچہ وہاں کا جدید آزاد خیال گروہ عیسائیت کے رائج الوقت افکار و نظریات سے در پردہ اور گاہے علانیہ بیزاری کا اظہار کرنے لگا اور اس طرح ایک مستقل باغی اور منکر ذہن پیدا ہو گیا یہ ذہن تثلیثی عقائد و تثلیثی نظام کے تو خلاف ہو گیا۔ لیکن اس کی جگہ کونسا نظام اور کونسا عقیدہ اختیار کرے، یہ سوال نہایت تیزی سے ابھر آیا۔ لیکن اس سوال کے جواب سے پہلے کائنات اور انسان کے بارے میں بھی کوئی نظریہ قائم کرنا ضروری تھا، تثلیثی نظام سے جب بیزاری ہوئی تو اس کے نظریۂ کائنات و نظریۂ انسان پر کیسے یقین باقی رہ سکتا تھا۔ چنانچہ اس پر فکر و آراء کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور بالآخر یہ گتھی ڈارون کے نظریہ ارتقاء سے سلجھائی گئی اب انسان اور کائنات کے بارے میں عیسائی اور تثلیثی نقطہ نظر کے متوازی ایک اور نظریہ ہاتھ لگ گیا تھا اس طرح صدیوں کی متوارث اعتقادی کش مکش سے بھی نجات مل گئی اور آئندہ کے تمام تغیرات فکری کے لیے ایک اساس ہاتھ آگئی۔

مذہب کا نظریۂ کائنات و نظریۂ انسان، خدا کی قدرتِ تخلیق، آدم کامل کے اولین ظہور و عرفان حیات بعد الممات اور عقیدۂ یوم الدین پر مبنی ہے۔ انسان کے لیے مذہب کی تمام پابندیاں اسی نظریہ کے تقاضوں کی بنیاد پر ہیں۔ درحقیقت ایک صاحب عقیدہ انسان کے لیے یہ نرا نظریہ ہی نہیں ہے، بلکہ سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اس کے برعکس ڈارون کا نظریہ ارتقاء کائنات اور انسان کی تخلیق میں قدرت کی کارفرمائیوں کے بجائے اندھے عناصر کی ترکیب و امتزاج کا ہاتھ مصروف عمل بتاتا ہے۔ یہ اندھے عناصر بجائے خود ایک ایسے بے شعور مادہ کے اجزا ترکیبی ہیں جو تنہا کائنات کی اصل حقیقت ہے۔ لیکن صرف اتنی بات ہی مکمل الحاد کے لیے کافی نہیں تھی۔ کائنات سے متعلق بہت سے پیچیدہ مسائل کے علاوہ انسان کے فکر و شعور اور جذبات و عواطف کے منبع دماغ کا مسئلہ بھی حل طلب تقاضا تھا اور مذہب کا انکار اس کی توجیہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ خدمت جن ماہرین نفسیات نے اپنے ذمہ لی۔ انھوں نے انسانی ذہن کی تمام مخفی اور پست حیثیتوں کو سامنے رکھ کر ایک ایسا خطرناک نتیجہ نکالا، جس نے نیکی اور اخلاق کے ایک ایک تصور کو ہلا ڈالا۔

مشہور ماہر نفسیات میگڈوگل نے کہا کہ انسان کے تمام عواطف و میلانات حیوانی جبلت کا نتیجہ ہیں۔ یہ ہی حیوانی جبلت انسان کا حقیقی رجحان طبعی ہے۔ آج اس کی کتاب، سوشل سائیکالوجی، یورپ وامریکہ کی یونیورسٹیوں میں ہی نہیں، بلکہ ہندو پاک و عرب و ایشیا کی تمام یونیورسٹیوں میں نفسیات کی سب سے اہم کتاب کی حیثیت سے داخل نصاب ہے، فرائڈ نے ایک قدم آگے بڑھ کر تمام انسانی احساسات و داعیات کا دامن شہوات و جنسیات کے ساتھ باندھ دیا، اس نے نفس انسانی کو تحت الشعور، شعور اور فوق الشعور کے مابین تقسیم کر کے دلوں سے مکافات نیت و عمل کے قانون الٰہی کا خوف نکال دینے کی کوشش کی اور اس طرح سماجی دباؤ بھی انسانیت کے لیے ایک ظلم بے جا بن گیا، جس سے نجات حاصل کرنا ہر فرد کا حق ہو۔ آج فرائڈ کے ان نظریات پر ہمارے کتنے ہی علوم و فنون کی بنیاد رکھی ہوئی ہے۔ علم معالجات کا تو ایک پورا شعبہ اس نظریہ کے ساتھ مخصوص کر دیا گیا ہے۔ ادب و آرٹ میں بھی اس کی نمود کئی مقامات پر دیکھی جاسکتی ہے۔ تفریحات کا تو کوئی شعبہ اس کے اثر سے خالی نہیں ہے۔ ایڈلر نے ایک اور ہی بات کہہ کر انسانی انا کو خود پسندی اور خود بینی کی ایک تاریک راہ پر ڈال دیا ہے، جس کے بعد حق کی روشنی کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہ جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہماری تمام خواہشات و اعمال کا اصل محرک جذبۂ حب تفوق ہے۔ انسان کی فطرت کا بنیادی تقاضہ یہ ہے کہ ہر چیز پر غالب آیا جائے اس کی بقاء و ترقی کا انحصار صرف جبر و تغلب میں ہی ہے۔ گویا اس طرح اگر ڈارون کا انسان جسمانی حیثیت سے ایک ترقی یافتہ حیوان ہے تو میگڈوگل کا انسان ذہنی حیثیت سے حیوانیت کی اعلیٰ سطح پر ہے اور فرائڈ کا انسان حیوانیت کی جبلت شہوات و جنسیات کا مرقع ہے۔ ان سب پر مستزاد ایڈلر کا انسان ہے جو سرتاپا ابلیس ہے اور ہر چیز پر جابر و متغلب رہنا چاہتا ہے۔

انسان کی ان حیثیتوں کی تعلیم جو ایک طرح انسان کا "مثلہ" بنا دینا ہے، بلا امتیاز، علانیہ دنیا بھر کی یونیورسٹیوں میں ہو رہی ہے۔ فن و آرٹ کے کئی شعبے ان سے فیضیاب ہو رہے ہیں، ادب و صحافت میں اس کے گہرے اثرات کام کر رہے ہیں۔ حیاتیات، طبعیات و معالجات میں اس کو بطور رہنما اصول کے استعمال کیا جاتا ہے الغرض انسان کی تخلیق، کائنات کے ابداء، اور افراد و قوم کی انفرادی و اجتماعی نفسیات پر اس کا علی الاعلان بلا تردد اطلاق و انطباق کیا جاتا ہے اور اب اس حد تک یہ اثرات بڑھ چکے ہیں کہ بعض بر خود غلط مذہبی متجددین اسے درجۂ الہام اور منشائے قرآنی تک قرار دینے پر آمادہ

ہو گئے ہیں۔

یہی وہ بنیادی افکار و نظریات ہیں جن کی ایک عرصہ تک نشر و اشاعت اور قبول و تسلیم کے بعد تاریخی مادیت کا مارکسی فلسفہ ظہور میں آیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی نوع انسانی پر اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی فضل و کرم تھا کہ بات مارکسیت پر آ کر رک گئی اور انسان کو اصلاح احوال کے لیے ایک اور مہلت مل گئی ورنہ ان افکار کا تقاضہ تو یہ تھا کہ انسان اپنا جامۂ انسانیت قطعاً چاک کر کے پھینک دے اور ایک بدترین حیوان کی زندگی اختیار کر کے، اسفل السافلین کی پستیوں میں ہمیشہ کے لیے جا گرے۔ بہرحال مارکس کی تاریخی مادیت اور فلسفہ اشتراکیت ان باطل نظریات کا قدرتی اور منطقی نتیجہ تھا اور یہ نتیجہ پوری ہلاکت سامانیوں کے ساتھ ظاہر ہو کر رہا۔ آخر ایک ایسا وجود جو اپنے کے اتفاقی تغیرات کی بدولت ایک نیم خلیہ سے ترقی کرتا ہوا انسان بنا، اور جس کا جسمانی و شعوری ارتقاء حیوانی سطح پر ہی ہوتا رہا۔ اس کی تاریخ شکم و معاش کی ہی تاریخ ہو سکتی تھی۔ اور مارکس نے یہ تاریخ مدلل طور پر پیش کر دی ہے۔ اس تاریخ کی روشنی میں جس فلسفۂ اشتراکیت کا ظہور ہوا اس نے دنیا میں عملاً اپنے لیے ایک بہت بڑی جگہ بنا لی ہے۔ اس کی اس گرفت کو ختم کرنے کے لیے جہاں اس کی سیاسی اور اخلاقی شکست ضروری ہے وہاں اس کا تاریخی اور نظریاتی ابطال بھی ضروری ہے۔ اس ابطال کے لیے مذکورہ نظریات کا ابطال ہی کافی نہیں بلکہ اس کے بالمقابل صحیح نظریات کا اثبات اور علوم حاضرہ پر ان کا علمی اور عملی اطلاق و انطباق بھی ضروری ہے۔ ہمارے وہ علمائے کرام و تعلیم یافتہ حضرات جو سیاسی، ادبی اور فقہی و کلامی نکات آفرینیوں میں بڑی بڑی داد تحقیق دے رہے ہیں کیا ان گوشوں پر بھی توجہ فرمائیں گے۔

عصر حاضر کے بعض مسلمان مصنفین نے ان نظریات کو قرآن کے دامن سے باندھنے کی بھی کوششیں فرمائی ہیں۔ بعض نے تو انھیں من و عن ہی قبول کر لیا ہے اور بعض نے کسی قدر ترمیم و تغیر کے ساتھ اپنایا ہے۔ بالخصوص مسئلہ ارتقاء کو تو ان سب نے ہی قبول کر لینے اور قرآن کی بیان کردہ حقیقت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ارتقائے جسمانی کا دور تو ختم ہو چکا ہے۔ اب انسان پر ذہنی ارتقاء کا عمل جاری ہے۔ قطع نظر اس بات کے کہ انکے اس قول کے دونوں جز واقعاتی شہادت سے محروم ہیں۔ ارتقاء کا جو بھی پہلو اور صورت مان لی جائے وہ قرآن کے نظریہ کائنات و نظریۂ انسان سے متصادم ہوتی ہے تاہم ایک ایسا وجود جس کی تخلیق ایک بے شعور مادہ کے اتفاقی تغیرات و عمل و ردعمل کے نتیجہ میں

میں ہوئی ہو۔ جو د جود اند ھے بہرے عناصر مادی کے آغوش میں اتفاقات کی بدولت ایک خلیہ سے ترقی کرتا ہوا مختلف مدارج حیوانی سے گذر کر انسان بنا ہو۔ جس کا شعور ہنوز حیوانیت کے عہد طویل کے موروثی اثرات کی پوری پوری گرفت میں ہو۔ جس کی جبلی سرشتوں کا دامن قدرت کے قانون فجور و تقوی کے بجائے خالص حیوانی دور کی امنگوں کے ساتھ بندھا ہوا ہو۔ آخر ان مصنفین نے کیسے سمجھ لیا کہ وہ دفعتاً خارج سے آئی ہوئی الہامی و اخلاقی ہدایات کا مکلف ہو سکتا ہے، اگر ذہنی اور نفسیاتی ارتقا کا عمل جاری ہے اور انسانی فہم و شعور ہنوز ناقص ہے تو وحی و نبوت کی تکمیل و اختتام کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور خود اس عمل ارتقاء کی موجودگی میں وحی و نبوت کا بھی کوئی مقام باقی نہیں رہ جاتا۔ الغرض ڈارون کے تصور ارتقاء کے کسی جز کو بھی تسلیم کر لینے کے بعد مذہب و عقائد کی وابستگی باقی ہی نہیں رہ سکتی۔ اسے قائم کرنے کی یہ کوشش تکلف یا ریاکاری سے خالی نہیں۔

وہ مسلمان مفکر جو عہد حاضر میں اسلام کی ذہنی و فکری خدمات انجام دینا چاہتے ہیں۔ انھیں اس پیچیدہ اور ناقص طرز فکر سے بلند ہو کر اسلام کے حقیقی نظریۂ کائنات و نظریہ انسان پر اثباتی و استشہادی دلائل قائم کرنے چاہئیں۔ نظریۂ اضافیت کے عملی اثبات کے بعد فلاسفۂ قدیم و جدید کے مادے کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہ گئی ہے اور بات ہر پھر کر پھر کن فیکون تک جا پہنچی ہے۔ ڈارون کے نظریہ ارتقاء کی بنا فلاسفہ کے محبوب مادے پر ہی تو ہے جسے کائنات کی اصل ٹھہرایا جاتا تھا۔ جب یہ اصل ہی باقی نہیں رہی تو اس سے متفرع نظریات کس طرح قائم رہ سکتے ہیں۔ انشاء اللہ اس پر کسی اگلی صحبت میں مفصل کلام کروں گا۔ (الفرقان ربیع الثانی ۱۳۹۰ھ)

بہترین
چائے
کے لئے
یہ ٹریڈ مارک
ہمیشہ یاد رکھئے
AA
TRADE MARK
ہمارے یہاں نیل گری سے لیکر آسام تک کے تمام مشہور باغات
کی چائے نہایت مناسب اور واجبی نرخ پر فراہم کی جاتی ہے
ہماری اسپیشل چائے
"سوداگر ڈسٹ" اور "سوداگر مکسچر"
کا ایک بار ضرور تجربہ کیجئے
عباس علاؤالدین اینڈ کمپنی
چائے کے تھوک اور خردہ بیوپاری
۴۴۔ حاجی بلڈنگ، نل بازار، بمبئی ۳
فون نمبر 332220
تار کا پتہ "CUPCATTLE"

ڈاکٹر احمد حسین کمال

اشتراکیت کا مقابلہ کیسے؟

(۲)

یہ بات واضح ہو جانے کے بعد کہ اشتراکیت کے خلاف جو محاذ غیر مسلم مخالف اشتراکیت اقوام نے قائم کر رکھا ہے وہ اول تو اتنا ٹھوس اور مضبوط نہیں ہے جس پر مکمل اعتماد کیا جا سکے، دوسرے اگر کسی طرح انھوں نے اشتراکیت پر فتح پا بھی لی تو خود ان اقوام میں لادینیت کا جو عروج و فروغ ہے وہ بجائے خود اشتراکیت سے کم درجہ کا فتنہ نہیں ہے، بلکہ اشتراکی فتنہ کا اصل سرچشمہ ان کے ہی نظریات و افکار ہیں جن سے کم و بیش دنیا بھر کی تمام قومیں متاثر ہیں، مستقبل کا جو نقشہ آج تعمیر ہو رہا ہے اور پیہم تغیرات دنیا کو جس منزل کی طرف کشاں کشاں لیے جا رہے ہیں اس کی رو سے اب یہ بات بعید از امکان نہیں رہی کہ مستقبل کا انسان جداگانہ قومیتوں اور ملکوں میں بٹا ہوا انسان نہیں ہو گا بلکہ ایک عالمی وطن کا شہری ہو گا، آئندہ کا یہ انسان فکر و نظر اور علم و فن کی جن راہوں سے گذرتا ہوا مستقبل کی جس دنیا کا شہری بنے گا اس دنیا کی تعمیر اس کے افکار و نظریات کے مطابق ہی ہو گی اور وہ افکار و نظریات آج کے دور سے وراثتاً حاصل کرے گا، کشمکش افکار کے اس پُر اضطراب اور ہنگامہ خیز دور میں آج کے مسلمان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ مستقبل کے انسان کے لیے کیا کچھ ترکہ چھوڑ کر جاتا ہے اور فکر و عمل کی وہ کونسی راہیں متعین کر دیتا ہے جن پر آنے والا انسان اپنا صحیح سفر جاری رکھ سکے۔ آج کی صحبت میں ان امور پر ہی کچھ غور کرنا ہے۔

مسلمانوں کے سیاسی زوال کے اسباب کے تجزیہ میں پڑے بغیر میں اپنے سلسلۂ سخن کا آغاز ان کے فکری تنزل کے دور سے کروں گا، حملۂ تاتار کے بعد سے ہی مسلمانوں کی فکری قوتیں اترا معاذ کم اوہ

اثر پذیر زیادہ ہونے لگی تھیں۔ اگر چہ ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ جیسی شخصیتیں بھی پیدا ہوئیں، لیکن ملت مجموعی حیثیت سے فکری تنزل میں ہی گرتی رہی جتنی کہ یورپ کے سیاسی تغلب کے آغاز تک یہ تنزل ایک خاص نقطہ تک پہنچ چکا تھا؛ چنانچہ سیاسی زوال سے زیادہ اس فکری زوال نے مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچایا! اُن کے جدید حریف یورپ نے اس راز کو جان لیا تھا اور وہ آج تک اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے میں معروف ہے۔ اس دور جدید میں یورپ سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کے طاقتور بن جانے میں ایسا کوئی اندیشہ محسوس نہیں کرتا ہے جتنا کہ فکری اعتبار سے اُن کے بیدار اور توانا ہو جانے میں وہ خطرات محسوس کرتا ہے۔ اسی لئے وہ نوآزاد مسلم ممالک میں اپنی "کلچرل" و "ایجوکیشنل" سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے اور طرح طرح کی رعایتیں دے کر ان روابط کو مضبوط تر بنا رہا ہے۔ یہ صورت حال یقیناً اسلام اور مسلمانوں کے لیے خوش آئند نہیں کہی جا سکتی۔ اور اس کے ازالہ کی طرف ہی سب سے پہلی توجہ کی ضرورت ہے۔ یورپ کے تغلب نے ہر جگہ کے مسلمانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا۔ ایک قدیم گروہ اور دوسرا جدید گروہ۔ یہ دونوں گروہ کسی بھی نصب العین کے حصول کے لیے باہم متحد نہ ہو سکے۔ ہر میدان میں ان دونوں کے درمیان حریفانہ کش مکش جاری رہی، حالاں کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے تعاون کے ہر وقت ضرورت مند رہے ہیں۔ اب وقت نہیں رہا ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو اس افسوسناک صورت حال کا ذمہ دار ٹھیرایا جائے۔ اب تو صورت حال یہ ہے کہ ایک طرف قدیم گروہ ہے جس کے اثرات محدود اور کمتر ہو چکے ہیں، دوسری طرف جدید گروہ ہے جو یورپ کے افکار و نظریات کا پروردہ ہے اور دینی تصورات سے بیگانہ ہو چکا ہے، اس صورت حال نے مسلمانوں کے دینی اور ملی محاذ کو بالکل بے جان بنا کر رکھ دیا ہے۔ بلاشبہ ابھی مسلمانوں کے کسی گروہ میں یہ جرأت پیدا نہیں ہوئی ہے کہ وہ علی الاعلان اسلام سے اپنی علاحدگی کا اعلان کر دے، لیکن امت کی زمام کار جن لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ رہی ہے وہ اسلام کی نظریاتی اور علمی رہنمائی سے محروم ہیں اور وقت کے تقاضوں کا سامنا بہرحال انھیں کو کرنا ہے۔ اگر یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تو مستقبل کا مسلمان موجودہ حالت پر قانع نہیں رہ سکے گا، اُسے صاف صاف اقرار و انکار کی کوئی راہ اختیار کرنا پڑے گی، اور اس کے لیے ان دونوں راہوں میں سے کسی ایک راہ کا اختیار کرنا ہمارے آج کے طرز عمل پر موقوف ہے۔

اس نصف صدی کے اندر مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کے لیے کتنی ہی راہیں تجویز کی گئیں، لیکن اصل اور بنیادی راہ علم و فکر کی ہی راہ تھی اور ہے۔ اب تک مسلمانوں نے جو کچھ پایا اور کھویا وہ اسی راہ

کے نشیب و فراز پر پایا اور کھویا، علم و فکر کی وادیاں کتاب و سنت کی تعلیم کے سایہ میں ہی بے خوف و خطر طے کی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ کتاب و سنت کی بے آمیز تعلیم کا جاری رکھنا نہایت ضروری ہے اور اس کو بنیاد بنا کر حال و مستقبل کی تعلیم کا خاکہ بنانا اور اس کو عمل میں لانا اس وقت کی اولین احتیاج ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نئی تبدیلیوں کے اس دور میں ہم ایک نہایت ہی ٹھوس اور جدید دینی نظام تعلیم کے محتاج ہیں، جس میں اوّل سے آخر تک بنیادی طور پر کتاب و سنت کا پورا پورا علم شامل ہو اور وہ رائج الوقت تمام سائنسی اور نظریاتی علوم و فنون پر حاوی ہو جس میں قدیم و جدید نظریات پر سیر حاصل مطالعہ کا سامان بہم ہو اور باطل نظریات کی علمی تردید کے ساتھ ساتھ اسلامی نظریات و عقائد کے اثبات کا پورا پورا وزن اس میں موجود ہو، بظاہر یہ کام بڑے بڑے وسائل اور حکومتوں کے بغیر سر انجام پانا مشکل نظر آتا ہے لیکن مسلمانوں کی علمی تاریخ اس کے برعکس ثبوت پیش کرتی ہے۔ آج ہمارے پاس احادیث، فقہ، حکمت، کلام اور اسی قسم کے دیگر سیکڑوں علوم و فنون کا جو عظیم ذخیرہ موجود ہے وہ سب انفرادی کوششوں کا ہی ثمرہ ہے، حکومتوں نے اگر کچھ سرپرستی کی بھی تھی تو اُن کا کم و بیش تمام حاصل بغداد و اندلس میں سیل تاتار و طوفان صلیب کی نذر ہو گیا تھا، یہ درس نظامی کا قدیم نظام تعلیم ہی جسے ہم آج دقیانوسی اور کہنہ وغیرہ کہہ کہہ کر ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں، کس طرح ایک مدت دراز تک ہماری دینی و دنیاوی علمی ضرورتوں کو پورا کرتا رہا ہے۔ مسجد کی امامت سے لے کر ملکوں کی وزارتوں تک، صدیوں یہی واحد ذریعہ علم بنا رہا ہے، مرتب کرنے والوں نے کس طرح بیک وقت اُس میں دینی علوم کے ساتھ ساتھ ضروری دنیاوی علوم بھی شامل کر دیے تھے اور ساتھ ہی وقت کے تمام افکار و نظریات پر دینی عقائد کی روشنی میں فیصلہ کن مباحث شریک کر لیے تھے پھر یہی نہیں بلکہ یہ نظام تعلیم معمولی سے تغیر کے ساتھ مسلمانوں کے سب ہی ملکوں اور سب ہی فرقوں میں مقبول رہا حتیٰ کہ شیعہ و سنی تک اپنے بُعد عقیدہ و عمل کے باوجود اس کو اپنائے رہے، درحقیقت امام غزالیؒ کے دور سے ہی اس طرز تعلیم کی ابتدا ہو گئی تھی اس وقت سے لے کر عرصۂ دراز تک جتنے بھی جدید افکار و نظریات وقتاً فوقتاً پیدا ہوئے ان پر بحث و نظر اور انھیں دینی عقیدہ و فکر کے تابع کر دینے کا کام ہماری ان درس گاہوں میں برابر جاری رہا اور اس نسبت سے اس نظام تعلیم کے نصاب میں کمی بیشی ہوتی رہی تا آنکہ شاہ ولی اللہؒ نے اس میں عمرانی، سیاسی و معاشی علوم بھی شامل کر دینے کی کوشش فرمائی، یہ تمام

جدوجہد ایک حد تک انفرادی ہی تھی اور سب بڑی حد تک حکومتوں کے تعاون سے مبرا بلکہ بعض حالات میں شدید مخالفتوں کے علی الرغم یہ کام انجام دیا گیا۔ اس طرح صدیوں مسلمانوں کے دینی عقائد و افکار کو ہر زد سے محفوظ رکھنے کا کام ہوا۔ اور مسلمانوں کی علمی برتری برقرار رہی۔ آج بھی ایک ایسے ہی نظام تعلیم کی داغ بیل ڈال دینے کی شدید ضرورت ہے۔ برصغیر ہند و پاک میں بے شمار آزاد تعلیمی ادارے موجود ہیں جو صرف اسلام کے نام پر قائم ہیں۔ ان میں سے بیشتر محض منتظمین و مہتممین کے شخصی ذوق کے حامل ہیں اور نوشت و خواند کا ایک ایسا سطحی انداز ان میں جاری ہے جو کسی بھی اعلیٰ افادیت کا حامل نہیں ہے، پھر ذہنیت و کردار کا جو سانچہ یہاں بن رہا ہے وہ دوسرے ماحول پر بہت ہی کم اثر انداز ہونے کی اہلیت رکھتا ہے، کاش اگر یہ تمام تعلیمی ادارے کسی ایک تعلیمی نظریہ اور نصب العین پر متحد ہو کر چل سکتے، تو ملت اسلامیہ کی بے شمار مشکلات حل ہو سکتی تھیں۔ تاہم ان اداروں کے تعاون سے آج بھی ایک اعلیٰ اسلامی نظام تعلیم کی ابتدا کی جا سکتی ہے اور ان کی انفرادیتوں کو مجروح کیے بغیر ایک مشترکہ پروگرام کے ذریعہ، الحاد و ارتداد کے خلاف ان میں ہم آہنگی پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہ ہے پہلا قدم جو ہمیں اشتراکی الحاد کے مقابلہ کے لیے جلد سے جلد اٹھا دینا چاہیے۔

اس سے دوسرے درجہ کا کام تزکیۂ نفوس کا کام ہے بعض حالتوں میں تو یہ پہلے کام سے بھی زیادہ اہم اور ضروری ہے، لیکن آج اس کام کی طرف سے جتنی محرومی لاحق ہے، میں اسے تاریخ انسانیت کی بہت بڑی بدقسمتی سمجھتا ہوں۔ ایک انسان علم کی کیسی ہی بلندی پر پہنچ جائے، اگر اس کا عمل اس کے اثر سے خالی ہے تو وہ شخص نہ صرف اپنے معاشرہ کے لیے غیر مفید ہی ثابت ہوگا، بلکہ بعض صورتوں میں اس کے مضر اثرات بھی پڑ سکتے ہیں۔ خلافت راشدہ کے بعد سے آج تک مسلمانوں کی جتنی کچھ اسلامیت قائم و برقرار رہی ہے وہ زیادہ تر تزکیۂ نفوس کی بدولت ہی قائم و برقرار رہی ہے — فتنوں کے اولین دور میں ہی مسلمان اکابرین نے اس کی ضرورت کو سمجھ لیا تھا۔ علمی و فکری، امارتی و ثروتی اور عملی و اخلاقی گمراہیوں کا ایک نہایت ہی نازک دور مسلمانوں پر اور گزر چکا ہے۔ اس دور میں رشد و ہدایت کا چراغ ان بوریہ نشین اہل اللہ کی کوششوں سے ہی روشن رہا ہے جو اس کام کے لیے اپنی پوری زندگیاں وقف کر چکے تھے۔ امت میں اختلافات کے ہنگامے روز اوّل کے بعد سے ہی شروع ہو گئے کتنی ہی حکومتیں اور امارتیں بدلتی رہیں، انقلاب پر انقلاب آتے رہے۔ نئے نئے فتنے اٹھے اور اٹھائے گئے لیکن صحابہ کے

وقت سے لے کو ہمارے اس دور تک افراد کی ایک جماعت نے ہر چیز سے منہ موڑ کر شہرت و دولت کی تمام خود فریبیوں کو ٹھکرا کر اپنے شب و روز تزکیۂ نفوس کے کاموں کے لیے وقف کر دیے۔ اس کا باقاعدہ ایک نظام قائم کیا۔ ذکر و فکر کی مجلسیں عام کیں۔ انسان کے شعور خفی میں پیدا ہونے والی شیطانی خرابیوں کے ریاضتی علاج تجویز کئے اور عین اس عہد میں جب کہ حکومت و ثروت اور علوم و فنون کی انتہائی سربلندیوں نے مسلمانوں کو دنیا کی سب سے بڑی قوم بنا دیا تھا۔ ہر طرف بے فکری و لا اُبالیت کا دور دورہ تھا، جگہ جگہ ذہنی و جسمانی عیاشیوں کے سامان فراہم تھے، غم امروز تھا نہ فکر فردا تھی، مردانِ حق کے اس گروہ نے اس شدت کے ساتھ دینی اخلاص، سادہ زندگی اور طاعت پیغمبری کا علم بلند کر کے رکھا کہ ہر اس چیز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا جس کا ثبوت پیغمبر علیہ السلام کی زندگی اور رضامندی سے نہ ملتا ہو چاہے وہ شرعاً مباح ہی کیوں نہ ہو۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ اسلامی قدروں سے غفلتوں کے دور تو آئے لیکن انحراف و بغاوت کی جرأت بڑوں بڑوں کو نہ ہو سکی —

فارغ البالی اور جاہ و ثروت کے ایسے ادوار میں ان قدسیوں کا جھونپڑیوں اور چٹائیوں پر پوری زندگی اطمینان کے ساتھ بسر کر دینا، اپنے اوقات کا ایک ایک لمحہ یاد الٰہی اور حق بیانی کے لیے وقف رکھنا، ایک دنیا کو دعوت حق دیتے رہنا اور دنیاوی خوش حالیوں سے برضا و رغبت دست کش ہو جانا یقیناً زبردست پُرعزیمت اقدام تھا جس نے امت کو امراء اور فرنگیوں کے ذہنی تغلب سے محفوظ رکھا۔ غلط ہے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تصوف مسلمانوں کے عہد زوال کی پیداوار ہے۔ قطع نظر اس بات کے کہ تصوف انسانی فطرت کا ایک اہم خاصہ اور اسلامی زندگی کا حاصل ہے، یہ مسلمانوں کے عہد عروج کی ایک بہت بڑی دینی ضرورت تھی جسے اللہ تعالیٰ نے ان اہل اللہ کے ہاتھوں پورا کرایا، اور مسلمانوں کی کشتی کو طاؤس و رباب کے دور بدمستی میں ڈوبنے سے بچایا۔ بعد کے لوگوں نے اگر ایک صحیح چیز سے غلط کام لیا تو اس سے اس کی صداقت و افادیت ختم نہیں ہو جاتی ہے۔ آج بھی مادی ساز و سامان کی فراوانیوں اور فکر و عمل کی بے لگام آزادیوں کے اس دور میں جب کہ زبان و عمل میں کوئی ہم آہنگی باقی نہیں رہ گئی ہے اور فساق و فجار کے ہاتھوں میں زمام کار آگئی ہے، تزکیۂ نفوس کے باقاعدہ نظام کی پہلے سے کہیں زیادہ شدید ضرورت موجود ہے۔ سابق میں بھی تزکیۂ نفوس کے اس نظام نے ہی مسلمانوں کے ذہن و اخلاق کو مضبوط رکھا، ان کے مذہبی حس و شعور کو مغلوب ہونے سے بچایا اور اعلائے کلمۃ الحق کی کتنی ہی مخلصانہ تحریکوں کے ابھرنے کے مواقع بہم پہنچائے۔ اور آج اذہان و افکار میں جو ٹکراؤ اور ہیجان برپا ہے

اس کے فیصلہ کن انجام پر ہی آئندہ کی کامیابیوں کا دارو مدار ہے اس کامیابی کے لیے بھی مسلمانوں میں تزکیۂ نفس کے کاموں کی ایک عظیم مہم چلانی شدید ضروری ہے۔

تیسرا درجہ مسلمانوں کے باہمی روابط کی ہمہ گیر اصلاح کے کام کا ہے، مسلمانوں کے مابین "رحماء بینہم" کی کوئی کیفیت آج باقی نہیں رہ گئی ہے، ان کے معاشی اور معاشرتی روابط میں ایک عظیم تفاوت پیدا ہو چکا ہے جس کی وجہ سے ایک دوسرے کے واسطے ہمدردی کے جذبات ان کے اندر معدوم ہو چکے ہیں۔ کوئی زیادہ نقصان کی بات نہیں تھی اگر مسلمان مختلف جائز فقہی اور سیاسی حلقہ بندیوں میں تقسیم ہو گئے تھے بشرطیکہ ان کے معاشی، معاشرتی روابط درست رہتے۔ مگر یہ بات بڑے ہی رنج کے ساتھ دیکھنے میں آئی ہے کہ فقہی و کلامی حلقہ بندیوں سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ نیم سیاسی و نیم مذہبی گروہ بندیاں ان روابط پر اثر انداز ہوئیں۔ عقیدہ و عمل کی دنیا جدید نظام تعلیم نے تہ و بالا کی تو اجتماعی زندگی کی ہمواری کو ان جدید نیم سیاسی و نیم دینی گروہ بندیوں نے نقصان پہنچایا۔

ہماری ملت اور ہمارے معاشرے کے یہ وہ کمزور گوشے اور رخنے ہیں جن کی طرف پوری پوری توجہ دیے بغیر مسلمانوں کو فتنہ ہائے امروز فردا سے بچایا نہیں جا سکتا۔ اور وہ بے تیغ مستقبل کے انسان کے لیے کوئی رہنما ترکہ چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔

(الفرقان جمادی ۱۳۹۰ھ)

عتیق الرحمٰن سنبھلی

جماعت اسلامی کا لٹریچر اور گذشتہ بزرگوں کا فہمِ دین

(یہ مضمون ربیع الاول [illegible]ھ کے الفرقان میں ”اجمال کی تفصیل“ کے عنوان سے شائع ہوا تھا)

جماعت اسلامی کے حلقہ سے شائع ہونے والے ایک مضمون پر، ذیقعدہ [illegible] کے الفرقان میں تنقید کرتے ہوئے ہم نے اپنا یہ احساس ظاہر کیا تھا کہ سلف صالحین اور امت کے ائمہ و مجددین کے ساتھ ایسی بے تکلفی و بے باکی (جس کا مظاہرہ اس مضمون میں کیا گیا تھا) کی ذمہ داری ایک حد تک اکابر جماعت اسلامی پر بھی عاید ہوتی ہے —— اور کیوں عاید ہوتی ہے؟ اس سلسلہ میں ہم نے کچھ اجمالی اشارات کیے تھے، جن کا حاصل یہ تھا کہ ان حضرات کی تحریروں میں ایک ایسا عنصر موجود ہے جو اسلاف سے بے اعتمادی پیدا کرتا ہے بلکہ بعض تحریریں تو صراحۃً اس نتیجہ تک پہنچاتی ہیں کہ یہ جو ائمۂ دین و مجددین کہلاتے ہیں، دین کو سرے سے سمجھے ہی نہیں۔ جماعت اسلامی کے حضرات نے ہمارے اس کہنے کا بہت بُرا مانا اور نہ صرف بُرا مانا بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ یہ صرف بہتان تراشی اور افترا پردازی ہے جس کا مقصد محض جماعت اسلامی کو بدنام کرنا اور اس کے خلاف اشتعال پیدا کرنا ہے۔

اکابر جماعت اسلامی کی ایسی تحریریں تو بہت سی ہیں جنھیں کسی خاص طبقہ کے حق میں اس کے مخصوص مزاج کے پیش نظر اسلاف سے بے اعتمادی کا موجب قرار دیا جاسکتا ہے۔ مگر جس طرح ان تحریروں کے بارہ میں ایک رائے یہ ہوسکتی ہے اسی طرح اس کے برخلاف بھی ہوسکتی ہے ورنہ کم از کم اتنا تو کہا ہی جاسکتا ہے کہ یہ تحریریں بذات خود کسی مضرت کی حامل نہیں۔ ان میں اگر مضرت کا کوئی پہلو پیدا

ہوتا ہے تو وہ خارجی اثر سے یعنی کسی خاص طبقہ کے حق میں ان کی مضرت اس کے مخصوص مزاج کی بنا پر پیدا ہوتی ہے اور ہوسکتا ہے کہ لکھنے والے کے پیش نظر وہ خاص طبقہ نہ رہا ہو اس کے مخصوص مزاج کا اندازہ یا اس کی طرف توجہ نہ ہو ـــــ اس لیے ہم ایسی تمام تحریروں کو نظر انداز کرتے ہوئے جن کے بارہ میں دو رائیں ہوسکتی ہیں یا کوئی عذر پیش کیا جاسکتا ہے، اس وقت صرف ایسی چند تحریریں مثال میں پیش کریں گے جو بلا کسی خارجی عامل کے بذات خود اسلاف کے اعتماد کو مجروح کرتی ہیں اور منطقی طور پر ان کے بارہ میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔

(۱)

اس سلسلہ میں سب پہلے نمبر پر ہم مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی مشہور کتاب "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" کا "مقدمہ" پیش کریں گے۔ اس کتاب میں مولانا نے قرآن کی چار بنیادی اصطلاحات ـــــ اِلٰہ، رب، عبادت، دین ـــــ کی تشریح فرمائی ہے۔ اور مقدمہ میں اس تشریح کی ضرورت یہ بیان فرمائی ہے کہ قرآن کی ان بنیادی اصطلاحات کے صحیح مفہوم پر صدیوں سے پردہ پڑا ہوا ہے اور اس کی بدولت قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم، بلکہ اسکی حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہوگئی ہے اس لیے ضرورت ہے کہ ان اصطلاحوں کی پوری پوری تشریح کی جائے۔[1]

اس سلسلہ میں مولانا لکھتے ہیں کہ:۔

"عرب میں جب قرآن پیش کیا گیا تھا اس وقت ہر شخص جانتا تھا کہ اِلٰہ کے کیا معنیٰ ہیں اور رب کسے کہتے ہیں، کیوں کہ یہ دونوں لفظ ان کی بول چال میں پہلے سے مستعمل تھے، انھیں معلوم تھا کہ ان الفاظ کا اطلاق کس مفہوم پر ہوتا ہے، اس لیے جب ان سے کہا گیا کہ اللہ ہی اکیلا اِلٰہ اور رب ہے اور الوہیت و ربوبیت میں کسی کا قطعاً کوئی حصہ نہیں، تو وہ پوری بات کو پا گئے۔ انھیں بلا کسی التباس و اشتباہ کے معلوم ہوگیا کہ دوسروں کے لیے کس چیز کی نفی کی جا رہی ہے اور اللہ کے لیے کس چیز کو خاص کیا جا رہا ہے۔ جنھوں نے مخالفت کی یہ جان کر کی کہ غیر اللہ کی الوہیت و ربوبیت کے انکار سے کہاں کہاں ضرب پڑتی ہے اور جو ایمان لائے وہ یہ سمجھ کر ایمان لائے ـــــ کہ ہمیں

[1] ان دو تین سطروں میں جو الفاظ آئے ہیں وہ قریب قریب سب مولانا ہی کے ہیں جو مقدمہ کے آخری حصے سے ماخوذ ہیں۔

عقیدہ کو قبول کر کے ہیں کیا چھوڑنا اور کیا اختیار کرنا ہوگا۔ اسی طرح عبادت اور دین کے الفاظ بھی ان کی بولی میں پہلے سے رائج تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ عبد کسے کہتے ہیں عبودیت کس حالت کا نام ہے۔ عبادت سے کون سا رویہ مراد ہے اور دین کا کیا مفہوم ہے اس لیے جب ان سے کہا گیا کہ سب کی عبادت چھوڑ کر صرف اللہ کی عبادت کرو اور ہر دین سے الگ ہو کر اللہ کے دین میں داخل ہو جاؤ تو انھیں قرآن کی دعوت کو سمجھنے میں کوئی غلط فہمی پیش نہ آئی۔ وہ سنتے ہی سمجھ گئے کہ یہ تعلیم ہماری زندگی کے نظام میں کس نوعیت کے تغیر کی طالب ہے۔

لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ ان سب الفاظ کے وہ اصلی معنی جو نزول قرآن کے وقت سمجھے جاتے تھے، بدلتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ہر ایک اپنی پوری وسعتوں سے ہٹ کر نہایت محدود بلکہ مبہم مفہومات کے لیے خاص ہو گیا۔ اس کی ایک وجہ تو خالص عربیت کے ذوق کی کمی تھی، دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلام کی سوسائٹی میں جو لوگ پیدا ہوئے تھے ان کے لیے اِلٰہ اور رب اور دین اور عبادت کے وہ معانی باقی نہ رہے تھے جو نزول قرآن کے وقت غیر مسلم سوسائٹی میں رائج تھے۔ انہی دونوں وجوہ سے دور اخیر کی کتب لغت و تفسیر میں اکثر قرآنی الفاظ کی تشریح اصل معانی لغوی کے بجائے ان معانی سے کی جانے لگی جو بعد کے مسلمان سمجھتے تھے۔"

(قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ص۹-۱۰ مقدمہ)

یہ بغیر کسی خیانت، تحریف اور کاٹ چھانٹ کے خود مولانا کی عبارت ہے۔ یہ عبارت اتنی صاف ہے کہ ہمیں اپنی طرف سے اس کا مطلب اور اس کے مضمرات بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ مولانا کا کھلا ہوا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن کی الٰہ، رب، عبادت اور دین جیسی بنیادی اصطلاحات کے جو اصلی مفہومات تھے وہ صدر اوّل کے بعد باقی نہیں رہے اور صدر اوّل سے جتنا جتنا بعد بڑھتا گیا اتنے ہی ان الفاظ کے معنیٰ بدلتے سمٹتے اور مبہم ہوتے چلے گئے۔ پھر مولانا کے اس بیان میں کوئی استثنا نہیں ہے، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ بعد کی صدیوں میں کوئی ایک بھی ایسا قابل ذکر شخص نہیں گزرا جو ان اصطلاحات قرآنی کے اصلی معنیٰ اور ان کی پوری وسعتوں سے آگاہ ہو۔ رہا یہ

پورا سلسلہ جو حاملین علوم دین اور ائمہ و مجددین کا ہمیں صدر اول کے بعد یا بعد کی صدیوں میں نظر آتا ہے، اس کا تو ذکر ہی کیا۔ بہرحال قطع نظر اس کے کہ "یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ" (الحدیث) جیسے نصوص کی موجودگی میں مولانا کا یہ بیان صحیح ہو بھی سکتا ہے یا نہیں، کہنا صرف یہ ہے کہ مولانا کے اس بیان سے متاثر ہونے کے بعد، بعد کی صدیوں کی ان تمام شخصیتوں کے متعلق جنھیں ہم دین کے شارح، مفسر اور معتمد نمائندگان کی حیثیت سے جانتے ہیں یہ خیال قائم ہوجانا ضروری اور لازمی ہے کہ یہ لوگ من اولھم الی آخرھم قرآن کی بنیادی اصطلاحات کے اصلی اور مکمل مفہومات سے نابلد تھے۔ اور اس کے نتیجہ میں لازماً یہ خیال پیدا ہوجانا بھی ضروری ہے کہ ان کی نگاہوں سے قرآن کی حقیقی روح مستور تھی۔ قرآن کی پوری تعلیم ان کے لیے غیر واضح تھی اور قرآن پر ایمان رکھنے کے باوجود ان کا عقیدہ اور عمل دونوں نامکمل تھے۔ اس لیے کہ جو شخص قرآن کی بنیادی اصطلاحات سے پوری طرح واقف نہ ہوگا اس کا یقیناً یہی حال ہوگا۔

آپ خفا نہ ہوں یہ نتیجہ کی بات بھی ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے ہیں خود مولانا قرآن فہمی میں ان بنیادی اصطلاحات کی اہمیت بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:۔

> "اگر کوئی شخص نہ جانتا ہو کہ الٰہ اور رب کا مطلب کیا ہے، عبادت کی تعریف کیا ہے اور دین کسے کہتے ہیں تو در اصل اس کے لیے پورا قرآن بے معنیٰ ہوجائے گا۔ وہ نہ توحید کو جان سکے گا، نہ شرک کو سمجھ سکے گا، نہ عبادت کو اللہ کے لیے مخصوص کرسکے گا اور نہ دین ہی کو اللہ کے لیے خالص کرسکے گا۔ اسی طرح اگر کسی کے ذہن میں ان اصطلاحوں کا مفہوم غیر واضح اور نامکمل ہے تو اس کے لیے قرآن کی پوری تعلیم غیر واضح ہوجائے گی اور قرآن پر ایمان رکھنے کے باوجود اس کا عقیدہ اور عمل دونوں نامکمل رہیں گے" الخ (مقدمہ)

اب فرمائیے کہ جن لوگوں کے متعلق یہ خیال کرلیا جائے کہ ان کی نگاہوں سے قرآن کی حقیقی روح مستور تھی اور اس کی پوری تعلیم ان کے لیے غیر واضح تھی، ان کے علم و فہم پر کیسے اعتماد کیا جاسکتا ہے اور بحیثیت دین کے شارح، مفسر اور نمائندگان کے انھیں کیا وقعت دی جاسکتی ہے؟ اور پھر اگر طبیعت بے باکی کی خوگر ہو تو ایسے حضرات کی آراء و افکار پر تنقید کرتے ہوئے کیا چیز بے باکی اور بے تکلفی سے مانع ہوسکتی ہے؟

ہم مولانا کی نیت کے بارے میں کوئی بدگمانی نہیں کرتے ممکن ہے مولانا کو اس کا اندازہ بھی نہ ہو کہ ان کے اس بیان کی زد کہاں اور کس طرح پڑے گی۔ مگر منطقی نتائج تو کسی نیت کے پابند نہیں ہوا کرتے۔ "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" کا مقدمہ بذات خود اسلاف سے بے اعتمادی پیدا کرنے کی پوری صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے وہ صلاحیت بروئے کار آکر رہے گی اور رہی!

(۲)

اس کے بعد ہم جماعت اسلامی ہند کی دوسرے نمبر کی شخصیت مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی کا وہ مضمون پیش کریں گے جو "دین کا قرآنی تصور کیا ہے اور کیا نہیں؟" کے عنوان سے ماہنامہ زندگی رام پور کی کئی اشاعتوں میں[۱] شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں فاضل مضمون نگار نے، جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، یہ جتلایا ہے کہ دین اور خدا پرستی کا کون سا تصور، خالص قرآنی اور اسلامی ہے اور کون سا تصور غیر قرآنی۔ اس تحقیق کے سلسلہ میں انھوں نے تفصیل کے ساتھ دین کے قرآنی اور غیر قرآنی تصورات کا جائزہ لیا ہے۔ پھر ان میں سے ہر ایک کے اپنے اپنے تقاضے بتلائے ہیں۔ اس کے بعد یہ دکھلایا ہے کہ کتنے غیر قرآنی افکار جو در اصل غیر قرآنی تصور دین کے تقاضے تھے مسلمانوں میں گھس آئے اور اسلامی تعلیمات میں سے سمجھے جانے لگے۔

اس جائزہ میں انھیں سب سے زیادہ قابل فکر اور حیرت انگیز واقعہ یہ نظر آیا ہے کہ یہ غیر قرآنی افکار صرف عام، دنیادار اور نام نہاد پیروان قرآن ہی تک محدود نہیں رہے ہیں بلکہ بڑے بڑے مخلص، دیندار اور اساطین امت تک کسی نہ کسی حد تک ان افکار کو شرف قبول بخشتے ہوئے نظر آتے ہیں مثلاً امام غزالیؒ، شیخ الاسلام ہرویؒ، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ، اور یہ دو چار نہیں ایسی بے شمار قابل احترام ہستیاں ہیں جو کم و بیش اسی حال میں نظر آتی ہیں۔ اور اس حیرت انگیز واقعہ کا سبب ان کے نزدیک یہ ہے کہ ان حضرات کے بنیادی تصور دین ہی میں بگاڑ پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ "پیروان قرآن میں غیر قرآنی افکار" کی مثالیں پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"یہ ہیں وہ چند بہت ہی نمایاں اور اہم غیر قرآنی افکار، جو پیروان قرآن کے ذہنوں

[۱] اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۵۳ء۔ جنوری ۱۹۵۴ء

ہیں سرایت کر گئے ہیں، اور برسوں سے امت کے اجتماعی کردار پر غیر معمولی اثر ڈال رہے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک کا عمل دخل یکساں گہرا نہیں، اور نہ سب کے حلقہ ہائے اثر یکساں وسیع ہیں، لیکن قرآن کی تعلیمات سے، اس کے مزاج سے، اس کے سطح نظر سے، اس کے افکار و تصورات سے میل نہ کھانے میں سب برابر کے شریک ہیں اور کارزار حیات کے اندر قرآنی تصور دین کے کارفرما ہونے کی فطری راہ روکنے میں کوئی پیچھے نہیں ہے"

آگے چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں:-

"سوال یہ ہے کہ ان بیگانے اور زہریلے افکار کو اس دراندازی کا موقع کیسے مل گیا؟ اگر دنیا کے طلب گاروں ہی تک ان کی پذیرائی محدود ہوتی تو یہ سوال کوئی سوال نہ تھا۔ ہر شخص بیک نگاہ جان سکتا تھا کہ یہ در اصل اغراض پرستی کے کرشمے ہیں جو انسان کو دین کی[1] ایسی ہی تعبیرات کی تلاش میں سرگرداں رکھتی ہے، جس کے ذریعے دنیوی اغراض کا حصول آسان تر ہو جائے، دنیا کے پیچھے بھاگنے والا تو کبھی اس امر میں کوئی باک ہی نہیں محسوس کرتا کہ جب ضرورت ہو، نفسانیت کی قینچی اٹھائے اور دین کی قطع و برید کر ڈالے۔ اپنے مفاد کے موقلم سے اسلام کی جیسی تصویر چاہے بنا ڈالے ——

لیکن معاملہ بڑا ہی فکر آزما اور سخت پیچیدار بن جاتا ہے جب (ان) افکار کو کسی نہ کسی حد تک شرف قبول بخشتے ہوئے کچھ دوسری طرح کے لوگ بھی دکھائی پڑتے ہیں[2] جن پر اس طرح کی کسی اغراض پرستی اور زمانہ سازی کا الزام لگانا ممکن ہی نہیں۔ کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اخلاص کی قسمیں کھائی جا سکتی ہیں۔ جن کی بلندیوں تک نفسانیت کے زاغ و زغن پرواز کرنے کی ہمت ہی نہیں رکھتے، جن کی تابناک سیرتوں پر نگاہوں کا ٹھہرنا بھی آسان نہیں اور جن کی پوری زندگی اللہ کی تقدیس اور حمد و تسبیح میں تحلیل ہو کر رہ گئی تھی۔ ایسے ارباب خلوص و دیانت کے بارے میں یہ گمان کہ انھوں نے جانتے بوجھتے ان افکار کے لیے اپنے سینے کھول دیے ہوں گے، وہی شخص کر سکتا ہو جو یا تو دماغی فتور میں

[1] کہیں کہیں الفاظ چھوٹے ہوئے معلوم ہوئے انھیں اپنی طرف سے اس طرح قوسین میں لکھ دیا گیا ہے۔ (م)

[2] انھیں لوگوں میں امام غزالی، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ ہیں۔ (م)

مبتلا ہو یا قلبی شقاوت میں اس لیے صورت واقعہ اس کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی کہ کچھ خاص اسباب کے ماتحت ان کے یہاں دین کے بنیادی تصور ہی کے اندر کسی ایسے انحرافِ نظر نے راہ پالی جو معصوم صورت تھا اور اپنے آب و رنگ سے مشکل پہچانا جا سکتا تھا، جس کے باعث انھیں ذرا نہ محسوس ہو پایا کہ اس طرح کا کوئی حادثہ پیش آ رہا ہے۔"

(زندگی بابت جنوری ۱۹۵۲ء صفحہ ۲۳-۲۴)

حاصل کلام یہ ہے کہ متعدد غیر قرآنی افکار جو در اصل غیر قرآنی تصور دین کے برگ و بار ہیں وہ صرف یکہ عرصہ دراز سے عوام اور نام نہاد پیروان قرآن کے ذہنوں میں سرایت کیے ہوئے ہیں بلکہ بہت سے وہ حضرات بھی جن کے سروں پر امامت و تجدید کے تاج رکھے ہوئے ہیں جو گذشتہ صدیوں میں دین کے کامل و معتمد ترین نمائندے اور کتاب و سنت کے انتہائی مستند شارح مانے گئے ہیں اور جن کی یہ حیثیت اہل حق میں آج بھی مسلم ہے، ان غیر قرآنی افکار کو سینہ سے لگائے رہے ہیں۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے یہاں دین کے بنیادی تصور ہی میں کچھ بگاڑ آ گیا تھا۔ یعنی ان حضرات کا تصور دین خالص قرآنی نہیں تھا، بلکہ اس میں غیر قرآنی تصور دین کی کچھ آمیزش ہو گئی تھی۔

جناب مضمون نگار نے کہنے کو تو یہ بات کہہ دی کہ ائمہ و مجددین کی صف کے ان اہم ترین اشخاص کے بنیادی تصور دین ہی میں بگاڑ پیدا ہو گیا تھا مگر پھر انھوں نے محسوس کیا کہ یہ گولی اتنی کڑوی ہے کہ بعض لوگوں کے حلق سے آسانی سے نہیں اتر سکتی اور اس بات کو تسلیم کرنے میں ذہنوں کو رکاوٹ پیش آئے گی چنانچہ انھوں نے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ لوگ شرح صدر کے ساتھ ان کے اس نتیجہ فکر کو تسلیم کر لیں۔ خود ہی لکھتے ہیں کہ :-

"اگرچہ پچھلی بحثوں کے ضمن میں اس بات کے متعدد کھلے ہوئے آثار و قرائن معرض تحریر میں آ چکے ہیں کہ مذکورہ بالا انحرافِ نظر یا غلطیٔ افکار کا سبب تصور دین ہی کا بگاڑ ہے، لیکن چونکہ یہ بات بڑی اہم ہے اور اس کا اثر امت کی بے شمار قابل احترام ہستیوں پر کچھ اس طرح کا پڑتا ہے جو ہماری عقیدتوں پر گراں ہو سکتا ہے[1] اس لیے ضرورت ہے کہ اس کی کچھ اور تنقیح ہو جائے تاکہ ذہنوں کو اس کے تسلیم کر لینے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہ جائے۔" (صفحہ ۲۲)

---

[1] ان الفاظ کو اچھی طرح ذہن میں رکھیے۔ ہم آگے صرف یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ "کچھ اس طرح کا" اثر کیا ہوگا۔ (ع)

ہمیں اس وقت اس سے بحث نہیں کہ فاضل مضمون نگار کی یہ تحقیقات صحیح ہیں یا غلط! اور ہم اس چیز سے بھی صرف نظر کرتے ہیں کہ مضمون نگار کی یہ کوشش کہ امام غزالیؒ، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ جیسے ائمہ ہدیٰ کے بنیادی تصور دین میں بگاڑ کا وقوع تسلیم کر لینے میں ذہنوں کو کوئی رکاوٹ باقی نہ رہ جائے، کس مقصد کی غمازی کرتی ہے۔ اس وقت سوال صرف اتنا ہے کہ کیا ان تحقیقات سے متاثر ہونے کے بعد اور پورے شرح صدر کے ساتھ یہ سمجھ لینے کے بعد کہ امام غزالیؒ مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہم اللہ جیسے ائمہ مجددین کا بنیادی تصور دین ہی صحیح نہیں تھا بلکہ وہ کچھ قرآنی اور کچھ غیر قرآنی تصور دین کا معجون مرکب تھا، ان حضرات کے فہم دین پر کسی قسم کا اعتماد باقی رہ سکتا ہے؟ اور دین میں ان کے آراء و اقوال کو کوئی وزن دیا جا سکتا ہے۔؟

بالکل سیدھی سی بات ہے کہ دین کا قرآنی تصور جو بھی کچھ ہو وہ بہرحال قرآن کی بنیادی تعلیمات کے صحیح فہم سے پیدا ہوتا ہے۔ بس جن لوگوں کے متعلق یہ خیال کر لیا جائے گا کہ ان کا تصور دین خالص قرآنی نہیں تھا ان کے متعلق لازماً یہ رائے قائم ہوگی کہ ان کو قرآن کی بنیادی تعلیمات کا صحیح فہم حاصل نہیں تھا۔ اور ایسے حضرات جنھیں قرآن کی بنیادی تعلیم کا صحیح فہم حاصل نہ ہو فہم دین کے معاملہ میں یقیناً کسی اعتماد کے مستحق نہیں ہو سکتے اور کتاب و سنت کی شرح و تفسیر میں ان کے اقوال اور ان کی آراء کا بجائے خود کوئی وزن نہیں محسوس کیا جا سکتا! —— اور جب یہ گذشتہ صدیوں کے منتخب اشخاص قابل اعتماد نہ رہیں گے تو —— بدیگراں چہ رسد!

اسی بنا پر اس مضمون کے متعلق ہم قطعی طور پر یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سے متاثر ہونے کے بعد گذشتہ صدہا برس کے سلف صالحین و ائمہ مجددین پر دین کو سمجھنے سمجھانے میں کسی قسم کے اعتماد کا سوال باقی نہیں رہ جاتا۔ خواہ انھیں نہایت مخلص و باخدا اور ذاکر و شاغل قسم کے بزرگ سمجھا جاتا رہے۔

سلف صالحین کے اعتماد کو سب سے زیادہ مجروح کرنے والا تو اس مضمون کا یہی پہلو ہے کہ اس میں ان کے تصور دین کو غلط تسلیم کرانے کی کوشش کی گئی ہے اور اس حد تک کی گئی ہے کہ "ذہنوں کو اس کے تسلیم کر لینے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہ جائے"! اس کے علاوہ ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ وہی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ذیقعدہ کے "نگاہ اولیں" میں ہم نے لکھا تھا کہ مودودی صاحب

کی اصولی نشان دہی کے بعد جماعت اسلامی کے بعض اہل قلم نے اکابر امت وائمۂ دین کی غلطیوں کی تفصیلات اور جزئیات مہیا کرنے کا کام شروع کیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس مضمون کی تیسری قسط میں مضمون نگار نے ان افکار و مقتضیات کو گنایا ہے جو دین کے غیر قرآنی تصور سے پیدا ہو سکتے ہیں (اور وہ یہ ہیں۔ ترک دنیا، وحی و رسالت سے بیگانگی، دین کی محدودیت، اور وحدت ادیان) پھر چوتھی قسط میں یہ دکھایا ہے کہ یہ غیر قرآنی افکار، پیروان قرآن کے ذہنوں میں بھی سرایت کیے ہوئے ہیں اور اس کے ثبوت کے طور پر انھوں نے گزشتہ دور کے دینی لٹریچر سے نکال کر ایک طویل فہرست ان عبارات و اقوال کی پیش کی جو انھیں ان غیر قرآنی افکار کے حامل نظر آئے۔ یہ عبارات اور یہ اقوال جہاں کچھ مجذوبین کے ہیں وہیں کچھ صوفیائے محققین اور غزالیؒ و شاہ ولی اللہ جیسے ائمہ و مجددین کے بھی ہیں۔ اس کے بعد پانچویں قسط میں انھوں نے اپنے قارئین کو یہ بتلایا کہ ایسی ایسی عظیم المرتبت شخصیتوں کے ان غیر قرآنی اور زہریلے افکار کے لیے اپنے سینے کھول دینے کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ ان کے بنیادی تصور دین ہی میں کچھ فتور پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد —— جیسا کہ ہم سابق میں بتلا چکے ہیں —— انھوں نے یہ محسوس کر کے کہ یہ بات بہت سخت اور دور رس ہے اور آسانی سے تسلیم نہیں کی جا سکتی، اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ اپنے دعوے کے حق میں کچھ اور شہادتیں بہم پہنچائی جائیں تاکہ ناظرین پورے شرح صدر کے ساتھ یہ بات مان لیں کہ ہاں واقعی ان مخلص و باخدا بزرگان دین اور ائمہ و مجددین کے بنیادی تصور دین ہی میں کچھ بگاڑ پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ایک بار پھر گزشتہ دور کے دینی لٹریچر کا جائزہ لیا اور پھر ایک طویل فہرست ان بزرگان دین اور ائمہ و مجددین کی ان عبارتوں کی پیش کی جو انھیں غیر قرآنی افکار کی حامل نظر آئیں یا یوں کہیے کہ جو ان بزرگوں کی غلطیٔ افکار کی مثالیں ہیں۔ چنانچہ وہ مزید شہادتوں کی ضرورت کا اظہار اُن الفاظ میں کرنے کے بعد جو سابق میں نقل کیے جا چکے ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

"ظاہر ہے کہ اس غرض کے لیے ہمیں پھر اُسی دینی لٹریچر کا جائزہ لینا پڑے گا جو گزشتہ زمانوں میں عبادت اور خدا پرستی کے موضوع پر فراہم ہو چکا ہے....... اس ذخیرے سے منتخب کی ہوئی حسب ذیل چند باتوں پر غور کیجیے" (زندگی بابتہ جنوری ۵۳ء صـ۲۰)

اس کے بعد مسلسل چھ سات صفحوں میں، وہ عبارتیں نقل ہوتی چلی گئی ہیں — اور یہ عبارتیں جن حضرات

کی ہیں ان میں حضرت شاہ ولی اللہ کی اہم شخصیت کے علاوہ دو اور اہم شخصیتیں شیخ الاسلام ہروی اور حضرت مجدد الف ثانی کی بھی ہیں۔ رحمۃ اللہ علیہم۔

بہرحال ہمیں کہنا یہ تھا کہ سلف صالحین کے اعتماد کو مجروح کرنے والا، اس مضمون کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں ان حضرات کی غلطی افکار کی مثالوں کی ایک پوری فہرست مرتب کر کے رکھ دی گئی ہے جسے دیکھ کر وہ لوگ جو ان حضرات کے مقام سے واقف نہیں ہیں یقیناً یہی کہیں گے کہ انھوں نے تو دین کا ستیاناس کر کے رکھ دیا ہے کہ رہبانیت اور وحی و رسالت سے بیگانگی، جیسے صریح غیر قرآنی افکار تک کو دین میں گھسا دیا!

ہم سمجھتے ہیں کہ اکابر جماعت اسلامی کی تحریروں میں اگر اس طرح کی کوئی اور چیز نہ بھی ہو تو بھی وہ تحریریں صدر اول کے بعد کے سلف صالحین اور مسلمہ ائمہ دین سے بے اعتماد کر دینے کے لیے بالکل کافی ہیں اور ان سے متاثر ہونے کے بعد ناواقفوں کو یہی سمجھنا چاہیے کہ شروع کی ایک آدھ صدی کو چھوڑ کر دین کی حقیقی روح اور اس کا کامل صحیح تصور مستور ہی رہا حتیٰ کہ اب چودھویں صدی میں مولانا مودودی اور ان کے رفقاء نے آکر اس حقیقی روح پر سے پردہ اٹھایا اور اس کامل صحیح تصور کو اجاگر کیا جو صدر اول میں پایا جاتا تھا۔

اس خیال کے قائم ہو جانے کا ایک قدرتی نتیجہ تو یہ ہے جس کی طرف ہم نے پہلے توجہ دلائی تھی کہ سلف صالحین کے علم و فہم کی وقعت دلوں سے نکل گئی اور ہر ایرے غیرے کو جرأت ہو گئی کہ اُن کے آراء و افکار کو نشانہ تنقید بنالے اور اگر طبیعت میں بے باکی کے جراثیم ہیں تو پھر وہ تنقید اس نمونہ کی ہو جس کا ایک نمونہ ذی قعدہ کے الفرقان میں پیش کیا جا چکا ہے۔

یہ نتیجہ جو ظہور میں آچکا ہے، صورتاً شنیع تو بہت ہے مگر دین کے لیے اتنا مضر حقیقتاً نہیں ہے جتنا ایک دوسرا نتیجہ جو ظہور میں آسکتا ہے اور وہ یہ کہ دین ایک بازیچۂ اطفال بن جائے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ دس پانچ صدیاں تو درکنار، بیچ کے کسی ایک دور کے متعلق بھی یہ کہنا کہ اس دور میں دین کی بنیادی حقیقتوں کا وہ مفہوم محفوظ نہیں رہا جو صدر اول میں سمجھا گیا تھا، اس بات کا اعلان ہے کہ صدر اول کا مفہوم ہم تک متواتر نقل کے ذریعہ نہیں پہونچ سکا ہے ـــــ پھر وہ کون سا

ذریعہ ہے جس سے ہمیں قطعیت کے ساتھ معلوم ہو سکے کہ صدرِ اول میں ان حقیقتوں کا کیا مفہوم تھا؟ ظاہر ہے کہ ایسا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں قطعیت اور یقین کا فائدہ دینے والا ذریعہ صرف نقل متواتر ہو سکتی تھی اور اس کا ہم انکار کر چکے ہیں۔ اب معاملہ ہمارے فہم پر آکر ٹھہر جاتا ہے کہ ہم کتاب و سنت کے الفاظ پر عربی لغت، اہل زبان کے استعمالات اور دیگر قرائن کی روشنی میں غور کر کے ان حقیقتوں کا کوئی مفہوم متعین کریں۔ مگر ظاہر ہے کہ کیسے ہی روشن دلائل ہم اپنے متعین کردہ مفہوم کے حق میں لے آئیں مگر وہ دلائل مفیدِ یقین ہرگز نہیں ہو سکتے۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ ظن غالب اس امر کا حاصل ہو سکتا ہے کہ صدرِ اوّل میں ان حقیقتوں کا یہی مفہوم رہا ہو گا۔ اور ہو سکتا ہے کہ واقعہ بھی یوں ہی ہو مگر ہم قطعیت کے ساتھ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ یہی مفہوم صدرِ اوّل میں ان حقیقتوں کا تھا۔ بس پہلی قباحت تو اس خیال میں بذاتِ خود یہی ہے کہ دین کی بنیادی حقیقتوں کا مفہوم بھی قطعی الثبوت نہ رہا۔ اور دوسری بڑی قباحت بلکہ فتنۂ عظیم جو اس کے بطن سے پیدا ہو گا (اور جس کی طرف توجہ دلانا یہاں مقصود ہے) وہ یہ ہو کہ (جب ان بنیادی حقائق کا کوئی مفہوم قطعی الثبوت نہ ہو گا تو) ہر شخص کو حق ہو گا کہ وہ اپنے فہم کے مطابق ان کا کوئی مفہوم متعین کرے اور اس کی بنیاد پر دین کا ایک جداگانہ تصور اپنے ذہن میں قائم کر لے ـــــ یہی مطلب ہے دین کے بازیچۂ اطفال بن جانے کا۔

(الفرقان ربیع الاول ۱۳۰۵ھ)

عتیق الرحمٰن سنبھلی

دینی اختلافِ رائے میں رواداری کے حدود

"اصل دین ہی خطرے میں اور عصری طوفانوں کی زد میں ہے ایسے میں اختلافی بحثیں چھیڑنا اور باہمی مباحثوں پر وقت صرف کرنا انتہائی ناعاقبت اندیشی اور دینی محاذ کو کمزور کرنے کے مترادف ہے۔"

اس قسم کی نصیحتیں ہیں جو آجکل بہت سننے میں آرہی ہیں۔ اور یہ فی الاصل ہے بھی صحیح بات! مگر صحیح باتیں اگر غلط محل میں استعمال کی جانے لگیں تو وہ انتہائی خطرناک اور گمراہ کن بھی ہو جاتی ہیں۔ "اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ" بالکل صحیح بات اور قرآن کی بیان کردہ حقیقت تھی، مگر اسی کو خوارج نے جب غلط محل میں استعمال کیا تو وہ اسلام میں ایک شدید فتنہ بن گیا اور سیدنا علی بن ابی طالب رضؓ کو کہنا پڑا کہ "کلمۃُ حقٍ اُرید بھا الباطل" یہ فی الاصل کلمۂ حق ہے مگر اس کا استعمال جس مقصد کے لیے کیا جارہا ہے وہ باطل ہے۔

اسی طرح وہ "کلمہ" جو اوپر نقل کیا گیا، اصلاً حق ہے، مگر اس کے استعمال میں بہت سے لوگ غلطی اور ناعاقبت اندیشی کا ثبوت دیتے نظر آرہے ہیں۔

مسائل کی ایک نوع وہ ہے جن پر آدمی کی ایک رائے ہونی چاہیے۔ مگر دوسری رائے کی بھی وہاں گنجائش ہوتی ہے۔ اس لیے اپنی رائے پر اعتماد کے باوجود کسی دوسری رائے کی بھی گنجائش تسلیم کی جانی چاہیے، اور تبادلۂ خیالات ہو تو ہو مگر بحث و نزاع کی صورت ہرگز نہ اختیار کی جائے۔

اس کی مثال فقہ کے وہ مسائل ہیں جن میں دونوں طرف کے دلائل موجود ہیں، معاملہ کسی دلیل کی ترجیح وغیرہ کا ہوتا ہے، یا جیسے آج کل دین کی خدمت و نصرت میں بہتر طریق کار کا مسئلہ ہے کہ اس میں مختلف رائیں ہو سکتی ہیں۔

ایک نوع وہ ہے جہاں ایک رائے کے سوا دوسری رائے کتاب و سنت کے خلاف اور دوسرا سلوک از قبیل منکرات و بدعات ہوتا ہے، اور تبادلہ خیالات سے کام نہ چلتا ہو تو فی نفسہ لازم ہے کہ اس کی تردید کی جائے۔ لیکن اگر وقت ایسا ہے کہ ان مسائل سے اہم تر مسائل در پیش ہیں اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے امت کے تمام دینی رجحان رکھنے والے عناصر کے اتفاق اور تعاون و تناصر کی اور اس بات کی ضرورت ہے کہ امت کی عام توجہ انھیں اہم تر مسائل کی طرف رہے تو ان غلط خیالات و اعمال کی اصلاح کی حکیمانہ کوشش تو بہر حال جاری رہنی چاہیے لیکن برملا تردید اور نزاع کی نوبت بیشک نہیں آنی چاہیے۔

مسائل کی یہ دونوں انواع فروع سے تعلق رکھتی ہیں، اور ان میں واقعی یا اضافی (یعنی دوسرے کے نقطۂ نظر سے) غلطی کا اثر محض کسی ایک جزئیہ تک محدود رہتا ہے، لیکن بعض مسائل ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا اثر پورے دین کی یا دین کے بڑے حصہ کی سلامتی پر پڑتا ہے۔ اور ان میں اگر کوئی غلط اصول قائم ہونے دیا جائے تو بجائے دشمنوں کے خود انہوں ہی کے ہاتھوں اور بجائے بدنیتوں کے خود مخلصین ہی کے ہاتھوں دین کا حلیہ بگڑ کر رہ سکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص الحاد اور دہریت کے عصری طوفان کے مقابلہ میں اسلام کا علمبردار ہے اور اسلامی نظام فکر و عمل ہی میں انسانیت کی نجات سمجھتا ہے۔ مگر وہ یہ اصول ساتھ لیکر چلتا ہے کہ خلیفۂ وقت مقتضیات زمانہ کے تحت دینی احکام کی ان تمام شکلوں میں ترمیم کر سکتا ہے جو قرآن میں منصوص نہیں ہیں، ظاہر ہے کہ اس شخص کے اس خیال کو فروعی اختلافات پر قیاس کر کے اور یہ سوچ کر کہ یہ وقت آپس میں لڑنے کا نہیں ہے، نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ یہ اصول دین کے ایک بڑے حصّہ کو تلپٹ کر کے رکھ دے گا۔ علیٰ ہذا جو بھی شخص اور جو بھی دینی گروہ اس طرح کا کوئی غلط اصول قائم کرتا ہے۔ وہ خواہ عصری طوفانوں کے مقابلہ میں "اصل دین" کے لیے کتنا ہی قیمتی کیوں نہ ہو، اس کی اس غلطی اور زیغ سے

چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔

اگر آپ کے گھر پر، محلہ پر، یا شہر پر باہر سے کوئی حملہ ہو رہا ہو۔ اور اندر آپ ہی میں کا کوئی شخص بے وقوفی سے یا بھول چوک سے کسی حصہ میں آگ لگا دے، تو کون عقل مند ہو گا جو کہے کہ پہلے بیرونی حملہ پسپا کر دو آگ بعد میں بجھانا؟ ظاہر ہے کہ اہل خانہ، اہل محلہ یا اہل شہر کو دونوں کام ساتھ ساتھ کرنا پڑیں گے اور یہی دانشمندی اور عاقبت اندیشی ہوگی! کوئی کہنے لگے کہ بیرونی حملہ پسپا نہ ہوا اور دوسری طرف توجہ کی وجہ سے قوت مدافعت کمزور پڑ گئی تو آگ سے جو کچھ تم بچاؤ گے اُس سے بھی محروم ہو جاؤ گے، اس لیے کہ وہ دشمن لے اُڑے گا۔ لہٰذا سب یکسو ہو کر بیرونی مورچے ہی پر ڈٹے رہو تاکہ آگ سے جو کچھ خود بچ رہے (جیسے سکّے اور معدنیات وغیرہ، بلکہ خود وہ زمین جس پر از سرِ نو تعمیر کی جاسکتی ہے) وہ تو تمھارا رہے، بتائیے کون ہے جو اس منطق کو قبول کرے گا؟

اسی طرح یہ منطق بھی سخت تباہ کن ہے کہ فلاں اصول سے زیادہ سے زیادہ نظام عمل میں کچھ فتور پیدا ہو جائے گا، مگر یہ جو الحاد و بے دینی کا سیلاب ہے، اس میں تو ایمانیات اور اساساتِ دین تک کی خیر نہیں۔ بس، پہلے اس کو روکو۔ اندر کے فتنوں کی بعد میں خبر لینا۔

یہاں ایک بات اور بھی قابل لحاظ ہے کہ اس قسم کا خطرناک اصول اگر کوئی ایسا شخص پیش کرتا ہے جس کا اہل دین میں کوئی خاص وقار اور کوئی خاص وزن نہیں ہے تو وہ اپنی حیثیت کے مطابق اہمیت کے باوجود اتنی توجہ اور اتنی فکر کا مستحق نہیں ہے، جتنی توجہ اور جتنی فکر کا مستحق ایسا کوئی وہ اصول ہے جو کسی ایسی شخصیت کی طرف سے پیش کیا جائے جسے اہل دین کی نظر میں کوئی خاص وزن اور کسی دینی طبقہ کی نظر میں دینی سند کی حیثیت حاصل ہو۔ ایسے کسی شخص سے اگر ایسی کوئی بات سرزد ہوتی ہے تو اُس پر اُسے ٹوکنا خصوصیت کے ساتھ زیادہ ضروری ہے۔ اس لیے کہ ایسی صورت میں ایک فرد کی نہیں بلکہ ایک بڑی جماعت کی گمراہی کا خطرہ یقینی ہے۔

ہاں اب یہ اس شخص کا اور اُس کے حامیوں کا فرض ہے، اگر وہ مخلص ہیں، کہ نہیں، اگر کسی بات پر ٹوکا جاتا ہے تو وہ اس کو نزاع کی صورت نہ دیں۔ تاکہ حتی الامکان اور کسی بھی حد تک اتحاد و تعاون

کی گنجائش باقی رہ سکے لیکن اگر وہ اَخَذَتۡہُ الۡعِزَّۃُ بِالۡاِثۡمِ کا مظاہرہ کرنے لگ جائیں۔ اور ایک اصولی اختلاف کو زبردستی ذاتی عناد کا نتیجہ قرار دے کر تنابز بالالقاب کی مہم شروع کر دیں۔ تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اتحاد و تعاون کی گنجائش برقرار رکھنا کسی بھی شخص کے بس کی بات نہیں۔ اور اس کی تمامتر ذمہ داری اسی شخص پر ہے جو بحث کو یہ غلط رنگ دے — تاہم یہ ممکن ہے کہ دوسرا شخص ضبط و تحمل سے کام لے کر اپنی حد تک فضا کو زیادہ خراب ہونے سے بچانے کی کوشش کرے۔

لیکن اس کے بعد اگر یہ درجہ آجائے کہ حق واضح ہو جانے پر اور اس کی شہادتیں چاروں طرف سے ہویدا ہو جانے پر بھی آدمی اپنی بات کی پچ میں بیتیرہ بازی دکھائے اور اپنی ساری ذہانت، سازی استدلالی قوت اور تقریر و تحریر کی تمامتر مہارت ایک باطل کو حق بنا دینے میں صرف کرنے لگے۔ کتاب و سنت کا غلط استعمال کرے اور فقہاء و محدثین کے بیانات کو بے محل استعمال میں لائے۔ اور اس طرح ایک اصولی گمراہی کے ساتھ ساتھ دس جزئی علمی و دینی غلط فہمیاں لوگوں میں پیدا کرے تو ہرگز روا نہیں ہے کہ اُس کے ساتھ ادنیٰ رعایت کی جائے، وہ اگر عصری طوفانوں کے مقابلہ میں اصل دین کی حفاظت کی کوئی بڑی خدمت بھی انجام دے رہا ہے اور ان طوفانی لہروں کی تخریب کے مقابلہ میں تعمیرِ نو کا علمبردار ہے تو لوگ ایسی تعمیر کو لیکر کیا کریں گے جس میں کتنی ہی خرابیوں کی صورتیں پیشگی مضمر ہوں، اور جس کا معمار اس بات کا روادار ہو کہ محض اپنے وقار کی خاطر دین کے کتنے ہی حصہ کو کسی وقت خود اپنے ہی ہاتھوں مسخ کر دے۔

تَحۡسَبُوۡنَہٗ ہَیِّنًا وَّ ہُوَ عِنۡدَ اللّٰہِ عَظِیۡمٌ۔

(الفرقان صفر ۱۳۸۹ھ)

محمد منظور نعمانی

داعیانِ حق

اپنی طرف نہیں بلکہ خدا کی طرف بلاتے ہیں

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ ○ وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا ۗ أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝

(آل عمران ع ۸)

کسی (خدا کے فرستادہ) بشر سے یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ اس کو کتاب اور قانونِ شریعت اور نبوت دیں پھر وہ لوگوں سے کہنے لگے کہ تم خدا کے سوا میرے بندے بن جاؤ، لیکن (اس کی ہدایت یہی ہوگی کہ) تم سب اللہ والے بن جاؤ، کتاب پڑھ پڑھا کر (یعنی اللہ کا فرستادہ رسول ہمیشہ کتاب الٰہی کی روشنی میں خدا کی طرف دعوت دیگا) اور وہ یہ نہیں کہے گا کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو رب بنا لو، کیا (معاذ اللہ) وہ تم کو کفر کا حکم دے سکتا ہے، بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو چکے ہو (ہمارے کسی رسول سے ایسا نہیں ہو سکتا۔)

اس آیت کریمہ میں داعیان حق بالخصوص پیغمبران الٰہی کا ایک عام اصول یہ بتلایا گیا ہے کہ وہ دنیا کو اپنی بندگی کی طرف نہیں بلاتے۔ بلکہ ان کی دعوت اور ان کی پکار صرف یہ ہوتی ہے کہ "اے لوگو صرف اللہ کے بندے بن جاؤ"۔

آپ حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک سارے انبیاء علیہم السلام

کے سوانح کا مطالعہ کر جائیے کہیں کسی ایک جگہ بھی آپ کو یہ نہ ملے گا کہ خدا کے کسی پیغمبر نے دنیا کو اپنی طرف دعوت دی ہو، اپنی بندگی کرائی ہو، اپنے کو سجدہ کرنے کا حکم دیا ہو، اپنی نذر و نیاز کا سبق دیا ہو، اپنے گھر کا طواف کرایا ہو۔

ہادیان حق میں صرف ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات ایسی ہے جن کے متعلق ان کی گمراہ قوم کا بیان ہے کہ انھوں نے دنیا کو خدا کے سوا اپنی بندگی کی بھی تعلیم دی۔ اور بقول بعض (معاذ اللہ) اپنی والدہ ماجدہ مریم صدیقہ کو بھی شریک الوہیت بتایا۔ لیکن خدا اور خدا کی آخری کتاب شاہد ہے کہ یہ سب مفتریوں کا افترا ہے جس میں صداقت کا کوئی شائبہ نہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام کی کیا مجال تھی کہ وہ بندگی چھوڑ کر خدا بن بیٹھتے۔ جو لوگ ایسا کہتے ہیں اور بندگی کو حضرت عیسیٰؑ کے لیے باعث عار سمجھتے ہیں وہ احمق ہیں اور عبد و معبود کی خصوصیت سے جاہل۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ	مسیح کو اللہ کا بندہ بننے سے ہرگز عار نہیں ہو سکتی
عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ	(اور انہی پر کیا موقوف) ملائکہ مقربین کو بھی
الْمُقَرَّبُوْنَ (نساء)	اس کی بندگی سے عار نہیں۔

اور جب قیامت کے دن اس گمراہ اور مفتری قوم کی افترا پردازی کا پردہ چاک کرنے کے لیے سر محشر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا جائے گا۔ کہ

ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ	کیا تم نے ان لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا
وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ	مجھ کو اور میری ماں کو بھی معبود بنا لینا۔

تو آپ صاف عرض کریں گے کہ حاشا و کلا میری کیا مجال تھی کہ ایسی باغیانہ بات منہ سے نکالتا

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ	میں نے تو ان سے اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہا کہ
بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ	تم بس اس خدا کی بندگی کرو جو میرا اور تمہارا
رَبَّكُمْ ۚ (مائدہ، رکوع آخر)	رب ہے (اور ہم سب اسی کے بندے ہیں)

ہمارا ایمان ہے کہ بیشک حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے توحید ہی کی تعلیم دی اور دنیا کو یہی بتلایا کہ اسی ایک خدا کے بندے بن جاؤ جو آسمان و زمین اور کل کائنات کا رب ہے۔ جو اس کے خلاف کہتا ہے اور اس معصوم نبی پر تعلیم شرک کی تہمت دھرتا ہے وہ مفتری ہے، کذاب ہے اور اس کے لیے

آخرت میں جہنم کا شدید عذاب ہے۔

علیٰ ہذا خدا کے آخری پیغمبر (فداہ امی وابی وروحی وقلبی) صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی امت کو اس اکیلے خدا کی بندگی کی تعلیم دی اور نہایت صفائی کے ساتھ دنیا کو بتلا دیا کہ میری دعوت و پکار صرف خدا کے لیے ہے۔ اور میں تم کو اپنی طرف نہیں بلاتا بلکہ اللہ کے حکم سے اللہ ہی کی طرف بلاتا ہوں۔

...... هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ (یوسف ۱۲ رکوع آخر)

...... یہ میرا طریقہ ہے، میں (لوگوں کو) خدا کی طرف بلاتا ہوں (اور میری یہ دعوت و تبلیغ اندھادھند نہیں ہے۔ (بلکہ اس طور پر ہے کہ) میں اور میرے متبعین سب دلائل کی روشنی میں ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لیے ہر قسم کے عیب اور شرک سے پاکی ہے اور میں شرک والوں میں سے نہیں ہوں۔

آپ نے اپنی دعوت میں یہ بھی ظاہر فرمایا کہ جس خدا کی عبادت کا میں تم کو حکم دیتا ہوں میں خود بھی اسی کی عبادت کرتا ہوں اور جس خدا کی بندگی کا سبق میں تم کو دے رہا ہوں میں بھی اس کا ایک بندہ ہوں۔

اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ○ (رعد ۱۳ رکوع ۵)

مجھ کو حکم ملا ہے کہ میں صرف ایک خدا کی عبادت کروں، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کروں، میں اسی کی طرف (تم کو بھی) بلاتا ہوں اور اسی کی طرف مجھ کو (اور سب کو) لوٹ کر جانا ہے۔

الغرض آدم علیہ السلام سے لیکر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے خدا کے ہادی آئے ان میں سے ہر ایک نے دنیا کو صرف خدا ہی کی طرف بلایا اور اپنی اپنی قوموں کو صاف بتلا دیا کہ ہماری دعوت صرف اللہ ہی کی طرف ہے۔ اور ہم محض یہ چاہتے ہیں کہ تمہاری عبدیت کا تعلق صرف

اسی واحد قہار سے رب ہے۔

لیکن یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی یہی متحدہ اور متفقہ تعلیم انکے مخاطبین کیلیے زیادہ گرانبار خاطر رہی اور اسی سے لوگوں نے زیادہ روگردانی کی آج بھی اگر آپ امت مرحومہ کا جائزہ لیں تو اپنے کو مومن اور مسلم کہنے والوں میں بھی ایک بڑی تعداد ایسے افراد کی نکلے گی جنھوں نے خدا کے سوا اور بھی بہت سوں سے رشتہ عبدیت جوڑ رکھا ہے۔ کوئی اپنے پیر کے سامنے جھک رہا ہے کوئی کسی بزرگ کے مزار کو سجدہ کر رہا ہے، کوئی امام حسین کے تعزیے یا کسی ولی کے روضہ کے طواف میں مشغول ہے۔

لیکن کیا معاذ اللہ ان بزرگان دین اولیاء کرام یا شہداء عظام نے ان کو ان افعال شنیعہ کی تعلیم دی ہے؟ .... حاشا للہ کہ ان کے پاک دلوں میں کبھی ایسا وسوسہ بھی گذرا ہو۔ ان کا دامن تقدس ان تمام شیطانی حرکات سے پاک ہے۔ اور ان کی مقدس روحیں ان تمام اعمال سے بری اور بیزار ہیں۔

حضرات اولیاء کرام کے مقدس گروہ میں سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو جو تفوق اور امتیاز حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں اور غالبًا یہی وجہ کہ ارباب ضلالت نے اپنے ان مشرکانہ اعمال کا زیادہ نشانہ آپ ہی کی ذات اقدس کو بنایا ہے اور آپ ہی کے نام پر آجکل یہ حرکتیں زیادہ کی جاتی ہیں۔ لیکن اس بارے میں آپ کی جو تعلیمات ہیں وہ وہی ہیں جو ایک سچے مسلم اور سچے توحید پرست کی ہو سکتی ہیں چنانچہ آپ کی ان موحدانہ تعلیمات کا ایک معتد بہ حصہ آپ کی تصنیفات "فتوح الغیب" اور "غنیۃ الطالبین" سے اقتباس کر کے ہم ربیع الثانی کے نمبر میں ہدیۂ ناظرین کر چکے ہیں۔ آج کی صحبت میں آپ کے ایک ملفوظ گرامی کا ترجمہ پیش کرتے ہیں، شاید کسی کے لیے ہدایت کا باعث ہو۔

فیوض یزدانی کی آٹھویں مجلس میں ہے کہ حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے ۱۹ شوال ۵۴۰ھ کو سہ شنبہ کے دن مدرسہ معمورہ میں لوگوں کو کچھ نصیحتیں فرمائیں۔ اسی ذیل میں ارشاد فرمایا۔

• صاحبو! میرا کہنا مانو کہ میں اللہ جل جلالہ کا داعی ہوں کہ تم کو بلاتا ہوں اسی کے دروازے اور اسی کی اطاعت کی طرف میں تم کو اپنی ذات کی طرف نہیں بلاتا کیونکہ یہ نیابت ہے پیغمبر کی

اور نائب رسول کا مقصود دعوت و پکار سے یہ ہوتا ہے کہ اللہ والے بن جاؤ نہ یہ کہ میری عزت کرو اور نذرانے دو۔ ہاں جو منافق اور دین فروش ہوتا ہے وہ مخلوق کو اللہ کی طرف نہیں بلاتا بلکہ اپنے نفس کی طرف بلایا کرتا ہے۔" (تیر من یزدانی ص۴۹)

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے نام کا وظیفہ پڑھنے والو اور خدا کے بجائے شیخ ممدوح سے لو لگانے والو للہ ذرا سوچو کیا تم اُس راستے پر ہو جس کی طرف حضرت شیخ رض نے بلایا تھا؟ اگر نہیں ہو اور یقیناً نہیں ہو تو کیا اب اس شاہراہ ہدایت پر آنے کو تیار ہو؟ دیکھو حضرت شیخ کی مقدس روح اب بھی تم کو پکار رہی ہے اور توحید کے سچے راستے کی طرف بلا رہی ہے۔ کیا ہے کوئی نیک بخت جو شیخ کی آواز پر لبیک کہے؟

(الفرقان رمضان وشوال ۱۳۵۳ھ)

--:(صفحہ ۱۹۲ کا بقیہ):--

۱۔ قلتِ خوراک و وسائل معاش کے خیال سے تحدید نسل کا رجحان کتاب و سنت کی رو سے کوئی پسندیدہ رجحان نہیں ثابت کیا جا سکتا۔

۲۔ عزل کی وہ روایات جو یہ دکھانے کے لیے پیش کی گئی ہیں کہ حضورؐ نے ممانعت نہیں فرمائی، ان میں سے کوئی بھی نہیں بتاتی کہ عزل کی بنا خشیۂ املاق (تنگدستی کا خوف) تھی --- واضح رہے کہ اُسامہ بن زیدؓ کی جو روایت احمد و مسلم کے حوالہ سے ان مضامین میں نقل کی گئی ہے اس میں "اشفق علی ولدِ ھا" کا مطلب غلط سمجھا گیا ہے۔ اس میں کثرت اولاد کا خوف نہیں، بلکہ دودھ پیتے بچے کو کوئی نقصان پہنچ جانے کا خطرہ بیان ہوا ہے، چنانچہ مسلم میں یہ روایت "باب الغیلۃ" کے تحت آئی ہے۔ اسی سے اس کا مطلب سمجھا جا سکتا ہے۔

۳۔ انفرادی واقعات اور قومی پیمانے کے رجحانات کا حکم یکساں ہونا ضروری نہیں۔ روایات میں انفرادی انداز کے واقعات سامنے آتے ہیں، نہ کہ قومی اور اجتماعی پیمانے کا کوئی رجحان۔ پس ان واقعات میں آنحضرتؐ کی عدم ممانعت کو قومی پیمانہ پر تحدید نسل کا رواج ڈالنے کے لیے وجہ جواز نہیں بنایا جا سکتا۔

۴۔ اولاد کو بیماریوں اور وباؤں پر قیاس کر کے اُس کے انسداد یا مدافعت کی تدبیروں کو جائز ٹھہرانا کوئی صحیح طرز فکر نہیں، اولاد اللہ کا ایک عطیہ اور نسل انسانی کی بقاء کے لیے اس کا ایک ازلی فیصلہ ہے جس کے لیے اللہ نے مرد و زن کو ایک ذریعہ بنایا ہے۔ اس کے برعکس ہم پر بیماریاں اور وبائیں مسلط کرنے سے اللہ کو از خود کوئی دلچسپی نہیں، یہ چیزیں در اصل خود ہماری کسی غلطی کے نتیجہ میں ہم پر مسلط ہوتی ہیں۔ پس ان غلطیوں سے احتیاط و اجتناب یا ان کے نتائج کے ازالہ کی تدبیروں پر قیاس کر کے اولاد کے انسداد کے لیے بھی یہی سب روا رکھنا ظاہر ہے کہ کس قدر غلط قیاس ہے۔

۵۔ بے روزگاری اور افلاس کا مسئلہ ہماری آبادی کے خاص طور پر جس حصہ کا مسئلہ ہے تجربہ بتاتا ہے کہ اُس میں ضبط تولید کو رواج پانے کے لیے جتنا عرصہ درکار ہوگا، ارباب اقتدار اور دردمندان ملت اگر ایمانداری اور فرض شناسی کے ساتھ جد و جہد کریں تو بلاشبہ اتنے عرصہ میں وسائل معاش کی افزائش اور اُن کی صحیح تقسیم کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ پس کیوں اس مسئلہ کو سیدھے سیدھے حل کرنے کے بجائے قوم کو تحدید نسل کا سبق پڑھایا جائے۔ اور اس سبق کے خطرات کو انگیز کیا جائے؟ (الفرقان بابت محرم ۱۳۸۳ھ)

انتخاب

مسلمانوں میں قبر پرستی

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا

آسام کے ایک وزیر جناب معین الحق چودھری نے پچھلے دنوں ایک سرکاری تقریب کے موقع پر گاندھی جی کی مورتی پر پھول چڑھانے سے انکار کر دیا تھا[1]۔ معاصر "دعوت" دہلی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے روزنامہ "پرتاب" کا تبصرہ بھی نقل کیا ہے۔ اس تبصرہ میں جہاں معاصر "پرتاب" نے معین الحق صاحب کے رویہ کی تعریف کی ہے۔ وہاں مسلمانوں کے ایک ایسی چٹکی بھی لی ہے جسے پڑھ کر غیرت ایمانی کو پسینہ پسینہ ہو جانا چاہیے! —— معاصر "دعوت" رقمطراز ہے:-

ایک تیسری بات جو اسی واقعہ سے سامنے آئی ہے یہ ہے کہ ہندوؤں کا وہ طبقہ جو کٹر فرقہ پرست کہلاتا ہے اس طرح کے اصولی اقدامات کو سراہنے پر آمادہ ہے۔ چنانچہ معاصر "پرتاپ" نے اس واقعہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "آسام کے وزیر مسٹر معین الحق نے اچھا کیا جو رواج پر اپنے ضمیر کی آواز کو ترجیح دیتے ہوئے گاندھی جی کی مورتی پر پھول چڑھانے سے انکار کر دیا، ان کے نزدیک یہ بت پرستی ہے اور اسلام کی رو سے بت پرستی شرک میں داخل ہے۔" یہ تعریف ثابت کرتی ہے کہ اصول پرستی پر جم جانا بجائے خود ایسا فعل ہے جو اپنی تاثیر پیدا کرتا ہے۔

وزیر مذکور کے اس اقدام کی تعریف کرتے ہوئے معاصر "پرتاب" نے ایک اور مسئلہ کی طرف توجہ دلائی ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمان خود بھی قبر پرستی میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ معاصر لکھتا ہے۔

"حضرت محمدؐ کو اس بات پر بجا فخر حاصل ہے کہ انھوں نے عرب جیسے شرک پسند ملک میں بت پرستی کے خلاف آواز اٹھائی اور اس بات پر نہایت سختی سے قائم رہے کہ بت پرستی کفر ہے خدا ایک ہے دوسرا انہیں

---

[1] جس زمانہ کا یہ واقعہ ہے اس زمانہ میں معین الحق چودھری صاحب آسام کی وزارت میں تھے بعد میں وہ مرکز کے وزیر بھی رہے۔ ابھی چند مہینے پہلے مرحوم کا انتقال ہوا ہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ (الفرقان)

مسلمان بھی حضرت کی اس تعلیم پر قائم رہے ہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے آنحضرت کی کوئی شبیہ نہیں بننے دی انکی اصل تصویر تو کیا ہو سکتی ہے لیکن جو نقلی تصویر شائع ہوئی اس کے خلاف انھوں نے پروٹسٹ کیا۔ نہ صرف یہاں بلکہ ہاتھ سے بھی عیسیٰ کی بھی کوئی اصل تصویر نہیں ہوگی لیکن چونکہ عیسائیوں کو اپنے پیا مبر کی تصویر بنائے جانے پر اعتراض نہیں اس لیے ان کی تصویر دنیا کے سامنے ہے۔ جہاں مسلمانوں نے بُت پرستی کے لحاظ سے اپنے رسول کے حکم کی تعمیل کی ہے وہاں..... افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ انھوں نے قبر پرستی جیسی بدعت کی پیروی کر کے انکی حکم عدولی کی ہے۔ یہ کہنا مبالغہ میں داخل نہ ہوگا کہ جتنی قبر پرستی مسلمانوں میں پائی جاتی ہے شاید ہی کسی اور قوم میں پائی جاتی ہو۔ ہندوؤں میں چونکہ مردوں کو دفن کرنے اور ان کی قبر بنانے کا رواج نہیں ہے۔ اس لیے ان میں سمادھ کی پوجا بہت کم ہے پھر بھی ان کے ہاں سمادھیں بن رہی ہیں اور لوگ ان پر پھول چڑھاتے ہیں۔ مسلمانوں کی دیکھا دیکھی ہندو عورتیں بھی دعا مانگنے اور بچے لینے کے لیے مسلمان پیروں کی قبروں پر جاتی ہیں۔ پیروں کی پرستش کرنیوالے مسلمان مردوں اور عورتوں کا تو کوئی شمار نہیں۔ اگر کسی کو یہ دیکھنا ہو کہ مسلمان کیسی بری طرح اس بدعت..... کا شکار ہو چکے ہیں تو وہ لاہور میں داتا گنج بخش کے دربار میں چلا جائے اسے معلوم ہو جائے گا کہ مسلمان کس قدر اپنے رسول کی حکم عدولی اور اپنے مذہب کی توہین کرتے ہیں۔ داتا گنج بخش تو پاکستان میں چلا گیا ہندوستان میں قبر پرستی یا مزار پرستی کا درشیہ دیکھنا چاہتے ہو تو خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ واقع اجمیر میں چلے جاؤ۔ میں نے اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کو ان کی قبر کے سوراخ میں منھ دے کر روتے دیکھا ہے۔ خواجہ کی درگاہ کا ہندوستان کے مسلم مقامات مقدسہ میں نمایاں مقام ہے اور ہر سال خواجہ کے عرس پر ہزاروں کی تعداد میں مسلمان وہاں جاتے ہیں۔ وہاں دو بڑے کڑھاؤ ہیں جن میں عرس کے دن چاول پکائے جاتے ہیں۔ یہ چاول بھگتوں میں بانٹے جاتے ہیں۔ چاول کم ہوتے ہیں اور بھگت زیادہ اس لیے ایک طرح کی لوٹ مچ جاتی ہے اور ہر ایک مسلمان بطور تبرک دیگ کے چاول حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس درگاہ میں مغل بادشاہوں کی بنوائی ہوئی مسجدیں ہیں۔ اکبر بادشاہ نے بھی یہاں ایک مسجد بنوائی تھی۔ حالانکہ مسلم علماء اس کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کر چکے ہیں لیکن لطف یہ ہے کہ یہ قبر پرستی کھلے بندوں ہوتی ہے اور اس کے خلاف کوئی ــــــ پروٹسٹ نہیں ہوتا۔

(الفرقان ربیع الاول ۱۳۸۰ھ)

عتیق الرحمٰن سنبھلی

دینی پختگی کی ایک اعلیٰ مثال

اسلام کی بنیاد جس ٹھیٹ اور ہمہ گیر توحید پر ہے اس کی رو سے خدا پرستی کے علاوہ کوئی بھی اور "پرستی" حرام اور قطعاً حرام ہیں۔ ازانجملہ قبر پرستی کی بھی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں، اور اُس کی توحید خالص کے ساتھ، اس پرستی کا بھی کوئی جوڑ نہیں بیٹھتا۔

اور پھر ممانعت قبر پرستی کے صرف انتہائی مظاہر (سجدہ ریزی اور جبہ سائی) ہی کی نہیں بلکہ ان سے ہلکے درجے کے مظاہر (دست بستہ کھڑا ہونا اور ہار پھول چڑھانا وغیرہ) بھی سب اسی زمرہ میں آتے ہیں اور روح توحید کے ساتھ جوڑ نہ کھانے میں (کم و بیش کے فرق کے ساتھ) سب برابر کے شریک ہیں۔

جدید دور کا "روشن خیال" اور مذہبیت بیزار انسان، قبر پرستی کیا، خدا پرستی کو بھی اوہام پرستی سمجھتا ہے مگر اس کے باوجود قبر پرستی کی روح سے وہ بھی خالی نہیں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ مذہبی عقیدت کی بنا پر قبر پرستی نہیں کرتا اور پرستش کے انتہائی مظاہر (سجدہ ریزی اور جبہ سائی وغیرہ) کو اختیار نہیں کرتا باقی قومی اور وطنی نقطۂ نظر سے جن شخصیتوں کو وہ ہیرو سمجھتا ہے، ان کی قبروں اور سمادھیوں پر جاکر، ان کی عظمت کا اعتراف اور اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے لیے وہ تمام دوسرے آدابِ پرستش بجالانے میں نہ صرف یہ کہ کوئی شرم محسوس نہیں کرتا بلکہ اسے اپنا مقدس فریضہ خیال کرتا ہے۔

حتیٰ کہ ایک مستقل دستور اس زمانہ کا یہ ہو گیا ہے کہ کسی دوسرے ملک میں سرکاری مہمان کی حیثیت سے جانے والا انسان اس ملک کی اہم قومی شخصیت یا وطنی ہیرو کے مقبرہ یا اس کی سمادھی پر جاکر پورے قبر پرستانہ انداز کے ساتھ عملی اظہار عقیدت اور اعتراف عظمت کرنا اپنے پروگرام کا ضروری جزو خیال کرتا ہے۔

اس مشرکانہ دستور کی پابندی، آئے دن ہم دیکھ رہے ہیں کہ اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والے بھی اسی طرح کر رہے ہیں جس طرح غیر مسلم —— اس ابتلائے عام میں ایک استثنائی مثال ان دنوں

شاہ سعود (والی نجد و حجاز) نے قائم کی ہے ۔ اور اس طرح کہ اپنی (عنقریب) ہندوستان آمد کے سلسلہ میں حکومت ہند کو صاف صاف مطلع کر دیا ہے کہ وہ اپنے اسلامی عقائد کی بنا پر اس رسم کی ادائیگی سے معذور ہیں۔

یقیناً یہ ایک قابل تقلید مثال ہے! اللہ تعالیٰ سلطان کو اس جاہلیت جدیدہ کے دور میں اس طرح کی مزید مثالیں قائم کرنے کی توفیق دے۔

ہندوستان میں قومی حکومت کے قیام کے بعد مسلمانوں کے لیے اس "جدید قبر پرستی" جیسے بہت سے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ کتنی ہی سرکاری اور قومی تقریبات ایسی ہیں کہ جن کے بعض اجزاء اسلام کی تعلیمات سے ٹکرانے والے اور اس کے مزاج کے منافی ہیں۔ ان تقریبات و رسوم کا پروگرام بنانے اور متعین کرنے والے وہ لوگ ہیں جو اسلام کی تعلیمات اور اس کے مزاج سے ناآشنا ہیں اس لیے وہ پروگرام بنانے میں مسلمانوں کا کتنا ہی لحاظ کریں پھر بھی ان کے لیے مشکل ہے کہ وہ پروگرام میں کوئی جزو ایسا نہ رکھیں جو اسلام کی تعلیمات اور اس کے مزاج سے ٹکراتا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی مسلمان ان تقریبات کے ایسے اجزاء میں شرکت سے گریز کرتا ہے تو اس کی ملکی وفاداری پر شبہہ کیا جاتا ہے۔ سیکڑوں صحیح الخیال مسلمانوں کو آئے دن اس کش مکش سے سابقہ پڑتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ علمائے اسلام میں سے ایسے حضرات جن کی حب الوطنی پورے ملک پر آشکارا ہے اور کم از کم ملک کے سربراہ اس معاملہ میں ان پر پورا اعتماد رکھتے ہیں وہ ایسی تمام چیزوں کے بارے میں ——— ایسی جرأت اور صاف گوئی کے ساتھ جس کی مثال سلطان سعود نے قائم کی ہے ——— سربراہان مملکت پر اسلامی نقطۂ نظر واضح کر دیں اور پھر ان سے درخواست کی جائے کہ اولاً تو کسی قومی تقریب کے پروگرام میں ایسے اجزاء شامل ہی نہ ہونے چاہئیں ورنہ کم از کم مسلمانوں کو ان کی شرکت سے واضح طور پر مستثنیٰ کر دیا جائے۔

یہ اس وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ سلطان سعود کے اس اقدام نے اس کام کے لیے زمین ہموار کر دی ہے۔ اللہ ان کو جزائے خیر دے۔

(الفرقان، ربیع الاول ۱۳۷۴ھ)

محمد منظور نعمانی

ہمارے جاہلوں کی گمراہی کی ایک مثال

ابھی حال ہی میں میں مرادآباد سے بریلی جانے کے لیے ٹرین پر سوار ہوا۔ ٹرین جب ریاست رامپور پہونچی تو ہمارے ہی والے درجہ میں چند آدمی سوار ہوئے جنکی صورتیں مسلمانوں کی سی تھیں۔ ساتھ میں چند عورتیں اور دو چار بچے بھی تھے۔ ان میں ایک بچہ کوئی ۸۔۱۰ برس کی عمر کا تھا جو کچھ ہلکے گلابی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھا اور سر پہ سہرا بھی بندھا ہوا تھا۔ عام طور سے سمجھا یہ گیا کہ یہ کوئی مختصر سی بارات ہے جو کہیں جا رہی ہے۔ جب گاڑی چل دی تو میرے قریب میں بیٹھنے والے ایک ہندو مسافر نے ان لوگوں سے دریافت کیا: "آپ لوگ اس بچہ کی شادی کرنے کے لیے جا رہے ہو؟" ان میں سے ایک بڑے میاں نے کہا "نہیں، شادی تو نہیں ہے۔ اس لڑکے کو ہم سلامی کے لیے مکن پور لیے جا رہے ہیں"۔ وہ ہندو بابو بولے "سلامی کیا بات؟" انہی بڑے میاں نے جواب دیا۔ مکن پور میں شاہ مدار جی کا مزار ہے، جب کسی کے بچے جیتے نہیں ہیں تو ان کے مزار پر جاکر وہ انکی نذر نیاز مان لیتا ہے کہ میرا بچہ جی جاوے گا تو میں یہ نذر چڑھاؤں گا اور بچہ بھی سلامی کے لیے حاضر ہوا کرے گا۔ تو اس کے بچے جینے لگتے ہیں۔ اس لڑکے پر بھی ان کی نذر مانی گئی تھی تو اب ہم ہر سال اس کو سلامی کے لیے لے جاتے ہیں۔ اور وہاں نذر نیاز چڑھاتے ہیں اور کبھی لاکھوں آدمی آتے ہیں"۔ بیچارہ ہندو بابو معلوم نہیں کس علاقہ کا تھا، وہ شاید ان چیزوں کو سمجھا نہیں اور اس نے سادگی سے کہا۔ "وہاں کوئی ٹھاکر جی ہیں، کوئی دیوتا ہیں؟" ان بڑے میاں نے کہا "نہیں شاہ مدار جی کا مزار ہے" ــــ وہ بولا "قبر ہے قبر؟" یہ بڑے میاں بولے "ہاں ہاں"۔

میں یہ ساری گفتگو سن رہا تھا اور دل کی آنکھیں خون رو رہی تھیں۔ ان مسلمانوں کی گرفتاری

شرک سے زیادہ اس بات پر کہ جو ہندو مسافر اس گفتگو کو غور سے سن رہے ہیں وہ بھلا کیا رائے قائم کریں گے اسلام کے متعلق۔ اور کیا فرق سمجھ سکیں گے اللہ کے مقدس دین اسلام اور اپنے دھرم میں؟

امانتِ توحید کے حامل اور اسلام کے محافظ سوچیں کہ ان حالات میں ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ پہلے جب سلسلۂ نبوت جاری تھا انھیں گمراہیوں کی اصلاح کے لیے پیغمبر آیا کرتے تھے اب نبوت کا دروازہ بند ہو گیا تو اس پیغمبرانہ کام کی ساری ذمہ داری امت محمدیہ پر ڈال دی گئی ہے۔ "کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" یقیناً قیامت میں ہم سے سوال ہو گا کہ خود مسلمان کہلانے والوں ہی میں جب یہ صریح شرک پھیل رہا تھا تو ان کی ہدایت و اصلاح کے لیے تم نے کیا کوشش کی؟ خوش نصیب ہیں وہ جو اس دن کے جواب کے لیے اس دنیا میں کچھ کر جائیں۔ اللّٰھم اجعلنا منھم۔

عتیق الرحمٰن سنبھلی

چند متفرقات ایک نگاہ میں

سب سے بڑا سانحہ

آنریبل گورنر یو۔ پی شری وی وی گری نے روٹری کلب (میرٹھ) کے ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ

"آخری جنگ عظیم کے بعد ایک سب سے بڑا سانحہ یہ ہوا کہ سچائی اور دیانت داری کا جذبہ ختم ہو گیا ہے ——— لوگوں میں ان اوصاف کو پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے ورنہ مجھے نہیں معلوم کہ ہندوستان کا حشر کیا ہو گا۔" (قومی آواز ۲۲ر جولائی ۵۹ء)

اے عشق مرحبا، وہ یہاں تک تو آگئے!

بات یہی ہے کہ سب کچھ کیے جائیے۔ پنج سالہ منصوبوں پر منصوبے بنائیے، اربوں روپیہ ان منصوبوں پر خرچ کیے جائیے۔ نئے نئے اور بڑے بڑے کارخانے کھولیے۔ کوآپریٹو کھیتی کی اسکیمیں دیجیے۔ "بل بنا، جاہ بنا" کے وظائف پڑھیے۔ جمہوریت کا راگ الاپئے۔ عوامی معیار زندگی کو بلند تر بنانے کے لیے زمین سے آسمان تک اُڑ دیے! لیکن اگر ہندوستان کے عوام و خواص میں سچائی اور دیانت داری کے اوصاف نہیں پیدا ہوتے تو ہر دُور اندیش اور حقیقت شناس ان "فیض کے اسباب" کے باوجود یہی کہنے پر مجبور ہو گا کہ

"نہیں معلوم ہندوستان کا حشر کیا ہو گا!"

کس قدر تشویش انگیز صورت حال ہے کہ ہندوستان کا معیار اخلاق روز بروز گرتا جا رہا ہے، مگر باتیں ہیں تو ہر دم بس "معیار زندگی" کو بلند کرنے کی! اخلاقی معیار کو بلند کرنے کی

ملک کے در و بست پر قابض ہونے والوں میں سے خال ہی خال کوئی آواز اٹھتی ہے، اور وہ بھی ایسی جیسے "نقار خانے میں طوطی کی صدا"

دوسری طرف یہ بھی بڑا سانحہ ہے کہ جن مشرقی ملکوں میں سچائی اور دیانت داری کا قابل رشک سرمایہ پایا جاتا ہے، وہاں اس سرمائے سے کوئی بڑا کام نہیں لیا جا رہا ہے، اور صرف روزمرہ کی محدود سی زندگی میں یہ سرمایہ کام آ رہا ہے۔ سرزمین پاک (حجاز) سے ہر سال حجاج کے ذریعہ کچھ خوش کن خبریں مل جاتی ہیں۔ امسال بھی نہایت معتبر حجاج سے یہ ایک واقعہ سننے میں آیا ہے، کہ ایک عرب تاجر کی دوکان سے دس لاکھ ریال کی چوری ہوئی۔ ملزم مین حجاز کی سرحد پر گرفتار کیا گیا۔ گرفتار کرنے والا صرف ایک کانسٹبل تھا۔ تیسرا ان دونوں کے درمیان کوئی نہ تھا، ملزم نے رشوت کی پیش کش کرنی شروع کی، اور آخر میں بات پورے کے پورے دس لاکھ پر پہنچ گئی۔ مگر اس عرب سپاہی کی دیانت کو یہ دس لاکھ کی مار سوت بھر بھی ادھر سے اُدھر نہ کر سکی۔ اور اس نے ملزم کو لے جا کر قاضی کے سامنے پیش کر دیا ——— یہ واقعہ اتنا مصدقہ ہے کہ ملزم چونکہ (ہماری بدقسمتی سے) ہندوستانی تھا اس لیے اس کی رپورٹ حکومت ہند کو بھی مل چکی ہے۔

اہل حجاز کی دیانت داری صرف پولس ہی تک محدود نہیں ہے کہ ڈسپلن کا نتیجہ سمجھ لیا جائے۔ وہاں باہمی، بلکہ آفاقیوں کے ساتھ بھی، اعتماد کی جو فضا ہر دیکھنے والے کو نظر آتی ہے اور ہم ہندوستان و پاکستان والوں کو تو خصوصاً محوِ حیرت کر دیتی ہے۔ وہ صرف اسی سچائی اور دیانت داری کا نتیجہ ہے جس کی بنا پر کسی کو ایک دوسرے کے متعلق دغدغہ نہیں ہوتا۔ مگر افسوس ہے کہ یہ عظیم و نایاب سرمایہ بھی ہے اور قومی دولت کے وسائل و ذخائر کی بھی کوئی انتہا سرزمین پاک میں نہیں۔ لیکن ان دو سرمایوں کے ملنے سے جو ترقیاتی کام مملکت میں ہو سکتے تھے اُن کے خانے میں اب تک صفر ہی صفر نظر آتا ہے۔

پہلی سالگرہ کا تحفہ

بغداد کی خبر ہے کہ

۔ اس ہفتہ یہاں مسلمان لڑکیوں نے پردہ ترک کر کے مردوں کی برابری کا اعلان

کر دیا ہے ——— عراق پانچ روز سے ۱۴ر جولائی کے انقلاب کی سالگرہ پر خوشیاں منا رہا ہے اس دوران لڑکیوں نے انقلاب کی خوشی میں بغیر کسی جھجک کے رقص کیا۔"

(قومی آواز ۲۰ر جولائی)

اس کے مقابلے میں ایک خبر یہ ہے کہ

"نیو یارک (امریکہ) میں ——— طلبا کی طرف سے دیے گئے ایک خیر مقدمی جلسے میں ڈاکٹر راد ھاکرشنن (نائب صدر جمہوریہ ہند) نے تین ہندوستانی لڑکیوں کو ناچنے اور گانے کی دعوت دی۔ ہندوستان کے مستقل مندوب مسٹر سی، ایس، جھا اور قونصل جنرل مسٹر گوپالا سین نے لڑکیوں کو بڑھاوا دیا۔ لیکن کسی لڑکی نے جراُت نہیں دکھلائی۔ اس کے بعد نائب صدر نے لڑکیوں کی ہمت بندھائی اور کہا کہ ناچنا گانا ہندوستان کی روایات کا جز ہے۔ آپ لوگوں کو اپنی میراث نہ چھوڑنا چاہیے۔ بڑی مشکل سے کچھ لڑکیاں گانے پر آمادہ ہوئیں۔ لیکن ناچنے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں ہوئی۔"

(ایضاً ۱۹ر جولائی)

کہیے اس پر کیا تبصرہ کیا جائے ——— ایک قوم کے یہاں ناچنے گانے کی کوئی جگہ نہیں، اور پردہ اس کی روایات کا عظیم جزو ہے۔ مگر وہاں انقلاب کی سالگرہ کی خوشی کا حق اُس وقت تک ادا نہیں ہوتا جب تک رقص نہ فرمایا جائے اور پردے کی روایات کو تار تار نہ کر دیا جائے۔ دوسری طرف ناچنا گانا ایک قوم کی عظیم میراث ہے، مگر اس کی لڑکیاں بلادِ رقص و سرود میں رہتے ہوئے اس روایت سے شرما رہی ہیں۔ اُن کے ملک کا نائب صدر فرمائش کرتا ہے، قونصل جنرل بڑھاوا دیتا ہے مگر وہ بصد شرم گانے سے آگے جانے کو تیار نہیں ہوتیں ——— یا مظہر العجائب!!

سچ ہے کہ اسلام کو اب ایک نئی قوم کی ضرورت ہے! ——— دیکھیے یہ سعادت کس کی طرف جاتی ہے؛ لیکن یہ ہونا بہر حال ہے۔ قرآن کا واشگاف اعلان ہے:

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (محمد۔ ع ۴)	اگر تم پھرو گے تو خدا (اپنے دین کے لیے) تم سے کسی اور قوم کو بدل دے گا اور پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔

اور کہیں کہیں کچھ ظاہری آثار بھی نظر آرہے ہیں ـــــ مگر یہ ہوگا بڑا حسرتناک واقعہ کہ اسلام کی گود میں پلے ہوئے الحاد کو گلے لگائیں، اور کوئی پروردہ کفر اٹھ کر اسلام کی آنکھ کا تارا بنے۔

وسیع نقطۂ نظر

یو، پی کے وزیر اعلیٰ شری سمپورنانند نے ریاست کی "سماجی فلاح تخمینہ کمیٹی" کی افتتاحی تقریر میں ناجائز بچوں کے مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ

> "ناجائز اولاد کا ایسا کوئی مسئلہ پرانے ہندو سماج میں نہیں تھا۔ اس لیے کہ قدیم سماج میں آٹھ قسم کی شادیاں تسلیم کی جاتی تھیں ـــــ قدیم ہندو سماج کے اس وسیع نقطۂ نظر کے نتیجے میں ہر بچہ جائز اولاد قرار دیا جاتا تھا، کیونکہ وہ اپنے والدین کی خطاؤں کے لیے مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔"

موصوف نے یہ بھی خیال ظاہر فرمایا کہ

> "سماجی نقطۂ نظر میں انقلاب لانا، سماجی فلاح کا اتنا ہی اہم جزو ہے جتنا کہ معذور اور بدنصیب اشخاص کی امداد کرنا۔"

(قومی آواز۔ ۳ جولائی)

جہاں تک بچے کے بے گناہ اور معصوم ہونے کا تعلق ہے، صحیح بات ہے۔ اور اس سماجی نقطہ نظر میں بے شک تبدیلی ہونا چاہیے جس کے تحت ناجائز بچوں کے ساتھ بھی خطاوار کا سا رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ مگر نقطۂ نظر کی یہ وسعت اگر مطلوب ہے کہ اس طرح کی ولادتوں کو سند جواز بھی دے دی جائے تو یہ نقطۂ نظر سماج کی بہبودی کا نہیں "خرابی بسیار" کا حامل ہوگا۔ ناجائز طور پر جو بچے وجود میں آجاتے ہیں اُن کی زندگی کا حل ضرور نکالنا چاہیے۔ اور سماجی نقطۂ نظر میں ایسی اصلاح کرنی چاہیے کہ ان بے گناہوں کی زندگی اجیرن نہ ہو۔ لیکن ایسا حل کہ جس سے ان بچوں کے ماں باپ کی خطاکاری بھی جائز ہو جائے کسی سماج کی طرف سے اس بات کا اعلان ہے کہ وہ ان خطاکاریوں کو روکنے سے قاصر ہے! ـــــ اسلام نے بھی اس طرح کے بچوں کو پوری انسانی عزت

کے ساتھ سماج میں جگہ دینے کی تلقین کی ہے۔ مگر اس میں یہ قوت تھی کہ وہ ناجائز تعلقات کو روک سکے، اس لیے اس نے بلا تامل ان چاروں قسم کی "شادیوں" کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھیں، اور جن کے خوبصورت نام کے ذریعہ قبل اسلام کا عرب سماج ناجائز تعلقات کے بارے میں اپنی بے بسی کو چھپانے کی کوشش کرتا تھا۔ اور صرف ایک طریقہ مقرر کیا۔ اسلام نے مؤثر عقائد و اعمال اور معاشرتی ضابطوں کا ایسا حصار انسان کے گرد کھینچا کہ اگر کسی سے بھولے بھٹکے یہ جرم سرزد ہو بھی گیا تو اس نے خود کو باصرار سزا دلوانے کا وہ رویہ اختیار کیا جو بجائے خود معاشرے میں زنا سے نفرت کا ایک عظیم نفسیاتی محرک اور ایسا خاموش تبلیغ کہلانے کا مستحق ہے، جس کے سامنے سیکڑوں تدبیریں اور تقریریں ہیچ ہوں۔

افسوس! تاریخ کا ایسا کھلا تجربہ سامنے ہوتے ہوئے بھی لوگ یہ سوچنا نہیں چاہتے کہ یہ بھی ہو سکتا ہے، وہ جو کچھ سوچ سکتے ہیں بس یہ کہ آج جو جنسی انارکی اور آوارگی ان کے اردگرد پھیلی ہوئی ہے کسی فلسفے کی رو سے اُسے جائز کر کے اپنے ذہن کو اس خنجال سے نکال لیں —— مگر اس میں ذمہ داری حال کے مسلمان معاشرہ کی بھی کم نہیں ہے۔ کاش اس چیز کو ایک گزشتہ تجربہ کہہ کر ماضی کی طرف اشارہ نہ کرنا پڑتا، بلکہ حال میں بچشم خود مشاہدے کی دعوت دی جا سکتی تو شاید آج کے انسان کو اپنے مسائل کی تلاش میں اس طرح بھٹکنا نہ پڑتا۔

تنگیٔ نظر!!

ایک طرف ہمارے وزیر اعلیٰ کی وسعت نظر کا یہ عالم ہے کہ وہ ناجائز بچوں کے ساتھ حسن سلوک ہی پر راضی نہیں بلکہ ناجائز ولادتوں کو بھی جائز تسلیم کرانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ دوسری طرف یہ تنگیٔ نظر کہ اُردو جو مادرِ ہند کی صدقہ طور پر جائز اولاد ہے اس کے دو حرف بھی ان کے اقتدار میں اس طرح دھکے کھاتے ہیں کہ سماج میں ناجائز بچے کیا وہ دھکے کھاتے ہوں گے۔

اس سے اشارہ اُس کشاکش کی طرف ہے جو یو، پی کے ایوان بالا کے اپوزیشن لیڈر اور ایوان کے سرکاری افسران کے درمیان، حال ہی میں بڑی شدت کے ساتھ اس مسئلے پر برپا ہی

ہے کہ کیا مخالف لیڈر (اپنے نام کا) اردو سائن بورڈ بھی اس کمرے پر لگا سکتا ہے جو اُسے کونسل ہاؤس میں سرکار کی طرف سے ملا ہوا ہے! اخبارات نے انکشاف کیا ہے کہ مخالف لیڈر نے یوپی لیجسلیٹو کونسل کے افسران سے اس کی خواہش کی کہ اُن کے سائن بورڈ پر ہندی اور انگریزی کے ساتھ ایک طرف اردو بھی لکھوا دی جائے۔ جس کی تعمیل نہ ہونے پر لیڈر مذکور نے اپنی طرف سے اردو سائن بورڈ تیار کرا کر آویزاں کر لیا۔ لیکن افسران مذکور نے اُسے دیکھتے ہی ہٹا دیا۔ اس پر ذمہ داروں سے رجوع کرنے پر مخالف لیڈر کو یہ جواب ملا کہ

"حکومت یو۔پی کا حکم ہے کہ سرکاری دفتروں اور سرکاری عمارتوں پر سوائے ہندی کے کسی اور زبان میں سائن بورڈ نہ لگایا جائے!"

اس کے بعد کشاکش باہم جاری رہی کہ مخالف لیڈر نے ایک تاریخ مقرر کر کے نوٹس دیا کہ اگر اس تاریخ تک اُن کی خواہش کی تعمیل نہ ہوئی تو وہ خود اپنی مرضی کا سائن بورڈ لگائیں گے، اور اس کو قائم رکھنے کی ذمہ داری لیں گے۔ تب کہیں جا کر ہمارے وسیع النظر وزیر اعلیٰ کی حکومت میں یہ "وسعتِ نظر" پیدا ہوئی ہے کہ اردو کا سائن بورڈ جو ہٹا لیا گیا تھا وہ لا کر مخالف لیڈر کے کمرے پر آویزاں کر دیا گیا۔

ہائے اردو! جو ناجائز اولاد سے بھی گئی گزری ہو گئی اور اس کے چار لفظ بھی اس وقت تک ناقابل برداشت ہیں جب تک کوئی سخت قسم کا والی وارث دھمکی سے نہ بات کرے۔

(الفرقان محرم ۱۳۸۹ھ)

(انتخاب)

تعدد ازدواج — یا جنسی انارکی!

" باہر سے زیادہ اندر سے کم " یہ عنوان ہے انگریزی معاصر ہندوستان ٹائمز کے ایک اداریہ کا، متحدہ اقوام کی طرف سے ڈیموگرافک سالنامہ بابت ۱۹۵۹ء حال ہی میں شائع کیا گیا ہو جس کے چند ابواب میں بچوں کی جائز اور ناجائز پیدائش سے بحث کی گئی ہو اور اعداد شمار کے ذریعہ ثابت کیا گیا ہو کہ دنیا سے شادی کی تقدیس ختم ہو رہی ہو اور بچے اندر سے کم اور باہر سے زیادہ پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ اعداد شمار بڑے ہی حیرتناک اور دہشت انگیز ہیں اور وہ بھی صرف ان قوموں کے لیے جن کے ہاں شادی بیاہ کی تقدیس موجود ہو اور نکاح کی رسم میں گھن نہیں لگا ہو۔ ورنہ وہ ممالک جو حلالی اور حرامی بچوں میں کوئی تمیز نہیں کرتے انھیں اس پر کوئی تشویش اور حیرانی نہیں۔

متحدہ اقوام کے سالنامہ میں بتایا گیا ہو کہ السلویڈور۔ ڈومینکن ری پبلک، ہنڈوراس گوئٹےمالا اور پناما میں حرامی بچوں کا تناسب ساٹھ فیصدی ہو۔ پناما میں تو چار میں تین بچے پادریوں کی مداخلت یا سول میرج جسٹری کے بغیر ہی پیدا ہو رہے ہیں یعنی ۷۵ فی صدی حرامی بچے۔ لاطینی امریکہ میں حرامی بچوں کی تعداد سب سے زیادہ ہو یہی حال ویسٹ انڈیز کا ہو، دنیا میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ شادی بیاہ کی تقدیس سے انحراف کیا گیا ہو۔ ہر قوم نے خواہ وہ کتنی ہی پس ماندہ ہو اس بات کو ضروری سمجھا ہے کہ چند قواعد و ضوابط کے تحت رشتہ داروں کے درمیان ازدواجی رشتے قائم ہوں اور انھیں اپنے اپنے رواج کے مطابق انجام دیا جائے، تاکہ خاندان اور سوسائٹی کو معلوم ہو کہ فلاں عورت فلاں مرد کے نکاح میں دے دی گئی ہو اور اس سے جو اولاد پیدا ہوئی ہو وہ قانون کی نظر میں جائز ہے۔ لیکن اگر ازدواجی رشتوں کا سلسلہ ختم ہو جائے تو معاشرہ کے لیے بے شمار مسائل پیدا ہو جائیں گے اور رشتے سے تقدس و احترام کا جو تصور پیدا ہوتا ہے وہ بالکل ختم ہو جائے گا۔

اس سلسلہ میں متحدہ اقوام کے سالنامے میں مسلم ممالک کا ذکر بھی کیا گیا ہو۔ یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ موجودہ ترقی یافتہ دنیا میں شادی بیاہ کے نقطۂ نظر سے مسلم ممالک کا رجحان کیا ہے اور ان میں ناجائز تعداد

کی تقدیس کس حد تک باقی ہے۔ اگر باقی ہے تو اس کے اسباب کیا ہیں، اور خود متحدہ اقوام نے کیا نتیجہ نکالا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ڈیموگرافک سالنامہ کے ایڈیٹروں نے جب مسلم ممالک اور غیر مسلم ممالک کا موازنہ کیا ہوگا تو وہ خود حیرت میں پڑ گئے ہوں گے۔ انھوں نے مسلم ممالک کے جو اعداد و شمار فراہم کیے ہیں ان میں متحدہ عرب جمہوریہ کو سرِ فہرست رکھا ہے اور دیگر مسلم ممالک کا اندازہ بھی اسی سے لگایا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ عرب ممالک میں متحدہ عرب جمہوریہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور تجدد پسند MODERNIST ہے۔ اگر وہاں کی سماج میں رشتۂ ازدواج کی تقدیس باقی ہے تو وہ مسلم ممالک جو مذہبی احکام کا زیادہ پاس اور لحاظ رکھتے ہیں اس رشتہ کو اور بھی زیادہ مقدس اور قابلِ احترام سمجھتے ہوں گے۔ متحدہ اقوام کے سالنامہ سے پتہ چلا کہ مسلم ممالک میں حرامی بچوں کی پیدائش کا تناسب ایک فی صدی سے بھی کم ہے۔!

لیکن ان اعداد و شمار سے ہماری تسلی نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ یہ پتہ نہ چلے کہ اس کمی کے اسباب کیا ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ مغربی تہذیب کو اپناتے ہوئے بھی اپنی "دقیانوسیت اور قدامت پرستی" پر قائم رہا؟ ایسا تو نہیں کہ حرامی بچوں کی پیدائش میں اسلام کی دور اندیشی نے کوئی روک لگائی ہو؟ اور ازدواجی رشتہ میں کوئی ایسا نکتہ رکھ دیا ہو جس نے ناجائز ولادت کی راہیں بڑی حد تک مسدود کر دی ہیں؟ اس کا جواب ہمیں متحدہ اقوام کے سالنامے سے لینا چاہیے۔ چنانچہ اس میں بتایا گیا ہے کہ چونکہ مسلم ممالک میں چند زوجیت POLYGAMY کا رواج ہے اس لیے وہاں ناجائز ولادتوں کا بازار گرم نہیں ہے اس چند زوجیت کے مسئلہ نے مسلم ممالک کو جنسی انارکی کے ایک بہت بڑے بحران سے بچا لیا ہے اور وہاں اس کی وجہ سے ناجائز بچوں کی شرح پیدائش کا تناسب نفی کے برابر رہ گیا ہے۔ اگر اسلام کی اس اجازت کو عملاً ترک کر دیا جائے تو چند سالوں میں وہ بھی پیدائش کے سلسلہ میں مغربی ممالک کی سطح پر آجائیں گے اور وہاں بھی ناجائز بچوں کا تناسب افسوسناک حد تک بڑھ جائے گا

جو لوگ چند زوجیت پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تہذیب کے اس دور میں یہ چیز دل کو نہیں لگتی، وہ غالباً اس بات سے خوش ہوں گے کہ یک زوجیت کے نتیجہ میں حرامی تہذیب خوب فروغ پا رہی ہے۔ اگر چند زوجیت کی بدولت ناجائز بچوں کی شرح پیدائش نفی کے برابر رہ جائے تو وہ بد تہذیبی ہے۔ لیکن اگر چند زوجیت پر قدغن لگانے کے بعد ناجائز بچوں کی فوج کھڑی نظر آئے تو یہ عین تہذیب ہے۔ (سہ روزہ دعوت۔ بحوالہ الجمعیۃ۔ دہلی)

(الفرقان ربیع الثانی ۱۳۸۸ھ)

چند کتابوں کا تعارف

نزول عیسیٰ علیہ السلام

از حضرت مولانا سید بدر عالم صاحب مؤلف "ترجمان السنۃ"
ناشر۔ حاجی مولوی غلام محمد نورگت صاحب مالک انور پریس صوفی باغ متصل اسٹیشن۔ سورت ۔ قیمت نامعلوم

مرزا صاحب قادیانی نے نزول عیسیٰ علیہ السلام ہی کی خبروں پر اپنی نبوت کا تخت بچھایا تھا، بایں طور کہ نزول کی جو خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے وہ تو قطعی ہے۔ مگر اس میں عیسیٰ بن مریم سے مراد مثیل عیسیٰ ہے خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول مراد نہیں ہے۔ اس دعوے کی قبولیت کے لیے مرزا صاحب کو اور بہت سے جتن کرنے پڑے مثلاً یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھائے نہیں گئے، تھے جیسا کہ سلف سے خلف تک اہل اسلام کا عقیدہ ہے بلکہ انھوں نے اسی زمین پر وفات پائی۔ اسی سلسلہ میں مرزا صاحب نے ایک داستان اختراع کی کہ حضرت مسیح علیہ السلام اپنے ملک سے ہجرت کر کے کشمیر پہونچے اور وہیں ان کی وفات ہوئی اور ان سب مخترعات کی مدد سے نزول عیسیٰ علیہ السلام کا راستہ بند کر کے اپنی نبوت کا راستہ ہموار کر لیا۔

حضرت مولانا بدر عالم صاحب نے ترجمان السنۃ جلد سوم میں ....
...... اس مسئلہ پر جمہور امت کے عقائد کے مطابق نہ صرف تشفی بخش بلکہ بے نظیر کلام کیا ہے اور جیسا کہ اس کتاب میں ان کا طریقہ ہے ایک مستقل رسالہ اس بحث پر رقم فرمایا ہے۔ اس مقالہ کو مولوی غلام محمد صاحب (سورت) نے علاحدہ کتاب کی شکل میں شائع کر دیا ہے جو اس وقت زیر تبصرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مصنف اور ناشر دونوں کو جزائے خیر دے کہ ایک نے اپنے قلم سے قادیانی علم کلام کے ایک بنیادی حصہ کا تار و پود بکھیر دیا ہے اور دوسرے نے اپنے مال سے اس کی وسیع تر اشاعت کا انتظام کر دیا۔ ہم اپنی سعادت سمجھتے ہیں کہ اس مقالہ کی اشاعت میں حصہ دار بنیں، اور اس کی آسان تر صورت یہی ہے کہ اس کی کچھ جھلکیاں

الفرقان کے صفحات میں پیش کر دیں تاکہ ناظرین کو اس کی قدر و قیمت کا پورا اندازہ ہو سکے۔ ہمارا حال یہ ہے مقالہ کی افتتاحیہ سطریں ہی پڑھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے مسئلہ اپنی آخری حد و ں تک صاف ہو گیا۔ آپ بھی یہی سطریں سب سے پہلے پڑھیے اور اندازہ کیجیے کہ چند ہی لفظوں میں مسئلہ کس حد تک پانی ہو گیا ہے۔

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات طیبہ میں ان کے آسمان پر تشریف لے جانے اور آسمان سے اترنے کی سرگذشت بے شک ایک عجیب و غریب واقعہ ہے لیکن اس پر غور کرنے سے پہلے یہ سوال ضرور سامنے رکھنا چاہیے کہ یہ مسئلہ کس دور اور کس شخصیت سے متعلق ہے کیونکہ روزمرہ کے معمولی سے معمولی واقعات میں بھی زمانہ اور شخصیتوں کے اختلاف سے ان کی تصدیق و تکذیب کرنے میں بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔"

غور کیجیے! کیا مسئلے کی ساری الجھن یہی نہیں ہے کہ ہم مسیحؑ کی شخصیت کو ایک عام انسانی شخصیت سمجھ کر اور اس کے نزول کے واقعہ کو اپنی اس دنیا کے ایک عام دور میں رکھ کر سوچنا شروع کرتے ہیں اور پھر اس کو اس دنیا کے ممکنات کے چوکھٹے میں فٹ کرنے سے عاجز آ کر انکار یا تاویل یا دامن بچا کر نکل جانے کی راہ پر پڑ جاتے ہیں۔ قلم چوم لیجیے مولانا کا، ایک ذرا سا سوالیہ اشارہ دے کر کس طرح مسئلہ کی ساری الجھن دور کر دی۔ مولانا نے پوری تفصیل سے اس اشارہ کی وضاحت کی ہے کہ مسیحؑ کی شخصیت میں عام انسانوں سے اور ان کے زمانۂ نزول میں ہماری اس دنیا کے عام زمانوں سے کیا فرق و اختلاف ہے مگر ہمیں یقین ہے کہ بہت سوں کے لیے صرف یہ اشارہ ہی کافی ہو گا، اور جن کے لیے صرف یہ اشارہ کافی نہ ہو گا ان کے لیے تفصیل کے یہ چند ٹکڑے ضرور ایک حد تک کافی ہو جائیں گے۔

نمبر (۱) "جب آپ ان دو سوالوں پر محققانہ نظر ڈالیں گے تو پوری وضاحت سے ثابت ہو گا کہ یہ واقعہ (واقعہ نزول مسیح) تخریب عالم یعنی قیامت کے واقعات کی ایک کڑی ہے۔ اور تخریب عالم کا ایک واقعہ بھی ایسا نہیں جو عالم کے تعمیری دور (یعنی تخلیق و تخریب کے درمیانی دور — ع) کے واقعات سے ملتا جلتا ہو۔" ص۶

(۲) "اس کے بعد جب آپ اس پر غور کریں گے کہ یہ پیش گوئی ہے کس شخصیت سے متعلق، وہ شخصیت کسی عام بشری سلسلہ کے تحت کوئی بشر ہے یا ان سے کچھ الگ؟ تو آپ کو یہی ثابت ہو گا کہ وہ صرف عام انسانوں سے ہی نہیں بلکہ انبیاء علیہم السلام کی جماعت میں بھی سب سے

ممتاز خلقت کا بشر ہے۔ جتنے انسان ہیں وہ سب مذکر و مؤنث کی دو صنفوں سے پیدا ہوئے ہیں مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام" الخ ص۴

(۳) "اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ایک انسان کا آسمانوں پر زندہ جانا اور زندہ رہنا اور آخر زمانہ میں پھر اسی جسم عنصری کے ساتھ اتر آنا نہ عام انسانوں کی سنت ہے اور نہ (دنیا کے ۔ع) عام واقعات کے موافق ہے لیکن اگر آپ یہ دو باتیں ملحوظ رکھیں کہ یہ مسئلہ تخریب عالم کا ایک مقدمہ ہے، اور یہ بھی اس شخصیت کے متعلق جس کے دیگر حالات زندگی بھی عالم کے عام دستور کے موافق نہیں رہا۔ تو پھر بہ نظر انصاف آپ کو اس میں کوئی تردد نہیں ہونا چاہیے" ص۱

اس سلسلۂ تفصیل میں ایک مقام کے یہ جملے کیسے آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔

"پس چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا مسئلہ بھی عالم کے درمیانی واقعات کا مسئلہ نہیں بلکہ تخریب عالم کے واقعات کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس لیے اپنی جگہ وہ بھی معقول ہے ظاہر ہے کہ جب تمام مُردوں کے زندہ ہو ہو کر ایک میدان میں جمع ہونے کا زمانہ قریب آ رہا ہو تو اس سے ذرا قبل صرف ایک زندہ انسان کا آسمانوں سے زمین پر آنا کونسی بڑی بات ہے بلکہ اس طویل گمشدگی کے بعد یہ جسمانی نزول مجموعہ عالم انسانی کی جسمانی نشاۃ ثانیہ کے لیے ایک بدیہی اور محکم برہان ہے۔ اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں ارشاد ہے" وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی ایک مجسم نشانی ہیں" ص۸

مرزا صاحب قادیانی نے نزول مسیح سے انکار کرنے کے لیے رفع مسیحؑ سے انکار کیا اور اس کی جگہ آپ کی موت کا دعویٰ کیا اور اس کے لیے وادی کشمیر میں ایک قبر تک گڑھ ڈالی۔ مولانا بغیر نام لیئے روئے سخن اس طرف کر کے فرماتے ہیں۔

"یہ بات کتنی عجیب ہے کہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام خود نبی اولوالعزم ہیں ان کی امت بھی تسلسل کے ساتھ کسی انقطاع کے بغیر اب تک چلی آ رہی ہے، پھر ان کی موت اور ان کی قبر کا صحیح صحیح حال آج تک ان سب پر کیسے مخفی رہ گیا[1]......... اس سے زیادہ حیرت اس پر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لا کر ان کے حق میں کبھی موت کا ایک حرف نہیں فرمایا۔ درآنحالیکہ یہ مسائل آپ کی آنکھوں کے سامنے چل رہے تھے ...... اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے

[1] خصوصاً جبکہ ان کی موجودہ امت کے ذوق جستجو نے سفینۂ نوح تک کے نشانات پا لیے اور فرعون کی لاش تک دستیاب کر لی۔

کہ قرآن کریم نے تردید الوہیت کے موقع پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معمولی سے معمولی حالات کا تذکرہ فرمایا۔ مثلاً ان کا کھانا کھانا: "کانا یاکلان الطعام" مگر ان کی الوہیت کے خلاف جو سب سے واضح ثبوت تھا یعنی یہ کہ وہ مر چکے ہیں اس کو ایک جگہ بھی عیسائیوں کے مقابلہ میں ذکر نہیں فرمایا۔" ص۱۹-۲۰

غرض مسئلہ پر جس جس پہلو سے بحث کی جاتی ہے تقریباً ہر ہی پہلو کے ضمن میں مولانا نے ایسے نکات و سوالات اُٹھا کر فکر و نظر کے سامنے کر دیے ہیں جو کسی غیر حقیقت پسندانہ بات کو دراندازی کا موقع نہیں دیتے گویا مسئلہ کے ہر موڑ پر ایک قندیل روشن ہے جو کسی مغالطہ کا چراغ نہیں جلنے دیتی۔ ہاں یہ بات جان لینے کی ہے کہ مسئلہ کے بعض پہلوؤں پر مولانا موصوف کی بحث اجمال اور اختصار پسندی کی وجہ سے ذرا اونچی اور عام ذہنوں کی گرفت سے باہر ہو گئی ہے۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ کسی کو کسی موقع پر عدم تشفی کا احساس ہو۔

ہم نہیں جانتے کہ ناشر کتاب اس کوچہ میں نو وارد ہیں یا اس کے آداب و رسوم سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں۔ اگر پہلی صورت ہے تب تو شکایت کی بات نہیں ورنہ ہم ان کے جذبۂ دینی کی قدر کے ساتھ اس کوتاہی کو قابل گرفت سمجھتے ہیں کہ کتاب میں مقدمہ و پیش لفظ کے نام سے چار سطریں تک نہیں حتیٰ کہ اتنا سا تعارف بھی نہیں کہ یہ مقالہ فلاں کتاب کا ایک حصّہ ہے حالانکہ متعدد جگہ "ترجمان السنۃ" کے دوسرے مباحث کے حوالوں کی موجودگی میں یہ ایک لازمی چیز تھی۔ ایک ناواقف ناظر پڑھے گا اور پریشان ہو گا کہ یہ (مثلاً) "معجزات کی بحث" کہاں ہے۔

ایک ایسے وقیع مقالہ کے ساتھ یہ سلوک انتہائی ناروا ہے اور اگر دہلی میں اس کی کتابت و طباعت "ندوۃ المصنفین" کے زیر اہتمام ہوئی ہے تب تو خصوصیت کے ساتھ یہ فروگذاشت ایک افسوسناک تساہل کا حکم رکھتی ہے۔ تصحیح کا بھی کوئی خاص اہتمام نہیں کیا گیا معلوم ہوتا ہے جو اغلاط ترجمان السنۃ میں رہ گئی تھیں وہ شاید اس میں بعینہٖ ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو ص۶ سطر ۱۰ و ۱۱۔ محوّلہ جملہ جس طرح "ترجمان السنۃ" میں مہمل چھپا ہے ٹھیک اسی طرح اس میں موجود ہے۔

آخر میں ہم حضرت مصنف مدظلہ کی خدمت میں گذارش کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اس پر نظر ثانی فرما کر عام اذہان کی رعایت سے کچھ تسہیل فرما دیں اور جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں بس ضرورت بعض مقامات پر کچھ تفصیل کی ہے۔ مثلاً بعض مقامات پر مصنف بعض قرآنی آیات و بیانات کی طرف اشارہ کر جاتے ہیں،

الفاظ ذکر نہیں کرتے اس سے بات کی وضاحت میں خلل پڑتا ہے۔ (الفرقان بابت رمضان ۱۳۸۳ھ)

کمرشل انٹرسٹ کی فقہی حیثیت

مرتبہ مولانا شاہ محمد جعفر صاحب۔ پتہ:۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ
صفحات ۱۳۴، سائز خورد، مجلد ۱/۸

"کمرشل انٹرسٹ" تجارتی سود کو کہتے ہیں، جو آجکل بینکنگ سسٹم کے ذریعہ رائج ہے۔ یہ کتاب اسی کے شرعی حکم پر چار مضامین کا مجموعہ ہے۔ پہلا مضمون سابق آڈیٹر جنرل پاکستان سید محمد یعقوب شاہ صاحب کا ہے، جس کی حیثیت دراصل ایک ایسے مفصل استفتاء کی ہے، جس میں مستفتی نے اپنے رجحان کو بھی مدلل انداز میں پیش کر دیا ہے۔ یہ مضمون اس مجموعہ کا سب سے اچھا اور اس قابل ہے کہ اہل علم دین سنجیدگی کے ساتھ اس سے اعتناء فرمائیں —— باقی تین میں سے دو مضمون مرتب کتاب مولانا جعفر صاحب کے ہیں اور ایک عطاء اللہ صاحب پالوی کا۔

مولانا جعفر صاحب کا ایک مضمون "سود خواری کی قسمیں" پر ہے، جس کا مذکورہ بالا استفتاء سے تعلق نہیں، اس مضمون پر ہمارا تبصرہ یہ ہے کہ یہ "کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی" کا مصداق ہے۔ ان کا دوسرا مضمون اور پالوی صاحب کا مضمون سید یعقوب شاہ صاحب کے استفتاء کے جواب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں ہر دو صاحبان نے کمرشل انٹرسٹ کو جائز ٹھہرایا ہے۔

ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ دونوں مضامین بالکل تلاعب بالدین کا منظر پیش کرتے ہیں۔ مولانا جعفر شاہ صاحب کمرشل انٹرسٹ پر فقہی حیثیت سے کلام فرماتے ہیں لیکن طے شدہ اصول فقہ کے ساتھ انھوں نے کھلا ہوا مذاق کیا ہے، اس طرح کوئی مسئلہ علمی سطح پر منقح ہونے سے تو رہا۔ البتہ بے پڑھے لکھوں کی گمراہی کا ذریعہ ایسے مضامین ضرور بن سکتے ہیں —— عطاء اللہ صاحب پالوی کو ہم نہیں جانتے کہ کتنے پڑھے لکھے ہیں۔ البتہ انکی بعض تصانیف دیکھنے کا ہمیں اتفاق ہوا ہے، جن میں ہم نے ایسے ایسے لطائف بھی پائے ہیں —— اعاذنا اللہ منہا —— کہ قرآن فہمی میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی تشریح کے پابند تھوڑے ہی ہیں۔ آپ تو قرآن میں تدبر کی دعوت دیتے تھے، تو اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ بعد والے فہم مراد میں آپ سے آگے جا سکتے تھے، اور بعض قرآنی حقائق ایسے ہو سکتے تھے کہ بعد والے لوگ ان کو زیادہ صحیح طور پر سمجھ سکتے تھے[1]۔ جن لوگوں کا انداز فکر یہ ہو وہ امت کو جس کھڈ میں لیجا کر نہ گرا دیں تھوڑا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے زیر تبصرہ مضمون میں مستفتی کے: اتی مسئلہ

---

[1] اصل الفاظ تو اس وقت ہمارے سامنے نہیں ہیں، لیکن مفہوم یہی ہے، کتاب کا نام غالباً "شمع فروزاں" ہے۔

کے بارہ میں فرماتے ہیں کہ ان کی جو انٹرسٹ کی رقم ہے۔

"وہ ملکی مروجہ قانون کے مطابق ہے۔ اور ملکی قانون کا احترام اور اس پر عملدرآمد خود از روئے قرآن ازبس ضروری ہے۔" (یعنی انٹرسٹ کی اس رقم کو لینے میں تامل روا نہیں۔)

یہ "ازبس ضروری" ہونے کا حکم قرآن کی کس آیت سے معلوم ہوتا ہے؟

فرماتے ہیں:۔

"قرآن نے مسلمانوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ

وہ لوگ کہ جب انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہوگا۔ تو وہ نظام صلوٰۃ قائم کریں گے زکوٰۃ وصول کریں گے۔ لوگوں کو معروفات پر عمل کرنے کا حکم دیں گے اور وہ تمام امور کا فیصلہ اللہ کے حکم کے مطابق کریں گے۔

یعنی اگر اسلامی نظام قائم ہوگا تو اُس وقت قوانین ہی ایسے بنائے جائیں گے جس میں معروفات پر عملدرآمد اور منکرات سے بچنے کی گنجائش ہو........ اور جب تک یہ نہ ہو مروجہ قانون کا احترام اور ان ہی پر عملدرآمد کرنا ہوگا۔"

یہ ہے رسول اکرمؐ کے قرآنی تشریحات پر بعد والوں کی ترقی کا نمونہ! کتنے ناخدا ترس ہیں وہ لوگ جو ان بالفضولی نکات کو اشاعت دیتے اور اپنی سفارشات کے ساتھ لوگوں کے غور و فکر کے لیے پیش کرتے ہیں! ـــــ قرآن تو اس وصف پر مسلمانوں کی ستائش کر رہا ہے کہ اگر انہیں اقتدار حاصل ہوگا تو وہ منکرات کو مٹائیں گے۔ اور یہاں اُس سے یہ نکتہ پیدا کیا جا رہا ہے کہ جب تک اقتدار حاصل نہ ہوگا وہ پورے "احترام" اور "اطمینان" کے ساتھ مروجہ منکرات پر عمل پیرا رہیں گے۔

غلطیہائے مضامیں مت پوچھ ‏ ‏ ‏ لوگ نالے کو "رسا" باندھتے ہیں

صاحب مضمون یا صاحب کتاب کو یہ شکایت نہ ہو کہ ہم بس ایک ٹکڑے کو لے اڑے اور اصل بحث پر کوئی نقد نہ کیا۔ دراصل ایک تو ہماری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ جب مستفتی ایک ایسا شخص ہے جو قرآن کے ساتھ حدیث اور پھر نصوص قرآن و حدیث پر متفرع اصول فقہ کو بھی قابل اعتنا سمجھتا ہے تو پالوی صاحب کو،

جو آیاتِ قرآنی کے سوا کسی چیز کو کچھ نہیں گردانتے، اس دخل در معقولات کی ضرورت کیا تھی؟ ـــ اور کیوں کوئی اس بحث میں اُن کی اس بے محل مداخلت کو لائق اعتنا گردانے؟

ثانیاً۔ ہمارے نزدیک یہ نقطۂ نظر قطعاً لغو ہے کہ ارشادات رسول کو چھوڑو، ائمہ مجتہدین اور علمائے اصول وفقہ کی کاوشوں کو چھوڑو اور ہر مسئلہ کا فیصلہ قرآن کے الفاظ سے کرلو۔ اس اصولی اختلاف کی موجودگی میں کیا سوال ہے کہ پالوی صاحب کی گفتگو سے اعتنا کیا جائے۔

ثالثاً۔ پالوی صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

"ربوا کے سلسلے میں انسانی راؤں پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ ہمارے یہاں صرف الفاظ سے کھیلا جاتا ہے۔"

اُدھر دوسری ہی سانس میں، "خود قرآن میں غور کرنے" کی دعوت دے کر اپنی رائے سے قرآنی الفاظ کے مقاصد و مطالب بیان کرنا شروع کر دیے جاتے ہیں ـــ جب انسانی رائیں ناقابل اعتبار ہیں تو خود پالوی صاحب کی رائے کیونکر لائق اعتنا ہوگی؟ اُس میں کون ایسے سُرخاب کے پر لگے ہیں۔؟

تحدیدِ نسل

مرتبہ مولانا محمد جعفر صاحب، ناشر:۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور
صفحات ۵، قیمت ۱۲ ار آنے۔

یہ کتاب بھی "کمرشل انٹرسٹ" کی طرح چند مضامین کا مجموعہ ہے۔ جن میں ضبط ولادت (برتھ کنٹرول) کو حالات کا شدید تقاضا قرار دیتے ہوئے، اس کے شرعی حکم سے بحث کی گئی ہے۔ اور اسے جائز بتایا گیا ہے۔ مضامین میں اس درجہ تکرار اور یکسانیت ہے کہ مرتب کے "پیش لفظ" میں اس پر دو ڈھائی صفحے کی تو جیہی تقریر پڑھنے کے بعد بھی طبیعت اُکتائے بغیر نہیں رہتی۔ اور کوئی معقولیت اِن مضامین کی یکجائی اشاعت میں، سمجھ میں نہیں آتی۔

ضبط ولادت کا موضوع آج کوئی نیا نہیں ہے۔ اس کی حمایت میں لکھنے والے عام طور پر جو لکھتے آئے ہیں وہی باتیں ان مضامین میں بھی دہرائی گئی ہیں۔ البتہ مولانا جعفر شاہ صاحب نے ایک نکتہ حدیث غالباً بالکل نیا نکالا ہے۔ ایک حدیث میں اس صاحب اولاد بیوہ کو جنت میں قرب نبوی کی بشارت دی گئی ہے جو اپنے یتیم بچوں کی خاطر باوجود اعلیٰ مواقع کے نفس کشی کرے اور عقد ثانی سے باز رہے۔ مولانا جعفر شاہ صاحب اس سے یہ نکتہ برآمد فرماتے ہیں کہ:۔

"آج اگر زندوں کو زندہ رکھنے کی خاطر مزید روحوں کو آنے سے روک دیا جائے تو

یہ کوئی گناہ نہیں، بلکہ قربِ نبویؐ کا ذریعہ ہے"

کیوں ؟

(اس لیے کہ عقد ثانی سے باز رہنا مزید اولاد کو وجود میں آنے سے روکتا ہی تو ہے۔ ص ۹۰-۹۱)

کہئے، ہم اس پر کیا تبصرہ کریں ؟

حدیث میں بشارت صرف اس بات پر ہے کہ ایک عورت اپنے یتامیٰ کی پرورش کی خاطر لذت نفس کے بھرپور مواقع قربان کرتی ہے۔ (جیسا کہ حدیث کے الفاظ "حبس نفس" سے صاف ظاہر ہے) لیکن شاہ صاحب کی نظر اس صاف اور سامنے کی بات پر رکنے کے بجائے اس گہرائی میں پہنچتی ہے کہ عقد ثانی سے باز رہنے میں مزید اولاد پیدا کرنے سے باز رہنا بھی تو لازم آتا ہے، سو دراصل بشارت اسی پر ہے کہ موجودہ اولاد کی خاطر مزید اولاد کو وجود میں آنے سے روکا جائے۔ بس آج ضبط ولادت کا عمل نہ صرف جائز بلکہ قربِ نبویؐ کا ذریعہ ہوا۔

کیا کہنے ہیں ان نکتہ سنجیوں کے !

گر ہمیں مکتب و ہمیں مُلّا ست کارِ طفلاں تمام خواہد شد

اسی کو کہتے ہیں "بارش میں آفتاب کی کرن لا کے لگانا"

اگر اتنی بات بھی شاہ صاحب فرماتے کہ اس حدیث سے ضبط ولادت کا جواز نکلتا ہے۔ تب بھی یہ کچھ کم سرمایۂ حیرانی نہ تھا۔ چہ جائیکہ اس پر قُربِ نبوی کی بشارت کا اعلان فرمانا ——— جبکہ اسی مضمون میں، بلکہ کتاب کے ہر مضمون میں، وہ روایتیں بھی درج ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ضبط ولادت (بذریعہ عزل) کی اجازت چاہنے والوں کو حضورؐ نے ہمیشہ ایسا جواب دیا جس سے اس رجحان کی حوصلہ شکنی ہی مفہوم ہوتی ہے۔ کہیں ایسا نہیں ہوا کہ حضورؐ فرماتے، یہ کام خوب کرو یہ تو جنت میں میرے قرب کا ذریعہ ہے۔

خیر، یہ تو شاہ صاحب کے ایک لطیف نکتہ کے طفیل گفتگو طویل ہوگئی[۱] ورنہ کہنے کی بات صرف یہ تھی کہ کتاب اپنے مدعا میں کامیاب نہیں ہے ——— اور اس کے چند وجوہ ہیں۔ (باقی صفحہ ۱۷۰ پر)

---

[۱] اس لطیفہ کے علاوہ شاہ صاحب کی یہ عبارت بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے کہ حضورؐ کے اس ارشاد پر کہ "آنے والی روح تو آکر ہی رہے گی" ایک موقع پر بالواسطہ یہ اعتراض بھی جڑا ہے کہ "وہ تو ناجائز روح بھی آکر رہتی ہے تو کیا اُسے بھی آنے دینا چاہیئے ؟" (ص ۵)

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کی گرانقدر تالیفات

اسلام کیا ہے؟

نہایت آسان زبان اور بیحد دل نشین اور پراثر انداز میں اسلامی تعلیمات کا جامع اور مکمل خلاصہ ـــ دین کی ضروری واقفیت حاصل کرنے ہی کے لیے نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا ولی بننے کے لیے بھی اس کا مطالعہ اور اس پر عمل ان شاء اللہ کافی ہے۔ مولانا موصوف کی سب سے زیادہ مقبول کتاب قیمت مجلد صرف ۴/۵۰

دین و شریعت

اس کتاب میں توحید، آخرت، رسالت، نماز، روزہ، زکوٰۃ و حج اخلاق و معاملات، دعوت و جہاد، سیاست و حکومت اور احسان و تصوف کے مباحث پر ایسی محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے کہ دل و دماغ اور عقل و وجدان ایمان و اطمینان سے معمور ہو جاتے ہیں۔ قیمت ۵/-

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟

قرآنی ہدایات اور اس کی اہم تعلیمات کا ایک جامع مرقع۔ جس میں سیکڑوں عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت موثر اور روح پرور تشریح کے ساتھ جمع کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد ۷/- انگریزی ۱۵/-

تذکرہ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ

امام ربانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات ـــ آپ کی عرفانی اور ارشادی خصوصیات اور اس عظیم تجدیدی کارنامہ کی تفصیل جس کے نتیجہ میں اکبر اور اس کے حواریوں کا چلایا ہوا دین الٰہی تاریخی قصہ ہو کر رہ گیا اور سلطنت مغلیہ کا رخ الحاد سے صحیح اسلام کی طرف مڑ گیا۔ قیمت مجلد ۱۲/-

معارف الحدیث

(احادیث نبوی کا ایک نیا اور جامع انتخاب اردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ)

مولانا نے احادیث کے مستند مجموعوں سے گہرے غور و فکر کے بعد وہ حدیثیں منتخب کیں جن کا انسانوں کی فکری و اعتقادی اور عملی زندگی سے خاص تعلق ہے اور جن میں امت کے لیے ہدایت کا خاص سامان ہے۔ اس سلسلے کی ۶ جلدیں بحمد اللہ مکمل ہو چکی ہیں۔ جلد اول ۹/۵۰ جلد دوم ۱۱/۵۰ جلد سوم ۱۳/۵۰ جلد چہارم ۱۰/- جلد پنجم ۱۲/۵۰ جلد ششم ۱۳/۵۰ (مجلد کے لیے جلد کی قیمت علاحدہ سے لگائی جاتی ہے۔)

انگریزی ایڈیشن۔ معارف الحدیث کی پہلی جلد اور نصف دوم کا انگریزی ترجمہ ایک جلد میں شائع ہو گیا ہے۔ قیمت ۳۲/-

تصوف کیا ہے؟

یہ کتاب اپنے اختصار کے باوجود انصاف، تحقیق اور مباحث کے سلجھاؤ کے لحاظ سے اپنے موضوع میں بہت ممتاز سمجھی گئی ہے۔ قیمت صرف ۵/-

منتخب تقریریں

مولانا موصوف کی ایمان افروز اصلاحی و تبلیغی تقاریر کا مجموعہ جو اپنے اندر افادیت اور جامعیت کے ہزاروں پہلوؤں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ قیمت مجلد صرف ۶/-

ملفوظات حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ

جن لوگوں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو نہیں پایا وہ ان کے ملفوظات کے مطالعہ سے آپ کو پوری طرح سے جان اور سمجھ سکتے ہیں۔ دین کی حقیقت سمجھنے اور اس کے لیے دل میں سوز و تڑپ پیدا کرنے میں یہ کتاب بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہے۔

ــــ قیمت ۳/۵۰

کلمہ طیبہ کی حقیقت

اسلام کا بنیادی کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ایک عہد و میثاق ہے جو اپنے اندر وسیع معنی رکھتا ہے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس عہد کی حقیقت کو سمجھے اور اس کو زندگی بھر نباہنے کی کوشش کرے۔ قیمت صرف ۷۵ ر۰

برکات رمضان

ماہ رمضان اور اس کے خاص اعمال و وظائف تراویح و اعتکاف وغیرہ کے فضائل و برکات اور ان کی روحانی تاثیرات کا نہایت موثر اور شوق انگیز بیان ——— قیمت صرف ۱/۵۰

آپ حج کیسے کریں؟

حج کے موضوع پر اردو میں بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن یہ کتاب ——— اپنی اس خصوصیت میں اب بھی منفرد و ممتاز ہے کہ یہ بہت آسان اور دلنشین انداز میں حج کا طریقہ اور احکام و مناسک بھی بتاتی ہے اور وہ ذوق و شوق بھی پیدا کرتی ہے جو حج و زیارت کی جان ہے۔ قیمت ۴/=

آسان حج

یہ آسان زبان میں "آپ حج کیسے کریں؟" کا خلاصہ ہے۔ قیمت ۱/۲۵

فیصلہ کن مناظرہ ——— اکابر علماء دیوبند پر مولوی احمد رضا خاں بریلوی کے سنگین تکفیری الزامات کا تحقیقی جواب ——— کتاب کے مقدمہ میں بریلی کے اس تکفیری فتنہ کی حقیقت اور اس کی تاریخ بیان کی گئی ہے نیز یہ بتایا گیا ہے کہ اب اہل حق کو اس سے کیسے نمٹنا چاہیے۔ قیمت ۲/۵۰

نماز کی حقیقت

اسلام میں ایمان کے بعد نماز ہی کا درجہ ہے۔ مگر کیا ہم نماز کو ایسی ہی اہمیت کے ساتھ ادا بھی کرتے ہیں؟ کیوں اس لیے کہ ہم عام طور پر اس کی پوری حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ بیحد مفید کتاب ہے۔ قیمت ۲/

انسانیت زندہ ہے

یہ کتابچہ مولانا موصوف کے چار مضامین کا مجموعہ ہے جن میں سے ہر مضمون میں مولانا نے اپنی زندگی کا کوئی خاص سبق آموز اور پراثر واقعہ بیان کیا ہے جذبہ انسانیت و اتحاد کی افزائش کے لیے بے حد مفید کتاب ہے قیمت صرف ۴۰/-

قادیانی کیوں مسلمان نہیں؟
اور مسئلہ حیات مسیح و نزول مسیح

مولانا موصوف کے چار مضامین کا مجموعہ ——— رد قادیانیت پر دلائل کی کتاب ——— اس میں قرآن و حدیث اور عقل کی روشنی میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بالکل عام فہم پیرائے میں لکھا گیا ہے جو عوام و خواص کے لیے یکساں تسلی بخش ہے۔ قیمت مجلد صرف ۳/-

قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ

قادیانیت پر مولانا کا یہ مختصر رسالہ دریا بہ کوزہ کا مصداق ہے۔ قیمت ۸۰/-

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور معاندین اہل بدعت کے الزامات

حضرت شاہ شہیدؒ جیسی مقدس ہستی پر جس نے اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے خون کا کفن پہنا۔ معاندین اہل بدعت نے خوف خدا سے بے نیاز ہو کر جو مکروہ الزامات لگائے ہیں۔ ان کا تسلی بخش اور مدلل جواب۔ قیمت ۲/۵۰

کتب خانہ الفرقان کی چند دیگر مایہ ناز مطبوعات

تجلیاتِ ربانی (حصہ اول)

(تلخیص و ترجمہ از مولانا نسیم احمد فریدی) پورے اسلامی ادب میں حضرت مجدد الف ثانی کے مکاتیب کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے ان مکاتیب میں احسان و تصوف، تعمیر باطن، حق و باطل میں امتیاز، جہاد فی سبیل اللہ اور اقامت دین و ترویج شریعت کی ترغیب اور امت مسلمہ کی عام رہنمائی کا وہ سامان موجود ہے جس کی صدائے بازگشت نے گذشتہ تین چار صدیوں میں امت مرحومہ کے حق میں میر کارواں کا کام انجام دیا ہے۔ ساتھ ہی مولانا موصوف نے حاشیہ پر مکتوب علیہم کے حالات بھی کسی قدر تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ جس نے اس کتاب کی اہمیت اور عظمت کو دوبالا کر دیا ہے۔ قیمت ۱۳/۵۰

مکتوباتِ خواجہ محمد معصومؒ

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے صاحبزادہ اور خلیفہ حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ کے مکتوبات کا ذخیرہ حضرت خواجہ کے ارشاد و ہدایت کے بڑے کارنامہ کا آئینہ دار ہے۔ آپ کے گرانقدر مکتوبات کو اردو زبان میں مولانا نسیم احمد فریدی امروہی نے تلخیص کے ساتھ منتقل کیا ہے۔ قیمت ۷/=

وصایا شیخ شہاب الدین سہروردیؒ

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے وصایا جو اپنے اندر بڑی کشش اور دلآویزی رکھتے ہیں، اب تک مخطوطہ کی شکل میں عربی زبان میں تھے مولانا نسیم احمد فریدی امروہی نے ان کا انتخاب کر کے اپنے شاہکار رواں انداز میں اردو زبان میں منتقل کیا ہے۔ قیمت ۱/۲۵

حضرت مولانا الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت

تالیف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تبلیغی تحریک کے بانی حضرت مولانا الیاسؒ کی مکمل سوانح حیات، مولانا کی شخصیت، ان کے اخلاق و عادات، ان کے امتیازی اوصاف، ان کے خواص افکار و نظریات ان کی دینی دعوت کا پس منظر، اس کا ارتقاء اور اس کے اصول و طریق کار کو سمجھنے کے لیے یہ واحد کتاب ہے۔ قیمت ۴/۵۰

صحبتے با اہل دل

مرتبہ مولانا ابوالحسن علی ندوی حکیم نکتہ داں عارف باللہ حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی بھوپالی (عرف پیر نیخے میاں) کی عرفانی و اصلاحی مجالس کا مرقع اور ان ارشادات و ملفوظات کا مجموعہ جن میں عصر حاضر کے ذوق اور مزاج کے مطابق زندگیوں کی اصلاح کا پیغام، ایمان و یقین، کیفیت روحانی پیدا کرنے کا راز، سامان اور حکایت و تمثیلات کے پیرائے میں تصوف اسلامی کا عطر آگیا ہے۔ قیمت ۸/=

تذکرہ حضرت صوفی عبدالربؒ

حضرت صوفی سید عبدالرب علیہ الرحمہ کے حالات زندگی۔ انکی اللہ پر ایمان کامل اور زندگی با مقصد اور اصلاحی شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے نیز اس تذکرہ میں ان کی چند منتخب اصلاحی نظمیں بھی شامل کی گئی ہیں۔ قیمت ۲/=

بریلوی فتنہ کا نیا روپ

از مولانا محمد عارف سنبھلی۔ ارشد القادری صاحب کی تصنیف "زلزلہ" کا تنقیدی جائزہ اور تحقیقی جواب (جدید ایڈیشن قیمتی اضافہ کے ساتھ زیر کتابت ہے) قیمت ۶/=

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی اہم اردو تصنیفات

تاریخ دعوت وعزیمت

عالم اسلام کی اصلاحی وتجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ

نامور مصلحین اور ممتاز اصحاب "دعوت وعزیمت" کا مفصل

تعارف، تین جلدوں میں مکمل حصہ اول ۴۹۶ صفحات ۱۲/-

حصہ دوم ۴۰۴ صفحات ۱۲/- حصہ سوم ۴۱۲ صفحات ۱۰/-

انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر

وہ شہرۂ آفاق اور انقلاب انگیز کتاب جس کے اردو،

انگریزی، ترکی، فارسی وغیرہ تراجم کے علاوہ صرف

عربی میں ۱۲ ایڈیشن عرب ممالک میں شائع ہو چکے ہیں

صفحات ۴۵۰، قیمت مجلد ۱۲/-

پرانے چراغ

مولانا موصوف کی تازہ ترین تصنیف

معاصر شخصیتوں، بزرگوں، استادوں، اور

دوستوں سے متعلق تعارفی مضامین، مشاہدات وواقعات

اور تأثرات ومعلومات کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ جس میں

مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی،

مولانا مدنی، مولانا تھانوی، شاہ وصی اللہ رحمہم اللہ

جیسے بلند پایہ حضرات کے علاوہ مصنف کے کچھ

اساتذہ، رفیقوں اور چند گمنام ہستیوں کا تذکرہ

آگیا ہے۔ صفحات ۴۶۲

قیمت مجلد مع گرد پوش ۱۲/-

ارکان اربعہ

اسلامی عبادات کتاب وسنت کی روشنی میں اور مسیحیت

ویہودیت نیز ہندو مذہب کے ساتھ اس کا تقابلی مطالعہ

تقریباً ۴۰۰ صفحات سائز $\frac{20\times 26}{8}$ قیمت صرف ۱۲/-

جب ایمان کی بہار آئی

مجاہد کبیر حضرت سید احمد شہیدؒ (م ۱۲۴۶ھ)

اور آپ کے عالی ہمت رفقاء کے ایمان افروز واقعات

جن کی کوششوں سے ہندوستان میں ایمان کی بہار

آئی اور اسلام کی ابتدائی صدیوں کی یاد تازہ ہوگئی۔

۲۰۲ صفحات۔ قیمت مجلد ۱۲/-

دریائے کابل سے یرموک تک

مغربی ایشیا کے مسلم اور عرب ممالک افغانستان

ایران، لبنان، شام، عراق اور شرق اردن کے

ایک معلوماتی دورہ کی مفصل روداد وڈائری۔ جس میں

ان ممالک کی دینی، فکری اور اقتصادی صورت حال کی

سچی تصویر اور وہاں کی دینی واصلاحی تحریکات، متضاد

عوامل واثرات اور ذہنی وروحانی کشمکش کا دیانت دارانہ

جائزہ لیا گیا ہے۔ صفحات ۳۰۴۔ خوبصورت گرد پوش

سے مزین بہترین کتابت وطباعت۔ قیمت ۱۴/-

ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں

یعنی موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کا مذہبی، تمدنی اور معاشرتی تعارف، ان کے عقائد، عبادات، مذہبی تہواروں، رسم ورواج، معاداتِ و اخلاق اور ان کی ملی خصوصیات کا بیان۔ ایک غیر جانبدارانہ جائزہ۔ ایک واقعی تصویر۔ قیمت =/۵

معرکۂ ایمان و مادیت

سورۂ کہف کا مطالعہ تفسیر قرآن، حدیث، قدیم تاریخ، جدید معلومات اور حالاتِ حاضرہ کی روشنی میں۔ اور اصحاب کہف کا عجیب سبق آموز قصہ۔ قیمت =/۵

مولانا کے دیگر خطبات و مقالات

پیامِ انسانیت	۲/۵۰
ایک بہتر ہندوستانی سماج	۱/-
عصرِ جدید کا چیلنج اور اس کا جواب	-/۸۵
خواص — ملت میں ان کا مقام	-/۵۰
محبت فاتح عالم	-/۲۵
طالبانِ علم نبوت	-/۶۰
مسلمانانِ ہند سے صاف صاف باتیں	-/۷۵
سیرت محمدی دعاؤں کے آئینہ میں	۱/-
اسلام مکمل دین مستقل تہذیب	-/۸۵
لسانی و تہذیبی جاہلیت کا المیہ	-/۷۵
دو انسانی چہرے قرآنی مرقع میں	-/۷۵
نشانِ راہ	-/۷۵
نیا طوفان اور اس کا مقابلہ	۱/-
مردِ خدا کا یقین	-/۵۰
محسنِ عالم	-/۵۰

تذکرہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ

جو تیرھویں صدی ہجری کے مشہور و مقبول بزرگ اور عالم دین اور یگانۂ زمانہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حیات، کمالات، ارشادات و ملفوظات۔ قیمت =/۴

پا جا سراغ زندگی

مولانا مدظلہ کی چند اہم تقاریر کا مجموعہ جن میں درد و سوز اور ایمان و یقین کی کیفیات کے ساتھ ساتھ موصوف کے طویل علم و مطالعہ اور تجربہ و مشاہدہ کا نچوڑ کتاب کی سطر سطر سے نمایاں ہے۔ قیمت =/۶

مولانا کی تصانیف انگریزی میں

فور پلرس آف اسلام		۳۰/-
ٹیلس آف دی پرافٹ		۵/-
سیوئرس آف اسلامک اسپرٹ	اول	۲۰/-
" " " "	دوم	۳۵/-
سیرت سید احمد شہید		۴۰/-
اسلام اینڈ دی ورلڈ		۱۸/-
ویسٹرن سویلائزیشن		۲۲/-
فیتھ ورسز میٹیریلزم		۱۰/-
اسپیکنگ پلینلی ٹو دی ویسٹ		۵/-
دی ورلڈ آف اسلام ٹوڈے		-/۶۰
ریلیجن اینڈ سویلائزیشن		۳/-
قادیانزم — اے کریٹیکل اسٹڈی		۱/-
اسلام اینڈ احمدزم		۲/-
گلوری آف اقبال		۱۸/-
دی مسلمان		۱۰/-

متن تفاسیر قرآن اور علوم قرآنی پر منتخب کتابیں

کتاب	قیمت
تفسیر ماجدی اول دوم	۳۵/-
تفسیر ابن کثیر مکمل مجلد	۱۳۰/-
تفسیر حقانی مکمل	۱۱۰/-
تفسیر بیان القرآن مکمل چرمی	۱۶۰/-
تفسیر موضح القرآن مکمل	۴۰/-
تفسیر حل القرآن مجلد	۱۰۰/-
" " غیر مجلد	۹۰/-
تفسیر مظہری	۲۱۵/-
تفسیر الفوز الکبیر اردو	۲/۵۰
لغات القرآن غیر مجلد مکمل	۵۷/۵۰
قصص القرآن " "	۲۶/۲۵
ارض القرآن مکمل	۱۷/-
قاموس القرآن مجلد	۱۵/-
قرآن اور تعمیر سیرت	۷/۵۰

کتاب	قیمت
قرآن اور تصوف	۵/-
فہم قرآن	۸/۷۵
قرآن عظیم اور جبریہ تعلیم	۱/-
رہنمائے قرآن	۱/۲۵
وحی الٰہی	۵/-
بشریت انبیاء	۲/۵۰
اعلام القرآن	۲/۵۰
فضائل قرآن	۱/-
قصص و مسائل	۲/-
تعلیم القرآن	۲/۷۵
جمع و تدوین قرآن	۳/-
اعجاز القرآن	۱/۷۵
قرآن کا تعارف	۲/۷۵
قرآن کی باتیں	۲/-

تراجم احادیث اور متعلقات حدیث

کتاب	قیمت
ایضاح البخاری ۱ تا ۱۳	۳۹/-
مسلم شریف مترجم	۱۰۰/-
تقریر بخاری	۱۰/-
انوار الباری شرح بخاری	۱۱۵/-
خصائل نبوی شرح شمائل ترمذی اردو	۱۵/-
ترمذی شریف مکمل اردو	۲۵/-

کتاب	قیمت
انتخاب صحاح ستہ	۸/-
ترجمان السنہ مکمل غیر مجلد	۷۲/۵۰
کتابت حدیث	۲/-
نصرۃ الحدیث	۳/-
مآثر و معارف	۱۱/۵۰
معارف الحدیث مکمل مجلد	۸۲/۵۰
مفسرین عظام اور ان کے علمی کارنامے	۱۰/-

سیرت نبوی صحابۂ کرام اور مشائخ پر بہترین کتب

کتاب	قیمت
سیرت النبی مکمل	۱۳۳/-
رحمۃ للعالمین	۳۶/-
پیغمبر عالم	۱۰/-
رسول اللہ	۱/۸۰
اصح السیر	۲۴/-
خطبات مدراس	۶/۲۵
رحمت عالم	۳/۲۵
اسوۂ حسنہ	۳/۷۵
رسول اکرم کی سیاسی زندگی	۱۲/-
ہمارے حضور	۲/-
پہلی تقریر سیرت	۳/-
دوسری تقریر سیرت	۳/۷۵
نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب	۲/۵۰
" " کلاں	۶/۷۵
سیرت خاتم الانبیاء	۲/-
سیرت خیر العباد	۱۲/-
خلفائے راشدین	۱۱/۹۰
سیرت عمر بن عبد العزیز	۴/۲۵
سیرت النعمان	۵/-
امام رازی	۱۲/۵۰
مہاجرین اول	۱۲/۵۰
" دوم	۱۱/-
سیر انصار اول	۱۲/۵۰
" دوم	۷/۸۰
المامون	۷/۸۰
ولی کامل	۷/-
الغزالی	۷/۸۰
سوانح مولانا یوسف کاندھلوی	۱۵/-

کتاب	قیمت
الفاروق	۱۵/۷۵
مشکل کشا	۲/۵۰
فاطمہ کا چاند	۳/۲۵
اسوۂ صحابیات	۳/-
رسول اللہ کی صاحبزادیاں	۳/-
امت مسلمہ کی مائیں	۲/۵۰
سیر الصحابیات	۳/۷۵
سیر الصحابہ ششم	۹/۴۰
" " ہفتم	۹/۷۰
حیات الصحابہ مکمل مجلد چرمی	۴۴/-
چار ستارے	۴/-
اسوۂ صحابہ اول	۹/۸۰
" " دوم	۹/۴۰
صحابہ کی انقلابی جماعت	۲/-
تاجدار مدینہ کی صاحبزادیاں	۱/۲۰
تابعین	۱۴/-
اہل کتاب صحابہ و تابعین	۳/۷۵
سو بڑے آدمی	۴/۲۵
حیات وحید الزماں	۵/-
حیات سلیمان	۲۷/۵۰
حیات شبلی	۲۶/۵۰
علمائے حق اور ان کی داستانیں	۴/-
غدر کے چند علماء	۲/۵۰
علمائے ہند کا شاندار ماضی مکمل	۳۴/-
صدر یار جنگ	۱۲/-
خوان خلیل	۳/۵۰
سیرت طیبہ	۶/-
ازواج ثلاثہ	۱۱/۵۰

تاریخ کے موضوع پر مستند و شاہکار کتابیں

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
تاریخ اسلام شاہ معین الدین	۵۲/-	تاریخ گجرات	۱۲/۵۰
تاریخ اسلام - اکبر شاہ خاں	۴۰/-	اسلام اور عربی تمدن	۱۳/۷۵
تاریخ ملت کامل ۱۱ حصے	۶۴/۵۰	اسلام کا سیاسی نظام	۹/۳۰
۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ	۶/۲۵	ہندوستان اسلامی عہد میں	۱۲/-
تاریخ ادبیات ایران غیر مجلد	۳/۷۵	عہد مغلیہ مسلمان اور ہندو	۱۰/۶۰
تاریخ ہند پر نئی روشنی	۳/۷۵	مختصر تاریخ ہند	۶/۲۵
تاریخ الفخری	۳/۷۵	ہماری بادشاہی	۶/۲۵
تاریخی مقالات	۶/۷۵	ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک	۱۶/۲۵
تاریخ دولت عثمانیہ مکمل ۲ حصے	۳۰/-		
تاریخ اندلس اول	۱۲/-	ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں	۹/۷۵
تاریخ فقہ اسلامی اول	۱۶/۳۰	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے	۳/۲۵
یادوں کی دنیا	۱۰/۲۵		

اکابر و مشائخ کے تذکرے، مکتوبات، ملفوظات اور مقالات

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
تذکرہ مجدد الف ثانیؒ	۱۲/-	مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط	۵/-
تذکرہ مولانا فضل الرحمٰن	۴/-		
تذکرہ شاہ علم اللہ	۵/-	مکاتیب شبلی	۱۹/۷۵
تذکرۃ الخلیل	۱۳/۵۰	صحبتے با اولیاء	۷/۵۰
تذکرۃ الرشید	۲۳/۵۰	صحبتے با اہل دل	۸/-
تذکرۃ المحدثین	۱۲/۷۵	مواعظ حسنہ	۸/-
تذکرہ شیخ الہند	۶/-	ملفوظات مولانا الیاسؒ	۳/۵۰
تذکرہ مخدوم صابر کلیریؒ	۳/-	ملفوظات شیخ الاسلام	۴/۵۰
شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات	۱۰/-	مقالات شبلی اول تا ہشتم	۴۳/۷۵
		مقالات امینی	۱۵/-
مکاتیب احمد سعید	۳/-	خطبات شبلی	۴/۷۰
اکابر کے خطوط	۸/-	ارشاد الملوک معہ اکمال الشیم	۱۰/-
ارشاد السالکین	۲/۵۰		
مکتوبات تصوف اول مجلد	۴/-	خطبات ماثورہ	۲/-
〃 دوم ۴/- سوم	۳/-	مقالات احسان	۱۵/۷۵

فقہ و فتاویٰ اور مسئلہ مسائل پر اہم کتابیں

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
رکعات تراویح	۲/-	مسئلہ سود	۳/-
رکعات تراویح جدید	۴/-	مسئلہ ختم نبوت	۳/۲۵
فتاویٰ رشیدیہ کامل	۱۲/-	مسئلہ تعدد ازدواج	-/۶۰
فتاویٰ رحیمیہ اول	۱۷/-	بہشتی ثمر مکمل سٹ	۶/-
〃 〃 دوم	۲۰/-	فتاویٰ دارالعلوم دیوبند	۹۸/-
〃 〃 سوم	۲۰/-	فتاویٰ عالمگیری ۲۲ قسط	۸۸/-
علم الفقہ مکمل مجلد	۴۱/-	نور الہدایہ ترجمہ ہدایہ فی قسط	۴/-
امداد الفتاویٰ	۳۰/-	تاریخ علم فقہ	۲/۵۰
آلات جدیدہ کے شرعی احکام	۲/۷۵	اصلاح الرسوم	۲/-

رد بدعت و قادیانیت پر بہترین کتابیں

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
رد بدعت	۲/-	چالیس بدعتیں	-/۶۰
آئینہ بدعت	۱/۳۰	تحریک وہابیت پر ایک نظر	-/۷۵
بدعت کی باتیں	۵/-		
بریلی فتنہ کا نیا روپ	۶/-	قادیانی مسلمان کیوں نہیں	۳/-
فیصلہ کن مناظرہ	۳/۵۰	تحفۂ قادیان	۲/۵۰
شاہ اسمٰعیل شہیدؒ	۲/۵۰	قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ	-/۸۰
وہابی کی پہچان	-/۳۰		
براہین قاسمیہ	۶/-	تحقیق لاثانی	۶/۵۰
تقویۃ الایمان	۱۲/-	عشرۂ کاملہ	۶/-

حج بیت اللہ اور نماز سے متعلق کتابیں

کتاب	قیمت
آپ حج کیسے کریں	۲/-
آسان حج	۱/۲۵
فضائل حج	۵/۵۰
رفیق حج	۳/-
معلم الحجاج	۱۰/-
تحفۃ الوداع	۱/۷۵
حج کا مسنون طریقہ	۲/۵۰
حج کی باتیں	۳/-
تجلیات کعبہ	۵/-
تجلیات مدینہ	۲/۵۰
سفر حجاز	۵/-
اعیان الحجاج	۵/۵۰
سب سے پہلا سفر نامہ حج	۳/-
حج و مقامات حج	۵/-

نماز

کتاب	قیمت
کتاب الصلوٰۃ مجلد	۲/-
نماز کی حقیقت	۱/۷۵
فضائل نماز	۱/۷۵
میری نماز	۲/۵۰
نماز مترجم	-/۴۰
نماز کی باتیں	۲/-
آئینہ نماز	۲/۲۵
آسان نماز	۱/۷۵
عورتوں کی نماز	۱/-
نماز کیا ہے؟	-/۲۰

تبلیغی کتابیں

کتاب	قیمت
تبلیغی نصاب اول سادہ	۱۳/۵۰
" " چرمی	۱۶/۵۰
تبلیغ دین	۴/۵۰
تبلیغی جماعت پر اعتراضات کا جواب	۵/-
تبلیغی تقریریں	۱/۲۵
تبلیغ کیا ہے؟	۳/۵۰
تبلیغی سات نمبر	۲/-
چھ باتیں	۱/۲۵
تبلیغی تحریک کے بنیادی اصول	۳/۵۰
مفتاح التبلیغ	۴/-
تبلیغی سرگرمیاں عہد سلف میں	۱/۵۰

کچھ ادبی کتابیں

کتاب	قیمت
شعر العجم مکمل	۴۳/۲۵
شعر الہند مکمل	۲۹/-
شعلۂ رقصاں	۴/۵۰
غزل انسائیکلوپیڈیا	۲۵/-
فن شاعری	۳/-
فریب تمدن	۱۲/-
گل رعنا	۱۶/۲۵
اقبال کامل	۱۲/۵۰
مکاتیب شبلی مکمل	۱۴/۷۵

فضائل و حقوق

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
فضائل اسلام	۱/۲۵	فضائل درود	۲/۲۵
فضائل قرآن	۱/۵۰	فضائل استغفار	-/۵۰
فضائل نماز	۱/۵۰	فضائل اذان و اقامت	-/۶۰
فضائل رمضان	۱/-	میاں بیوی کے حقوق	-/۷۵
فضائل حج	۴/۵۰	حقوق الزوجین	۳/۲۵
فضائل صدقات	۱۲/-	والدین کے حقوق	۱/۲۵
فضائل ذکر	۳/۲۵	حقوق البیت	۱/۲۵
فضائل تبلیغ	-/۶۰	حقوق الاسلام	-/۵۰

دین کی تعلیم دینے نیز اردو سکھانے کے لیے بہترین کتابیں

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
اچھا قاعدہ	-/۴۰	اچھی باتیں اول	-/۶۰
اللہ کے رسولؐ	-/۸۵	" " دوم	۱/-
حضرت ابوبکرؓ	-/۸۵	" " سوم	-/۸۵
حضرت عمرؓ	-/۸۵	" " چہارم	۱/-
حضرت عثمانؓ	-/۸۵	" " پنجم	۱/-
حضرت علیؓ	-/۸۵	" " ششم	۱/۲۵
ہمارا ایمان	-/۷۵	حضرت خدیجہؓ	۱/-
اچھے قصے	۱/۵۰	حضرت سودہؓ	-/۵۰
آسان فقہ	-/۷۵	حضرت عائشہؓ	۲/۷۵

دارالعلوم ندوۃ العلماء کا جدید عربی نصاب

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
قصص النبیین مکمل	۶/۵	تمرین الصرف	۲/۲۵
القراءۃ الراشدہ مکمل	۹/۷۵	تمرین النحو	۲/۵۰
منثورات	۶/-	الادب العربی	۶/-
مختارات مکمل	۱۳/-	النبوۃ والانبیاء	۱۵/-
معلم الانشاء مکمل	۱۳/-	علم التعریف	۳/-

ہمارا پتہ: کتب خانہ الفرقان ۳۱- نیا گاؤں مغربی - لکھنؤ

قوم ترقی کی راہ پر

بجلی کی پیداوار میں کئی گنا اضافہ

1974ء میں ہمارے ملک میں بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت ایک کروڑ 90 لاکھ کلوواٹ تک پہنچ گئی۔ 1947ء میں یہ 13 لاکھ کلوواٹ تھی۔ آج 1.5 لاکھ دیہات میں بجلی کی سہولتیں میسر ہیں۔ کھیتوں میں 24 لاکھ 40 ہزار پمپ سیٹ چالو ہیں۔ اس سال بجلی کی پیداواری صلاحیت میں مزید 26 لاکھ کلوواٹ کا اضافہ ہوگا۔

مضبوط ارادہ اور کڑی محنت ہمارے ساتھی ہیں

davp 75/449

Regd. No. LW/NP-62

Monthly AL-FURQAN 31, Naya Gaon West Lucknow (U.P.)

VOL. 44 NO. 4,5,6 SPECIAL ISSUE April, May, June 76

Cover Printed at—Shining Press, Naya Gaon, Lucknow-1

الفرقان

لکھنؤ

مدیر

محمد منظور نعمانی

ممالک غیر سے سالانہ چندہ
محصول ڈاک میں زبردست اضافہ کے بعد
اب نئی شرح اس طرح ہوگی
بحری ڈاک سے ۳ پونڈ
ہوائی ڈاک سے ۴ پونڈ

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۱۵/-
پاکستان سے ۲۵/-
بنگلہ دیش سے ۱۶/-
قیمت فی کاپی ۱/۵۰

جلد (۴۴) بابت ماہ جولائی ۱۹۷۶ء مطابق رجب المرجب ۱۳۹۶ھ شمارہ (۷)

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۵ تاریخ تک آجائے ورنہ اگلا پرچہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانا چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

مولوی محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

قرآن مجید پر جس شخص کا ایمان ہے اس کو اس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ ابلیس اور شیطان کوئی محض فرضی یا خیالی اور وہمی چیز نہیں ہے بلکہ ایک واقعی اور حقیقی وجود ہے اور بنی آدم کو گمراہ کرنا اس کا اور اس کی ذریت کا خاص مشن ہے اور وہ آدم علیہ السلام کی تخلیق کے وقت ہی سے پوری سرگرمی کے ساتھ اپنے کام میں لگا ہوا ہے ——— اللہ کے پیغمبر جب کبھی ہدایت کا پیام لے کر اس دنیا میں آئے تو اس نے کوشش کی کہ لوگ ان کی بات نہ مانیں، ہدایت کو قبول نہ کریں اور شرک ہی پر جمے رہیں (وکذٰلک جعلنا لکل نبیٍّ عدوًّا شیاطین الانس والجن۔ الآیۃ) اور جب اللہ کی توفیق سے کچھ لوگ ایمان لے آئے تو اس نے کوشش کی کہ کسی طرح ان کو پھر گمراہ کر دے۔ یہود ونصاریٰ اور دوسری بگڑی ہوئی امتوں کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

پھر جب اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول فخر بنی آدم سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو اولاً شیطان نے کوشش کی کہ کوئی آپ کی بات نہ مانے اور کوئی ایمان نہ لائے، مکہ کے اشرار کو اس نے آپ کے خلاف کھڑا کر دیا، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے ذریعہ ایمان اور نور توحید کا پھیلنا مقدر ہو چکا تھا، اگرچہ اس راستہ میں آپ کو بڑی زحمتیں پیش آئیں اور شیطان کی ذریت اور اس کی امت کی طرف سے آپ کو بڑی اذیتیں اور تکلیفیں پہونچیں (ما اوذی نبی اللہ احد مثل ما اوذیت) لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں پورے جزیرۃ العرب میں اور اس کے بعد دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی آپ کا لایا ہوا دینِ حق پھیل گیا۔ اور بندگان

خدا کی خاصی بڑی تعداد نے آپؐ کی دعوت و ہدایت پر کفر و شرک چھوڑ کے ایمان و توحید کو اپنا لیا۔ شیطان کے لیے اپنی ہزاروں یا لاکھوں برس کی عمر میں یہ سب سے بڑا حادثہ تھا۔ وہ اپنی کوششوں میں اتنا ناکام و نامراد کبھی نہیں ہوا تھا، جتنا کہ خاتم النبیین سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب و حواریین کے مقابلہ میں ہوا۔ اس کے بعد سے اس نے اپنی کوششوں کا خاص نشانہ امت محمدیہ ہی کو بنا لیا، اور طرح طرح کے اختلافات اور اعتقادی فتنے برپا کرتا رہا قرن اول کے بعد سے جتنے بھی فتنے امت میں اٹھے یقیناً ان سب کے برپا کرنے میں شیطان اور اس کی ذریت ہی کا نظر نہ آنے والا ہاتھ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع بھی فرما دیا تھا کہ شیطان آپ کی امت کو ایمان و توحید اور صلاح و تقویٰ کے راستہ سے ہٹا کر الحاد و شرک اور فسق و فجور کے اندھیرے راستہ پر ڈالنے کی بھرپور کوشش کرے گا اور آپ کی امت کے کچھ لوگ اگلی امتوں کی طرح اس کے جال میں پھنس جائیں گے ــــ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو اس خطرہ سے خبردار بھی کر دیا تھا، تاکہ آپ کے امتی ہمیشہ چوکنے رہیں۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم اور حدیث کی قریباً سب ہی کتابوں میں یہ حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "لتتبعن سنن من کان قبلکم شبراً بشبر و ذراعاً بذراع الحدیث" ــــ جس کا مطلب یہ تھا کہ میری امت کے کچھ لوگ اگلی گمراہ امتوں کی بالکل قدم بہ قدم پیروی کریں گے۔ یعنی جو گمراہیاں اور بداعمالیاں یہود و نصاریٰ وغیرہ گمراہ امتوں نے اپنائیں۔ میری امت کے بھی کچھ لوگ ان کو ضرور اپنائیں گے۔

آپ کا یہ ارشاد صرف ایک پیشین گوئی نہیں بلکہ امتیوں کے لیے دردمندانہ آگاہی بھی تھی تاکہ وہ ہوشیار رہیں اور شیطان کے جال میں نہ پھنسیں ــــ لیکن جو ہونا تھا ہو کر رہا، امت میں فتنوں اور اعتقادی و عملی گمراہیوں کا سلسلہ قرن اول کے آخری دور ہی میں شروع ہو گیا۔ اور دنیا میں اسلام کی روشنی پھیلنے کے ساتھ ساتھ شیطانی کوششوں کا دائرہ بھی وسیع ہوتا گیا۔ جہاں اسلام اور توحید کے داعی پہنچے وہاں شیطان بھی اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ پہنچا۔

جیسا کہ معلوم ہے ہمارے اس ملک ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت زیادہ تر صوفیائے کرام کے ذریعہ ہوئی، یہ سب اللہ کے بڑے مخلص بندے اور توحید کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

یہاں کے جن لوگوں اور جن طبقوں نے اُن کی دعوت اور ان کی خدا پرستانہ و پاکبازانہ زندگی سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا۔ شیطان نے اُن کے بارہ میں اندازہ کر لیا کہ وہ ان کو اسلام سے برگشتہ کرنے اور کھلے ارتداد پر آمادہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے گا، تو اس نے ان میں گمراہی پھیلانے کے لیے وہ حربہ استعمال کیا جس کا وہ عیسیٰ علیہ السلام کے امتیوں اور دوسرے بعض طبقوں کو گمراہ کرنے میں کامیاب تجربہ کر چکا تھا۔ اُس نے اُن کے دلوں میں ڈالا کہ یہ بزرگان دین خدا کے لاڈلے ہیں، خدا نے اُن کو بہت سے اختیارات سپرد کر دیے ہیں اور یہ خود حاجت روا اور مشکل کشا ہیں، لہٰذا انہی سے اپنی حاجتیں اور مرادیں مانگو، مصیبتوں اور پریشانیوں میں ان کے نام کا وظیفہ پڑھو، "حاجتی" بن کر اُن کے مزاروں پر جاؤ، اُن کی قبروں پر سجدے کرو، نذریں منتیں مانو، اُن کے نام کے مرغے بکرے قربان کرو، چادر گاگر اور پھول مالا چڑھاؤ، یہ تمہاری بگڑی بنا دیں گے اور ناؤ پار لگا دیں گے ـــــ جن لوگوں کی دینی تعلیم و تربیت نہ ہو سکی تھی اور اسلامی توحید کو انھوں نے پوری طرح نہیں سمجھا تھا، انھوں نے اس کو بزرگوں کے ساتھ عقیدت و محبت کا تقاضا سمجھا اور اُس بُت پرستی کا اچھا بدل بھی اُن کو مل گیا جس کے وہ اور اُن کے باپ دادے ہمیشہ سے عادی رہے تھے۔

یہ ہے اجمالی تاریخ ہندوستان میں قبر پرستی اور اولیاء پرستی کے آغاز و رواج کی، فی الحقیقت یہ سب شیطان ہی کا کھیل تھا، اُس نے شروع ہی میں چیلنج کر دیا تھا" وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ (میں آدم کی اولاد کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔)

جب سے اس گمراہی کا آغاز ہوا اُسی وقت سے امت کے علماء و مصلحین نے اس کے خلاف قلمی اور لسانی جہاد کیا اور امت محمدیہ کو ان گمراہیوں سے بچانے کی کوششیں کیں۔ ہمارے ملک میں جن اکابر علماء امت اور ہادیان ملت نے اللہ کی توفیق سے ان مشرکانہ خیالات و اعمال اور اس سلسلہ کی رسوم و بدعات سے مسلمانوں کو بچانے میں نیابت نبوت کا حق ادا کیا ان میں تین حضرات کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ سب سے پہلے امام ربانی حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی (متوفی ۱۰۳۴ھ) دوسرے شاہ ولی اللہ دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ)

تیسرے اُن کے پوتے۔ شاہ اسمٰعیل شہید فی سبیل اللہ (۱۲۴۶ھ)

امام ربانی کے مکتوبات کے دفتروں میں ایسے بہت سے مکاتیب ہیں جن میں اسلامی توحید کی تشریح کی گئی ہے اور شرک کی جن انواع و اقسام میں مسلمان مبتلا تھے یا مبتلا ہونے کا امکان اور اندیشہ تھا اُن کے بارہ میں تنبیہ فرمائی گئی ہے۔ لیکن دفتر سوم کے مکتوب ۴۱ میں شرک کی اُن صورتوں پر خاص طور سے تفصیلی کلام فرمایا گیا ہے جن میں اُس وقت (یعنی اب سے چار پانچ سو برس پہلے) مسلمان مرد اور ان سے زیادہ مسلمان عورتیں مبتلا تھیں ——— جیسا کہ عرض کیا گیا حضرت مجددؒ کا یہ کلام بہت مفصل اور طویل ہے اس لیے یہاں صرف حوالہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے تجدیدی دور کے قریباً ایک صدی کے بعد حضرت شاہ ولی اللہؒ کا اصلاحی و تجدیدی دور ہے۔ ان کی کتابوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے زمانہ میں بھی جاہل مسلمانوں میں شرک کی وبا عام تھی، اس کو دیکھ کر ان کا دل تڑپتا تھا۔ اپنی مشہور بے نظیر تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" میں حقیقت شرک کے بیان میں شرک کی بعض خاص شکلیں بیان فرمانے کے بعد تحریر فرماتے ہیں

وھذا مرض جمھور الیھود والنصاریٰ	اور شرک کی یہ وہ بیماری ہے جس میں یہود و
والمشرکین و بعض الغلاۃ من	نصاریٰ اور مشرکین بالعموم اور ہمارے اس
منافقی دین محمد صلی اللہ علیہ	زمانہ میں مسلمانوں میں سے بعض غالی منافقین
وسلم یومنا ھذا[1]	مبتلا ہیں۔

اور "الفوز الکبیر" میں اپنے زمانہ کے جاہل و گمراہ مسلمانوں کا یہ حال تحریر فرماتے ہیں ——— کہ

بقبور و آستانہا مے روند و انواعِ	وہ قبروں اور آستانوں درگاہوں پر جاتے
شرک بعمل مے آرند[2]	ہیں اور طرح طرح کے شرک کرتے ہیں۔

اور یہی شاہ ولی اللہؒ اپنے کشکول "تفہیمات الٰہیہ" میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے حوالہ سے وہ حدیث نقل فرمانے کے بعد جو ہم نے ابھی اوپر درج کی ہے (جس کا حاصل یہ ہے کہ میری امت میں بھی وہ سب اعتقادی اور عملی گمراہیاں آئیں گی جو اگلی گمراہ امتوں یہود و نصاریٰ وغیرہ میں آئیں) تحریر فرماتے ہیں

صدق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	یہ جو فرمایا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۵۲　[2] الفوز الکبیر ص ۱

فقد رأينا رجالاً من ضعفاء المسلمين يتخذون الصلحاء ارباباً من دون الله و يجعلون قبورهم مساجد كما كان اليهود والنصارى يفعلون ذالك[1]

ظہور ہوگیا، ہم نے اپنی آنکھوں سے مسلمان کہلانے والوں میں ایسے لوگ دیکھے ہیں جنھوں نے خدا کو چھوڑ کے اس کے نیک بندوں (بزرگان دین) کو اپنا رب (خدا) قرار دے لیا ہے اور ان کی قبروں کو یہود و نصاریٰ کی طرح اپنی سجدہ گاہ بنا لیا ہے۔

اور اسی "تفہیمات" میں ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں

ومن اعظم الامراض فی زماننا هذا اعباد تهم لشيوخهم احياءً او لقبورهم اموتاً، والجهلة يقلدون بكفرة الهند فى فعالهم[2]

۔۔۔ ہمارے اس زمانہ کا سب سے بڑا مرض اور روگ یہ ہے کہ جاہل لوگ اپنے زندہ پیروں کی عبادت کرتے ہیں اور مرنے کے بعد ان کی قبروں کو پوجتے ہیں اور یہ جاہل مسلمان اپنے ان اعمال و افعال میں ہندوستان کے کافروں مشرکوں کی پیروی اور نقل کرتے ہیں۔

اور اسی کتاب میں ایک تیسری جگہ مجددانہ جلال کے ساتھ فرماتے ہیں

كل من ذهب الى بلدة اجمير او الى قبر سالار مسعود او ما ضاهاها لاجل حاجة يطلبها فانه اثم اثماً اكبر من القتل والزنا، ليس مثله الا مثل من كان يعبد المصنوعات او مثل من كان يعبد اللات والعزى[3]

جو کوئی شہر اجمیر (خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار پر) یا (بہرائچ) سالار مسعود غازیؒ کی قبر پر یا اس کے مثل کسی اور مزار یا درگاہ پر اپنی کوئی حاجت طلب کرنے کے لیے (اور ان سے اپنی مراد مانگنے کے لیے) گیا تو اس نے اتنا بڑا گناہ کیا جو خون ناحق اور زنا سے بھی زیادہ بڑا اور سنگین ہے اس آدمی کا حال بالکل وہ ہے جو ہاتھوں کے بنائے ہوئے اور تراشے ہوئے معبودوں اور لات و عزیٰ (وغیرہ بتوں) کی پرستش کرنے والے مشرکین کا ہے۔

---

[1] تفہیمات الٰہیہ ص ۱۳۵ ج ۲ [2] ایضاً ص ۶۳ ج ۱ [3] ایضاً ص ۴۵ ج ۲

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے اس پرجلال ارشاد سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اُن کے زمانہ کے جاہل مسلمانوں میں قبر پرستی اور اولیاء اللہ کے مزارات پر جا کے حاجت طلبی کا شرک اس درجہ کو پہنچ گیا تھا کہ شاہ صاحب جیسے حکیم، حلیم مصلح کی روح تڑپ اٹھی اور ان کے قلب کا جلال اور غصہ اس طرح اُن کی زبانِ قلم پر آگیا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کا وصال ۱۱۷۶ھ میں ہوا، اس کے قریباً ۴۰۔۵۰ سال کے بعد اُن کے پوتے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی اصلاحی جدوجہد کا دور شروع ہوتا ہے، انھوں نے بھی ہوش سنبھالا تو وہی منظر دیکھا جس نے اُن کے دادا کی روح کو تڑپایا تھا یا اُس سے بھی زیادہ خراب۔ انھوں نے عوام کی اصلاح کے لیے ایک طرف مواعظ کا سلسلہ شروع کیا جن کا خاص موضوع توحید و سنت کی طرف دعوت دینا ہوتا تھا، اور دوسری طرف ٹھیٹ عوامی زبان میں ایک مستقل کتاب "تقویۃ الایمان" تصنیف فرمائی۔ جس میں قبر پرستی وغیرہ شرک کی اُن سب شکلوں اور قسموں پر جو شیطان نے جاہل مسلمانوں میں رائج کر رکھی تھیں اپنے دادا شاہ ولی اللہ والے جلالی انداز میں (بلکہ یہ کہنا غالباً زیادہ صحیح ہوگا کہ اپنے جدِ اعلیٰ فاروق اعظمؓ کے فاروقی انداز میں) کلام کیا ــــ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ اُس کے کتنے بندے شیطان کے پنجوں سے رہا ہوکر اور شرک کے اندھیروں سے نکل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقۂ ایمان میں اور توحید کے اجالے میں آئے۔ یہ بات شیطان اور اس کی ذریت کے لیے جتنی ناگوار ہونی چاہیے تھی اتنی ہی ناگوار ہوئی، اُس نے قبر پرستی وغیرہ مشرکانہ کاروبار کے حامیوں کو سجھایا کہ "تقویۃ الایمان" کے مصنف پر بے تحاشا حملہ کرو، عوام میں پروپیگنڈہ کرو کہ انھوں نے اپنی اس کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیاء کرام کی شان میں سخت گستاخیاں کی ہیں، اور اس پروپیگنڈے سے آسمان سر پر اٹھا لو، تاکہ توحید و شرک کا اصل مسئلہ تو پیچھے چلا جائے، اور گستاخی اور توہین کی بحث چل پڑے، حامیانِ توحید، قبر پرستی، تعزیہ پرستی وغیرہ کی تردید کرنے اور عوام کو شرک کے اندھیروں سے نکالنے کی فکر اور کوشش کے بجائے اپنی صفائی دینے اور الزامات کی گندگی دھونے میں مشغول ہو جائیں۔

ہندوستان بھر کے اُس وقت کے حامیانِ شرک و بدعت نے اسی تکنیک کو استعمال کیا، پھر چودھویں صدی ہجری کے شروع میں، پروپیگنڈے کی اس مہم کا جھنڈا بریلی کے مولوی احمد رضا خاں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جو یقیناً اس کام کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے اور بلاشبہ اُن کو اس باب

میں "امامت" کا مقام حاصل تھا، انھوں نے داعیٔ توحید و سنت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے خلاف (جس نے اللہ کا نام بلند کرنے اور دار الکفر کو دار الاسلام بنانے کے لیے سر کٹا یا اور خون کا کفن پہنا) کتابوں پر کتابیں اور رسالوں پر رسالے لکھے۔ جن میں ستر ستر وجہ سے ان کو کافر ثابت کیا اور اللہ و رسول کی شان میں گستاخیوں کا مجرم قرار دیا[لہ] ـــــ پھر یہی حربہ انھوں نے خاندان ولی اللہی کے علمی و روحانی وارث اور ان کے خاص مشن دعوتِ توحید و سنت کے علمبردار اکابر علماء دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی وغیرہ کے خلاف استعمال کیا ان حضرات کو انھوں نے ختم نبوت کا منکر، اللہ تعالیٰ کا مکذب اور رسول اللہ کی شان میں گستاخیاں کرنے والا قرار دے کر فتویٰ لگایا کہ یہ سب کافر مرتد اور واجب القتل ہیں اور جو کوئی ان کے کافر مرتد ہونے میں شک یا شبہ کرے وہ بھی کافر مرتد اور واجب القتل ہے[لہ]۔

ہمیں اس کا اقرار کرنا چاہیے کہ شیطان اپنی اس چال میں بڑی خاصی حد تک کامیاب ہوا، علماء حق کے وقت کا جو سرمایہ اور زبان و قلم کی جو طاقت، توحید و سنت اور صلاح و تقویٰ کی دعوت اور شرک و بدعت اور فسق و فجور کے خلاف جہاد میں صرف ہونی چاہیے تھی اس کا بڑا حصہ ان شیطانی الزامات کی تردید اور صفائی پر صرف ہونے لگا اور یہ حالت اب تک ہوتا رہا۔

یہاں اس کے اظہار میں ہم کو کوئی مضائقہ نہیں کہ الفرقان کے ناظرین میں سے جو حضرات دور قدیم سے (کم از کم ۴۰ سال سے) اس کا مطالعہ کر رہے ہیں وہ بطور خود بھی جانتے ہیں کہ اس کے ابتدائی دور میں بلکہ اس کے اجراء سے بھی کئی سال پہلے سے، یہ عاجز راقم سطور اپنے وقت اور فکر کا بڑا حصہ اسی دفاعی مہم میں صرف کرتا تھا، اور قرآنی ارشادات "اِنَّ اللّٰهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" اور "كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ" کی روشنی میں اس کو جہاد فی سبیل اللہ تصور کرتے ہوئے اپنے رب کریم سے اس پر اجر کی امید رکھتا تھا، اور اس کے کرم سے اب بھی یقین کے ساتھ امید ہے کہ وہ اس کے اجر سے محروم نہ فرمائے گا ـــــ لیکن قریباً ۴۰ سال کے مسلسل تجربہ کے بعد اس میں قطعاً شک شبہ نہیں رہا کہ شاہ

[لہ] اس کے لیے دیکھے جائیں مولوی احمد رضا خاں صاحب کے رسالے "الکوکبۃ الشہابیہ" اور "سل السیوف الہندیہ" وغیرہ
[لہ] دیکھے جائیں "تمہید ایمان" اور "حسام الحرمین" وغیرہ

اسمٰعیل شہید اور اکابر علماء دیوبند پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان پاک میں گستاخی وغیرہ کے گندے الزامات لگانے والے بریلوی سلسلہ کے یہ مولوی صاحبان کسی غلط فہمی کی بنا پر نہیں بلکہ جان بوجھ کر یہ افترا پردازی کی مہم چلا رہے ہیں، اب یہ ان کا خالص معاشی دھندا اور کاروبار ہے، وہ اس ذریعہ سے بیچارے عام مسلمانوں کو باہم لڑاتے اور ٹکراتے ہیں اور پھر شیطان ان کو ان جاہل مسلمانوں سے جو قبر پرستی وغیرہ شرک و بدعات سے دلچسپی رکھتے ہیں اپنے نذرانے دلواتا ہے ۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ ان کے الزامات بالکل جھوٹے اور بے بنیاد ہیں، ان کا حال ان ناخدا ترس مقدمہ بازوں کا سا ہے جو معمولی دنیوی نفع کے لیے جان بوجھ کر جھوٹے مقدمے لڑاتے اور عدالت میں جھوٹے حلف اٹھاتے ہیں ۔ پھر زمانہ گزرنے کے ساتھ اس عاجز کا یہ یقین بڑھتا ہی گیا۔

یہ لوگ غلط بیانی اور دروغ بافی میں کتنے دلیر اور کس قدر بے باک ہیں اس کی ایک تازہ مثال حال ہی میں علم میں آئی ہے۔ مختلف مقامات کے لوگوں نے بیان کیا اور پاکستان کی اطلاعات سے بھی معلوم ہوا کہ اب ان لوگوں نے اپنی تقریروں میں یہ بھی کہنا شروع کر دیا ہے کہ انگریزوں کے خلاف لڑی جانے والی آزادی کی جنگ میں جانے فلاں فلاں بزرگوں کے یہ کارنامے ہیں [illegible] علماء دیوبند تو انگریزوں سے ساز باز تھے ۔ لا الٰہ الا اللہ!

جنگ آزادی کوئی دو چار صدیوں پہلے کی بات نہیں ہے، اس میں حصہ لینے والے اور اس کے [illegible] والے ابھی [illegible] زندہ ہیں اور سب ہی جانتے ہیں کہ علماء دیوبند کا اس میں کیا [illegible] استاذ الکل شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن اور ان کے رفقاء [illegible] حکومت کے خلاف اس خفیہ انقلابی تحریک کی یاد اب میں [illegible] برسہا برس جزیرۂ مالٹا میں نظر بند رہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے [illegible] آزادی کی کوئی عوامی تحریک شروع بھی نہیں ہوئی تھی۔ پھر پہلی جنگ عظیم کے [illegible] انگریزی حکومت کے خلاف "خلافت" اور کانگریس کی مشترک تحریک چلی، علماء دیوبند اس میں پیش پیش رہے اور انھوں نے اور ان کے معتقدین نے جیلیں بھر دیں۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی نے کراچی کی عدالت میں جو بیان دیا تھا جس میں باغیانہ تقریر کا اقرار کیا تھا وہ اب چھپ بھی چکا ہے۔

پھر ۱۹۳۰ء میں کانگریس کی طرف سے شروع ہونے والی سول نافرمانی کی جنگ میں (جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس منعقدہ امروہہ کی تجویز کے مطابق) جماعت دیوبند نے ایسی حالت میں پورا حصّہ لیا کہ مولانا محمد علی شوکت علی جیسے حضرات بھی ساتھ نہ تھے اور عام مسلمانوں کو کانگریس کا مخالف بنا دیا گیا تھا — ۱۹۳۰ء کی اس تحریک میں جماعت دیوبند اور جمعیۃ العلماء کے قریباً سب ہی اکابر و مشاہیر حضرت مولانا حسین احمد مدنی حضرت مفتی کفایت اللہ حضرت مولانا احمد سعید، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا حفظ الرحمٰن وغیرہ سیکڑوں علماء اور ہزاروں ان کے معتقدین طویل طویل مدتوں تک جیلوں میں رہے۔

پھر جنگ آزادی کے آخری مرحلہ "کوئٹ انڈیا" کی ۱۹۴۲ء کی تحریک میں بھی حضرت مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ اکابر علماء دیوبند کانگریسی لیڈروں کے دوش بدوش اور جیلوں میں ان کے ساتھ رہے۔

یہ سب کل کے واقعات ہیں جن کے دیکھنے والے ابھی لاکھوں کی تعداد میں زندہ ہیں — اور جنگ آزادی کی تاریخ سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص یہ بھی جانتا ہے کہ مولوی احمد رضا خاں نے خلافت کی تحریک میں شرکت ہونے والے مسلمانوں (خاص کر ان کے لیڈروں مولانا محمد علی، شوکت علی وغیرہ) کا نام "فرقہ گاندھویہ" رکھا تھا اور حسب عادت ان کے خلاف بھی رسالوں پہ رسالے لکھے اور کفر کے فتوے چلائے تھے، وہ رسالے اور فتوے دنیا سے ناپید نہیں ہو گئے ہیں اور بریلویت کے صحیفہ جامعہ "تجانب اہل سنہ" میں بھی یہ سب محفوظ کر دیا گیا ہے۔ مولوی احمد رضا خاں صاحب تو تحریک خلافت کے دوران ہی میں ۱۳۴۰ھ میں انتقال فرما گئے تھے، اس کے بعد آزادی کی جنگ کے جو مرحلے آئے اس میں ان کے گھرانے اور ان کے حلقہ کا کوئی آدمی کبھی قریب آیا — اللہ نے ان کو ایسے کاموں کے لیے پیدا ہی نہیں کیا تھا جن کے لیے وہ پیدا کیے گئے تھے اس کے انجام دینے میں انھوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی (کل میسّر لما خلق لہ)

ان حالات میں ان بریلوی مولوی صاحبان کا یہ دعویٰ کہ جنگ آزادی میں ہم اور ہمارے اکابر و اسلاف شریک تھے اور علماء دیوبند کا اس میں کوئی حصہ نہ تھا، یہ جاننے کے لیے کافی ہے کہ جھوٹ بولنے اور جھوٹا پروپیگنڈا کرنے میں یہ لوگ کتنے دلیر ہیں — اس لیے دین کی خدمت اور توحید و سنت کی حمایت و حفاظت کے مخلصانہ جذبہ اور داعیہ رکھنے والے حضرات کو اس عاجز کا مشورہ یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو اور ان لوگوں کے گندے پروپیگنڈے کو بالکل نظرانداز کریں — الزامات کی

مرکز تردید کا کام بحمدللہ کافی سے زیادہ ہو چکا ہے۔ اب ہمارا رویہ اور پالیسی یہ ہونی چاہیے کہ اپنی تقریر اور تحریر سے عام مسلمانوں کو توحید خالص، اتباع سنت اور صلاح و تقویٰ و فکر آخرت کی دعوت دیں۔ ہمارا حملہ براہ راست اُس شرک و بدعت و فسق و فجور اور اُس خدا فراموشی اور آخرت سے بے فکری پر ہو جس میں شیطان نے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کو مبتلا کر دیا ہے۔ ہمارے ائمہ و اکابر حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ، شاہ اسمٰعیل شہید، حضرت مولانا گنگوہی، حضرت تھانوی کا یہی طریقہ اور شعار تھا اور یہی کلمۂ ایمان لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے حامل و علمبردار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی ہونے کی حیثیت سے ہمارا فرض منصبی ہے۔ واللہ الموفق وھو المستعان۔

کتاب المعاملات

مَعَارِفُ الْحَدِیْث

(مسلسل)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معاشی معاملات انسانوں کی فطری ضرورت

اس باب میں خداوندی ہدایت اور اس کے بنیادی اصول

اللہ تعالیٰ نے انسان کو مدنی الطبع بنایا ہے یعنی انسانوں کی فطری ساخت ایسی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں باہمی تعاون اور معاملاتی لین دین کے محتاج ہیں، ہر فرد اور ہر طبقہ کی ضرورت دوسرے سے وابستہ ہے۔ مثلاً ایک مزدور جس کی زندگی کی ضرورتیں بہت مختصر ہیں، جو صبح سے شام تک محنت مزدوری کر کے بس گزارہ کے پیسے حاصل کرتا ہے۔ اُسے بھی ضرورت ہے اُس آدمی کی جس سے وہ اپنا اور بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے غلہ وغیرہ خرید سکے، اور غلہ پیدا کرنے والے کاشتکار کو ضرورت ہے اُس مزدور کی جس سے وہ اپنی کھیتی باڑی کے کاموں میں مدد لے سکے۔ اسی طرح مزدور اور کاشتکار دونوں کو ضرورت ہے اس آدمی کی جو اُن کے لباس کی ضرورت پوری کرنے کے لیے کپڑا تیار کرے اور یہ اس سے بلاواسطہ یا بالواسطہ کپڑا خرید سکیں، اور کپڑا تیار کرنے والے کو ضرورت ہے اس آدمی یا اُس ایجنسی کی جس سے وہ سوت یا ریشم اور کپڑے کی صنعت کی دوسری ضروریات نقد یا قرض اُدھار خرید سکے، پھر ان میں سے کسی کو رہنے کے لیے مکان تعمیر کرانا ہو تو اس کو ضرورت ہوگی کسی سے اینٹ سیمنٹ وغیرہ تعمیری ضروریات خریدنے کی اور اُس کے بنوانے کے لیے معماروں اور مزدوروں کی۔ پھر خدانخواستہ ان میں سے کوئی بیمار پڑ جائے تو

ضرورت ہوگی حکیم ڈاکٹر سے رجوع کرنے کی اور دواؤں کی دوکان سے دوا خریدنے کی ۔۔۔ الغرض اشیاء کی خرید و فروخت اور تجارتی مبادلہ اور محنت و مزدوری، اور صنعت و زراعت اور قرض و عاریت وغیرہ معاشی معاملات، اس دنیا میں انسانی زندگی کے لوازم ہیں، پھر ان معاملات میں کبھی کبھی نزاعات کا پیدا ہونا بھی ناگزیر ہے، ان کے حل کے لیے ضرورت ہے عدل و انصاف کے کسی نظام کی اور کسی دستور و قانون کی ۔۔۔ یہ جو کچھ عرض کیا گیا کوئی فلسفہ یا منطق کا مسئلہ نہیں ہے سب مشاہدہ اور ہم سب کا روزمرہ کا تجربہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ اور سب سے آخر میں خاتم الانبیاء سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جس طرح انسانوں کو یہ ہدایت دی کہ وہ اپنے آغاز و انجام کے بارہ میں، اپنے پیدا کرنے والے مالک و معبود کی ذات و صفات اور توحید و آخرت وغیرہ کے بارہ میں کیا عقیدہ اور یقین رکھیں اور کس طرح اس کی عبادت کریں اور کیا کیا اعمال اُن کی روحانیت اور انسانی شرافت کے لیے مضر و مہلک ہیں جن سے وہ بچیں اور پرہیز کریں، اور اخلاق اور معاشرت کے بارہ میں اُن کا رویہ کیا رہے، اسی طرح اس نے خرید و فروخت، صنعت و تجارت اور محنت مزدوری وغیرہ اُن معاشی معاملات کے بارہ میں بھی جو بظاہر انسانوں کی خالص دنیوی ضرورتیں ہیں، اُن اصولوں اور طریقوں کی ہدایت فرمائی جو انسانی شرافت و عظمت سے مطابقت رکھتے ہیں اور جن میں انسانوں کی دنیوی و اخروی فلاح ہے۔

اس کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ اس خداوندی ہدایت اور اس شعبہ سے متعلق شریعت محمدی کے احکام کی پابندی اور پیروی کرتے ہوئے ان دنیوی کاموں کا کرنا اب دنیا نہیں بلکہ عین دین، اور ایک نوع کی عبادت ہے اور اللہ کی رضا کا وسیلہ ہے، اسی طرح اجر و ثواب اور آخرت کے درجات عالیہ کا ذریعہ ہے جس طرح نماز، روزہ اور ذکر و تلاوت وغیرہ عبادات اور اچھے اخلاق پر اور دین کی دعوت اور خدا کی راہ میں جان و مال کی قربانی پر۔

انسانی زندگی کے اس شعبہ یعنی **معاملات** کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو ہدایتیں اور جو احکام امت کو ملے ہیں اُن کی بنیاد جہاں تک ہم نے سمجھا ہے چار اصولوں پر ہے ۔۔۔ ایک خلق اللہ کی نفع رسانی ۔۔۔ دوسرے عدل ۔۔۔ تیسرے سماحت* [illegible] دیانت داری ۔۔۔ چوتھے

* سماحت کا مطلب یہ ہے کہ ہر فریق دوسرے کے ساتھ رعایت اور خیر خواہی کا [illegible]

خواہ کمزور اور ضرورت مند فریق کو حتی الوسع سہولت دی جائے۔

اس تمہید کے بعد ناظرین کرام معاشی معاملات سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات و تعلیمات ذیل میں پڑھیں۔ — اللہ تعالیٰ لکھنے والے اپنے گنہگار بندہ کو نیز پڑھنے والوں اور سننے والوں کو ان ہدایات وارشادات کی پیروی کے اہتمام کی توفیق عطا فرمائے۔

سب سے پہلے حضور کے چند وہ ارشادات درج کیے جاتے ہیں جن میں معاشی معاملات کی اہمیت افزائی فرمائی گئی ہے اور اُن پر اجر و ثواب کی بشارتیں سنائی گئی ہیں۔

حلال روزی حاصل کرنے کی فکر و کوشش فرائض میں سے ہے

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ.

——————— رواہ البیہقی فی شعب الایمان

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حلال حاصل کرنے کی فکر و کوشش فرض کے بعد فریضہ ہے　　(شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) اکثر شارحین نے حدیث کا مطلب یہ بیان کیا ہے اور بظاہر یہی ہے کہ اللہ و رسول پر ایمان اور نماز روزہ زکوٰۃ وغیرہ جو اسلام کے ارکان اور بنیادی ارکان و فرائض ہیں ان کے درجہ اور مرتبہ میں ان کے بعد حلال روزی حاصل کرنے کی فکر اور کوشش بھی ایک اسلامی فریضہ ہے۔ بندہ اگر اس سے غفلت برتے اور کوتاہی کرے تو خطرہ ہے کہ حرام روزی سے پیٹ بھرے، اور آخرت میں اس کا انجام وہ ہوگا جو حرام سے پیٹ بھرنے والوں کا بتلایا گیا ہے۔ اللہ کی پناہ!

پھر یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو بھی کسی فریضہ کا ادا کرنا اس کی بندگی اور عبادت ہے اور بندہ اس پر اس اجر و ثواب کا مستحق ہے جو فریضہ کی ادائیگی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنا چاہیے۔ پس کسب حلال کی فکر و کوشش اور اس میں مشغول ہونا عین دین و عبادت اور موجب اجر و ثواب ہے — اس میں کسب حلال کے طالب ہر تاجر، ہر مزدور ہر کاشتکار اور ہر دستکار کے لیے کتنی بڑی بشارت ہے۔

لیکن یہ بہر حال پیشِ نظر رہے کہ اس حدیث میں صرف کمائی کرنے کو نہیں بلکہ کسبِ حلال کی تلاش و فکر کو فریضہ بتلایا گیا ہے اور اس ارشاد کا خاص مقصد اور مطمحِ نظر حرام سے بچانا ہے۔

بعض حالات میں روپیہ پیسہ کی ضرورت و اہمیت

عَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيْكَرِبَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَيَأْتِيَنَّ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يَنْفَعُ فِيْهِ إِلَّا الدِّيْنَارُ وَالدِّرْهَمُ

—————— رواہ احمد

حضرت مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے۔ لوگوں کے لیے ایک وقت آئے گا جب روپیہ پیسہ ہی کام آئے گا۔

(مسند احمد)

(تشریح) اس حدیث کو حضرت مقدام ابن معدی کرب صحابی رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والے ایک تابعی ابوبکر بن ابی مریم ہیں، انھوں نے واقعہ یہ بیان کیا ہے کہ حضرت مقدامؓ کے یہاں دودھ دینے والے جانور تھے، اُن کی ایک باندی دودھ فروخت کرتی اور اس کی قیمت خود حضرت مقدام لے لیتے تھے، اس پر بعض لوگوں نے ناپسندیدگی کے ساتھ تعجب کا اظہار کیا اور کہا کہ آپ دودھ فروخت کراتے ہیں اور اس کی قیمت وصول کرتے ہیں ــــ انھوں نے فرمایا کہ ہاں میں ایسا کرتا ہوں، اور اپنے اس طرزِ عمل کے جواز کی سند میں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا حوالہ دیا۔ اُن کا مطلب یہ تھا کہ اپنی چیز فروخت کر کے روپیہ پیسہ حاصل کرنا کوئی ذلیل اور قابلِ اعتراض بات نہیں ہے، حضورؐ نے فرمایا ہے کہ ایسا وقت بھی آئے گا کہ ــــ روپیہ پیسہ ہی آدمی کے کام آئے گا ــــ یعنی میں اسی خیال سے دودھ فروخت کرا کے روپیہ پیسہ حاصل کرتا ہوں۔ مطلب یہ تھا کہ یہ اگر عزیمت نہیں تو رخصت ضرور ہے۔

سچائی اور دیانت داری کے ساتھ کاروبار کرنے والے انبیاء صدیقین اور شہداء کے ساتھ

عَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ۔ رواہ الترمذی والدارمی والدارقطنی ورواہ ابن ماجۃ عن ابن عمر

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پوری سچائی اور پوری دیانت داری کے ساتھ کاروبار کرنے والا تاجر نبیوں اور صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔ (جامع ترمذی، سنن دارمی، سنن دارقطنی) ...... اور ابن ماجہ نے یہی حدیث اپنی سند سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔

(تشریح) الصدوق اور الامین دونوں مبالغے کے صیغے ہیں۔ حدیث کا مطلب اور پیغام واضح ہے کہ جو تاجر اور سوداگر اپنے کاروبار میں سچائی اور امانت یعنی دیانت داری کی پورے اہتمام سے پابندی کریں گے، قیامت اور آخرت میں وہ نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوں گے۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے "وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ ۚ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا ۝" اور جو بندے اللہ و رسول کی فرمانبرداری کریں گے وہ (قیامت و آخرت میں) اُن مقبولین و مقربین کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ کا خاص انعام ہے یعنی انبیاء و صدیقین، اور شہداء و صالحین (کے ساتھ) اور یہ حضرات کیا ہی اچھے رفیق ہیں۔ ...... تجارت اور سوداگری بڑی آزمائش کی چیز ہے، تاجر کے سامنے بارہا ایسی صورتیں آتی ہیں کہ اگر وہ اللہ کے حکم کے مطابق سچائی اور ایمانداری کی پابندی کرے تو اس کو بظاہر نقصان ہوتا ہے اور اگر سچائی اور دیانت داری کا لحاظ کرنے کے بجائے اُس وقت وہ اپنی تجارتی مصلحت کے مطابق بات کرے تو ہزاروں لاکھوں کا نفع ہوتا ہے۔ پس جو تاجر اپنی تجارتی مصلحت اور نقصان سے صرفِ نظر کر کے اللہ کے حکم کے مطابق ہر حال میں سچائی اور ایمانداری کی پابندی کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے امتحان میں پورا کامیاب ہے اور اس حدیث پاک میں ایسے تاجروں کو بشارت سنائی گئی ہے کہ قیامت و آخرت میں وہ اللہ کے مقبول ترین اور مقرب ترین بندوں یعنی نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اُن کی سچائی و دیانت داری کا صلہ ہوگا۔

تنبیہ: اسی سلسلۂ معارف الحدیث میں قرآن و حدیث کے نصوص کی بنیاد پر بار بار یہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ اسی طرح کی تمام بشارتیں اس شرط کے ساتھ مشروط ہوتی ہیں کہ وہ آدمی اُن خبیث اور مہلک باتوں سے پرہیز کرے جو بندہ کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم کر دیتی ہیں۔

دستکاری، صنعت و حرفت اور محنت مزدوری کی فضیلت:۔

عَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيكَرِبَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا أَكَلَ أَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِنْ أَنْ يَأْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ وَإِنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَأْكُلُ مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ — رواہ البخاری

حضرت مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کسی نے کبھی کوئی کھانا اُس سے بہتر نہیں کھایا کہ اپنے ہاتھوں کی محنت سے کر کے کھائے اور اللہ کے پیغمبر داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھوں سے کام کر کے کھاتے تھے۔ (صحیح بخاری)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ تحصیل معاش کی صورتوں میں بہت اچھی صورت یہ ہے کہ آدمی اپنے ہاتھ سے کوئی ایسا کام کرے جس سے کھانے پینے وغیرہ کی ضروریات پوری ہوں، آپ نے فرمایا کہ یہ اللہ کے پیغمبر داؤد علیہ السلام کی سنت بھی ہے —— قرآن مجید میں بھی ہے کہ وہ زرہیں بناتے تھے اور اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسی کو انھوں نے اپنا ذریعۂ معاش بنایا تھا —— بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد نے دستکاری اور ذاتی محنت کو بہت بلند مقام عطا فرمادیا۔

عَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ قَالَ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَيُّ الْكَسْبِ أَطْيَبُ؟ قَالَ عَمَلُ الرَّجُلِ بِيَدِهِ وَكُلُّ بَيْعٍ مَبْرُوْرٍ — رواہ احمد

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ حضرت کون سی کمائی زیادہ پاک اور اچھی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ آدمی کا اپنے ہاتھ سے کوئی کام کرنا اور ہر تجارت جو پاکبازی کے ساتھ ہو۔ (مسند احمد)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ سب سے اچھی کمائی تو وہ ہے جو خود اپنے دست و بازو اور اپنی محنت سے ہو اور اُس تجارت کی کمائی بھی پاکیزہ ہے جو شریعت کے احکام کے مطابق اور دیانت داری کیساتھ ہو۔ بیع مبرور کا یہی مطلب ہے۔

زراعت و باغبانی کا عظیم اجر و ثواب:۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مُؤْمِنٍ

يَغْرِسُ غَرْسًا اَوْ يَزْرَعُ زَرْعًا فَيَاكُلُ مِنْهُ طَيْرٌ اَوْ اِنْسَانٌ اَوْ بَهِيْمَةٌ اِلَّا كَانَ لَهٗ صَدَقَةٌ ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی صاحب ایمان بندہ درخت کا پودا لگائے، یا کاشت کرے پھر اس میں سے پرندے کھائیں یا آدمی یا کوئی جانور کھائے تو وہ اس کے حق میں صدقہ ہوگا (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) سبحان اللہ وبحمدہ باغات لگانے والوں اور کاشتکاری کرنے والوں کے لیے اس حدیث نبوی میں کتنی عظیم بشارت ہے کہ اگر کوئی آدمی یا چلتا پھرتا جانور یا اڑتا ہوا پرندہ اُن کے درخت کا پھل یا کھیت کے دانے کھائے تو باغ والے اور کھیت والے بندہ کو فی سبیل اللہ صدقہ کا ثواب ہوگا ——— اس حدیث پاک میں باغبانی اور کاشتکاری کے لیے جن پر انسانوں کی بنیادی ضرورتوں کا دارمدار ہے کتنی بڑی ترغیب اور ہمت افزائی ہے۔

جائز مال ودولت بندۂ مومن کے لیے اللہ کی نعمت ہے :-

عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَهٗ اُرِيْدُ اَنْ اَبْعَثَكَ عَلٰى جَيْشٍ فَيُسَلِّمَكَ اللّٰهُ وَيُغْنِمَكَ وَاَرْغَبُ لَكَ مِنَ الْمَالِ رَغْبَةً صَالِحَةً فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا اَسْلَمْتُ مِنْ اَجْلِ الْمَالِ وَلٰكِنْ اَسْلَمْتُ رَغْبَةً فِي الْاِسْلَامِ وَاَنْ اَكُوْنَ مَعَكَ فَقَالَ يَا عَمْرُو نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلْمَرْءِ الصَّالِحِ ——— رواہ احمد

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا میرا ارادہ ہے کہ تم کو ایک لشکر کا امیر بنا کر بھیجوں پھر تم اللہ تعالیٰ کے فضل سے صحیح سالم لوٹو (اور وہ مہم تمہارے ہاتھ پر فتح ہو) اور تم کو مال غنیمت حاصل ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم کو مال ودولت کا اچھا عطیہ ملے ——— تو میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میں نے اسلام مال ودولت کے لیے قبول نہیں کیا ہے، بلکہ میں نے اسلام کی رغبت ومحبت کی وجہ سے اس کو قبول کیا ہے اور اس لیے کہ آپ کی معیت ورفاقت مجھے نصیب ہو۔ تو حضورؐ نے فرمایا کہ اے عمرو! اللہ کے صالح بندہ کے

لیے جائز و پاکیزہ مال و دولت اچھی چیز (اور قابلِ قدر نعمت) ہے۔ (مسند احمد)

(تشریح) حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مال و دولت اگر جائز طریقہ سے حاصل ہو تو اللہ تعالیٰ کی قابلِ قدر نعمت اور اس کا خاص فضل ہے ـــــ اور زہد و رقاق کے عنوانات کے تحت متعدد وہ حدیثیں اسی سلسلہ معارف الحدیث میں ذکر کی جا چکی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فقر و مسکنت اور مال و دولت سے خالی ہاتھ رہنے کو افضلیت حاصل ہے اور امت کے فقراء اغنیاء سے افضل ہیں ـــــ واقعہ یہ ہے کہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ بالکل صحیح ہیں، اگر فقر و مسکنت کے ساتھ صبر اور تسلیم و رضا اور تعفف نصیب ہو تو پھر بلا شبہ یہ فقر و مسکنت بہت بلند مقام ہے اور اس میں بڑی خیر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے یہی پسند فرمایا تھا، اور آپ اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتے تھے (اس سلسلے کی آپ کی دعائیں پہلے اپنے موقع پر ذکر کی جا چکی ہیں) ـــــ اور اگر اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو جائز اور پاک ذرائع سے مال و دولت نصیب فرمائے اور شکر کی اور صحیح مصارف میں خرچ کرنے کی توفیق ملے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کا خاص فضل اور بڑی قابلِ قدر نعمت ہے، انبیاء علیہم السلام میں سے حضرت داؤد و سلیمان اور حضرت ایوب و یوسف علیہم السلام اور ان کے علاوہ بھی متعدد حضرات کو اللہ تعالیٰ نے اس فضل سے نوازا تھا اور اکابر صحابہ میں حضرت عثمان، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، اور حضرت زبیر بن عوام وغیرہم رضی اللہ عنہم کو بھی اس فضل خداوندی سے وافر حصہ عطا ہوا تھا۔ بہرحال یہ بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی قابلِ قدر اور لائق شکر نعمت ہے۔ (نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلْمَرْءِ الصَّالِحِ)

مالی معاملات کی نزاکت و اہمیت:-

عَنْ اِبْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَزُوْلُ قَدَمَا ابْنِ اٰدَمَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حَتّٰى يُسْئَلَ عَنْ خَمْسٍ عَنْ عُمُرِهٖ فِيْمَا اَفْنَاهُ وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَا اَبْلَاهُ وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهٗ وَفِيْمَا اَنْفَقَهٗ وَمَاذَا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ ـــــ رواہ الترمذی

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت

کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن جب حساب کتاب کے لیے بارگاہِ خداوندی میں پیشی ہوگی تو آدمی کے پاؤں اپنی جگہ سے سرک نہ سکیں گے جب تک کہ اس سے پانچ چیزوں کے بارہ میں پوچھ گچھ نہ کر لی جائے — ایک اس کی پوری زندگی کے بارے میں کہ کن کاموں اور مشغلوں میں اس کو ختم کیا؟ — اور دوسرے خصوصیت سے اس کی جوانی کے بارہ میں کہ کن مشغلوں میں ان کو بوسیدہ اور پرانا کیا — اور تیسرے اور چوتھے مال و دولت کے بارہ میں کہ کہاں سے اور کن طریقوں اور راستوں سے اس کو حاصل کیا تھا اور کن کاموں اور کن راہوں میں اس کو صرف کیا۔ اور پانچواں سوال یہ ہوگا کہ جو کچھ معلوم تھا اس پر کتنا عمل کیا۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قیامت میں ہر آدمی کو اپنے پورے آمد و خرچ کا بھی حساب دینا ہوگا کہ کتنا کمایا، حلال طریقہ سے کمایا یا خدانخواستہ حرام طریقہ سے؟ — اور کمائی کو کن مدوں میں خرچ کیا، جائز میں یا ناجائز میں؟ — الغرض اس دنیا اور اس کی زندگی میں ہم جو کچھ کماتے اور خرچ کرتے ہیں آخرت میں اس کا پورا پورا حساب دینا ہوگا۔ وہ بندے بڑے خوش نصیب اور خوش قسمت ہیں جو قیامت کے دن کے اس حساب کو پیش نظر رکھتے ہوئے کمانے اور خرچ کرنے میں اور سارے مالی معاملات میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے احکام کی پابندی کرتے ہیں، اور ان کا انجام بہت خطرناک ہے جو اس طرف سے بے فکر اور بے پروا ہیں۔
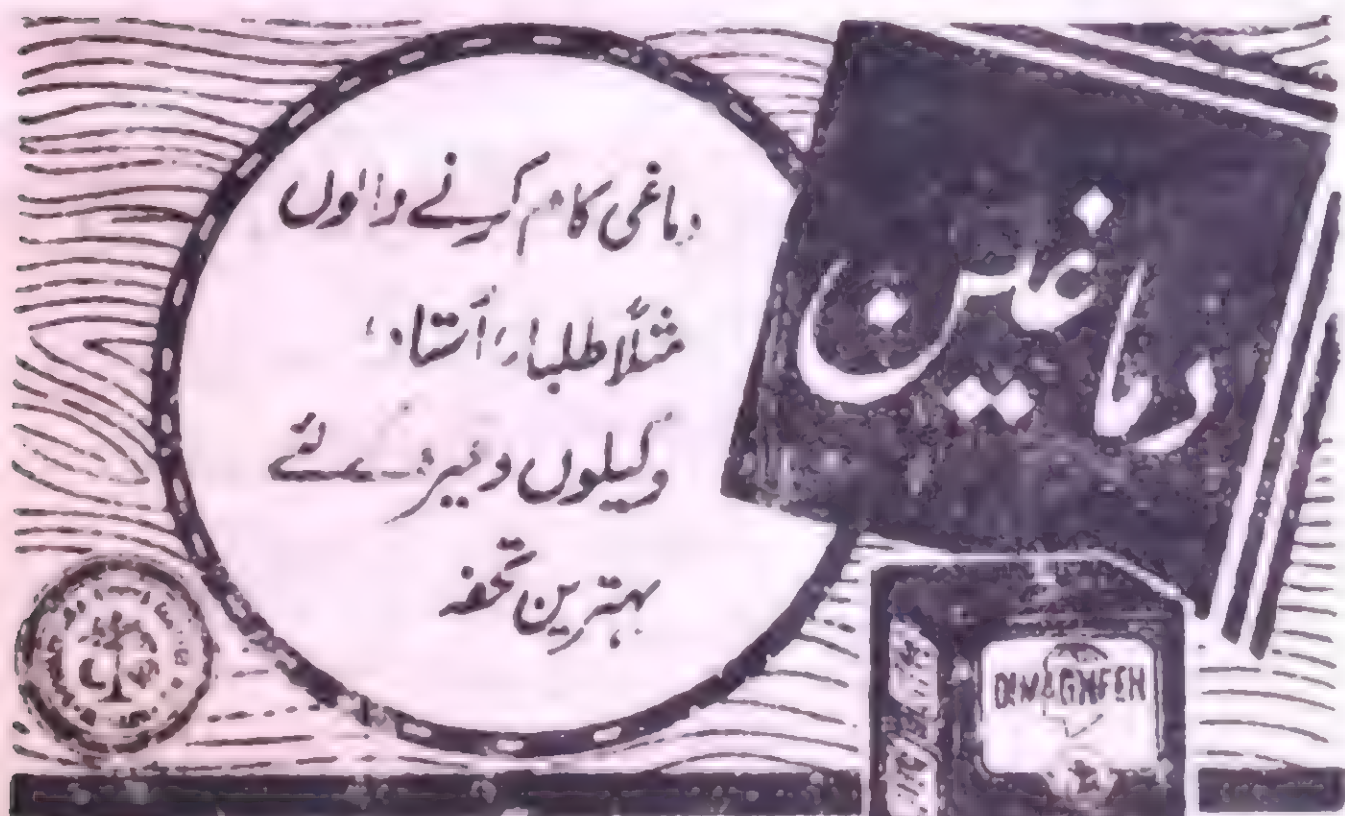
مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

جواہر پارے

اقتباسات مکاتیب رشیدیہ

(سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو الفرقان بابت فروری ۱۹۷۶ء)

مولانا مولوی محمد روشن خاں صاحب مراد آبادیؒ[1] کے نام

از بندہ رشید احمد عفی عنہ، بگرامی خدمت مولوی محمد روشن خاں صاحب سلمہٗ۔

بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند ——

آج آپ کا خط آیا۔ بندہ آپ کے فرزند احمد شفیع کے باب میں دعا کرتا ہے مگر حسب قول "او خویشتن گم است کرا رہبری کند" خود سال بھر سے بیمار ہے کسی کو میرے سے کیا نفع ہوگا۔ بہر حال بندہ بندہ ہے۔

۱؎ مولانا محمد روشن خاں صاحب مراد آبادیؒ آپ نے آستانہ رشیدیہ سے ہی علم ظاہر و باطن حاصل کیا تھا۔ اور حضرت کے خلیفہ مجاز بھی تھے (تذکرۃ الرشید جلد اول صفحہ ۱۹۲) آپ کے متعلق مولانا حکیم محمد عمر صدیقی مراد آبادی سے حسب ذیل مزید معلومات حاصل ہوئیں:۔

(۱) مولانا محمد روشن خانؒ کے والد ماجد کا نام نامی میاں جی میر خاں تھا جو فارسی کے استاد تھے۔

(۲) مولانا محمد روشن خاں کی عمر کا بیشتر حصہ گوالیار میں گزرا۔ گوالیار میں آپ سے بہت سے لوگ بیعت ہوئے وہاں آپ نے سلسلۂ بیعت کے ساتھ ساتھ تعلیم و تبلیغ کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ وہاں کی معزز خواتین آپ سے ارادت و عقیدت رکھتی تھیں۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

دعا اپنا کام ہے، اجابت بحکم مولیٰ تعالیٰ شانہٗ ہے۔ بندہ اگرچہ بیمار مدت سے تھا مگر شعبان کے اوائل سے اب تک شدت مرض رہی۔ تنقیۂ مسہل کے بعد اب اس قدر ہوا ہوں کہ بدست خود جواب خطِ مرسلہ بعبارتِ قلیل لکھ سکوں ضعف ہے، اگر امراض زائل ہو گئے ؎

ہر چہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف ست

وظیفہ وظائف متروک ہوئے۔ خواب و خور کا شغل باقی ہے۔

.... بیعت مولوی عبد السبحان صاحب کو چندے ملتوی کرتا ہوں۔ وہ استخارۂ مسنونہ دس پانچ دن کر کے اپنی طبع کو آزمائیں اور وظیفۂ محررہ کو چند روز پڑھیں۔ ازاں بعد جیسا ہوگا کیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

---

(۳) گوالیار کے ایک صاحب جو قوم کے کالستھ تھے آپ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے اور ان کا اسلامی نام عبد الرحمٰن رکھا گیا۔ وہ اپنا تمام گھر بار چھوڑ کر مراد آباد آ گئے تھے اور مسجد دو ندے خاں واقع بازار دیوان میں رہنے لگے تھے۔ یہ نومسلم عبد الرحمٰن فارسی کے استاد و معلم تھے اور خط شکستہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ چونکہ وہ گوالیار میں ناظر عدالت رہے تھے اس لیے ناظر عبد الرحمٰن کہلاتے تھے۔

(۴) مولانا محمد روشن خاں نے دو نکاح کیے اور آپ کی دونوں بیویوں سے ایک ایک اولاد ہوئی۔ آپ کے بڑے لڑکے کا نام محمد شفیع تھا اور چھوٹے لڑکے کا احمد شفیع۔ آپ نے ان دونوں لڑکوں کو دیوبند میں تعلیم دلوائی۔ بڑے لڑکے نے درمیان میں تعلیم چھوڑ دی۔ احمد شفیع دار العلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے اور گلبرگہ شریف میں مدرس رہے۔ وہیں ۱۹۴۴ء میں ان کا انتقال ہوا۔

(۵) مولانا محمد روشن خاںؒ جب حج کو گئے تو مکہ معظمہ میں شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بھی شرف بیعت حاصل کیا۔

(۶) حضرت مولانا محمد روشن خاںؒ صاحبِ حال بزرگ تھے۔ جب کبھی گوالیار سے آتے تو مولانا حکیم محمد صدیق قاسمی مراد آبادی سے ضرور ملاقات کرتے تھے۔ اور ان سے تازہ کلام سننے کی فرمائش کیا کرتے تھے۔ بعض دفعہ ان کا کلام سن کر آپ پر وجد کیفیت طاری ہو جاتا تھا۔

(۷) مولانا محمد روشن خاںؒ نے یکم شوال ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء میں انتقال کیا۔

جاوے گا۔ اول خود لائق اخذ بیعت نہیں ہوں۔ دوسرے وہ اہل علم۔ تیسرے بندہ کے حال سے واقف نہیں۔ لہذا استخارہ تک توقف ضروری ہے۔ اور استخارہ حدیث کا ہی کافی ہے۔ والسلام

.... خواب آپ کا عمدہ ہے، مبارک ہو۔ مرشدوں کا خواب میں دیکھنا اور کیفیت کا حاصل ہونا حاصل کی بات ہے۔ وسواس جب ذکر کو مضر نہ ہوں تو چنداں حرج نہیں۔ اپنا کام کیے جاؤ۔ جو کچھ مقدر ہے سب ملے گا۔ طبع کو بہ تکلف توکل و رفع خطرات کی طرف لگایا کرو۔ اول تکلف ہوتا ہے، پھر ملکہ ہو جاتا ہے وَمَنْ يَسْتَعِفَّ يُعِفَّهُ اللّٰهُ[1] جو حدیث ہے سب ملکات کا حال ایسا ہی ہے۔

.... تہجد کے واسطے یہ کیا کرو کہ اگر شب کو اٹھنے کا اتفاق نہ ہو تو روزہ رکھا، اور نفس پر جرمانہ کسی قسم کا لگا دیا۔ تو البتہ نفس کی سرکشی کچھ کم ہو جاوے گی۔ اور جو نفس کو اپنے حال پر چھوڑ دو گے تو روز بروز زیادہ سرکش ہوتا جاوے گا۔ بس اب پھر تجدید عہد کرو اور تہجد اور شغل کو جاری کرو۔ حالت، (مثل مہمان عزیز کے ہوتی ہے۔ اگر اس کی تواضع نہیں کی تو ناراض ہو جاتا ہے۔ اب جب خوب محنت کرو گے اور ملازمت رکھو گے تو پھر حالت عود کرے گی۔ یا وہ یا مثل اس کے۔ لہذا کام کرنا بالتزام ضروری ہے۔ اور جو کچھ قلیل کثیر ہو اس پر شکر بہت بہت کرنا۔

.... حسب قاعدہ ہمارے حضرت (حضرت حاجی امداد اللہ) کے آپ مجاز ہیں۔ لہذا بطوع و رغبت اجازت بیعت کی عموماً دیتا ہوں کہ اپنے نام سے بیعت لیا کرو۔ جاہل ہووے توبہ کرادی۔ حسب لیاقت وظیفہ بتا دیا کریں۔ مبارک ہو۔ شکر کرو بہت شکر کرو۔ اور اس اجازت کو حضرت سلمہ (حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ) کی طرف سے سمجھو۔ سچ کہتا ہوں کہ ترجمان زبان شیخ ہوں۔ اپنا حال جو ہے لکھ نہیں سکتا۔ نفس بیگانہ ہوں۔ چند باتیں یاد ہیں اور بس — والسلام

(مورخہ ۳ رمضان ۱۳۰۷ھ)

---

[1] ترجمہ: جس نے پرہیزگاری طلب کی اللہ نے اس کو پرہیزگار بنا دیا۔

آپ کا خط آیا۔ حال تخفیف مرض عزیز احمد شفیع سے سرور ہوا۔ حق تعالیٰ بقیہ مرض کو دفع فرما دے۔ اور بندہ دعا گو سب خلائق کا ہے۔ خصوصاً اپنے دوستوں کا۔ تم جس دن تہجد فوت ہو روزہ رکھا کرو یا بدون صوم فاقہ کر دیا۔ غرض سزا، جوع نفس پر بہت سخت ہے۔ اور جو صاحب بیعت کرنا چاہے گیا ان کو توبہ کرا دیا کرو۔ اپنے آپ کو کچھ مت جانو۔ بلکہ وسیلۂ خیراز حضرت مرشد ناسلمہٗ تصور کرو۔ چند لوگ جن کا آپ نے حال لکھا ہے (اس کو) دیکھ کر سرور ہوا۔ حق تعالیٰ بذریعہ آپ کے کسی سے ذکر جو کراتا ہے اس کا اجر آپ کو ملتا ہے۔ تواضع بہت عمدہ خصلت ہے۔ جب تواضع رفع ہوئی اور عُجب (غرور) آیا، ہلاک ہوا۔ ابلیس کا مُغوی و مہلک (بہکانے والا اور ہلاک کرنے والا) یہی عُجب تھا اور حرص و مال و جاہ دو دشمن سخت ہیں کہ دین و دنیا دونوں کو تباہ کرتے ہیں۔ والسلام

(مورخہ ۲ محرم ۱۳۱۰ھ روز چہار شنبہ)

آپ کا خط آیا۔ حال دریافت ہوا۔ (اس سے پہلے) غالباً بندہ کے پاس کوئی آپ کا خط نہیں آیا۔ اگر آیا ہو اور فقط خیریت طلبی اس میں تھی تو عدم تحریر جواب بھی ممکن ہے کیوں کہ بندہ اب بلا کاہل بہت ہو گیا ہے اور کام بہت بڑھ گیا ہے۔ غیر ضروری خط کا جواب لکھنا شاق ہوتا ہے۔ بندہ امراض متواتر کا مورد ہے۔ اب عمر ضعیف اور قویٰ سست (ہیں) جو دن حیات کے مقدر ہیں پورے کیے جاویں گے۔ . . . . یہ احقر اپنے قدیم عنایت فرمایان سے منحرف نہیں۔ دعا کرتا رہتا ہوں اور ان کی خیر خواہی) سے کسی وجہ سے دریغ نہیں۔ زبان بہ دعا خیر ہلانا کیا گراں ہے۔ اور تم تو بظاہر معتقد بندۂ احقر کے ہو۔ تم سے تو کس طرح عذر ہو وے۔

. . . . تعبیر خواب یہ ہے کہ اگر منظور حق تعالیٰ کو ہے تو قرۃ العینین مسعود احمد[1] بندہ کی وضع پر رہے گا۔ اگرچہ فقط قلباً و اعتقاداً ہی ہو ——

. . . . اس عاجز کا واسطہ آپ سے بوجہ دین اور علم دین کے ہے۔ یہ جو دوست بندہ کا اپنے طریق پر ہے جو راہ حق (اور) صراط مستقیم ہے۔ اس سے بندہ کو الفت ہے۔ اگرچہ

---

[1] حکیم مسعود احمد صاحب گنگوہی صاحبزادہ حضرت مولانا گنگوہیؒ

بظاہر اس کا کوئی ظہور نہ ہو، مگر قلبی علاقہ ہوتا ہے اور جو صاحب انحراف اپنے مسلک سے کرتے ہیں بہ قدر (ان کے) انحراف کے علاقہ قلبی میں فتور آجاتا ہے پس جس اپنے دوست کو سنت کی راہ (پر) مستحکم دیکھتا یا سنتا ہوں بے ساختہ اس طرف تعلق بڑھتا ہے۔ ورنہ کم ہوتا ہے۔ ....

اخبار اغیار سے آپ کا میلان بدعت کی طرف معلوم ہو کر لاریب آپ کی طرف سے ملال ہوا تھا، اور اس کے انکشاف کی غرض سے ہی وہ فقرات لکھے تھے جس سے آپ کو عبرت و تلاش ہووے۔ سو الحمدللہ آپ کو تنبّہ ہوا۔ اب بندہ نے بھی ظاہر کر دیا۔ اب صریح لکھتا ہوں کہ راہ سنت میں فتور نہ ہونا چاہیے کمال طریقت و شریعت یہی ہے۔ ورنہ کشف و کرامات، خرق عادات خلاف شرع کے ساتھ کچھ وقع (وقعت) نہیں رکھتے۔

افلاس میراث انبیاء علیہم السلام ہے اس پر رضا دینا چاہیے (راضی رہنا چاہیے) کوئی جزع فزع نہ ہووے۔

.... جن کو بارہ تسبیح اور پاس انفاس تلقین کیا ہے اور وجد کی حالت ہے، ان کو کچھ درود شریف کی تسبیح بھی بتاؤ کہ سکون ہو۔ اور اگر مولوی عبدالسبحان کو شوق شغل کا ہو تو یہ دونوں شغل ان کو بھی بتا دویں۔ مگر ایسا نہ ہو کہ روزگار سے جاتے رہیں۔ معاش کا معاملہ بھی نازک ہے۔ لہٰذا اول پاس انفاس بتا دینا کہ اس کی مشق کریں۔ پھر اگر مناسب ہو تو بارہ تسبیح بتا دیں۔ ذکر جہر نہایت گرمی لاتا اور جلد اثر کرتا ہے۔

.... آپ کے خط سے جملہ کیفیت معلوم ہوئی۔ آپ نے اپنی نسبت جو کلمات لکھے ہیں سو آدمی کو اپنے آپ کو ادنیٰ اور ہیچ جاننا بھی کمال ہے۔ جتنے بزرگ پہلے گذرے ہیں وہ سب اپنے کو ایسا ہی سمجھتے رہے ہیں۔ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ اپنے اکثر خطوط میں اپنی نسبت یہ تحریر فرماتے ہیں ؎

سودہ شد از سجدۂ پیش بتاں پیشانیم

اور اکثر جگہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ تمہ بہ رسید بوئے اسلام نشنیدم ورد ئے اسلام

نہ دیدم[۱] وغیرہ وغیرہ

بس اپنے کو حقیر جاننا بھی عزت اور بزرگی ہے۔ آپ کے واسطے میں دعاء خیر کرتا ہوں۔

.... یہ مسئلہ (وحدت الوجود) بہت نازک اور پیچیدہ ہے۔ اس میں لب کشائی کرنا اور زیادہ گھسنا مناسب نہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ یہ مسئلہ فی نفسہٖ حق ہے۔ حضرت شیخ قدس سرہٗ (شیخ محی الدین ابن عربی) جس جگہ اس مسئلہ کا تذکرہ کرتے ہیں تو یہ بھی لکھ دیتے ہیں کہ الرَّبُّ رَبٌّ والعَبدُ عَبدٌ وشتّانَ ما بَینَهُما[۲]۔ بس اس مسئلہ میں جبکہ بڑے بڑوں سے بھی زلّت (لغزش) ہوگئی ہے۔ تو اس میں ذرا سوچ سمجھ کر لب کھولنا چاہیے ——— والسلام

مولانا صادق الیقین کرسوئیؒ کے نام[۳]

(از بندہ رشید احمد عفی عنہ بعد سلام مسنون الاسلام مطالعہ فرمایند ———

آپ کا خط اس سے پہلے اور ایک خط آج پہونچا۔ آپ کا حال معلوم کرکے رنج ہوا۔ آپ گھبراویں نہیں اور مریضہ کے علاج میں بدل مصروف رہیں۔ آدمی کو راضی برضائے الٰہی رہنا چاہیے۔ گھبرانے سے کچھ نہیں ہوتا ....

---

[۱] (ترجمہ) عمر ختم ہوگئی۔ نہ بولنے اسلام کو میں نے نہیں سونگھا اور نہ بولے اسلام کو میں نے نہیں دیکھا۔

[۲] (ترجمہ) رب رب ہے اور بندہ بندہ ہے۔ اور دونوں کے درمیان میں بہت بڑا فرق ہے۔

[۳] الشیخ العالم الصالح صادق الیقین بن سراج الیقین الحنفی الکرسویؒ

آپ کرسی ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ بچپن میں قرآن مجید حفظ کیا۔ اور ابتدائی تعلیم کے بعد دیوبند چلے گئے۔ وہاں حضرت شیخ الہندؒ وغیرہ سے تعلیم حاصل کی۔ پھر گنگوہ پہنچ کر حضرت گنگوہیؒ سے حدیث پڑھی۔ پھر حضرت گنگوہیؒ کی رہنمائی میں سلوک طے کرکے اجازت وخلافت حاصل کی۔ اپنے والد ماجد کے ساتھ ۱۳۲۳ھ میں حج و زیارت کے لیے حجاز گئے۔ حج کے بعد بیمار ہوئے اور مکہ معظمہ میں ۳ محرم ۱۳۲۴ھ کو انتقال کیا۔ (نزہۃ الخواطر جلد ۸)

.... ایک نیا حادثہ واقع ہوا کہ حکیم ضیاء الدین صاحب رامپوری[1] نے ۲۸ رمضان کو اس دنیا سے انتقال کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ ان کی مفارقت سے ہم کو سخت رنج ہے۔

آج آپ کا خط بعد انتظار کے پہونچا۔ حال دریافت ہوا .... تم اپنے کام میں لگے رہو۔ حق تعالیٰ سے امید باندھے رکھو بندہ سے جس قدر ہو سکے وہ سراسر رحمت ہے مسعود احمد سعید احمد سب اچھے ہیں۔ آج ہی مولوی محمد یحییٰ صاحب (کاندھلوی[2]) حسب طلب اپنے والد کے دہلی گئے ہیں۔ آپ اپنے والد صاحب کا حال تحریر کریں کہ شکایت بیماری کی کیسی ہے۔

(یکم رجب المرجب سنہ ۱۳۱۵ھ یوم شنبہ)

---

[1] حکیم ضیاء الدین صاحب رام پور منہیاران ضلع سہارنپور کے رہنے والے تھے۔ حضرت حافظ ضامن شہیدؒ سے بیعت تھے۔ بعد میں حضرت حاجی صاحب سے اصلاح کا تعلق پیدا کیا اور ان کے خلیفہ مجاز ہوئے۔ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبر رہے ہیں۔ تاریخ وفات اور مزید حالات اس وقت دستیاب نہ ہو سکے۔

[2] حضرت مولانا محمد یحییٰ ابن حضرت مولانا محمد اسمٰعیل جھنجھانوی ثم کاندھلویؒ (م سنہ ۱۳۳۴ھ)

آپ حضرت گنگوہی قدس سرہ کے خاص مرید و شاگرد و مقرب خادم اور صاحب البستر تھے۔ حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کے بڑے بھائی تھے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم آپ کے باکمال اور بلند پایہ صاحبزادے ہیں۔ آپ کی عظیم شخصیت کے پیش نظر ایک مستقل مقالہ درکار ہے جس میں آپ کے اخلاق و عادات اور روحانی و علمی کمالات اور سیرت سازی کے تمام گوشے واضح کیے جائیں۔ ویسے آپ کے حالات بہت سی کتابوں اور رسالوں میں موجود ہیں اور حضرت شیخ الحدیث کی آپ بیتی میں بھی آپ سے متعلق بڑی اہم اور قیمتی معلومات آگئی ہیں۔ مگر ضرورت ہے کہ ان سب حالات کو یکجا کر کے ایک خاص ترتیب کے ساتھ مرتب کیا جائے۔

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

تصوّف و احسان

حقیقت — اور وسائل و اصطلاحات کا حجاب

[عمر کے لحاظ سے بلکہ ایک "عزیز مکرم" اور مقام کے لحاظ سے "برادر محترم" صوفی محمد اقبال صاحب ہوشیارپوری مہاجر مدنی نے جو مخدومنا شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہٗ کے خواص اہل تعلق میں سے ہیں اور بفضل اللہ تعالیٰ مجاز بھی ہیں، تصوف و سلوک اور اصلاح و تزکیہ سے متعلق حضرت شیخ الحدیث کے اُن ملفوظات و افادات کو جمع کیا ہے جو انھوں نے مدینہ طیبہ کی حضرت شیخ کی مجالس میں خود سنے یا اُن کی "آپ بیتی" سے انتخاب کیے۔ پچھلے دنوں رفیق محترم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدینہ طیبہ تشریف لے گئے، تو صوفی محمد اقبال صاحب نے وہ ملفوظات و افادات مولانا کو سنائے۔ مولانا نے اُس کے مقدمہ کے طور پر مندرجہ ذیل مقالہ لکھا اور اس کی نقل الفرقان میں اشاعت کے لیے عنایت فرمائی۔ اللہ تعالیٰ ناظرین کو قدر و استفادہ کی توفیق دے۔ — نعمانی]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مذاہب، اخلاقیات، تعلیم و تربیت، اصلاح و تجدید اور علوم و فنون سب کی تاریخ میں دو مرحلے بڑے سخت پیش آئے ہیں اور ان سے ان میں سے کسی کو مفر نہیں۔

ایک جبکہ وسائل مقاصد بن جاتے ہیں، دوسرے جب اصطلاحات، حقائق کے لیے حجاب ہو جاتی ہیں، وسائل اور اصطلاحات دونوں نہایت ضروری اور بالکل قدرتی اور طبعی چیزیں ہیں ان کے بغیر ان مقاصد عالیہ کی تبلیغ و توسیع اور تشریح و تفہیم عام طور پر ممکن نہیں ہوتی، لیکن وسائل

ہوں یا اصطلاحات، مقاصد و حقائق کے لیے ان کا درجہ خادم و معاون کا ہے، ان کو وقتی طور پر ایک ضرورت کی تکمیل کے لیے اختیار کیا جاتا ہے اور بعض اوقات ان پر مقاصد و حقائق ہی کی طرح زور دیا جاتا ہے اور ان کا مطالبہ کیا جاتا ہے، لیکن ان میں سے ہر فن کا مجتہد جب ضرورت سمجھتا ہے اُن سے نہ صرف خود استغناء کرتا ہے بلکہ بعض اوقات بطور علاج ان کے ترک کا بھی حکم دیتا ہے اور وہ ان کا محکوم ہونے کے بجائے ان کا حاکم ہوتا ہے، وہ اس کا بھی لحاظ رکھتا ہے کہ وہ اس تناسب سے آگے بڑھنے نہ پائیں کہ بجائے مفید ہونے کے مضر اور موصل الی المطلوب ہونے کی بجائے سدِّ راہ اور طریق کے رہزن ثابت ہوں۔

لیکن اس تاریخی حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ان مقاصد عالیہ کو یہ ابتلاء بار بار پیش آیا ہے کہ وسائل مقاصد بن گئے ہیں اور اصطلاحات نے حقائق پر ایسے دبیز پردے ڈال دیے ہیں کہ وہ نہ صرف یہ کہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے بلکہ اُن سے اُن تلخ تجربوں اور غلطیوں کی بناء پر جو ان اصطلاحات کے علمبرداروں سے سرزد ہوئیں ایسی شدید غلط فہمیاں پیدا ہوئیں کہ حق جُو اور سلیم الفطرت انسانوں کی ایک بڑی تعداد کو ان مقاصد اور حقائق ہی سے ایسی وحشت اور بیزاری پیدا ہو گئی کہ ان کو ان مقاصد کے حصول و تکمیل اور ان حقائق کے قدر و اعتراف پر آمادہ کرنا ایک نہایت دشوار کام بن گیا۔ جب ان کے سامنے ان مقاصد کی تحصیل کی ضرورت پر تقریر کی جاتی یا ان کو ان کے بارے میں مطمئن کرنے کی کوشش کی جاتی تو وسائل کے وہ پہاڑ ان کے سامنے آکر کھڑے ہو جاتے جن کے بارے میں خام اور غیر محقق داعیوں نے سخت مبالغہ اور غلو سے کام لیا تھا اور ہر شخص سے اُن کے بارے میں بے جا اصرار کیا تھا اور وہ انھیں میں اس طرح الجھ کر رہ گئے تھے کہ مقصود ہی بالکل فراموش اور نظر انداز ہو گیا تھا، اسی طرح جب ان حقائق کی دعوت دی گئی جن کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں اور جو بدیہیات میں داخل ہیں تو وہ اصطلاحات ان کے لیے حجاب بن گئیں جن کے بارے میں نہ صرف یہ کہ اختلاف کی گنجائش تھی بلکہ وہ خاص ماحول مخصوص حالات اور عام طور پر بہت بعد کے زمانے میں ان حقائق کو ذہن کے قریب کرنے کے لیے اور خاص مصالح کے ماتحت وضع کی گئی تھیں۔ ان حقائق کے ابتدائی علم بردار جن کی زندگی ان حقائق کی سچی تصویر تھی ان اصطلاحات سے ناآشنا تھے، انھوں نے ان حقائق کو سمجھانے اور ذہن نشین کرنے

کے لیے دوسرے ہی الفاظ اور اسالیب اختیار کیے تھے، صرف، نحو، قواعدِ زبان، علومِ بلاغت سے لے کر حقیقت، معرفت، اصلاحِ باطن، اور تزکیۂ نفس تک جس کی تاریخ دیکھی جائے اور اس فن کے متقدمین اور متاخرین کا مقابلہ کیا جائے تو یہ حقیقت سب جگہ نظر آئے گی کہ متقدمین وسائل پر حاکم، متاخرین ان کے محکوم، محققین حقائق کے داعی و مبلغ اور غیر محقق اصطلاحات کے پیرو و پرستار اور ان کے اسیر و گرفتار ہیں، یہ مقاصدِ عالیہ دینیات و اخلاقیات اور علوم و فنون کا ایک ایسا المیہ اور ان کے طالبین کے لیے امتحان و آزمائش کا ایسا مرحلہ ہے جو ہر دور میں پیش آیا ہے۔

تصوف کے معاملہ میں بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ جہاں تک اس کے مقصد و حقیقت کا تعلق ہے وہ ایک متفق علیہ اور بدیہی حقیقت ہے لیکن اس کو انھیں دو چیزوں نے نقصان پہونچایا — ایک وسائل کے بارے میں غلو اور افراط سے کام لینا۔ دوسرے اصطلاحات پر غیر ضروری حد تک زور دینا اور اس پر بے جا اصرار کرنا۔ اگر کسی سے پوچھا جائے کہ اخلاص اور اخلاقِ حسنہ کی تحصیل ضروری ہے کہ نہیں، یقین کا پیدا ہونا مطلوب ہے یا نہیں، فضائل سے آراستہ ہونا اور رذائل سے پاک ہونا حسد، کینہ، ریا، عجب، کبر، حبِ مال، حبِ جاہ اور دوسرے اخلاقِ ذمیمہ سے نجات پانا، نفسِ امارہ کی شدید گرفت سے خلاصی پانا کسی درجہ میں ضروری یا مستحسن ہے یا نہیں؟ نماز میں خشوع و خضوع، دعا میں تضرع و ابتہال کی کیفیت، محاسبہ نفس کی عادت اور سب سے بڑھ کر اللہ و رسول کی محبت کی حسی حلاوت و لذت کا حصول یا کم سے کم اس کا شوق و اہتمام، صفائی معاملات، صدق و امانت اور حقوق العباد کی اہمیت اور نفس پر قابو رکھنا، غصہ میں آپے سے باہر نہ ہو جانا کسی درجہ میں مطلوب ہے یا نہیں؟ تو ہر سلیم الفطرت انسان اور خاص طور پر وہ مسلمان جس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہوئی نہیں ہے یہی جواب دے گا کہ یہ چیزیں نہ صرف مستحسن بلکہ شرعاً مطلوب ہیں اور سارا قرآن اور حدیث کے دفتر اس کی ترغیب و تاکید سے بھرے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر کہا جائے کہ انھیں صفات کے حصول کا ذریعہ وہ طریق عمل ہے جس کو بعد کی صدیوں میں تصوف کے نام سے پکارا جانے لگا اس کے سنتے ہی بعض لوگوں کی پیشانی پر شکن پڑ جائے گی اس لیے کہ اس اصطلاح سے ان کو وحشت اور اس کے بعض بزعمِ خود غلط علم بردار وں اور دعوے داروں کے متعلق ان کے تجربے نہایت تلخ ہیں، ان کے حافظہ میں

اُس وقت وہ واقعات ابھرتے ہیں جو اُن کو معاملہ پڑنے پر یا اُن کو قریب سے دیکھنے پر ان کے ساتھ پیش آتے ہیں، لیکن یہ صرف تصوف ہی نہیں ہر علم و فن، ہر اصلاحی دعوت اور ہر نیک مقصد کا حال ہے کہ اس کے حاملین و عاملین میں اور اس کے داعیوں اور دعوے داروں میں اصلی و مصنوعی، محقق و غیر محقق، پختہ و خام، یہاں تک کہ صادق و منافق پائے جاتے ہیں، اور ان دونوں نمونوں کی موجودگی سے کوئی حقیقت بین انسان بھی اس ضرورت کا منکر اور سرے سے اُس فن کا مخالف نہیں بن جاتا۔ دنیاوی شعبوں کا بھی حال یہی ہے کہ تجارت ہو یا زراعت، صنعت ہو یا ہنر، ہر ایک میں کامل و ناقص اور رہبر و رہزن دونوں پائے جاتے ہیں، لیکن دین و دنیا کا نظام اس طرح چل رہا ہے کہ آدمی اپنے کام سے کام رکھتا ہے اور ناقصوں یا مدعیوں کی وجہ سے اس دولت سے محرومی اور مقصد سے دست برداری اختیار نہیں کرتا اور کسی اصطلاح سے عدم تفاق کی وجہ سے وہ اصل حقیقت کو نہیں ٹھکراتا۔ شاعر نے صحیح کہا ہے کہ

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے گہر سے کہ صدف سے

تصوف کے سلسلے میں دو گروہ پائے جاتے ہیں، ایک وہ جو تمام اجزاء کو علاحدہ علاحدہ تسلیم کرتا ہے لیکن جب اس کے مجموعے کو کوئی نام دیدیا جاتا ہے تو وہ اس سے انکار کر دیتا ہے، یعنے اوپر جن مقاصد و صفات کا ذکر کیا ہے وہ تقریباً سب لوگوں کو علاحدہ علاحدہ تسلیم ہیں لیکن جب کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگوں نے کسی وجہ سے اس کے مجموعہ کا نام تصوف رکھ دیا ہے تو فوراً تیوری پر بل پڑ جاتے ہیں اور وہ کہنے لگتے ہیں ہم تصوف کو نہیں مانتے اور تصوف نے بڑا نقصان پہونچایا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو اگر کوئی اسی حقیقت کا نام بدل کر پیش کرے اس کو قبول کر لیتا ہے مثلاً کہا جائے کہ قرآن مجید کی اصطلاح میں اس کا نام تزکیہ، حدیث کی اصطلاح میں اس کا نام احسان اور بعض علماء متاخرین کی اصطلاح میں اس کا نام فقہ باطن ہے تو وہ کہتے ہیں اس سے اختلاف کی کوئی وجہ نہیں اور یہ سب چیزیں منصوص ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت تک کی لکھی ہوئی ساری کتابوں میں نہ ترمیم ہو سکتی ہے اور نہ زبان خلق کو جو نقارۂ خدا کہی گئی ہے روکا جا سکتا ہے ورنہ اگر ہمارے اختیار کی بات ہوتی تو ہم اس کو تزکیہ و احسان ہی کے لفظ سے یاد کرتے اور تصوف کا لفظ ہی استعمال نہ کرتے، لیکن اب اس کا

معروف نام یہی پڑ گیا ہے اور یہ اسی فن کی خصوصیت نہیں علوم و فنون کی ساری تاریخ اسی طرح مروجہ اصطلاحات سے پُر ہے، محققین فن نے ہمیشہ مقاصد پر زور دیا اور وسائل کو وسائل ہی کی حد تک رکھا، اس طرح انھوں نے بڑی جرأت اور بلند آہنگی سے ان چیزوں کا انکار کیا جو اس کی روح و مغز اور اصل مقاصد سے نہ صرف خارج بلکہ ان کے منافی اور اکثر اوقات ان کے لیے مضر ثابت ہوتی ہیں۔ تاریخ اسلام میں کوئی دور ایسا نہیں گذرا کہ اس فن کے داعیوں اور معلموں اور اہل تحقیق نے مغز و پوست حقائق و اشکال اور مقاصد و رسوم میں فرق نہ کیا ہو۔

پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے لیکر مجدد الف ثانیؒ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ، حضرت مولانا رشید احمدؒ گنگوہی اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سب نے قشر و لباب، مقصود و غیر مقصود میں پوری وضاحت کے ساتھ امتیاز پر زور دیا اور اُن رسومات کی اس شدت سے تردید کی جو غیر مسلموں کے اختلاط یا صوفیائے خام کے اثر سے داخل ہو گئی تھیں اور ان کو تصوف و طریقت کا جزو سمجھ لیا گیا تھا، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی "فتوح الغیب" ہو یا "غنیۃ الطالبین" یا شیخ شہاب الدین سہروردی کی "عوارف المعارف" حضرت مجدد صاحب کے مکتوبات امام ربانی ہوں یا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی تصنیفات یا حضرت سید احمد شہید کی صراط مستقیم، حضرت گنگوہی کے مکتوبات ہوں یا مولانا تھانوی کی تربیت السالک، و قصد السبیل وغیرہ، ہر جگہ یہ مضامین بکثرت ملیں گے۔ ان حضرات نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیا ہے اور جہاں تک حضرت شاہ ولی اللہ کا تعلق ہے انھوں نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ یہ نسبت ہو فیہ کبریت احمر است و رسوم ایشاں ہیچ نیرزد (صوفیائے کرام کی نسبت باطنی تو نعمت عظمیٰ و کیمیا ہے لیکن ان کے رسوم (جن کا شریعت سے ثبوت نہیں) کوئی قیمت نہیں رکھتے)، اسی طرح ان سب حضرات نے بلا استثناء اخلاق و معاملات و حقوق العباد کی اہمیت پر پورا زور دیا ہے اور اس کو اصلاح و قرب کے لیے شرط قرار دیا ہے ان حضرات کی تصانیف بھی اس مضمون سے بھری ہوئی ہیں اور ان کی مجالس اس تذکیر و تبلیغ سے ہمیشہ معمور ہیں۔ ہم نے جن بزرگوں کا زمانہ پایا اور جن کی خدمت میں پہونچنے کی سعادت حاصل ہوئی اور ان کو دیکھ کر تصوف کے قائل اور معتقد ہوئے، ان کو ہم نے تصوف و طریقت ہی کا نہیں دین و شریعت کا لب لباب پایا، ان کے اخلاق اخلاق نبوی کا پرتو، ان کے

معاملات واعمال اور ان کی زندگی شریعت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی اور اس کی ترازو میں تلی ہوئی دیکھی، ان کو ہمیشہ مقاصد و وسائل کے درمیان فرق کرتے ہوئے، اصطلاحات سے مستغنی ہو کر اور اکثر ان کو فراموش کر کے حقائق پر زور دیتے ہوئے دیکھا، رسوم سے بے پرواہ، بے گانہ اور بدعات کا سخت مخالف اور منکر پایا، اُن کے اتباع سنت کا دائرہ صرف عبادات نہیں بلکہ عادات و معاملات تک وسیع اور محیط پایا، وہ اس فن کے مقلد نہیں بلکہ مجتہد تھے جو اپنی خداداد بصیرت اور طویل تجربے سے اس فن میں کبھی کبھی انتخاب اور کبھی حذف و ترمیم سے کام لیتے اور ہر ایک کے مزاج کے مطابق نسخہ تجویز کرتے اور معالجہ فرماتے اور علاج و پرہیز میں طبائع و مشاغل و حالات کا پورا لحاظ رکھتے۔ جو مصلحین و معالجین اپنے فن کے محکوم نہیں حاکم ہوتے ہیں اور جن کے سامنے اصل مقصود فائدہ اور مریض کی صحت ہوتی ہے نہ کہ لکیر کے فقیر بننا اور رٹے ہوئے سبق کا دہرا دینا۔ اُن حضرات کے نزدیک اخلاق کی اصلاح اور معاملات کی صفائی، طبیعت میں اعتدال کا پیدا ہونا، ضبط نفس اور ایثار وانقیاد، اطاعت اور ہر چیز میں اخلاص و رضائے الٰہی کی طلب تصوف کا اصل مقصود اور اذکار و مجاہدات و صحبت شیخ حتیٰ کہ بیعت و ارادت کا اصل فائدہ ہے۔ اگر یہ حاصل نہیں تو یہ ساری محنت گویا کندن و کاہ برآوردن کے مرادف ہے اور اس شعر کے مصداق ہے

کہ خواجہ پندارد کہ مرد واصل است
حاصل خواجہ بجز پندار نیست

پیش نظر رسالہ اس سلسلۃ الذہب کی ایک قیمتی کڑی ہے جس میں اپنے وقت کے ایک مصلح و مربی اور شیخ زمانہ نے حقائق کا اظہار اور اصل مقاصد کی پردہ کشائی فرمائی ہے اور اُن غلط فہمیوں کو دور کیا ہے جو اس راہ کے مبتدیوں اور خام کار صوفیوں کو پیش آتی ہیں اور کبھی مستقل ارشادات و ذاتی تجربات کے ضمن میں، کبھی اپنے مشائخ اور بزرگوں کی حکایات کے ضمن میں تصوف کا لب لباب بیان فرمایا ہے اور ان مغالطوں اور خود فریبیوں کا پردہ چاک کیا ہے جن میں اچھے اچھے لوگ گرفتار نظر آتے ہیں، نیز شیخ سے استفادہ کے ان آداب و شرائط کا ذکر کیا ہے جن کے بغیر طویل صحبت اور زیادہ سے زیادہ اظہار عقیدت کے باوجود بھی حقیقی نفع نہیں پہنچتا۔ برادر عزیز مولوی محمد اقبال ہوشیارپوری ہم سب کے شکریہ اور دعا کے مستحق ہیں کہ انہوں نے حضرت شیخ کے ان ملفوظات و

افادات کو یکجا جمع کردیا جو مسجد نبوی کے زیر سایہ مدینہ طیبہ کی پاک سرزمین پر سلفت یذ نفس میں انھوں نے سنے یا حضرت کی آپ بیتی سے انتخاب کیے، امید ہے کہ ان کا مطالعہ ناصحین، سالکین اور مخلصین و صادقین سب کے لیے مفید، چشم کشا و بصیرت افزا ثابت ہوگا جو اس طریق کے اصل مقاصد اور مشائخ کے ساتھ تعلق کے اصل منافع کے جویا ہیں، اور اپنی اصلاح و تربیت کے لیے فکرمند اور خدا کے قرب و رضا کے آرزومند ہیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی یہ مساعی مشکور اور ان کا یہ عمل مفید و مقبول ہو۔

مدینہ منورہ، ۲۴ ربیع الاول ۱۳۹۶ھ

تصوف کیا ہے

مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، اور مولانا محمد اویس ندوی کی مشترکہ تصنیف۔

تصوف کے موضوع پر یہ کتاب اپنے اختصار کے باوجود انصاف و تحقیق اور مباحث کے سلجھاؤ کے لحاظ سے اپنے موضوع میں بہت ممتاز ہے۔ قیمت مجلد صرف -/۵

مکتوبات تصوف

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کے ان گرانقدر مکاتیب کا مجموعہ جن میں سلوک و احسان کا آسان راستہ، اخلاص نفس، ذکر کی تلقین، اہتمام دنیا کی زیاں کاری اور آخرت کی فکرمندی کو دلنشین اور موثر انداز میں قرآن حکیم اور ارشادات نبوی کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔

قیمت جلد اول -/۸ دوم جلد -/۴ سوم جلد -/۳

تجلیات ربانی

تلخیص و ترجمہ از: مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ان مکاتیب میں احسان و تصوف، تعمیر باطنی، حق و باطل میں امتیاز، جہاد فی سبیل اللہ اور اقامت دین، وترویج شریعت کی ترغیب اور امت مسلمہ کی راہنمائی کا وہ سامان موجود ہے جس کی صدائے بازگشت نے گذشتہ صدیوں میں امت مصطفویہ کے حق میں اکسیر کا کام انجام دیا ہے۔ حصہ اول مجلد ۱۳/۵۰

شریعت اور طریقت

از افادات حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی

یہ کتاب اسلامی تصوف و سلوک کے اصول و فروع کا ایک جامع و مدلل ذخیرہ ہے شاید ہی تصوف کا کوئی ایسا اہم مسئلہ ہوگا جس پر اس کتاب میں روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔ قیمت مجلد صرف -/۹

ملنے کا پتہ

کتب خانہ "الفرقان" ۳۱- نیا گاؤں مغربی، لکھنؤ

مولانا حافظ محمد نعیم صدیقی ندوی، ایم۔ اے
دار المصنفین اعظم گڑھ

کردار شکنی کا المیہ

(۳)

(سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو الفرقان بابت فروری ۱۹۷۶ء)

منافقت نفاق فطرت انسانی کی ایک کمزوری اور بیماری ہے، جو اسی کی طرح پرانی اور عام ہے۔ اس بیماری کے پیدا ہونے کے لیے یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ اسلام اور کفر کی دو طاقتیں میدان میں ضرور ہوں اور ان میں کش مکش جاری ہو۔ خالص اسلام کے غلبہ اور اقتدار کی حالت میں بھی ایک ایسا گروہ پیدا ہو جاتا ہے جو کسی وجہ سے اسلام کو ہضم نہیں کر پاتا لیکن اس میں اتنی اخلاقی جرأت بھی نہیں ہوتی کہ وہ اس کا انکار اور اس سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کر سکے۔ یا اس کے مصالح اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ ان فوائد سے دست بردار ہو جائے جو اسلام کے انتساب سے اس کو کسی اسلامی سلطنت یا مسلمان سوسائٹی میں حاصل ہیں۔ اس لیے وہ ساری عمر اس دو عملی اور تذبذب کی حالت میں رہتا ہے۔ اس کی نفسی کیفیات، اس کے اعمال و اخلاق، اس کی اخلاقی کمزوری، اس کی مصلحت شناسی، موقع پرستی، زندگی سے تمتع و لطف اندوزی کا جذبہ، دنیا میں انہماک، آخرت فراموشی، اہل اقتدار کے سامنے روباہ مزاجی اور کمزوروں غریبوں پر دست درازی، "منافقین اولین" کی یاد تازہ کرتی ہے۔ (تاریخ دعوت و عزیمت ا ز ۷)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے الفوز الکبیر میں بہت صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ نفاق اور منافقین کا وجود کسی خاص زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہر زمانہ میں موجود اور زندہ رہتا ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب اپنے زمانہ کے متعلق فرماتے ہیں۔

اگر خواہی کہ از منافقاں نمونہ بینی رو در مجلس امراء و مصاحبان ایشاں را بیں کہ مرضی ایشاں را بر مرضی شارع ترجیح می دہند (مکتوبات کبیر ص ۱۲ طبع محمدی)

اگر تم اس زمانہ میں منافقین کا نمونہ دیکھنا چاہو تو امراء کی مجالس میں جاؤ اور ان کے ان مصاحبین کو دیکھو، جو ان امراء کی مرضی کو خدا و رسول کی مرضی پر ترجیح دیتے ہیں۔

محدث ابوبکر فریابی نے صفة النفاق و ذم المنافقین میں امام حسن البصری کا یہ مشہور قول نقل کیا ہے کہ

یا سبحان اللہ مالقیت ھذہ الأمة من منافق قھرھا واستأثر علیھا۔

یعنی امت میں ایسے افراد کی کمی نہیں ہے جو دل سے اسلام اور مسلمانوں کے مخلص نہیں ہیں۔ بلکہ ان کو صرف اپنے اغراض اور منافع سے دلچسپی ہے۔ ان کو آئین قرآن کے مقابلہ میں دنیوی مصالح، خواہشات نفسانی اور لذائذ جسمانی زیادہ مرغوب ہوتے ہیں۔ اور ان ہی کی تعمیل و تکمیل کے لیے وہ اسلام اور ایمان کو آڑ بناتے ہیں۔ قرآن کریم نے اخلاقیات کی اس بدترین خصلت کو خوب کھول کھول کر بیان کیا اور اس کے حاملین کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کی ہے مثلاً سورۂ توبہ کا ساتواں رکوع مکمل منافقین کی پردہ دری میں ہے۔ اسی میں ارشاد ہے۔

ویحلفون باللہ انھم لمنکم وماھم منکم ولکنھم قوم یفرقون (۱۰ - ۱۰)

اور یہ اللہ کی قسمیں کھا کھا کے اطمینان دلاتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں۔ حالانکہ وہ تم میں سے نہیں بلکہ یہ ڈرپوک لوگ ہیں۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جن لوگوں کے پاس کردار کی حجت نہیں ہوتی وہ خود کو معتبر ثابت کرنے کے لیے کثرت جھوٹی قسموں کا سہارا لیتے ہیں چنانچہ قرآن نے منافقین کے متعلق جگہ جگہ واضح کیا ہے کہ یہ اپنے اخلاقی خلاء کو جھوٹی قسموں سے پُر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

وہ مسلمانوں کو مطمئن رکھنے کے لیے قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتے کہ ہم آپ ہی لوگوں میں سے ہیں۔ ہمارے بارہ میں کسی کو کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ قرآن نے کہا کہ یہ ہرگز تم میں سے نہیں ہیں بلکہ یہ محض ڈر کے سبب سے تمہارے ساتھ وابستہ ہیں، کیونکہ کفار و مشرکین کا حشر یہ دیکھ چکے، یہود و نصاریٰ کا انجام بھی ان کے سامنے ہے۔ اب کوئی راہ فرار باقی نہ رہنے کے باعث مسلمانوں

کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں، اگر آج انھیں اپنے مفادات کے ساتھ گھس بیٹھنے کی کوئی جگہ مل جائے، تو ایک دن بھی مسلمانوں کے ساتھ رہنا پسند نہ کریں۔

اسی طرح قرآن پاک کی بکثرت آیات میں نفاق کی حقیقت و ماہیت کی وضاحت اور منافقوں کی سازشوں سے اہل ایمان کو چوکنا رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ منافقت کے محرکات غیر منتہی ہیں۔ لیکن ان سب کی تہ میں صرف ایک ہی روح کارفرما رہتی ہے، یعنی قرآن پر عدم یقین اور دنیا پرستی۔ یہ صحیح ہے کہ آغاز اسلام میں منافقین کی جس خاص قسم کا وجود تھا اب وہ نہیں پائی جاتی۔ لیکن منافقین کے دوسرے اقسام کے گروہ ہر زمانہ میں موجود رہے ہیں۔ اور اب بھی موجود ہیں۔ جو ملت اسلامیہ کی تباہی و بربادی کا کام نہایت ہوشیاری کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔

عصر حاضر میں نفاق کی کچھ نئی شکلیں اور مظاہر

آج کچھ منافق اس قسم کے بھی ملتے ہیں جن کے لیے سب سے مقدم چیز اپنے ذاتی مفادات اور دنیوی فائدے ہوتے ہیں۔ انھیں دوسرے الفاظ میں موقع پرست بھی کہا جا سکتا ہے۔ ان کو حق و باطل کے جھگڑے سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ صرف اپنا شخصی مفاد عزیز ہوتا ہے۔ اور اس کے حصول کی خاطر وہ مسلمانوں اور کفار دونوں سے سٹے رہتے ہیں۔ آغاز اسلام میں ایسے منافقین بڑی تعداد میں موجود تھے۔ قرآن پاک میں ان کی ظاہری و باطنی خصوصیات کا تفصیلی ذکر ان الفاظ میں مذکور ہے۔

ومن الناس من يقول آمنا بالله	اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو دعویٰ کرتے ہیں
وباليوم الآخر وما هم بمؤمنين	کہ ہم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں
يخادعون الله والذين آمنوا	حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں۔ یہ لوگ اللہ کو اور
وما يخدعون إلا أنفسهم	ایمان لانے والوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔
وما يشعرون ...... وإذا	حالانکہ یہ خود اپنے آپ ہی کو دھوکا دے رہے
قيل لهم لا تفسدوا في الأرض	ہیں جس کا وہ شعور و ادراک نہیں رکھتے! اور
قالوا إنما نحن مصلحون	جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ

أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن
لَّا يَشْعُرُونَ ۔ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا
كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ
كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ۗ أَلَا إِنَّهُمْ
هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ
وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا
آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ
قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ
مُسْتَهْزِئُونَ ۔

(بقرہ ــ ۱)

پیدا کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو صلح کل کی
پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ یاد رکھو یہی لوگ حقیقی
مفسد ہیں۔ لیکن وہ اس حقیقت کو سمجھتے نہیں
اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (اس دورنگی
کو چھوڑ کر) اس طرح ایمان لاؤ جس طرح (مخلص)
لوگ ایمان لاتے ہیں تو کہتے ہیں کیا ہم بھی اسی
طرح ایمان لائیں جس طرح غیر مآل اندیش اور
ناعاقبت شناس لوگ ایمان لائے ہیں۔ آگاہ
رہو کہ فی الحقیقت بے وقوف اور انجام ناشناس
یہی لوگ ہیں لیکن یہ سمجھتے نہیں۔ اور جب یہ
لوگ اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی مومن ہیں اور جب اپنے شیاطین کی مجلسوں میں جا
پہنچتے ہیں تو ان سے کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔ اور ہم تو مسلمانوں سے یوں ہی مذاق کرتے
ہیں اور انہیں بے وقوف بناتے ہیں۔

ایسے لوگ اس وقت تو سراپا ایمان بن جاتے ہیں جب احکام ہلکے اور بے ضرر ہوتے ہیں۔
لیکن جہاں سخت احکام آتے اور ان کے دنیوی مفاد کو خطرہ لاحق ہوتا تو صاف کترا جاتے۔ ان کا مذکورہ
بالا برتاؤ مسلمانوں اور احکام قرآنی ہی کے ساتھ نہ تھا بلکہ خود اعدائے اسلام کے ساتھ بھی ان کے
تعلقات کی نوعیت اخلاص پر مبنی نہ تھی حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف اپنے نفس کے دوست تھے اور
اس کی خاطر مسلم و کافر دونوں کو خوش رکھنا چاہتے تھے تاکہ موقع پر ہر ایک سے حق دوستی حاصل
کریں۔ قرآن نے بڑے جامع و مانع الفاظ میں ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے۔

مُّذَبْذَبِينَ بَيْنَ ذَٰلِكَ لَا إِلَىٰ
هَٰؤُلَاءِ وَلَا إِلَىٰ هَٰؤُلَاءِ

(نساء ــ ۲۱)

کفر و ایمان کے بیچ میں پڑے لٹک رہے
ہیں۔ نہ مسلمانوں کی طرف ہیں نہ کافروں
کی طرف

اور یہی اسی مذبذب پالیسی کو صلح کل قرار دے کر وہ دعویٰ کرتے تھے کہ انما نحن

مصلحون (ہم تو سراپا اصلاح ہیں) اس دورخی پالیسی کو نباہنا ان کی طلاقت لسانی پر موقوف تھا۔ قرآن اس دورنگی کو ترک کرنے کا بار بار مطالبہ کرتا تھا

یہ روح نفاق آج بھی کسی نہ کسی قالب میں موجود ہے مسلمانوں کے مجمع میں بانگ دہل اس کا اعلان کرنے والے بہت سے لوگ ملیں گے کہ میں سب سے پہلے مسلمان ہوں اور بعد میں کچھ اور۔ لیکن اعدائے اسلام کے سامنے اسی زبان اور حلق کی اسی طاقت کے ساتھ وہی لوگ یہ اظہار کریں گے کہ میں پہلے فلاں ہوں اور پھر مسلمان۔ اس قسم کے لوگوں کے لیے احادیث میں وعید شدید آئی ہے۔ حضرت عمار سے مروی ہے کہ

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اکرم کا ارشاد ہے کہ جو شخص دنیا میں
من لہ وجھان فی الدنیا کان	دورخا ہوگا۔ قیامت کے دن اس کی آگ
لہ یوم القیامۃ لسانان من نار	کی دو زبانیں ہوں گی۔
(ابوداؤد: باب ذی الوجھین)	

حضرت ابوہریرہ سے مروی ایک دوسری صحیح حدیث میں ہے

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اکرم نے ارشاد فرمایا قیامت کے روز
تجدون شر الناس یوم القیامۃ	سب سے بڑا وہ شخص ہوگا جو دورخا منافق
ذا الوجھین الذی یأتی ھؤلاء	ہے یعنی جماعت کے پاس ایک رنگ میں
بوجہ وھؤلاء بوجہ	آتا ہے اور دوسری جماعت کے پاس دوسرے
(بخاری: باب ما قیل فی ذی الوجھین)	رنگ میں۔

علاوہ ازیں منافق صفت لوگوں کی ایک خاصی تعداد ایسی بھی ملتی ہے جو دینی احکام و مناسک کا مذاق اڑاتے، اسلامی عبادات کا استہزاء کرتے اور خود مسلمانوں کے اوضاع و اطوار اور ان کے اعمال و کردار پر پھبتیاں کستے ہیں مثلاً ایک گروہ کے متعلق قرآن کہتا ہے:

واذا نادیتم إلی الصلوٰۃ	اور جب تم نماز کے لیے اذان دیتے ہو تو
اتخذوھا ھزواً ولعباً۔	یہ لوگ اس کو مذاق اور کھیل بنا لیتے
(مائدہ — ۹)	ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی آیت بالا کی تفسیر میں لکھتے ہیں :-

"جو لوگ شعائر اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ ہرگز اس لائق نہیں ہیں کہ کوئی مسلمان ان سے دوستی رکھے۔ اگر کوئی شخص ان سے دوستی رکھتا ہے اور ایمان کا مدعی بھی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ غیرت ایمانی سے خالی ہے۔ اور غیرت ایمانی سے خالی شخص اپنے ایمان کی کبھی حفاظت نہ کر سکے گا۔" (تدبر قرآن ۲/۳۲۲)

ایسے منافقوں کے بارے میں سورہ نساء میں شدید ترین الفاظ میں وعید آئی ہے۔

بشر المنافقين بأن لهم عذابا	منافقوں کو خوشخبری دے دو کہ ان کے لیے ایک
اليما الذين يتخذون الكافرين	دردناک عذاب ہے۔ اُن کے لیے جو مسلمانوں
اولياء من دون المؤمنين	کے مقابلہ میں کافروں کو دوست بنائے
ايبتغون عندهم العزة	ہوئے ہیں۔ کیا ان کے ہاں عزت ڈھونڈ
فان العزة لله جميعا -	چاہتے ہیں۔ عزت تو سراسر اللہ ہی کے لیے ہے۔

یعنی یہ منافقین مسلمانوں کے مقابل میں کفار کو اپنا دوست اور کارساز بنائے ہوئے ہیں۔ ان کی نگاہوں میں عزت اور سرخروئی حاصل کرنے کے آرزو مند ہیں، حالانکہ عزت و ذلت سب خدا کے اختیار میں ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔ یہ منافق صفت اُن مجالس میں حاضری دیتے ہیں جہاں اللہ کی آیات و احکام کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن میں یہ صریح ہدایت نازل ہو چکی ہے کہ جب دیکھو کہ اللہ کی آیات کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو ایسے لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھو، یہاں تک کہ یہ تمسخر کرنے والے کسی اور بات میں لگ جائیں۔ اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو وہ بھی ان ہی کا ساتھی بن جاتا ہے۔ اللہ جل شانہ ایسے منافقوں کو ان ہی کافروں کے ساتھ دوزخ میں جمع کرے گا۔

اس سے یہ بھی منکشف ہوا کہ جن مجلسوں میں اللہ کے دین اور اس کی شریعت کی ہتک ہو ان میں اگر کوئی مسلمان شریک ہو تو یہ اس کی بے حمیتی اور بے غیرتی کی دلیل ہے۔ اگر کوئی شخص ان میں شرکت کو اپنے لیے وجہ عزت و شرف سمجھے تو یہ صرف بے حمیتی کی ہی نہیں بلکہ اس کے مسلوب الایمان ہونے کی بھی دلیل ہے۔ اس قسم کے منافقوں کا حشر ان ہی لوگوں کے ساتھ ہوگا۔ جن کے ساتھ خدا کے دین

کے استہزاء میں یہ سب یکساں رہے ہیں۔ (تدبر قرآن ۲/۱۰۲)

آج کا المیہ یہ ہے کہ نئی روشنی کے حامل اور جدید تعلیم یافتہ گروہ کی آزاد خیالی FREE THINKING اور عقلیت RALIONALISM کی ابتدا ہی اذان اور نماز کے تمسخر سے ہوتی ہے اسلامی سیرت وصورت کا استہزاء، شیطان، ملائکہ اور دوسری غیر مرئی چیزوں کو وہم پرستی خیال کرنا عہد جدید کا وہی نفاق ہے جس پر قرآن میں شدید وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ حقیقت آئینہ ہو جاتی ہے کہ عہد رسالت میں منافقین کا جو خاص قسم کا گروہ اسلام کے خلاف سرگرم سازش تھا۔ گو جسمانی طور پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن عملاً اس کے بہت سی دوسری قسموں کے گروہ فی زمانہ بھی اپنے کام میں مصروف ہیں۔

(جاری)

مفتی محمد رفیع اللہ صاحب

جہیز کی شرعی حیثیت

[پاکستان کے ادارہ تحقیقات اسلامی (اسلام آباد) کے ماہنامہ "فکر و نظر" کے فروری کے شمارہ میں عنوان بالا کے تحت جناب مفتی محمد رفیع اللہ صاحب کا مضمون شائع ہوا جو قابل قدر تحقیقی مضمون ہے ہم اس کا صرف وہ حصہ شائع کر رہے ہیں جس میں رسم جہیز کی اسلامی اور شرعی حیثیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔]

مسلمانوں میں جہیز کی ابتدا کب ہوئی اور کیا جہیز سنت رسولؐ ہے؟

ہم پہلے واضح کر چکے ہیں کہ ظہور اسلام سے قبل جزیرۂ عرب میں اس نام کی کوئی رسم موجود نہیں تھی بلکہ بجائے جہیز دینے کے جاہلی دور کے عرب لڑکیوں کا حق مہر تک خود کھایا کرتے تھے۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں جہیز کی رسم کب اور کیونکر پیدا ہوئی جبکہ عہد جاہلیت میں بھی یہ چیز نہیں تھی۔ اس سوال کے جواب کے لیے جب ہم ذخیرہ احادیث اور کتب تاریخ و سیرت کی ورق گردانی کرتے ہیں تو ہمیں صرف دو واقعے صدر اسلام میں ایسے ملتے ہیں جنھیں مسلمانوں میں جہیز کی ابتداء اور وجہ جواز قرار دیا جا سکتا ہے بلکہ ان میں بھی بنیادی حیثیت صرف ایک واقعہ کو حاصل ہے اور وہ ہے جگر گوشۂ رسولؐ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے جہیز کا واقعہ۔ لے دے کے اسی واقعہ کو لوگ مسلمانوں میں جہیز کی ابتداء قرار دیتے ہیں اور اسی سے اس رسم کے جائز بلکہ سنت ہونے پر استدلال کرتے ہیں۔

سب سے پہلے ہم اس واقعہ کا روایات اور تاریخی شواہد کی روشنی میں تجزیہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ کا نکاح حضرت فاطمہؓ سے کب اور کس حال میں ہوا تھا، اور پھر یہ دیکھتے ہیں کہ اس جہیز کی حقیقت کیا تھی جس کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی جاتی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ حضرت فاطمہؓ کو یہ چیزیں دینے کی وجوہ اور دلائل کیا تھے۔

یہ حقیقت دلائل و براہین کی محتاج نہیں کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ منورہ

تشریف لائے تو دوسرے مہاجرین کی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی اپنا تمام تر مال و دولت مکہ میں چھوڑ کر خالی ہاتھ مدینہ منورہ ہجرت کر آئے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کی مستقل رہائش حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دولت کدہ پر رہی۔ ۲ھ میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے رشتہ کے بارے میں کوئی جواب نہیں دیا اور دونوں حضرات کے جواب میں آپ نے خاموشی اختیار فرمائی، تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت فاطمہؓ کی بابت آپؐ کو پیغام دیا جس کو آپؐ نے شرف قبولیت بخشا۔ جب دونوں کا نکاح ہونا طے پایا تو آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ مہر ادا کرنے کے لیے کچھ پاس ہے یا نہیں؟ حضرت علیؓ نے عرض کیا، ایک گھوڑا اور ایک زرہ کے سوا میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ زرقانی میں ہے کہ آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ گھوڑے کی تو لڑائی میں ضرورت پڑے گی اس کو مت بیچو، البتہ زرہ کو فروخت کر دو۔

علامہ زرقانی نے شرح مواہب میں دو طرح کی روایات نقل کی ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ نے وہ زرہ ہی مہر میں دے دی تھی۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپؓ نے وہ زرہ حضرت عثمان غنیؓ کے ہاتھ چار سو اسی درہم (۴۸۰) میں بیچی اور اسی میں سے حضرت فاطمہؓ کا مہر ادا کیا۔

محدثین نے دونوں روایات میں اس طرح تطبیق پیدا کی ہے کہ حضرت علیؓ نے تو وہی زرہ حضرت فاطمہ کو دی تھی البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ زرہ پھر حضرت علیؓ کو دے کر فروخت کرنے کا حکم فرمایا، چنانچہ حضرت علیؓ نے اسے حضرت عثمان غنیؓ کے ہاتھ بیچ دیا۔

شرح مواہب میں ہے:

[illegible]

(زرقانی ج ۲ ص [illegible])

ان روایات سے برخلاف اقوال کی [illegible] قوی ترین یہ ہے کہ نکاح تو زرہ ہی پر ہوا تھا۔ البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حضرت علیؓ کو بیچنے کے لیے دوبارہ دیا۔ آپ نے اسے بیچ کر رقم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دی۔ [illegible] دونوں روایتوں میں اتفاق بھی ہو جاتا ہے۔

غرض حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وہ زرہ بیچ ڈالی اور قیمت لا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں پیش کی۔ تو آپؐ نے اس میں سے کچھ رقم حضرت بلالؓ کو دے کر حکم دیا کہ بازار سے خوشبو اور جہیز بھی

خود پڑھایا، پھر خود ہی نکاح پڑھایا اور حاضرین مجلس میں کھجوریں تقسیم ہوئیں۔ نکاح کے تقریباً دس گیارہ ماہ بعد رخصتی ہوئی۔ رخصتی تک حضرت علیؓ کی رہائش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہی۔ عین رخصتی کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت علیؓ نے حضرت حارثہ بن نعمانؓ کا مکان کرایہ پر لیا اور اسی مکان پر آپؐ حضرت فاطمہؓ کو رخصت کرا کر لائے۔ اس موقع پر محدثین اور مؤرخین، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت فاطمہؓ کو زندگی کی کچھ انتہائی ضروری اشیاء دینے کا ذکر کرتے ہیں، جن کی تفصیل کچھ اس طرح بیان کی جاتی ہے۔

ایک چادر، ایک چمڑے کا گدا جس میں کھجور کے درخت کی چھال بھری ہوئی تھی، دو چکیاں، ایک مشکیزہ اور دو مٹی کے گھڑے۔ (رواہ احمد، الترغیب والترہیب للمنذری ص ۲۶۰/۲۲، اصابہ ص ۳۷۹/۲۲)

اس سلسلہ میں جو دوسرا واقعہ بیان کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے حضرت زینبؓ کو ان کی شادی میں ایک قیمتی ہار دیا تھا۔ جب ان کا شوہر جنگ بدر میں گرفتار ہو کر آیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فدیہ لے کر قیدیوں کو چھوڑ رہے تھے تو حضرت زینبؓ نے اپنے شوہر کو قید سے آزاد کرانے کے لیے فدیہ میں یہی ہار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھجوا دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ ہار پہچان لیا اور صحابہ کرام سے اس کی واپسی کی سفارش فرمائی۔ چنانچہ وہ ہار حضرت زینبؓ کو واپس کر دیا گیا۔

صدر اسلام میں یہی دو واقعے جہیز کے سلسلے میں مذکور ہیں۔ ان واقعات میں بھی پہلا واقعہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے اور جہیز کے جواز بلکہ اس کے سنت ہونے پر اسی واقعہ سے استدلال کیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ صدر اسلام میں کوئی واقعہ حدیث یا تاریخ و سیرت کی کتابوں میں نہیں ملتا۔

اب اس مرحلہ پر جو اہم سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جہیز دیا تھا، تو کیا آپ کی اتباع میں دوسرے مسلمانوں کا اپنی لڑکیوں کو جہیز دینا سنت ہے، یا مسنون نہیں ہے؟

اس سوال کا جواب بعض علماء نے یہ کہہ کر نفی میں دیا ہے کہ جہیز دینا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے۔ اس لیے شادی بیاہ کے وقت لڑکیوں کو جہیز دینا سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہے۔ اور جن روایات میں جہیز دینے کا ذکر آیا ہے، ان روایات کا جواب وہ یہ کہہ کر دیتے ہیں کہ وہ آپ نے اپنی طرف سے نہیں دیا تھا بلکہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی زرہ فروخت کر دی جو مہر میں حضرت فاطمہؓ کو دینی تھی، اور رقم لا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی، تو آپ نے اسی میں سے حضرت

فاطمہؓ کے جہیز کا سامان تیار کرایا۔ چنانچہ فقہائے کرام کا وہ گروہ (جیسے امام مالکؒ وغیرہ) جو جہیز کو لڑکی پر لازم قرار دیتا ہے، دلیل میں انہی روایات کو پیش کرتا ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو المحلیٰ لابن حزم ص ۵۰۹/ ۹۲)

دوسرے حضرات اس کو صحیح تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ چیزیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے دی تھیں۔ یہ حضرات اپنی تائید میں ان روایات کو پیش کرتے ہیں جن میں جہیز دینے کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔ اسی سلسلہ میں صحیح اسناد کے ساتھ خود صاحب واقعہ حضرت علیؓ سے منقول ہے:-

عن علي قال: جهز رسول الله صلى الله عليه وسلم فاطمة في خميل وقربة ووسادة حشوها إذخر (مسند احمد ص ۹۲/۲۲، نسائی ص ۹۲/۲۲)

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جہیز میں ایک مشک اور تکیہ جس میں اذخر کی گھاس بھری ہوئی تھی اور سیاہ رنگ کی ایک چادر دی۔

یہ اور اس طرح کی دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہؓ کو رخصتی کے وقت جو کچھ آپ نے دیا تھا اپنی طرف سے عطا فرمایا تھا۔

علماء کے اس اختلاف کا اصل سبب یہ فقہی بحث ہے کہ جہیز تیار کرانا شرعاً لڑکی کی ذمہ داری ہے یا نہیں؟ جو حضرات جہیز کی تیاری لڑکی کے ذمہ قرار دیتے ہیں وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مہر کی رقم سے جہیز تیار کرایا تھا اور جو حضرات اس کو لڑکی کے ذمہ قرار نہیں دیتے وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ چیزیں آپؐ نے مہر کی رقم سے نہیں بلکہ اپنی طرف سے لیکر دی تھیں۔

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ چیزیں اپنی طرف سے لے کر دی تھیں تو بھی یہ بات قابل غور ہے کہ حضرت فاطمہؓ کو یہ جہیز دینے کی خصوصیت کیا تھی جب کہ ۲ھ میں حضرت فاطمہؓ کی شادی کے بعد ۳ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام کلثومؓ کا نکاح حضرت عثمان غنیؓ سے کر دیا تھا اور حضرت ام کلثومؓ کو آپؐ نے کوئی جہیز نہیں دیا تھا۔

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ حضرت فاطمہؓ رخصتی ہونے تک حضورؐ کے دولت کدہ پر مقیم رہیں۔ رخصتی کے وقت آپ نے محسوس فرمایا کہ حضرت فاطمہؓ جس گھر میں رخصت ہو کر جا رہی تھیں وہ گھر زندگی کی بنیادی ضروریات سے بالکل خالی تھا۔ اسی بنیاد پر آپؐ نے ان کو فوری ضرورت کی یہ چند چیزیں عطا فرمائیں، کیونکہ ضرورت کے وقت داماد کی امداد داماد کے ساتھ ساتھ اخلاقی فرض بھی ہے اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو اخلاق کے معلم عظم تھے، اس کے خلاف کیسے توقع رکھی جا سکتی ہے۔

بس معلوم ہوا کہ اس لینے دینے کا اصل سبب انتہائی احتیاج تھا۔ نہ یہ کہ اسلام میں ایک نئی رسم کی بنیاد ڈالنی تھی۔ حضرت ام کلثومؓ جس گھر میں بیاہ کر جا رہی تھیں، وہاں ان چیزوں کی ضرورت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے ان کو کوئی جہیز نہیں دیا۔

پھر مزید یہ کہ آپؐ کی حیات طیبہ میں بے شمار شادیاں ہوئیں، کسی شادی میں جہیز کا کوئی ذکر نہیں۔ آپؐ کے بعد بھی صحابۂ کرام کا یہی طرز عمل رہا۔ جس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ صحابۂ کرامؓ نے آپؐ کے اس فعل کو سنت یا واجب الاتباع نہیں سمجھا تھا، اگر شادی بیاہ کے وقت لڑکیوں کو جہیز دینے کی کوئی بھی مذہبی اور دینی حیثیت ہوتی تو صحابۂ کرام اس پر ضرور عمل کرتے جبکہ صحابۂ کرام آپؐ کی ایک ایک بات کی پیروی کو اپنی سعادت سمجھتے تھے تو اس کا یہی مطلب ہوا کہ اس رسم کی کوئی دینی اور مذہبی حیثیت اسلام کے ذہن میں نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ متاخرین علماء نے جہیز کی رسم کو زمانہ اور عرف کی پیداوار قرار دیا ہے۔

فقہ السنۃ کے مؤلف لکھتے ہیں:۔

وھذا المجرد عرف جری علیہ الناس (ج۲، ص۲۰۹) یعنی جہیز دینا محض عرف کی پیداوار ہے جسے لوگوں نے اپنا لیا ہے۔

جب اسلام دنیا کے مختلف اطراف میں پھیلتا چلا گیا، مختلف تہذیبیں اسلام کے زیر اثر آئیں تو جب تک مسلمانوں میں اسلامی حمیت کا بھرپور جذبہ موجود تھا، اسلام کسی اجنبی ثقافت و تہذیب سے متاثر نہیں ہوا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا مسلمانوں میں اسلامی حمیت کم ہوتی چلی گئی۔ اس کے بعد بہت سی اجنبی رسوم و روایات کو انھوں نے اپنی تہذیب و ثقافت کا جزو بنا لیا۔

برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کا بھی کچھ یہی حال تھا، اس علاقہ کا خاصا بڑا حصہ پہلی صدی ہجری ہی میں مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا تھا۔ کئی صدیوں تک انھوں نے شان و شوکت سے برصغیر پر نہ صرف حکومت کی بلکہ ہندوستان کو علم و ہنر اور تہذیب و ثقافت سے مالا مال کر دیا۔ مگر رفتہ رفتہ یہاں کے مسلمان حکمراں اپنے سیاسی اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے مقامی تہذیب و ثقافت کو آگے بڑھنے کی ترغیب دینے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پیدائش سے لے کر مرنے تک مقامی رسوم مسلمانوں کی زندگی کا حصہ بن گئیں اور جنوبی ایشیا کے اسلامی دور کی تاریخ پر نظر رکھنے والوں سے یہ مخفی نہیں ہے کہ کس طرح ان لوگوں نے اپنی مصلحتوں کے لیے اسلامی ثقافت کا خون کیا۔ اس لیے یہ دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ

برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں نے یہ رسم بھی اس کی موجودہ صورت میں دوسری بے شمار رسوم کی طرح یہاں کی ہندو معاشرت سے اخذ کی ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کے شادی بیاہ میں جتنی بھی رسومات ادا کی جاتی ہیں، ان میں کتنی رسوم ایسی ہیں جنہیں اسلامی رسوم کہا جا سکتا ہے؟ شادی بیاہ کے مواقع پر یہاں کے مسلمان بے شمار ایسی رسمیں بجا لاتے ہیں جن کے خالص ہندوانہ رسوم ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ برصغیر کے بعض اہل علم حضرات نے جہیز کی رسم کو بھی خالص ہندوستانی رسم قرار دیا ہے۔ مولوی سید لطف علی شاہ، ہندوستانی مسلمانوں کے شادی بیاہ میں ہندوستانی رسوم ادا کرنے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

اما جہیز بر آن اضافہ نمایند و جہیز موقوف بر دستگاہ پدر عروس است...... اما جہیز ازیں زیادہ و کم ہم می باشد۔

اور جہیز ان رسومات پر مزید اضافہ ہے اور جہیز کی مقدار دلہن کے والد کی مالی حالت پر موقوف ہوتی ہے...... جہیز اس سے کم و بیش بھی دیا جاتا ہے۔

اور آخر میں لکھتے ہیں:-

اگرچہ این فقیر بہیچ جا از رسوم غیر مشروعہ شادی ہائے مردم ہند شریک نگشتہ اما آنچہ شنفتہ قلمبند کردہ تا کہ شما از رسوم غیر مشروعہ مسلمانان ہندوستان واقف شوند (ارمغان ہندوستان)

یعنی اگرچہ یہ فقیر ہندوستانیوں کی شادی بیاہ کے غیر مشروعہ رسومات میں کہیں بھی شریک نہیں ہوا ہے تاہم جو کچھ سنا ہے وہ لکھ دیا ہے یہ محض اس لیے تاکہ آپ ہندوستانی مسلمانوں کے غیر مشروعہ رسوم سے واقف ہو جائیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں میں یہ رسم ہندو معاشرت سے لی گئی ہے اس کو حسنِ اتفاق کہیے یا شومیٔ قسمت کہ اس رسم کے جواز کے لیے اسلامی معاشرے میں بھی ایک دو مثالیں ان لوگوں کو مل گئی ہیں۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ اپنی اولاد کو کچھ دینا اسلامی تعلیمات کی رو سے نہ صرف یہ کہ جائز بلکہ مستحب ہے اور صلہ رحمی کی اسلام میں بہت تاکید آئی ہے۔ مگر غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہمارے اس رسم میں بھی مسلمان یہی سوچ کر اور اسی نیت سے کچھ دیتے ہیں ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں اس میں سوائے نمود و نمائش، مباہات اور محض ایک رسم بجا لانے کے اور کوئی نیت نہیں ہوتی۔ اولاد سے نیکی اور صلہ رحمی کا تو نام و نشان تک بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے اس بیہودہ حرکت کو اسلامی رسومات کے زمرہ میں شمار کرنا، اسلامی تعلیمات کی توہین ہے۔ اسلام کبھی ایسے لغو افعال کی اجازت نہیں دیتا۔

ڈاکٹر سمیع الحق ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی
صدر شعبۂ اردو ــــ رانچی یونیورسٹی

سورۂ فاتحہ

(آزاد منظوم ترجمہ)

مجھے اللہ رکھے اپنی پناہ میں ۔۔۔ کہ شیطانِ لعیں پیچھے پڑا ہے
شروع کرتا ہوں میں نامِ خدا سے ۔۔۔ کہ جس کی رحمتوں کا آسرا ہے

الفاتحہ

جہاں میں جس کی جو بھی خوبیاں ہیں ۔۔۔ سبھی کا مصدر و مرجع خدا ہے
جہانوں کا وہی ہے ربِّ اکبر ۔۔۔ اسی کی رحمتوں کا آسرا ہے
وہی مالک ہے بزمِ آخرت کا ۔۔۔ وہی شاہنشہِ روزِ جزا ہے

تجھی کو اے خدا ہم پوجتے ہیں ۔۔۔ اعانت کی تجھی سے التجا ہے
کرم سے اپنے ہم کو تو دکھا دے ۔۔۔ وہ رستہ جو کہ سیدھا راستا ہے
یہی جادہ کہ جس پر چلنے والا ۔۔۔ تری نعمت سے بہرہ ور ہوا ہے
نہ وہ راہِ غضب جس پر چلا جو ۔۔۔ غضب میں تیرے اے مالک پڑا ہے
نہ وہ راہِ ضلالت جس پہ چل کر ۔۔۔ جو بھٹکا وہ بھٹکتا ہی رہا ہے

آمین

Regd. No. LW/NP-62

Monthly **AL-FURQAN** 31, Naya Gaon West Lucknow (U.P.)

VOL. 44 NO. 7 JULY 1976 Phone : 25547

Cover Printed at—Shining Press, Naya Gaon, Lucknow-1

الفرقان لکھنؤ

مدیر

محمد منظور نعمانی

قوم پھر ہمت سے آگے بڑھنے لگی ہے

۱۹۷۵-۷۶ء

کالے دھن کے خلاف مہم

■ اسمگلروں کی مجرمانہ سرگرمیوں کا قلع قمع کر دیا گیا ہے۔ نامی اسمگلر جیل میں ڈال دیے گئے۔ ۴۴۲ اسمگلروں کو مفرور قرار دیا گیا اور ان کی جائداد ضبط کر لی گئی۔

■ خالی شہری زمین کی ملکیت کی حد مقرر کر دی گئی۔ مقررہ حد کے اندر بھی منتقلی ممنوع قرار دی گئی۔

■ رہائشی مکانوں کے رقبہ کی حد مقرر کر دی گئی۔ ٹیکس چوروں کو گرفت میں لینے کے لیے عالیشان و آرام دہ مکانوں کی ملکیت کا تعین کیا گیا۔ جولائی ۱۹۷۵ء سے ٹیکسوں کی چوری کے سلسلے میں چھاپے مارے گئے۔ چھاپوں کے نتیجے میں براہ راست ٹیکسوں کی وصولی میں ۲۷ء۴ فیصد کا اضافہ ہوا۔

■ ۲,۵۰,۰۰۰ افراد نے رضاکارانہ انکشاف کی اسکیم کے تحت ۱۵۸۷ کروڑ روپے سے زیادہ دولت اور آمدنی کا انکشاف کیا۔ اس سے ۲۴۹ کروڑ روپے ٹیکس کی صورت میں حاصل ہوئے۔

DAVP-76/90

۷۶/۹۰

ممالک غیر سے سالانہ چندہ
محصول ڈاک میں زبردست اضافہ کے بعد
اب نئی شرح اس طرح ہوگی
بحری ڈاک سے ۲ پونڈ
ہوائی ڈاک سے ۴ پونڈ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۱۵/-
پاکستان سے ۲۵/-
بنگلادیش سے ۱۶/-
فی کاپی ۱/۵۰

جلد (۴۴) | بابت ماہ اگست ۱۹۷۶ء مطابق شعبان المعظم ۱۳۹۶ھ | شمارہ (۸)

اگر اس دائرہ میں سُرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۵ تاریخ تک آ جائے ورنہ اگلا پرچہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۵ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آ جانا چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

(مولانا) محمد منظور نعمانی پرنٹر پبلشر و اڈیٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر "الفرقان" ۳۱۔ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا

ایک ضروری اطلاع اور معذرت

ہماری حکومت نے ناشکر؛ دوسرے ملکوں کی ڈاک کے محصول میں جو غیر معمولی اضافہ اس سال کے شروع سے کیا ہے اُس کا ذکر اپریل، مئی، جون کے مشترک شمارہ "تیسرے انتخاب نمبر" میں کیا جاچکا ہے ۔۔ اس اضافہ کے بعد صورت حال یہ ہے کہ الفرقان کے ایک عام شمارہ پر بحری ڈاک کے لیے نئے تین پیسے کا ٹکٹ لگتا تھا اب اسّی پیسے کا ٹکٹ لگتا ہے اور انگلستان وغیرہ مغربی ممالک کو ہوائی ڈاک سے بھیجے جانے والے ایک عام شمارہ پر بجائے قریباً دو روپئے کا ٹکٹ لگتا تھا اب تین روپئے بتیس پیسے کا لگانا ہوتا ہے اس مجبوری سے اب بحری ڈاک سے الفرقان منگوانے والے بیرونی حضرات کے لیے بدل اشتراک (سالانہ چندہ) ڈیڑھ پونڈ اور ہوائی ڈاک سے منگوانے والے حضرات کے لیے چار پونڈ کردینا پڑا ہے۔

ہوائی ڈاک کے محصول میں اس غیر معمولی اضافہ کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ "تیسرا انتخاب نمبر" جب تیار ہوا تو وزن کرنے سے معلوم ہوا کہ ہوائی ڈاک کے لیے ایک پرچہ پر قریباً پندرہ روپئے کے ٹکٹ لگیں گے۔ اس صورت میں صرف ہوائی ڈاک سے جانے والے پرچوں پر قریباً دو ہزار روپئے کے ٹکٹ لگانے پڑتے دفتر الفرقان اس خرچ کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا اس لیے مجبوراً یہ طے کرنا پڑا کہ یہ نمبر سب حضرات کو بحری ڈاک ہی سے بھیجا جائے اور جولائی کا شمارہ جلدی تیار کرکے ہوائی ڈاک کے خریدار حضرات کو ہوائی ڈاک ہی سے روانہ کیا جائے اور اُس میں معذرت کے ساتھ اس کی اطلاع دیدی جائے کہ تیسرا انتخاب نمبر ان کو بحری ڈاک سے بھیجا گیا ہے ۔۔۔۔۔۔ لیکن ہم سے یہ کوتاہی ہوگئی کہ جولائی کے شمارہ میں یہ اطلاع نہیں دی جاسکی، اُن حضرات کو جولائی کا شمارہ شروع جولائی میں پہنچ گیا اور "انتخاب نمبر" جو بحری ڈاک سے روانہ کیا گیا تھا وہ اُس وقت تک اُن کو نہیں ملا، متعدد حضرات نے خط لکھکر اس کی اطلاع دی اور شکایت کی۔ اگر جولائی کے شمارہ میں یہ اطلاع دیدی گئی ہوتی تو ان کو خط لکھنے کی زحمت اور شکایت نہ ہوتی ۔۔۔ امید ہے کہ اگست کے اس شمارہ کے پہنچنے تک "انتخاب نمبر" اُن حضرات کو مل چکا ہوگا یا عنقریب مل جائے، بحری ڈاک سے اُس کو روانہ کیے دو مہینے سے زیادہ ہوچکے ہیں۔ بہرحال اپنی اس کوتاہی کے لیے ہم اُن سب حضرات سے معذرت خواہ ہیں۔

ناظم دفتر الفرقان
۳ر اگست ۱۹۶۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

ـــــــــــــــ عتیق الرحمٰن سنبھلی

مولانا محمد عثمان فارقلیط

گزشتہ ماہ ۱۰ جون کی تاریخ کو ایک کام سے دہلی پہنچنا ہوا۔ دہلی جانے پر جن بزرگوں سے ملنا ہوتا تھا، اُن میں ایک روزنامہ الجمعیۃ کے ایڈیٹر مولانا محمد عثمان فارقلیط بھی تھے، جنھیں آج "مرحوم" لکھنا پڑ رہا ہے ــــ اس دفعہ دہلی کا سفر ایک ایسے کام سے ہوا تھا جس سے جلدی نپٹنے کا تقاضہ ذہن کو اس طرح لپٹے ہوئے تھا کہ اس سے فرصت کے بغیر کسی اور بات کا خیال بھی آنا مشکل تھا۔ ۱۰ ار گزری، ۱۱ گزری اور مولانا یا اور کسی سے ملنے کا خیال تک آنا تھا نہ آیا۔ ۱۲ ار کی صبح ہی شروع ہوئی تھی اور میں اپنی قیام گاہ ۵۳۰۱ کشن گنج (آزاد مارکیٹ) میں میرے میزبان سے چھپا ہوا اخبار دیکھ رہا تھا کہ گشتی لاؤڈ اسپیکر سے ایک اعلان کی آواز کانوں میں پڑی، جو کسی کے انتقال کی خبر اور نماز جنازہ وغیرہ کے پروگرام سے متعلق تھا۔ قدرتی طور پر کان کھڑے ہوئے۔ مگر پوری توجہ کے باوجود نام سمجھ میں نہ آیا کہ کس کے متعلق اعلان ہے۔ تاہم ارادہ کرلیا کہ باہر نکلنے پر معلوم کرنا ہے۔

نو بجنے کے قریب میرے عزیز میزبان اپنے دفتر (اسٹیشن آفس) جانے کے لیے تیار ہونے لگے تو میں نے بھی خیال کیا کہ ان کے ساتھ ہی نکل چلوں۔ ہم دونوں باہر نکلے تو دروازے ہی پر ایک صاحب سے کچھ دیر پہلے کے اس اعلان کے بارے میں پوچھنے کا موقع مل گیا اور جواب نے تأسف اور قلق کا ایک دریا ہی تو جیسے دل میں انڈیل دیا۔ معلوم ہوا کہ مولانا محمد عثمان فارقلیط انتقال کر گئے اور بس یہی وقت اُن کی نماز جنازہ کا ہے۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۔ اپنے عزیز میر اندریں زاہد القادری) سے میں نے کہا کہ بس اب تم اپنی راہ جاؤ،
میں مولانا کی نماز جنازہ میں شرکت کی کوشش کروں گا۔

یہ دن یو پی اور دہلی میں کچھ قبل از وقت بارش کے دن تھے۔ گھر سے نکلتے ہی بوندیں بھی گرنا شروع
ہوگئیں تھیں۔ تیزی سے بڑھ کر آزاد مارکیٹ کی سڑک پر سواری پکڑنے کے لیے آیا۔ اسکوٹر میں بیٹھا ہی تھا کہ
بوندوں نے زور پکڑنا شروع کر دیا اور گلی قاسم جان تک پہنچتے پہنچتے کپڑے بھی بچانا مشکل ہو گئے۔ جمعیۃ
بلڈنگ (گلی قاسم جان) میں نماز جنازہ کا اعلان تھا۔ اُس سے چند ہی قدم پہلے مولانا کی جائے قیام (احاطہ
کالے صاحب) کا پھاٹک پڑتا تھا۔ اسکوٹر وہیں رکوایا کہ اگر میت ابھی اُٹھی نہ ہو تو "ابتک کی" قیام گاہ ہی
پر پہنچ کر تلافی "مافات" کی جو زیادہ سے زیادہ امکانی شکل ہو سکتی ہے وہ پوری کر لوں۔ اور اس پھاٹک پر
آثار ایسے ہی ملے جیسے ابھی میت اُٹھی نہو، اپنے اس اندازہ ہی کی بنا پر بارش کی شدت کے باوجود اسکوٹر
سے اتر گیا اور پھر یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اندازہ صحیح تھا۔

تھوڑی دیر پھاٹک میں کھڑے ہو کر بارش میں کمی کا انتظار کیا اور پھر جب راہ کھلی تو گلی در گلی کے،
کچھ یاد اور کچھ بھولے ہوئے سے طویل سلسلے کو پار کر کے وہاں پہنچا جہاں ملت کا یہ غم خوار و جانباز اسی
غم خواری و جانبازی میں قریب پچاس برس تک اپنی ہڈیاں اور توانائیاں گُھلا گُھلا کر بالآخر جان سے گذر
گیا تھا۔ اور اب آرام گاہ ابدی کی طرف چلنے کے لیے دوسروں کے ہاتھوں آخری غسل لینے اور کفن کا جوڑا زیب
تن کرنے کی منزل سے گزر رہا تھا۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۔

خواہش تھی کہ مولانا کے اہل خانہ اور قریبی اعزہ میں سے کسی سے مل کر دو لفظ تعلق اور تعزیت کے کہوں
مگر نہ کسی کو پہچانتا تھا اور نہ اس کا اس وقت موقع تھا کہ پوچھ پاچھ کے کسی کو جانا جائے اور اس خواہش
کو پورا کرنے کے لیے ایک دو منٹ اُس کے لیے جائیں، جنازہ کی تیاری میں تاخیر اور دروازے پر کھڑا منتظر مجمع،
پھر موسم کی خرابی ان لوگوں کو ہمہ تن جلد سے جلد تیاری کی کوشش میں منہمک کیے ہوئے تھی۔ اس صورت حال
میں گرمی، جگہ کی تنگی اور بوندا باندی کے پیش نظر مناسب نظر آیا کہ جمعیۃ بلڈنگ چل کر جنازہ کا انتظار کیا جائے۔

اتفاق سے یہاں بھی کوئی جانا پہچانا چہرہ نظر نہ آیا اور پتہ نہیں مولانا کے حادثۂ وفات کا اثر تھا یا کوئی
خاص اصول و ضابطہ، کہ ایک اجنبی کو یہاں کسی ناشناس نظر میں ایک عام التفات یا تجسس تک کا رنگ نظر نہ آیا۔
بس اتنا فائدہ یہاں سے اٹھا سکا کہ نماز جنازہ کے لیے وضو وہاں کے نل پر کر لیا۔ خوش قسمتی سے جنازہ بھی

چند ہی منٹ میں آتا نظر آگیا۔ مگر وہ ادھر کو آنے کے بجائے سڑک ہی پر رواں رہا۔ پتہ نہیں کس وجہ سے نماز کی جگہ بدل کر اب جامع مسجد قرار پا گئی تھی یا مجھے غلط فہمی تھی۔ بہر حال جامع مسجد پہنچ کر گیارہ بجے کے قریب نماز جنازہ ہوئی، مولانا مسلکاً اہل حدیث تھے۔ ایک اہل حدیث عالم نے نماز پڑھائی اور مولانا کی بدولت اس مسلک پر نماز جنازہ پڑھنے کا یہ پہلا اتفاق ہوا۔

جنازہ کو دفن کے لیے پلکھوا (ضلع میرٹھ) جانا تھا، جہاں کے مولانا رہنے والے تھے۔ میرے جیسے لوگوں نے جنھیں آگے نہیں جانا تھا۔ یہاں مسجد ہی سے مولانا کے جسد خاکی کو الوداع کہا رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃ الشہداء والمجاہدین وغفرلہ مغفرۃً کاملۃً واسعۃ

مولانا فارقلیط کی ذات تعارف سے بے نیاز ہے۔ انھوں نے قریب پچاس برس اپنی بے لوث صحافت سے وہ سچی عزت اور اعلیٰ شہرت حاصل کی جو اس نسل میں بہت کم انہی کا خاص حصہ بن گئی۔ البتہ سوانحی تذکرے اور ذاتی خصوصیات کے طور پر کچھ باتیں قابل ذکر ہیں۔

مولانا کی صحافت کا آغاز اسی اخبار الجمعیۃ سے ہوا جس کی خدمت ہی میں اُن کی عمر صحافت گویا اختتام کو پہنچی۔ وہ باقاعدہ عالم دین تھے اور آریہ سماجیوں اور عیسائیوں سے مناظرہ اُن کی نوجوانی کا خاص مشغلہ تھا۔ آریہ سماج ہی کی تحریک شدھی سنگٹھن کے دور میں (۲۳-۱۹۲۴ء) جمعیۃ علماء ہند نے اس فتنہ کے انسداد اور مقابلہ کے لیے شعبۂ تبلیغ قائم کیا اور اس وقت کے حالات میں وہی اس کی جدوجہد کا خاص مرکز بن گیا۔ انہی حالات میں اخبار نکالنے کی بھی ضرورت محسوس ہوئی تو "سہ روزہ الجمعیۃ" نکالنے کا فیصلہ کیا گیا جو آج کے مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی اور اُس وقت کے "ابو الاعلیٰ مودودی" کی ادارت میں جاری ہوا تو مولانا فارقلیط بھی اُس کی خدمت سے وابستہ ہوئے، — یہ سوانح میری شنیدہ ہیں۔ اس کے بعد کب اور کیوں وہ "الجمعیۃ" سے الگ ہو کر دوسرے کن کن اخبارات و رسائل سے وابستہ رہے اس کا مجھے علم نہیں ہو سکا، البتہ "زمزم" لاہور سے مولانا کا تعلق میرے اپنے آغاز شعور کی بات ہے — تقسیم وطن کے وقت میں مولانا لاہور سے پھر دہلی آ گئے اور یہاں پھر روزنامہ الجمعیۃ سے ان کا تعلق مدیر اعلیٰ کی شکل میں ہوا، اور یہ تعلق اب سے چند ہی سال پہلے اُس وقت ختم ہوا جب مولانا کے قویٰ نے ایک طرف تو اس روزمرہ کی ذمہ داری کے مقابلہ میں تقریباً جواب دیدیا اور دوسری طرف اُس دباؤ کے مقابلہ میں مولانا کی قوت

برداشت بھی جواب دینے لگی جو ذمہ داران جمعیۃ کی طرف سے آزادی کے بعد برابر ہی اُن پر قلم کو زم کرنے کے لیے پڑتا رہا تھا ـــــ اس کے بعد وہ مختلف اخبارات میں کبھی کبھی کوئی کالم لکھ دیتے تھے۔ اسی دور میں (اب سے قریباً دو ہی سال پہلے) اردو ڈائجسٹ "ہندوستان دہلی" میں اُن کے نام سے ایک مضمون قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیے جانے کے خلاف بلکہ قادیانیت کی حمایت و وکالت میں شائع ہوا جو مولانا سے تعلق والوں اور اُن کے نیازمندوں کے لیے انتہائی حیرت انگیز بلکہ کرب انگیز ہوا، اس پر الفرقان میں بھی مفصل تنقید کی گئی لیکن بعد میں مولانا کے ایک اخباری بیان اور نجی خطوط سے یہ معلوم کر کے کہ "وہ مضمون اُن کا لکھا ہوا ہی نہیں تھا غلطی سے اُن کے نام سے شائع ہو گیا، اور الفرقان میں جو کچھ اس سلسلہ میں لکھا گیا اُس سے ان کو پورا اتفاق ہے اور وہی اُن کا مسلک ہے" سب کو اطمینان ہو گیا اور جو دھبہ اُن کے دامن پر خواہ مخواہ لگ گیا تھا، الحمد للہ وہ جلد ہی دُھل گیا۔ بلاشبہ یہ بھی اُن کی بلند کرداری اور دینداری تھی کہ اخباری بیان کے ذریعہ یہ وضاحت کر دی ورنہ کوئی اُن کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اُن کے اس عمل کا بھی بہتر سے بہتر صلہ اُن کو عطا فرمائے۔

انھوں نے اپنی تحریروں پر قوم سے بلاشبہ داد و تحسین ہی پائی۔ لیکن تحریروں ہی میں نہیں وہ اپنے ذاتی کردار اور اخلاق و عادات میں بھی ایسی ہی ثنا و ستائش کے مستحق انسان تھے۔ غالباً ۱۹۷۰ء کے آخر کی بات ہے۔ اردو اڈیٹرز کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ کی صدارت انھوں نے فرمائی۔ خطبہ میں اردو صحافت کے کردار پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے ارباب حکومت سے ایک التجا کی ـــــ اور کیا "التجا" کی ـــــ کہ اُردو صحافت جس کی داغ بیل ایک فریضے کے طور پر پڑی تھی نہ کہ پیشے کے طور پر، اور بحیثیت مجموعی اس کا یہ کردار آج تک بھی بڑی حد تک محفوظ ہے۔ اُسے حکومت اپنی بہبودیٔ صحافت کی اُس اسکیم سے الگ باہر رہنے دے جس کے ماتحت صحافت کو ایک صنعت و حرفت قرار دے کر اہل صحافت کو پیشہ ورانہ حقوق سے نوازا جا رہا ہے تو اردو صحافت کی ہر دم کے لیے یہ بات ہی حقیقی ممنونیت کا باعث ہو گی۔

یہ بات جو مولانا نے کہی بس بات نہیں، اُن کا کردار تھی۔ انھوں نے عمر بھر پیشہ ورانہ ذہنیت کے بجائے فرض شناسانہ ذہنیت سے کام کیا۔ اُن کے اخبار کی انتظامیہ اُن کے فرض شناسانہ

انداز تحریر کو بعض موضوعات پر پسند نہیں کرتی تھی۔ مگر وہ اپنے آپ کو پیشہ ورانہ سطح سے بلند رکھتے ہوئے آخری دن تک اپنی فرض شناسی ہی کی راہ پر چلنے کے لیے مصر رہے۔ معمولی تنخواہ پاتے تھے اور اسی میں بال بچوں کے ساتھ گزر کرتے تھے۔ میں نے جب سے دیکھا (یا اس کے بعد، بہرحال کافی دن سے) کھانسی کا مریض اور شکستہ استخواں دیکھا، اور اس پر روزمرہ کی ادارتی دماغ سوزی۔ کیا دوا علاج اور مناسب غذا وہ اس آمدنی میں کر پاتے ہوں گے۔ اگر "پیشہ ورانہ" راہ اختیار کر لیتے تو اپنی انتظامیہ کو خوش رکھنے کے علاوہ، اپنے اخبار کی ایک مخصوص اہمیت کی بنا پر یقیناً کچھ اور ذرائع آمدنی بھی پیدا کر سکتے تھے۔ مگر نہ صرف یہ کہ وہ اپنے اس حال میں خوش اور کردار میں مستقیم رہے بلکہ اس کردار کی آبرو رکھنے (اور زیادہ صحیح لفظوں میں آبرو بڑھانے) میں وہ کوئی موقع امتحان آنے پر وہاں تک چلے گئے جہاں دیکھنے والے دنگ رہ گئے۔

اسی لکھنؤ کانفرنس کی بات ہے، جو خود اپنی آنکھوں سے دیکھی، کہ اوپر سے نیچے تک ارباب حکومت کا مجمع تھا۔ ریاست کے وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا اور دوسرے ریاستی اور مرکزی وزراء سے لیکر وزیر اعظم اندرا گاندھی تک شریک بزم تھیں۔ لوگ بقدر ہمت و حیثیت نگاہوں میں آنے اور توجہ پانے کے لیے ہر طرح کے ڈھنگ اختیار کر سکتے تھے، لیکن مولانا جو میر محفل تھے اور وزیر اعظم اندرا گاندھی مہمان خصوصی کی حیثیت سے اُن کے برابر کی کرسی پر گھنٹہ سوا گھنٹہ بیٹھی رہی تھیں، وہ اول سے آخر تک ایسے انداز میں رہے کہ دیکھنے والوں کو بے اختیار محمد علی جوہر کا یہ مصرع یاد آجائے۔ ع

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

حتیٰ کہ چلتے وقت خود مسز گاندھی ہی نے اُن کے خطبہ کی تحسین اور رخصتی آداب کے لیے مولانا کو اپنی طرف متوجہ کیا۔۔۔۔ اس درجہ کے انداز استغنا کو کوئی صحیح کہے یا غلط، لیکن مولانا مسلمانان ہند کے مسائل پر ارباب حکومت کے رویہ سے، جس جراحت دل کا اظہار اپنے ادارتی مقالات میں مسلسل کرتے رہتے تھے، اُس میں اپنی سچائی کا ایسے کٹھن موقع پر بھی ثبوت دے کر انھوں نے کردار کی جس پختگی اور بلندی کا نمونہ پیش کیا اُس کی عظمت کو تسلیم کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

مولانا سادگی اور منکسر مزاجی میں بھی نہایت بلند پایہ انسان تھے۔ میرا نہ اُن کی عمر سے

کوئی تناسب تھا نہ علم و فضل اور ملکۂ تحریر و انشاء سے۔ مگر کس خورد نوازی سے ملتے تھے کہ ایک دفعہ ملنے کے بعد پھر کبھی ممکن ہی نہ ہوا کہ دہلی جا کر اُن کی مجلس اُنس و عنایت کی یاد اور ملنے کی خواہش دل میں پیدا نہ ہو جائے۔ یہ پہلی بار تھا کہ دہلی میں پورے دو دن اُن کی یاد آئے بغیر گزر گئے اور تیسرے دن یہ یاد اُن کے بارے میں اُس خبر سے آئی جس کے بعد وہ صرف یاد کیے جا سکتے تھے پائے نہیں جا سکتے تھے ـــــ خدا بیش از بیش رحمتیں اُن کی روح پر نازل فرمائے۔ اور جن کی خاطر انھوں نے عمر بھر اپنی جان گھلائی اُنھیں کم از کم دو لمحے کی پرخلوص دعا کی ضرور توفیق عطا فرمائے۔

کتاب المعاملات

معارف الحدیث

حرام مال کی نحوست اور بدانجامی

عن عبد الله بن مسعود عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لا يكسب عبد مال حرام فيتصدق منه فيقبل منه ولا ينفق منه فيبارك له فيه، ولا يترك خلف ظهره الا كان زاده الى النار، ان الله لا يمحو السيئ بالسيئ ولكن يمحو السيئ بالحسن، ان الخبيث لا يمحو الخبيث۔ رواه احمد وكذا فى شرح السنة

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی بندہ (کسی ناجائز طریقے سے) حرام مال کمائے اور اس میں سے للہ صدقہ کرے، تو اس کا وہ صدقہ قبول ہو، اور اس میں سے خرچ کرے تو اس میں من جانب اللہ برکت ہو، اور جو شخص حرام مال مرنے کے بعد اپنے پیچھے چھوڑ کے جائے گا تو وہ اس کے لیے جہنم کا توشہ ہی ہوگا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ بدی کو بدی سے نہیں مٹاتا بلکہ بدی کو نیکی سے مٹاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ گندگی گندگی کو نہیں دھو سکتی ۔ (مسند احمد ـ نیز شرح السنہ میں بھی اسی طرح ہے)

(تشریح) حدیث کا ماحصل اور مدعا یہ ہے کہ حرام مال سے کیا ہوا صدقہ قبول نہیں ہوتا اور حرام کمائی میں برکت نہیں ہوتی، اور جب کوئی آدمی ناجائز و حرام طریقے سے کمایا ہوا مال مرنے کے بعد وارثوں کے لیے چھوڑ جائے تو وہ آخرت میں اس کے لیے وبال ہی کا باعث ہوگا، اس کو حرام کمانے کا بھی گناہ ہوگا اور وارثوں کو حرام کھلانے کا بھی ـــــ حلال کما کر وارثوں کے لیے حلال مال چھوڑ جانا ایک طرح

کا صدقہ ہے اور اس پر یقیناً اجر و ثواب ملنے والا ہے) آگے جو فرمایا گیا ہے "ان اللہ لا یمحو السیئ بالسیئ الخ" اس میں مالِ حرام کا صدقہ قبول نہ ہونے اور مرنے کے بعد باعثِ وبال ہونے کا سبب بیان فرمایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ صدقہ اگر صحیح اور پاک مال سے ہو تو وہ گناہوں کا کفارہ اور مغفرت کا وسیلہ بن جاتا ہے لیکن اگر حرام اور ناپاک مال سے صدقہ کیا گیا تو وہ نجس اور ناپاک ہے وہ گناہوں کی گندگی کو دھونے کی اور گناہوں کا کفارہ اور مغفرت کا وسیلہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا جس طرح گندے اور ناپاک پانی سے ناپاک کپڑا پاک صاف نہیں کیا جاسکتا۔

عن ابی هریرة قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ان اللّٰه طیبٌ لا یقبل الا طیبًا وان اللّٰه امر المومنین بما امر به المرسلین فقال یا ایها الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحًا وقال یا ایها الذین اٰمنوا کلوا من طیبات ما رزقناکم، ثم ذکر الرجل یطیل السفر اشعث اغبر یمد یدیه الی السماء یا رب یا رب ومطعمه حرام ومشربه حرام وملبسه حرام وغذی بالحرام فانی یستجاب لذالك ———— رواه مسلم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا — "اللہ تعالیٰ پاک ہے وہ صرف پاک ہی کو قبول کرتا ہے، اور اس نے اس بارے میں جو حکم اپنے پیغمبروں کو دیا ہے وہی اپنے سب مومن بندوں کو دیا ہے، پیغمبروں کے لیے اس کا ارشاد ہے کہ "اے پیغمبرو! تم کھاؤ پاک اور حلال غذا اور عمل کرو صالح" اور اہلِ ایمان کو مخاطب کر کے اس نے فرمایا ہے کہ "اے ایمان والو تم ہمارے رزق میں سے حلال اور طیب کھاؤ (اور حرام سے بچو)" — اس کے بعد حضور ؐ نے ذکر فرمایا ایک ایسے آدمی کا جو طویل سفر کر کے (کسی مقدس مقام پر) ایسے حال میں جاتا ہے کہ اس کے بال پراگندہ ہیں اور جسم اور کپڑوں پر گرد و غبار ہے، اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کے دعا کرتا ہے۔ اے میرے رب! اے میرے پروردگار!! اور حالت یہ ہے کہ اس کا کھانا حرام ہے، اس کا پینا حرام ہے۔ اس کا لباس حرام ہے، اور حرام غذا سے اس کا نشو و نما ہوا ہے، تو اس آدمی کی دعا کیسے قبول ہوگی۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) حدیث کا مطلب اور پیغام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مقدس اور پاک ہے اور وہ اسی صدقہ اور

اسی نذرانہ کو قبول کرتا ہے جو پاک مال سے ہو۔ آگے فرمایا گیا ہے کہ حرام سے بچنے اور صرف حلال استعمال کرنے کا حکم وہ امرالٰہی ہے جو تمام اہل ایمان کی طرح سب پیغمبروں کو بھی دیا گیا تھا۔ لہٰذا ہر مومن کو چاہیے کہ وہ اس حکم الٰہی کی عظمت و اہمیت کو محسوس کرے اور ہمیشہ اُس پر عمل پیرا رہے۔ اس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی بیان فرمایا کہ حرام مال اتنا خبیث اور ایسا منحوس ہے کہ اگر کوئی آدمی سر سے پاؤں تک درویش اور قابل رحم فقیر بن کے کسی مقدس مقام پہ جا کے دعا کرے لیکن اُس کا کھانا پینا اور لباس حرام مال سے ہو تو اس کی دعا قبول نہ ہو گی۔

عن ابن عمر قال من اشتری ثوبًا بعشرة دراهم وفيه درهم حرام لم يقبل الله له صلوٰة مادام عليه، ثم ادخل اصبعيه في اذنيه وقال صمتا ان لم يكن النبي صلی اللہ علیہ وسلم سمعته يقوله۔

(رواہ احمد والبیہقی فی شعب الایمان)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انھوں نے بیان فرمایا کہ "جس شخص نے دس درہم میں کوئی کپڑا خریدا اور اُن میں ایک درہم بھی حرام کا تھا تو جب تک وہ کپڑا اُس کے جسم پر رہے گا اس کی کوئی نماز اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول نہ ہو گی" (یہ بیان کرکے) حضرت ابن عمر نے اپنی دو انگلیاں اپنے دونوں کانوں میں دے لیں اور بولے "بہرے ہو جائیں میرے یہ دونوں کان اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات فرماتے نہ سنا ہو" (یعنی میں نے جو کہا یہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے کانوں سے سُنا ہے)

(مسند احمد، شعب الایمان للبیہقی)

عن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا يدخل الجنة لحم نبت من السحت وكل لحم نبت من السحت كانت النار اولی به۔

(رواہ احمد والدارمی والبیہقی فی شعب الایمان)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ گوشت اور وہ جسم جنت میں نہ جائے گا جس کی نشو و نما حرام مال سے ہوئی ہو۔ اور ہر ایسا گوشت اور جسم جو حرام مال سے پلا بڑھا ہے دوزخ اس کی زیادہ مستحق ہے۔ (مسند احمد، سنن دارمی، شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) اللہ کی پناہ! اس حدیث میں بڑی سخت وعید ہے۔ الفاظِ حدیث کا ظاہر مطلب یہی ہے کہ دنیا میں جو شخص حرام کمائی کی غذا سے پلا بڑھا ہوگا وہ جنت کے داخلہ سے محروم رہے گا اور دوزخ ہی اُس کا ٹھکانہ ہوگا۔ اللّٰھم احفظنا! — شارحین حدیث نے قرآن و حدیث کے دوسرے نصوص کی روشنی میں اس کا مطلب یہ بیان فرمایا ہے کہ ایسا آدمی حرام خوری کی سزا پائے بغیر جنت میں نہ جاسکے گا۔ ہاں اگر وہ مومن ہوگا تو حرام کا عذاب بھگتنے کے بعد جنت میں جاسکے گا۔ اور اگر مرنے سے پہلے اُس کو صادق توبہ و استغفار نصیب ہوگیا یا کسی مقبول بندہ نے اس کی مغفرت کی دعا کی اور قبول ہوگئی یا خود رحمت الٰہی نے مغفرت کا فیصلہ فرمادیا تو عذاب کے بغیر بھی بخشا جاسکتا ہے۔ رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یاتی علی الناس زمانٌ لایبالی المرء ما اخذ منہ، من الحلال ام من الحرام۔ رواہ البخاری

(زاد رزین علیہ فاذا ذالک لا تجاب لھم دعوۃ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ آدمی کو اس کی پروا نہ ہوگی کہ وہ جو لے رہا ہے حلال ہے یا حرام، جائز ہے یا ناجائز　(صحیح بخاری)

(تشریح) حدیث کا مطلب بالکل ظاہر ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس زمانہ کی اس حدیث میں خبر دی تھی بلاشبہ وہ آچکا آج امت میں اُن لوگوں میں بھی جو دیندار سمجھے جاتے ہیں کتنے ہیں جو اپنے پاس آنے والے روپیہ پیسہ یا کھانے پینے پہننے کی چیزوں کے بارہ میں یہ سوچنا اور تحقیق کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ جائز ہے یا ناجائز — ہوسکتا ہے کہ آگے اس سے بھی زیادہ خراب زمانہ آنے والا ہو، مسند رزین کی اسی حدیث کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ اُس وقت اُن لوگوں کی دعائیں قبول نہ ہوں گی — حلال و حرام اور جائز و ناجائز میں تمیز نہ کرنا، روح ایمانی کی موت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سلسلہ کی تعلیمات و ہدایات نے صحابہ کرام کی زندگیوں اور اُن کے دلوں پر کیا اثر ڈالا تھا اس کا اندازہ ان دو واقعات سے کیا جاسکتا ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ مروی ہے کہ اُن کے ایک غلام نے کھانے کی کوئی چیز اُن کی خدمت میں پیش کی، آپ نے اس میں سے کچھ کھا لیا، اس کے بعد اُس غلام نے بتلایا

کہ یہ چیز مجھے اس طرح حاصل ہوئی کہ اسلام کے دور سے پہلے زمانہ جاہلیت میں ایک آدمی کو میں نے اپنے کو کاہن ظاہر کر کے دھوکا دیا تھا اور اس کو کچھ بتلا دیا تھا۔ جیسے کہ کاہن لوگ بتلا دیا کرتے تھے، تو آج وہ آدمی ملا اور اس نے مجھے اس کے حساب میں کھانے کی یہ چیز دی ہے۔ حضرت ابو بکرؓ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے حلق میں انگلی ڈال کر قے کی اور جو کچھ پیٹ میں تھا سب نکال دیا۔

اسی طرح امام بیہقی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ کسی شخص نے حضرت عمرؓ کی خدمت میں دودھ پیش کیا، آپ نے اس کو قبول فرما لیا اور پی لیا، آپ نے اس آدمی سے پوچھا کہ دودھ تم کہاں سے لائے؟ اس نے بتلایا کہ فلاں گھاٹ کے پاس سے میں گزر رہا تھا وہاں زکوٰۃ کے جانور اونٹنیاں، بکریاں وغیرہ تھیں لوگ ان کا دودھ دوہ رہے تھے، انھوں نے مجھے بھی دیا، میں نے لے لیا، یہ وہی دودھ تھا۔ حضرت عمرؓ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو حضرت ابو بکرؓ کی طرح حلق میں انگلی ڈال کے آپ نے بھی قے کر دی اور اس دودھ کو اس طرح نکال دیا۔ (مشکوٰۃ)

ان دونوں واقعوں میں ان دونوں بزرگوں نے جو کھایا یا پیا تھا چونکہ لاعلمی اور بے خبری میں کھایا پیا تھا اس لیے ہرگز گناہ نہ تھا لیکن حرام غذا کے بارہ میں حضورؐ سے جو کچھ ان حضرات نے سنا تھا، اس سے یہ اتنے خوف زدہ تھے کہ اس کو پیٹ سے نکال دینے کے بغیر چین نہ آیا۔ بے شک حقیقی تقویٰ یہی ہے۔

مقامِ تقویٰ مشتبہ سے بھی پرہیز ضروری:-

عن النعمان بن بشير قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الحلال بيّنٌ والحرام بيّنٌ وبينهما مشتبهات لا يعلمهنّ كثير من الناس فمن اتقى الشبهات استبرأ لدينه وعرضه ومن وقع في الشبهات وقع في الحرام كالراعي يرعى حول الحمى يوشك ان يرتع فيه، الا وانّ لكل ملكٍ حمىً الا وانّ حمى الله محارمه الا وان في الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد كله واذا فسدت فسد الجسد كله الا وهي القلب۔
(رواه البخاري ومسلم)

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! جو حلال ہے وہ واضح اور روشن ہے، اور جو حرام ہے وہ بھی واضح اور روشن ہے اور ان دونوں کے درمیان کچھ چیزیں ہیں جو مشتبہ ہیں، اُن کو (یعنی اُن کے شرعی حکم کو) بہت سے لوگ نہیں جانتے ہیں جو شخص شبہ والی چیزوں سے بھی (از راہ احتیاط) پرہیز کرے وہ اپنے دین اور اپنی آبرو کو بچالے گا اور بے داغ رہے گا۔ اور جو شخص شبہ والی چیزوں میں پڑے گا اور مبتلا ہوگا وہ (خدا نکردہ) حرام کے حدود میں جا گرے گا۔ اُس چرواہے کی طرح جو اپنے جانور سرکاری محفوظ علاقے کے آس پاس بالکل قریب میں چراتا ہے تو اس کا قریبی خطرہ ہوتا ہے کہ وہ جانور اس محفوظ سرکاری علاقے میں داخل ہو کر چرنے لگیں (جو قابل سزا جرم ہے) —— اور معلوم ہونا چاہیے کہ ہر بادشاہ اور فرمانروا کا ایک حمیٰ (محفوظ علاقہ) ہوتا ہے (جس کے حدود میں بغیر اجازت داخلہ جرم کہا جاتا ہے) تو اللہ تعالیٰ کا وہ حمیٰ (محفوظ علاقہ) اُس کے محارم یعنی محرمات ہیں (آدمی کو چاہیے کہ ان کے قریب بھی نہ جائے یعنی مشتبہ چیزوں سے بھی پرہیز کرے) اور خبردار! انسان کے جسم میں ایک مُضغہ (گوشت کا ایک ٹکڑا) ہے (جو کی شان یہ ہے) کہ اگر وہ ٹھیک ہو (یعنی اُس میں نور ایمان، خدا کی معرفت اور اُس کا خوف ہو) تو سارا جسم ٹھیک رہتا ہے (یعنی اس کے اعمال و احوال صحیح و درست ہوتے ہیں) اور اگر اُس کا حال خراب ہو تو سارے جسم کا حال بھی خراب ہوتا ہے۔ (یعنی اُس کے اعمال و احوال خراب ہوجاتے ہیں) آگاہ رہو! گوشت کا وہ ٹکڑا قلب ہے۔

(تشریح) حدیث کے ذخیرہ میں چند حدیثیں وہ ہیں جن کو امت کے علماء اور فقہاء نے بہت اہم اور اصولی سمجھا ہے، انہی میں سے حضرت نعمان بن بشیرؓ کی روایت کی ہوئی یہ حدیث بھی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں سب سے پہلے تو یہ فرمایا ہے کہ شریعت میں جو چیزیں اور جو معاملات صراحت کے ساتھ حلال یا حرام قرار دیے گئے ہیں اُن کا معاملہ تو صاف اور روشن ہے لیکن اُن کے علاوہ بہت سی چیزیں اور بہت سے معاملات ایسے ہیں جن کا جائز یا ناجائز ہونا کسی صریح دلیل سے معلوم نہ ہو سکے گا بلکہ دونوں رایوں کی گنجائش ہوگی، مثلاً شریعت کے ایک اصول کی روشنی میں اُن کو جائز اور کسی دوسرے اصول کی روشنی میں ناجائز قرار دیا جا سکے گا تو ایسی شبہ والی چیزوں اور ایسے معاملات کے بارہ میں بندۂ مومن کا طرز عمل یہ ہونا چاہیے کہ از راہ احتیاط و تقویٰ اُن سے بھی پرہیز کرے، اسی میں اس دین و آبرو کی حفاظت ہے ——

آگے آپ نے ارشاد فرمایا کہ ـــــ "جو شخص ایسی مشتبہ چیزوں سے پرہیز کا اہتمام نہ کرے گا تو وہ بے احتیاطی کا عادی بن کر محرمات کا بھی مرتکب ہو جائے گا" پھر اسی بات کو مثال سے سمجھاتے ہوئے آپ نے ارشاد فرمایا کہ "مثلاً جو چرواہا اپنے جانوروں کو اُس سرکاری محفوظ علاقہ کے قریب اور بالکل اس کی سرحد پر چرائے گا جس میں عوام کے لیے جانوروں کا چرانا جرم ہے تو بعید نہیں کہ اُس کے جانور کسی وقت اُس محفوظ علاقہ کی حدود میں داخل ہو کر چرنے لگیں، پس جس طرح چرواہے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے جانوروں کو سرکاری علاقہ سے دور ہی رکھے اور اُس کے قریب بھی نہ جانے دے اسی طرح بندۂ مومن کو چاہیے کہ وہ مشتبہ چیزوں اور مشتبہ معاملات سے بھی پرہیز کرے، اس طرح وہ محرمات اور معصیات سے ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ یہی مقام تقویٰ ہے۔

آخر میں حضور نے ایک نہایت اہم بات ارشاد فرمائی، فرمایا کہ انسانی وجود کے بگاڑ اور سدھار سعادت اور شقاوت کا دار مدار اُس کے قلب کے حال پر ہے جو انسان کے پورے جسمانی وجود پر اور تمام اعضاء پر حکمرانی کرتا ہے اگر وہ درست ہو گا اور اس میں خدا کی معرفت اس کا خوف اور ایمانی نور ہو گا تو انسان کا پورا جسمانی وجود درست رہے گا اور اُس کے اعمال و احوال ٹھیک اور نیک ہوں گے اور اگر قلب میں فساد و بگاڑ ہو گا اور اس پر حیوانی و شیطانی جذبات کا غلبہ ہو گا تو پورا جسمانی وجود فاسد اور غلط کار ہو گا اور اس کے اعمال و احوال شیطانی و حیوانی ہوں گے۔

اس حدیث میں قلب سے مراد انسان کا وہ باطنی حاسہ ہے جس کا رجحان خیر یا شر کی طرف ہوتا ہے۔ اس کو مضغہ (گوشت کا ٹکڑا) اس لیے کہا گیا ہے کہ انسان کے سینہ میں بائیں جانب جو صنوبری شکل کا جو ایک خاص عضو اور مضغۂ لحم ہے جس کو قلب اور دل کہا جاتا ہے وہ اس باطنی حاسہ کا خاص محل اور گویا اُس کا تخت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث پاک میں پہلے تو محرمات کے علاوہ مشتبہات سے بھی بچنے اور پرہیز کرنے کی تاکید فرمائی جو تقوے کی بنیادی شرط ہے اُس کے بعد آپ نے قلب کے بارہ میں یہ آگاہی دی اور یہ بتلا کر کہ انسان کی سعادت و شقاوت کا دارومدار قلب کی صلاح و فساد پر ہے اُس کی حفاظت اور نگرانی کی طرف توجہ دلائی ـــــ مبارک ہیں وہ بندے جو قلب اور باطن کی اس اہمیت کو سمجھتے ہیں اور قالب اور ظاہر سے زیادہ اپنے قلب اور باطن کی فکر رکھتے ہیں۔

حضرات صوفیائے کرام کا یہی امتیاز ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت کی اہمیت کو سب سے زیادہ انھوں نے سمجھا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی برکات سے ہمیں محروم نہ فرمائے۔

بعض شارحین نے اس حدیث پاک کے مضامین کی ترتیب سے یہ بھی سمجھا ہے کہ قلب کی صفائی اور طہارت کے لیے یہ ضروری ہے کہ آدمی کھانے پینے میں محرمات کے علاوہ مشتبہ چیزوں سے بھی پرہیز کرے۔

عن عطیۃ السعدی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم " لا یبلغ العبد ان یکون من المتقین حتی یدع مالا باس بہ حذراً لما بہ باس ــــ رواہ الترمذی و ابن ماجۃ

حضرت عطیہ سعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی بندہ اُس درجہ تک نہیں پہنچ سکتا کہ وہ متقیوں میں شمار ہو جب تک کہ اس کا رویہ یہ نہ ہو کہ گناہوں سے بچنے کے لیے وہ مباحات کو بھی ترک نہ کرے۔ (جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) بہت سی چیزیں اور بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں کہ وہ فی نفسہٖ جائز اور مباح ہوتے ہیں لیکن اس کا اندیشہ ہوتا ہے کہ آدمی اُن میں مبتلا ہو کر گناہ تک پہنچ جائے اس لیے مقام تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ اُن جائز و مباح چیزوں اور کاموں سے بھی پرہیز کرے۔ اس کے بغیر آدمی مقام تقویٰ تک نہیں پہنچ سکتا۔

معاملات اور دوسرے ابواب میں تقوے کا جو تقاضا ہے وہ ان تین حدیثوں سے پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ اللّٰھم اٰتِ نفوسنا تقوٰھا وَ زکّھا انت خیر من زکّٰھا انت ولیھا و مولاھا۔

مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

جواہر پارے

اقتباسات مکاتیب رشیدیہ

(مسلسل)

مولانا ممتاز علی انبہٹوی کے نام

عنایت فرمائے بندہ مولوی ممتاز علی صاحب مد فیوضہم۔ بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند۔
ہمارے شیخ الشیوخ قطب عالم شیخ عبد القدوس فرماتے ہیں کہ اگر کسی کو بعد مجاہدہ ہزار سالہ

ملاحظہ: [illegible] احمد حسین صاحب انبہٹوی نے مولانا ممتاز علی صاحب کے متعلق، حضرت راقم کے جواب میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے
وہ بعد حذف و ترمیم ذیل میں ہے:
مولانا ممتاز علی ولد شیخ [illegible] علی انبہٹہ کے زمیندار تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب امام ناصر الدین جالندھری سے ملتا ہے۔
آپ نے ابتدائی تعلیم قصبہ [illegible] کے مدرسہ [illegible] حضرت شاہ ابو المعالی میں حاصل کی۔ اور اسی مدرسے [illegible] فارسی اور عربی کی
ابتدائی کتابیں پڑھیں [illegible] کے استاد تھے۔ آپ کا زیادہ زمانہ بہ سلسلہ ملازمت کوئٹہ میں گزرا آپ کے
والد کے [illegible] سکونت پذیر ہیں مولانا
ممتاز علی مرحوم کو [illegible] بہت سادہ زندگی گزارتے تھے [illegible] اپنے [illegible]
[illegible] باقی رہ گئے ہیں ۔۔۔ آپ کا
۱۹۲۵ء میں انتقال ہوا۔ انبہٹہ ہی میں آپ کا مزار ہے۔

"حسرت و درد نایافت" حاصل ہو جاوے تو سب کچھ اس کو حاصل ہو گیا۔ ہائے افسوس کہ "درد نایافت" نہیں تاکہ کام تمام ہو جاوے۔ پس اب لازم ہے کہ شغل باطن کو خوب التزام کے ساتھ بجا لاؤ اور بحکم مَالَا یُدْرَکُ کُلُّہٗ، لَا یُتْرَکُ کُلُّہٗ [1] جس قدر ہو سکے اس کے شغل میں رہو اور پھر حسرت نایافت میں لطف دیکھو۔ اور امید ہے کہ حق تعالیٰ آپ کو ضائع نہ فرماوے گا۔ شغل وہی کافی ہے کہ جو پہلے آپ کرتے تھے اب بھی اس کا ہی التزام کرو۔ ذکر پاس انفاس محدود نہیں۔ فقط یہ ایک شغل شب و روز کی مشغولی کو کافی ہے۔ ہم ذکر و ہم مراقبہ، اس میں حاصل ہے۔ یک در گیر محکم گیر [2] ——— ان شاء اللہ تعالیٰ نفع ہووے گا۔

.... آپ اپنا شغل معمولی کرتے رہیں اس میں ہی سب کچھ ہے اور گاہ کسل گاہ حدت ہر دو لازم بشر ہے۔ ایک حالت پر آدمی نہیں رہتا۔ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں:

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم　　　گہے بر پشت پائے خود نہ بینم [3]

ہم تو کس حساب میں ہیں۔ مگر آدمی کو اپنا شغل و ذکر اگرچہ قلیل ہے ترک نہ کرنا چاہیے۔ خَیْرُ الْعَمَلِ مَادِیْمَ عَلَیْہِ [4]۔ الحدیث ———

(مندرجہ ذیل مکتوب گرامی فارسی میں تھا۔ یہاں اس کا ترجمہ درج کیا جا رہا ہے)

از بندہ شرمسار احقر العباد رشید احمد گنگوہی عفی عنہ بہ گرامی خدمت برادرم مولوی ممتاز علی صاحب دام مجدہم ——— بعد سلام مسنون واضح ہو ——— میں اپنی صحت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور آپ جیسے دوستوں کے لیے دعائے ترقی درجات میں سرگرم رہتا ہوں۔ مگر میری دعا کیا فائدہ پہونچائے گی۔ جب میں خود خرابی اندرون میں گرفتار ہوں۔ ع

بہرچہ ساقی ما ریخت عین الطاف ست

---

[1] (ترجمہ) جو چیز پوری حاصل نہ کی جا سکے، پوری چھوڑی بھی نہ جائے۔

[2] (ترجمہ) ایک دروازہ پکڑو اور اس کو مضبوطی سے پکڑے رہو۔

[3] (ترجمہ) کبھی میں بلند مکان پر بیٹھ کر نظارہ کرتا ہوں اور کبھی اپنے پاؤں کے اوپر بھی نہیں دیکھ پاتا ہوں۔

[4] (ترجمہ) بہترین عمل وہ ہے جس پر مداومت ہو۔

عزیزم! قدماء اور متاخرین میں کون ہے جو اپنے آپ کو معاصی اور حکم عدولی مولیٰ تعالیٰ سے مہذب اور منزہ جانتا ہو ——— تمام کاملین اپنی تقصیرات کا ذکر کرکے نفس کی تذلیل میں مشغول رہے ہیں اور فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے لا اُحصِی ثناءً علیک (اے اللہ میں آپ کی تعریف کا احاطہ نہیں کرسکتا۔) فرمایا ہے۔ پس جو شخص کہ اپنی عبادت قلیلہ پر جس کی حیثیت ایک ناکارہ سامان سے زیادہ نہیں ہے، نادم و شرمندہ ہوا اور اپنے آپ کو حقیر و خوار سمجھا اس نے اپنے اسی عجز و انکسار کے بقدر کمال حاصل کرلیا۔ کیا اچھا نصیب ہے اس شخص کا کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں اپنے آپ کو عاصی و خوار اور نفس شریر کے ہاتھ میں گرفتار سمجھا۔

یہ اپنی تمام تقصیرات کا دیکھنا اور عجز [illegible] جس قدر بھی اس کو میسر آجائے، اللہ تعالیٰ کی عنایت ہی کی نہایت ہے کہ اپنی ضعف کو اپنے [illegible] کے اقدام پایا [illegible] نیستی کا یہی حظ وافر حصہ ہے جو کہ حقیقت بشری ہے۔ اور جس کا انجام ہستی ہے وہ اور اپنے کمال پر نظر کرنا حقیقت بشر نہیں ہے ——— کمال تو حق تعالیٰ کی ذات لا متناہی کے لیے ہی زیبا ہے۔ اس لئے کہ [illegible] جز می کے اندر کوئی حصہ نہیں ہے ——— پس برادر عزیزم نے جو اپنی تقصیرات کو لکھا ہے وہ صفا کمال کے نزدیک عین حصہ کمال ہے ——— اللّٰھم زد فزد ———

جو کچھ [illegible] ملتا ہے وہ بہت جلد [illegible] غنیمت سمجھنا چاہیے۔ اور اپنے وقت [illegible] کو جتنا ہو سکے اسی میں صرف کرنا چاہیے۔ اور آپ! [illegible] آخرت کے سلسلے میں کوشش کرنی چاہیے [illegible] کی کوئی حیثیت نہیں ہے کیونکہ کائنات کا ذرہ ذرہ مختار حقیقی جل شانہٗ کے [illegible] ہے۔ پھر بھی جو کچھ ہو سکے اس میں سستی نہیں کرنی چاہیے ——— سابقوا الی مغفرة من ربکم[1] ——— پر نظر ڈال کر اپنا کام کرنا چاہیے۔ بندہ حقیر کے ہاتھ میں کیا ہے مگر جو کچھ ہو سکے سب توفیق اللہ تعالیٰ کی [illegible] ہے ——— لا حول ولا قوة الا باللہ ——— اپنا کام کیے جائیں۔ اس حقیر کو بھی جسے آپ نے اپنے حسن ظن سے نوازا ہے دعائے خیر میں یاد رکھیں والسلام

...... آپ کا خط آیا حال دریافت ہوا۔ حق تعالیٰ کی رحمت کا ہر دم امیدوار ہونا چاہیے

---

[1] (ترجمہ) اپنے رب کی جانب سے مغفرت کی طرف سبقت کرو۔

اور اپنے کام میں سرگرم رہے۔ یہ بسط و قبض ہر روز سب پر رہتا ہے۔ گاہ کیفیت وارد ہوئی اور گاہ مفرد ہو گئی۔ مگر جب وارد ہو شکر کرنا چاہیے۔ لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ۔ اور جب بند ہو جاوے تو دعا کرنا اور تضرع و زاری کرنا چاہیے۔ اس کو گمراہی یا شقاوت نہ جاننا چاہیئے بلکہ (اس کو) لطف حق تعالیٰ کا جاننا ضروری ہے۔ یاس، رحمتِ حق تعالیٰ سے حرام ہے، بلکہ رجار میں رہے۔ والسلام

.... آپ کا خط آیا۔ حال دریافت ہوا۔ آدمی کو جو کام کرنا ضرور ہے اس کے واسطے انتظار فرصت کا نہیں کرنا چاہیے۔ مثلاً اگر کوئی بیمار ہے اور علاج کرنا ضرور ہے تو یہ نہیں انتظار کرتا کہ جب سب کاروبار سے فراغ ہووے گا تو شروع معالجہ کروں گا۔ بلکہ معالجہ کو مقدم یا منجملہ تمام امور کے کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ہاں اگر مرض کا غلبہ نہیں اور علاج کی ضرورت نہیں یا علاج کرنا ہی مراد نہیں تو دوسری بات ہے۔ پس جب ذکر کرنا بندہ کو اگرچہ وہ نفل ہی ہے اپنے خیال و عزم میں ضرور ہوا تو انتظار فرصت کا ہرگز درست نہیں۔ کیوں کہ انسان ہرگز فارغ نہیں ہو سکتا۔ معاش کے اکتساب میں، عیال کی تربیت میں، حوائج کی فراہمی میں ہر روز پریشان ہے —— تھوڑا یا بہت —— پس تا دم مرگ فرصت نہ ملے گی —— اور جب شیطان کو تحقق ہوا کہ یہ مرد فرصت کے خیال میں ہے تو ہرگز فرصت نہ لینے دے گا۔ اس خیالِ امید فرصت کو قوت دے کر راسخ کرے گا۔ اور تسویف[عہ] ڈال کر سدِّ طریق خیر[عہ] ہووے گا۔ یہ فی الواقع دھوکا شیطان کا ہے۔ لہٰذا انسان عاقل کو واجب ہے کہ ذکر و فکر آخرت کو کسی حال تعویق میں نہ ڈالے۔ البتہ اگر ممکن ہو تو امور دنیاوی کے اندر تسویف کر دیوے۔ اور جس قدر ذکر ہو سکے اگرچہ قلیل ہو اس کو اس ہی تشویش سے مخلوط کر کے کرتا رہے۔ اگر پریشانی خاطر ہے تو فقط لسانی (ذکر) ہی سہی۔ کہ اگر لطیفہ قلب معطل رہا اور غافل ہوا تو زبان تو معطل و غافل نہیں (رہی) مَالَا یُدْرَکُ کُلُّہٗ لَا یُتْرَکُ کُلُّہٗ

ذکر ایسی شے ہے کہ اگر اس کو کرتا رہے اگرچہ بے ہوشیٔ خواطر و پریشانیٔ تعلقات میں محض تحریک لسانی ہو، نافع اور موجب نورانیتِ قلب کا ہوتا ہے، ہر چند ذکر قلبی ہی ہے"—— اور ذکر کامل وہی ہے کہ تمام لطائف کو شاغل بنا دیوے۔ مگر یہ نہ ہو تو فقط لسان کو بھی کیوں بیکار

عہ تاخیر اور ٹال مٹول عہ خیر کے راستے کو روکنے والا

کر دیوے۔ یہ محض لسانی بغفلت کا ذکر بھی۔ کشاں کشاں قلب تک پہونچا دیتا ہے بعضو لسان اگر حقیقت میں جائے گا تو کیا دیگر جملہ اعضا محل نار ہو سکتے ہیں؟

ذکر وہ شے ہے کہ اگر کسی جزو انسانی سے متصل ہووے گا، تمام جسد کو اپنی طرف کھینچ لیوے گا۔ زنہار کہ آپ التزام شغل کے واسطے فرصت کا انتظار کریں۔ اگرچہ پانچ چار منٹ ہی ہو۔ مگر شغل کو شروع کریں۔ اور خیر العمل ما دیم علیہ کو پیش نظر کر کے ان ہی پانچ منٹ پر التزام کریں۔ اگرچہ محض لسانی اور بھاگتے دوڑتے ہی ہو۔ بس اس تحریر کو مبالغہ نہ تصور فرماویں۔ اور اپنا کام ان ہی کاموں میں بالالتزام شروع فرمادیں۔ والسلام

مولوی فتح محمد صاحب .... کے نام

از بندہ رشید احمد عفی عنہ۔ بعد سلام مسنون آنکہ

آپ کا خط آیا۔ حال دریافت ہوا۔ چار خاندان قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ، سہروردیہ ہیں۔ اور خانوادہ اس کو کہتے ہیں جو ان میں سے شاخیں نکلی ہیں۔ سو شاخیں بہت ہیں۔ چودہ خانوادے جو لکھے ہیں اس وقت میں چودہ تھے۔ اس کے بعد بہت زیادہ ہوئے ہیں۔ غرض خانوادے بہت ہیں۔ چودہ کسی خاص وقت میں تھے۔ اب چودہ کہنا درست نہیں۔ پرانا لفظ ہے۔ والسلام

.... خط آیا حال دریافت ہوا۔ تم شغل کو برابر کرتے رہو .... کسی امر کا کچھ خیال اور فکر نہ کرو۔ جس قدر ہو سکے اس میں مشغول رہو آدمی کا کام کرنا ہے اور مابعد کا حال دریافت کرنا ضروری نہیں۔ بالفعل جو کچھ ہے اس کو کرو اور کسی کے اختیار میں نہیں کہ متعین کر دیوے کہ اتنے ایام میں فلاں امر موجود ہو گا۔ ذکر جہاں تک ہو سکے کرنا کام ہے۔ دنیا کے دیگر تعلقات خلاف شغل ذاکر کے ہیں کرنا پڑتا ہے۔ ریاضات ترک رقت، طعام و کلام، ترک قلت صحبت انام اور ترک کثرت خواب و اشغال دنیوی مشاغل کا نام ہے جس سے نفس پر ہر امر شاق ہووے۔ فقط ذکر کرنا کوئی ریاضت نہیں۔ تسبیح رکھنا سنت ہے اور قرآن باقی اگر یاد ہو جاوے تو بہتر ہے۔ جس قدر یاد ہو گیا ہے اس کا محفوظ رکھنا بہت ضروری ہے۔ مبادا بھول جاؤ کہ اس کا بہت

سنت گناہ حدیث میں آیا ہے وضو زیادہ دیر تک ٹھہرنے کی صورت میں اول تجدید وضو کر لیا کرو، بعد تجدید وضو کرکے نوافل پڑھ لیے۔ اور وظائف بلا وضو بھی درست ہیں۔ والسلام

......برادرم منشی فتح محمد صاحب سلمہ بعد سلام مسنون مطالعہ فرمائید——

دعاگو ہوں اور آپ سے بھی طالب دعا کا ہوں۔ حق تعالیٰ ہم کو اور آپ کو بخشے۔ آمین۔ آپ خط میں حافظ مسعود احمد کو سلام لکھا کریں۔ حافظ محمود مرحوم دو سال ہوئے کہ اس عالم سے رحلت فرما کر مجھ ناکارہ کو پریشان و حیران کر گئے ہیں۔ جب آپ ان کو سلام لکھتے ہیں، مجھ کو بے قراری ہو جاتی ہے۔ آئندہ ان کا نام مت لکھنا۔۔ والسلام

..........آپ کا خط آیا۔ حال دریافت ہوا........ شغل کا کمال جب ہوتا ہے کہ جملہ امور کو چھوڑ کر رات دن اسی میں مشغول ہو جاوے۔ جیسا بزرگوں نے سب کو ترک کرکے خلوت کی۔ اور جو مشغول دنیا کے امور میں ہیں، کبھی صبح شام شغل بھی کر لیا۔ ان کو بہت دیر میں کشش ہوتی ہے۔ سو آپ سے جس قدر ہو سکے اس کو کرتے رہیں.......... معاش کا معاملہ بہت تنگ ہے۔ بعد ترک کے پریشانی زیادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا اول دوسری جگہ مقرر کرکے ترک کرنا مناسب ہے ورنہ زیادہ موجب پریشانی کا ہو جاوے گی۔ والسلام

حاجی ظہور احمد صاحب انبیٹھویؒ کے نام

برادرم حاجی ظہور احمد صاحب سلمہٗ۔ السلام علیکم

آپ کا خط آیا جس سے بوئے دین و دیانت آتی ہے۔ الحمد للہ کہ افسوس دین کا اس صاحب نصیب کو نصیب ہوتا ہے کہ نصیب و حصہ رحمت کاملہ کا کامل رکھتا ہے۔ برادرا! یہ تمام شریعت کا علم اور طریقت کا طریقہ نور یقین کی تحصیل کے واسطے ہے اور انجام و منتہی سب کا یہی تو ہے کہ جس کا مسلمان سرسری طور سے علم رکھتے ہیں وہ یقین، حق یقین (اور) مثل مشاہدہ کے ہو جاوے۔ یہ انتہا سب طرق کی ہے......... صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اپنا جان و مال اور آبرو

و جان کیوں دی تھی، کیا کیا تھا؟ یہ ہی فیض صحبت پیغمبر علیہ السلام سے یقین حاصل ہو گیا تھا کہ دنیا کا فانی ہونا اور آخرت کا باقی ہونا اپنا لاشئ اور حق کا کارساز ہونا یقین ہو گیا تھا۔ بس اس پر مدار سب کام کا تھا۔

حضرت سیدی عبدالقادر جیلانیؒ اور خواجۂ خواجگان حضرت معین الدین چشتیؒ اور سید الطائفہ (حضرت) بہاء الدین بخاریؒ کیوں بڑے ہو گئے؟ اسی یقین کے سبب بڑے ہوئے تھے۔ سو عزیزا! یہ دولت اگرچہ بہ ہر گز سہل نہیں، تمام جان و مال دے کر اس سے ایک ذرہ ملے اور عمر نوح علیہ السلام خرچ کر کے اگر ذرہ ملے تو مفت اور بہت سہل اور جلد ہے.......... الحق کہ کشف و کرامت ایک جو برابر بھی نہیں، اس نور یقین کے سامنے..... جس قدر یقین ہے اسی قدر قوتِ ایمان و تقرب ہے۔ الحاصل اگرچہ یہ قوتِ تاثیر اور وجد اور کشف اور تصرف دنیا میں بہت ہے مگر یہ نور یقین مثل کیمیا کے نادر الوجود ہے۔ اگرچہ عالم خالی نہیں —.......... نہ یہ نسبت حقہ معدوم و مفقود ہے اور نہ تحصیل اس کی محال ہے۔ اگرچہ اہل اس نسبت کے ہر روز (ہمیشہ) کم رہے ہیں اور اب اقل قلیل ہیں، مگر عالم خالی بھی نہیں ہے۔ طرق اربعہ کی اس ہی نسبت پر انتہا ہے اور اس کے واسطے گھر بار ترک کر کے حیران و پریشان ہوئے ہیں.......... اس نسبت کا نام نسبتِ احسان ہے۔ بعثت جناب فخر رسل علیہ السلام کی اس کے ہی واسطے تھی۔ اور صحابہؓ جملہ اس نسبت کے حامل تھے۔ [illegible] حسب استعدادہم —— پھر اولیائے امت نے اس کو دوسرے طریقے سے پیدا کیا کہ ہر ایک نے اشغال اپنے اپنے طریقے کے وضع کیے۔ سو یہ سب مقدمات اس کے ہیں اور بس —— اس کا کوئی طریق معین نہیں۔ ہر شخص کا طرز جداگانہ ہے۔ مگر اس زمانے میں ترکِ تعلق کو شرط کامل ٹھہرایا ہے ؎

نخست موعظۂ پیرِ میکدہ ایں است
کہ از معاشرِ ناجنس احتراز کنید[1] (حافظؒ)

اور پھر کوئی (یعنی کسی) بتلانے والے کی ضرورت شدید ہے کہ بدون ہادی کس طرح اندھیری راہ کو طے کرے؟ بس (اگر) زیادہ لکھوں (تو یہ) اپنے حوصلے سے زیادہ اور فہم سے خارج ہے اور خود یہ درماندہ تمنا اس کی رکھتا ہے۔ ہر چند کہ حاصل کچھ نہیں، مگر ؎

---

[1] پیر میکدہ یعنی پیر طریقت، کی پہلی نصیحت یہ ہے کہ ناجنس کی صحبت سے بچو۔

أُحِبُّ الصّٰلِحِيْنَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ ؎ لَعَلَّ اللّٰهَ يَرْزُقُنِيْ صَلَاحًا ؎

از بندہ رشید احمد عفی عنہ عنایت فرمائے حاجی ظہور احمد صاحب سلمہ بعد سلام مسنون مطالعہ فرمائند ـــــ

.... آج آپ کا دوسرا خط آیا۔ اے برادر! گریہ وزاری و التجا بحضرت الٰہ العالمین عین سعادت ہے اور خائف ہونا اپنی تقصیر پر بڑی نعمت ہے۔ اس سے زیادہ نہ کوئی وظیفہ ہے اور نہ کوئی حال و وارد ہے۔ مگر سنو کہ آیۃ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ الخ کفار کی شان میں ہے کہ بلا توبہ مر گئے۔ ورنہ التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ ؎ حدیث صحیح ہے۔ اور معذور کی معذرت اور عاصی کی توبہ کے قبول کا وعدہ ہے۔ وہ مجبور تھے آپ تائب خائف ہیں تو توبہ کو کس طرح کوئی رد کہہ سکتا ہے۔ حق تعالیٰ خود توبہ کے قبول کا وعدہ فرماتا ہے۔ اور آیۃ ہے يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ الخ ظالم وہ ہے جو بالفعل مبتلائے ظلم ہو مشرک وہ ہے کہ بالفعل شرک کا ملبوث ہو۔ جو تائب ہوا وہ مشرک و ظالم نہیں کہ شرک و ظلم دفع ہو گیا۔ اب اس کو مشرک و ظالم کہنا درست نہیں۔ پس جو لوگ کہ قیامت کو ظالم ہوویں گے وہ وہ جماعت ہے کہ بدون توبہ کے شرک میں ملوث فوت ہوئے۔ تو فرماتے ہیں کہ مشرکین کو اس دن عذر نفع نہ دیوے گا۔ یہ معنیٰ نہیں کہ اگر مشرک آخر دنیا میں توبہ کرے اس کی توبہ نافع نہ ہووے گی۔

برادرم منشی حاجی ظہور احمد صاحب السلام علیکم و رحمۃ اللہ تعالیٰ و برکاتہ ـــــ

.... واضح ہو کہ فخر عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خواب میں دیکھنا عین ایمان ہے اور جناب علیہ السلام (حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) لاریب جو لوگ سنت کے اتباع میں سرگرم ہیں ان کے ساتھ کمال خوش اخلاقی سے معاملہ فرماتے ہیں۔ جو سنت کی طرف متوجہ ہوتا ہے آپ کی عنایات اس کی طرف توجہ فرماتی ہیں۔ اس خواب کی تعبیر کی حاجت ہی نہیں مبارک ہو ـــــ

.... آپ کا خط آیا۔ بندہ کے نزدیک ایصال ثواب میں اگر صدقہ جاریہ ہو تو اعلیٰ درجہ ہے کہ دیر تک اس کا ثواب پہونچتا رہتا ہے۔ اور جو کچھ گرسنہ کو کھلا دیوے، حاجت مند کو دیا جاوے تو بھی ثواب ہے۔ مگر جب اس کھانے وغیرہ کا اثر ختم ہوا ثواب منقطع ہو گیا۔

؎ ترجمہ: میں صالحین سے محبت رکھتا ہوں اگرچہ خود صالحین میں سے نہیں ہوں، کیا عجب ہے اللہ تعالیٰ مجھ کو بھی صلاحیت عطا فرماوے۔

؎ گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص کی مانند ہے جس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔

مولانا حافظ محمد نعیم صدیقی ندوی، ایم، اے
دار المصنفین اعظم گڑھ

کردار شکنی کا المیہ

(۴)

حق گوئی و بیباکی اسلام نے اعلان حق کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ

فاصدع بما تؤمر واعرض عن المشرکین (حجر-۶)

جو کچھ آپ کو حکم ملا ہے اس کو آشکارا طور پر بیان کیجیے اور مشرکین کی مطلق پروا نہ کیجیے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر

بہترین جہاد ظالم حکمراں کے سامنے حق بات کہنا ہے۔

اور تاکید فرمائی کہ

"تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے تو اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دینا چاہیے" اگر ہاتھ سے اس کی طاقت نہ ہو تو پھر زبان سے اس پر نکیر کرنی چاہیے اور اس کی بھی طاقت نہ ہو تو کم از کم دل سے اس کو برا سمجھنا چاہیے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے"

صحابہ کرامؓ نے جان کو ہتھیلی پر رکھ کر اس حکم کی تعمیل کی۔ یوں خیر و شر کے وجود سے تو کوئی عہد خالی نہیں رہا ہے خواہ خیر القرون ہو یا عصر حاضر۔ لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ابتدائی صدیوں میں باطل کی ساری شوکت و جبروت کے باوجود پوری جرأت و بیباکی کے ساتھ حق بات کہہ گذرنے کا جیسا عموم و شیوع تھا اس نفاق پسندی اور مصلحت کوشی کے دور میں لوگ اس کا اندازہ نہیں کر

جا سکتا ہے۔

ایمان کامل اور یقین محکم سود و زیاں کے اندیشہ سے بالاتر ہوتا ہے اور جلال حق کے سامنے بڑی سے بڑی قوت و عظمت پر کاہ سے زیادہ بے حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ کسی نے شیخ عز الدین بن عبد السلام سے پوچھا کہ آپ کو سلطان وقت کے دربار میں بیباکی سے گفتگو کرتے وقت کوئی خوف لاحق نہیں ہوتا۔ فرمایا کہ اللہ کی ہیبت ایسی ہمیشہ نظر رہتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں مجھے سلطان بلی کی طرح معلوم ہوتا ہے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ بہت طویل خطبہ دیا جس میں فرمایا" ہوشیار رہنا کہ کسی کی ہیبت تم کو اس حق بات کے کہنے سے باز نہ رکھے جو تم کو معلوم ہے۔" یہ بیان کرکے حضرت ابو سعیدؓ رو دیے اور فرمایا" افسوس ہم نے ایسی باتیں دیکھیں اور ہیبت میں آ گئے۔" (الترغیب والترہیب مسند عن)

اسلامی تاریخ کا ایک عہد سعادت وہ تھا جب خود خلیفۂ وقت لوگوں کو حق گوئی کی تاکید کرتا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ امراء کے کاموں میں اگر کوئی غلطی ہو تو لوگ برملا انہیں متنبہ کر دیں تاکہ وہ اپنی اصلاح کرکے آخرت کی بازپرس سے محفوظ ہو جائیں۔ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ نے خلافت کے بعد سب سے پہلے اعلان یہ کیا کہ" لوگو! میں تم پر حاکم مقرر کیا گیا ہوں اور تم سے بہتر نہیں ہوں، اگر میں اچھے کام کروں تو تم میری مدد کرو اور اگر برائی کروں تو مجھے درست کر دو۔"

جرأت، صداقت گوئی، حق پرستی اور بیباکی کی بصیرت افروز مثالیں پیش کرنے والے" مردان حق" تاریخ کے ہر دور میں بکثرت پائے جاتے رہے ہیں ــــ امام عبد اللہ بن عمر دوسری صدی کے ایک مشہور محدث اور فقیہ گذرے ہیں۔ ایک بار انھوں نے ایام حج میں خلیفہ ہارون الرشید کو مسعیٰ (صفا و مروہ کے درمیان) میں روک کر اس کی بدعنوانیوں پر سخت سرزنش کی۔ شیخ نے فرمایا:-

" ہارون! کیا تم ان حاجیوں کی تعداد شمار کر سکتے ہو"

خلیفہ نے جواب دیا" بھلا انھیں کون شمار کر سکتا ہے۔"

یہ سن کر شیخ نے فرمایا" سنو تو کان کھول کر سن لو ان میں سے ہر ہر شخص خود اپنی ذات کا ذمہ دار ہے۔ لیکن تم خدا کے نزدیک ان تمام بندگان خدا کے ذمہ دار ہو۔ بخدا جب انسان خود

اپنے مال میں اسراف کرتا ہے تو وہ لائق تعزیر قرار پاتا ہے۔ تو پھر اگر وہ عام مسلمانوں کے مال میں فضول خرچی کا مرتکب ہو تو اس کی سزا کس قدر بڑی ہوگی۔ (مرأة الجنان ۱/۳۶۷)

اندلس کے مشہور اموی حکمراں عبدالرحمٰن الناصر نے جب اپنے یادگار زمانہ شہر مدینۃ الزہراء کی تعمیر میں بےشمار دولت صرف کر ڈالی اور محل شاہی میں سونے کی اینٹیں لگانی چاہیں تو قاضی قرطبہ منذر بن سعیدؒ سے مسلمانوں کے مال میں خلیفہ کا یہ اسراف بے جا دیکھا نہ جاسکا۔ اور انھوں نے جمعہ کے خطبہ میں اس پر سخت تنقید کی اور خلیفہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"مجھے یہ گمان نہ تھا کہ شیطان اس حد تک آپ پر مسلط ہوسکتا ہے کہ وہ آپ کو کفار اور خدا کے باغیوں تک پہونچا دے"

یہ سن کر الناصر کے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور اس نے قاضی موصوف کو درمیان ہی میں ٹوکتے ہوئے کہا

"غور تو کیجئے آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ نے مجھے کفار کے مقام تک پہونچا دیا"

قاضی موصوف نے اسی طرح پُر زور لب ولہجہ میں جواب دیا "ہاں میں بالکل درست کہہ رہا ہوں۔ اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے۔

ولولا أن يكون الناس أمة	اگر ایسا نہ ہوتا کہ لوگ ایک امت بن جائیں
واحدة لجعلنا من يكفر بالرحمن	تو ہم خدائے بغاوت اور کفر کرنے والوں کے
لبيوتهم سقفاً من فضة ومعارج	مکانات کی چھتیں اور سیڑھیاں چاندی کی بنا
عليها يظهرون ولبيوتهم أبوابا	دیتے جن پر وہ چڑھتے۔ اور ان کے گھروں
وسررا عليها يتكؤن	کے لیے دروازے اور مسہریاں بھی چاندی کی،
(زخرف - ۶)	بنادیتے جن پر وہ آرام کرتے

قاضی منذر بن سعید کی زبان سے یہ بات اور یہ آیت سنکر خلیفہ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ اس کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی اور خدا کے خوف سے اس کا سر جھک گیا۔ اور اس نے فوراً منارے کو گرا کر چاندی کی اینٹوں کی جگہ مٹی سے اس کے دوبارہ بنانے کا حکم دیا۔

شیخ عزالدین بن عبدالسلام ساتویں صدی ہجری کی بہت باکمال اور باعظمت شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے علم وتقویٰ اور دعوت واصلاح کے ساتھ حق گوئی و بیباکی میں بھی نادرۂ

روزگار تھے۔ ان کی جرأت کا ایک حیرت انگیز واقعہ علامہ سبکی نے یہ نقل کیا ہے کہ عید کے دن قلعہ میں دربار شاہی تھا۔ بادشاہ پورے تزک و احتشام کے ساتھ سریر آرا تھا۔ دو رویہ افواج شاہی دست بستہ کھڑی تھیں۔ امراء حاضر ہو ہو کر آداب و تسلیم بجالاتے اور زمیں بوس ہوتے تھے۔ اس بھرے دربار میں دفعتہً شیخ نے بادشاہ کا نام لے کر خطاب کیا

"ایوب! خدا کو تم کیا جواب دو گے جب پوچھا جائے گا کہ ہم نے تم کو مصر کی سلطنت اس لیے دی تھی کہ شراب آزادی سے پی جائے"

بادشاہ نے کہا "کیا یہ واقعہ ہے؟"

شیخ نے بلند آواز سے فرمایا۔ ہاں فلاں میخانے میں شراب آزادی سے بک رہی ہے اور دوسرے گھنونے کام بھی ہو رہے ہیں۔ اور تم یہاں بیٹھے داد عیش دے رہے ہو؟"

بادشاہ نے کہا "جناب والا اس میں میرا کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ میرے والد کے زمانے سے ہو رہا ہے"

شیخ نے فرمایا "پھر تم بھی ان ہی لوگوں میں سے ہو جن کا جواب یہ ہوتا ہے" انا وجدنا آباءنا علی أمة" (یعنی یہ ہمارے آباء و اجداد کے زمانے سے چلا آرہا ہے)

سلطان نے فوراً اس شراب خانے کی بندش کا حکم جاری کیا۔

(طبقات الشافعیہ جلد ۵ تذکرہ عز الدین بن عبد السلام)

صحیح مسلم کے مشہور شارح امام محی الدین نووی نے مصر کے نامور فرمانروا الملک الظاہر بیبرس کے باشندگان شام پر مظالم کے سلسلے میں اس کو بڑے جرأتمندانہ خطوط لکھے اور بالمشافہ گفتگو بھی کی۔ اس سلسلہ کا ایک واقعہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

شاہ ظاہر تاتاریوں سے جنگ کرنے کے لیے مصر سے نکلا اور شام پہونچا اور وہاں کے علماء سے یہ فتویٰ حاصل کیا کہ اس جنگ کی تیاری کے لیے رعیت کے اموال پر قبضہ کر سکتا ہے۔ جب علماء کا فتویٰ اس کے پاس پہونچا تو اس نے دریافت کیا کہ علماء میں سے کوئی باقی تو نہیں رہا۔ لوگوں نے کہا صرف شیخ محی الدین نووی نے دستخط نہیں کیے ہیں۔ ظاہر نے شیخ کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ جب وہ آئے تو اُن سے کہا "دوسرے علماء کی طرح آپ بھی دستخط کر دیں" انھوں نے انکار کیا۔ ظاہر نے پوچھا "آپ دستخط کرنے سے انکار کیوں کر رہے ہیں۔

امام نووی نے فرمایا:-

"میں جانتا ہوں کہ تم امیر بندقدار کے غلام تھے اور تمھارے پاس کچھ نہ تھا۔ پھر اللہ نے تم پر احسان کیا۔ اور تمھیں بادشاہت عطا کی۔ میں نے سنا ہے کہ تمھارے پاس ایک ہزار غلام ہیں اور ہر غلام کے پاس سونے کا کمربند ہے، دو سو لونڈیاں ہیں اور ہر لونڈی کے پاس زیورات کا ایک ایک بکس ہے جب تم یہ تمام دولت صرف کر لو گے اور تمھارے غلاموں اور لونڈیوں کے پاس سوت کے کمربند اور معمولی لباس کے سوا کچھ نہ بچے گا تب میں تمھیں فتویٰ دوں گا کہ رعیت کے مال پر ہاتھ ڈالو۔"

یہ سن کر ظاہر غصہ سے بیتاب ہو گیا۔ اور حکم دیا کہ تم میرے شہر دمشق سے فوراً نکل جاؤ۔ امام نووی نے فرمایا بہتر ہے۔ یہ کہکر شام کے ایک دیہات "نویٰ" میں جا کر مقیم ہو گئے۔ شیخ کے جانے کے بعد دوسرے فقہاء نے بادشاہ سے عرض کیا کہ شیخ محی الدین ہمارے اکابر علماء و صلحا میں شمار ہوتے ہیں۔ اور عوام ان ہی کی اقتدا کرتے ہیں۔ ان کا دمشق سے نکل جانا مناسب نہیں ہے۔ یہ سن کر ظاہر نے شیخ کی واپسی کا حکم صادر کیا۔ لیکن جب بادشاہ کا فرمان شیخ کو ملا تو انھوں نے جانے سے انکار کیا اور فرمایا کہ جب تک ظاہر دمشق میں موجود ہے میں وہاں نہیں جا سکتا۔ اس واقعہ کے تھوڑے دن بعد ظاہر کا انتقال ہو گیا۔

سلطان محمود خلجی کا معمول تھا کہ وہ اپنے لباس اور غذا کے لیے خود کوئی کام کرتا تھا۔ وہ وہی چاول گیہوں اور کپڑے استعمال کرتا تھا جو اس کو جائز طریقے سے حاصل ہوتے تھے۔ سفر میں لکڑی کے تختوں پر بوئی ہوئی سبزیاں اس کے ساتھ رہتیں۔ ایک بار وہ احمد آباد پر حملہ آور ہوا جس کا فرمانروا جمنی خاندان کا نظام شاہ تھا۔ اس حملہ کے بعد احمد آباد کے ایک بزرگ مولانا شمس الدین حق گو کرمانی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلطان نے ملاقات کے دوران میں کہا میرے پاس ترکاری ختم ہو گئی ہے اس لیے بہت پریشانی ہے۔ لکڑی کے تختوں پر ترکاری پیدا کرتا ہوں مگر وہ شاہی باورچی خانے کے لیے کافی نہیں ہوتی۔ اگر کسی شخص کے پاس حلال۔ ورثے سے خریدی ہوئی زمین موجود ہو تو مجھے بتائیے تاکہ میں اس کو اچھی قیمت دے کر سبزیاں خریدوں۔ یہ سن کر مولانا شمس الدین حق گو نے فرمایا!

"اے سلطان ایسی بات نہ کرو جس کو سن کر تمھارا مذاق اڑایا جائے۔ مسلمانوں کے ملک میں آکر ان کے مال و اسباب کو تباہ و غارت کرنا، ان کے گھروں اور آبادیوں کو ویران

کرنا اور اس کے بعد ترکاریوں کی خرید و فروخت میں حلال و حرام کا یہ خیال قابل مضحکہ نہیں تو کیا ہے ؟ یہ طرز عمل خدا ترسی سے بہت دور ہے۔"

یہ سن کر سلطان کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اس نے کہا "آپ سچ کہتے ہیں۔"

(تاریخ فرشتہ ۱/۳۴۶)

سلطان سکندر لودھی کی شہزادگی کے زمانہ میں ہندو کرکشیتر کے کنڈ میں آکر اشنان کیا کرتے تھے۔ جو ایک مذہبی میلہ بھی بن گیا تھا۔ سکندر لودھی نے اس کو روک دینے کی کوشش کی۔ اس کے لیے اس نے علماء کا ایک محضر طلب کیا۔ جس میں ملک العلماء عبداللہ اجودھنی بھی شریک ہوئے۔ تمام علماء نے ان کی طرف اشارہ کرکے کہا ان ہی کی رائے حرف آخر ہے۔ سکندر لودھی مولانا عبداللہ کی طرف مخاطب ہوا تو انھوں نے پوچھا کہ کرکشیتر کیا چیز ہے ؟ جواب ملا کہ ایک بڑا حوض ہے جہاں ہندو ہر شہر سے آکر غسل کرتے ہیں۔ مولانا نے پوچھا۔ کب سے یہ رسم جاری ہے ؟" جواب ملا "قدیم رسم ہے" مولانا عبداللہ نے فتویٰ دیا کہ کسی قدیم معبد کو تباہ کرنا جائز نہیں ہے۔" سکندر لودھی نے اس فتویٰ کو اپنی منشا کے خلاف پایا۔ اور غصہ سے خنجر بکف ہوکر کہنے لگا۔ یہ جانبدارانہ فتویٰ ہے۔ میں پہلے تجھے ماروں گا پھر کرکشیتر کو تباہ کردوں گا۔ مولانا نے بڑی دلیری سے جواب دیا

"اللہ کے حکم کے بغیر کوئی نہیں مرتا۔ جب کوئی ظالم کے پاس آتا ہے تو وہ اپنی موت کے لیے پہلے سے تیار ہوکر آتا ہے۔ ہر چہ بادا باد۔ آپ نے مجھ سے دریافت کیا میں نے شرعی مسئلہ بیان کردیا۔ اگر آپ کو شریعت کی پرواہ نہیں ہے تو پھر پوچھنے کی حاجت ہی کیا تھی۔"

یہ سن کر سلطان کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا۔ جب مجلس برخواست ہوگئی تو سکندر نے مولانا سے کہا :۔

"میاں عبداللہ ! آپ گاہے گاہے مجھ سے ملاقات کرتے رہیں۔"

(واقعات مشتاقی ص۲۶)

(باقی)

پروفیسر فلپ۔ کے۔ ہٹی

(ترجمہ) وحید الدین خاں

اِسلام اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

مغربی لٹریچر میں

لاہور سے شائع ہونے والے ایک دینی ماہنامہ (محدث) نے اپنی خصوصی اشاعت "رسول مقبول نمبر" (بابت ربیعین ۱۳۹۶ھ) میں عنوان بالا کے تحت ذیل کا مضمون شائع کیا ہے۔ اس مضمون کو ہم معاصر کے شکریہ کے ساتھ خاص طور سے اپنے اُن ناظرین کے لیے الفرقان میں نقل کر رہے ہیں جو مغربی ممالک میں دینی دعوت کا کام کرتے ہیں تاکہ اُن میں سے جس کسی کے علم میں مغربی ممالک کا یہ پہلو آیا ہوا نہ ہو وہ اس مضمون کے ذریعہ آجائے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق کس کس طرح اور کیسی غلط اور گمراہ کن باتیں وہاں کے لوگوں کے دلوں میں بٹھائی گئی ہیں۔

ڈاکٹر ہٹی (PHILIP K. HITTI) عربی زبان اور تاریخ کے مشہور ماہر ہونے کی حیثیت سے مغربی دنیا میں مشرق قریب کے مسائل پر سند سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے عرب اور اسلام کے موضوعات پر متعدد کتابیں لکھی ہیں اور مختلف انسائیکلوپیڈیا کے مقالہ نگار ہیں۔ ان کی کتابیں یورپ اور ایشیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ وہ متعدد یونیورسٹیوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں۔

اسلام اور مغرب (ISLAM AND THE WEST) ڈاکٹر ہٹی کی کتاب ہے جو ۱۹۶۲ء میں امریکہ سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے ۱۹۰ صفحات ہیں اور اس کا موضوع عیسائی دنیا اور اسلام کے

تمدنی تعلقات کی تاریخ بنتی رہی۔ بازنطینی سلطنت کے وقت سے لے کر اب تک مختلف قسم کے اتار چڑھاؤ پائے جاتے رہے ہیں۔ مصنف نے ترجموں کی مدد سے نہیں بلکہ اصل ماخذ سے براہ راست استفادہ کر کے یہ کتاب تیار کی ہے۔

کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے کے ابتدائی تین ابواب میں اسلام کا بالترتیب مذہب، ریاست اور کلچر کی حیثیت سے تعارف ہے۔ چوتھا باب ہے "اسلام مغربی لٹریچر میں"۔ پانچویں اور چھٹے باب میں بالترتیب مشرق کا مغرب پر اور مغرب کا مشرق پر نفوذ و اثر دکھایا گیا ہے۔ ساتویں باب میں اس تحریک کا مختصر تعارف ہے جو اسلام اور مغربی تہذیب کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کے لیے مختلف اسلامی ملکوں میں جاری ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں قرآن اور دوسری قدیم کتابوں سے اسلام اور اسلامی تاریخ اور اسلامی شخصیتوں کے بارے میں اقتباسات نقل کیے ہیں، یہ اقتباسات کل ۲۹ ہیں۔

ذیل میں کتاب کے چوتھے باب (ISLAM IN WESTERN LITERATURE) کا ترجمہ دیا جا رہا ہے۔ اس معذرت کے ساتھ کہ نقل کفر کفر نباشد)

قرونِ وسطیٰ کے مغربی لٹریچر میں پیغمبر اسلام کو عام طور پر جعل ساز اور جھوٹے پیغمبر کی حیثیت سے متعارف کرایا جاتا تھا۔ قرآن پاک ان کی ایک بناوٹی کتاب اور اسلام ایک نفس پرستانہ طریق حیات تھا۔ دنیا میں بھی اور دوسری زندگی میں بھی۔ اس زمانے میں مذہب، اسلام اور عیسائیت دونوں کے درمیان دشمنی کی سب سے بڑی وجہ تھی۔ دونوں طرف سے یہ دعویٰ کیا جاتا تھا کہ ان ہی کا مذہب تمام صداقتوں کا واحد خزانہ ہے گو کہ سیاسی اور تہذیبی تصادم، نظریاتی تصادم سے کبھی زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوا۔ محمد کے بعد ڈیڑھ صدی تک ان کے پیرو پہلے مدینہ پھر دمشق اور اس کے بعد بغداد سے نکل کر بازنطینی سلطنت کو روندتے رہے یہاں تک کہ بڑھتے ہوئے مسیحیت کے مشرقی دار السلطنت کے دروازے تک پہنچ گئے۔ قسطنطنیہ کے سقوط (۱۴۵۳ء) کے بعد چار صدیوں میں مسلم سلجوقی اور عثمانی ترک اپنی ہمسایہ مسیحی طاقتوں کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن گئے۔ ۷۱۱ء سے شروع ہو کر تقریباً آٹھ سو برس میں مسلمان اسپین کے ایک حصہ پر قابض ہو چکے تھے۔ انھوں نے فرانس تک دھاوا بول دیا تھا۔ سسلی دو صدیوں تک ان کے قبضہ میں رہا اور اٹلی کے خلاف ایک فوجی اڈے کا کام کرتا رہا۔ بارھویں اور تیرھویں صدی

کے دوران میں مغربی اقوام مسلمانوں کی زمین پر صلیبی جنگ لڑتی رہیں۔ ان صلیبی لڑائیوں کی یاد آئندہ نسلوں میں باقی رہی

زرتشت، بدھ ازم اور دوسرے کم ترقی یافتہ مذاہب کی کبھی اس طرح سے نفرت اور تحقیر نہیں کی گئی جیسا کہ اسلام کے ساتھ پیش آیا۔ وہ قرونِ وسطیٰ کے مغرب کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھے اور نہ انھوں نے مقابل میں آنے کی کبھی کوشش کی۔ اس لیے یہ بنیادی طور پر خوف، دشمنی اور تعصب تھا جس نے اسلام کے بارے میں مغرب کے نقطۂ نظر کو متاثر کیا۔ اسلام کا عقیدہ ایک دشمن عقیدہ تھا، اس لیے وہ غلط نہ ہو، جب بھی شبہ کی نظر سے دیکھا جانا لازمی تھا۔

پھر زبان کا روک بھی تھا۔ مسیحیت اور دنیائے اسلام کے درمیان سیاسی اور فوجی تصادم کے چھ سو سال تک یورپ قرآن کی زبان کے باقاعدہ مطالعہ کی سہولت سے محروم رہا۔ اس پوری مدت میں لاطینی زبان کا کوئی عالم یورپ میں ایسا نہیں ملتا جو عربی زبان پر عبور رکھتا ہو۔ قرآن کی زبان سے اس بے خبری نے قرآن کے بارے میں غلط تعارف کو پھیلنے کا موقع دے دیا۔

قرونِ وسطیٰ اور اس کے بعد کی مسیحیت نے جن تحریری یا زبانی ذرائع سے اسلام کے بارے میں اپنا تصور قائم کیا وہ وہی تھا جو صلیبی جنگوں کے دوران وجود میں آئے یا ان لوگوں کی معرفت ملے جن سے اسلام کی لڑائی پیش آ چکی تھی۔ مسیحی علماء اور پادری نویسندہ اسی کے ذریعہ سے اسلام کی تصویر بنائی۔ اسلام کی اس پوری تصویر اور اس کی حقیقی اسلامی تصویر میں کوئی مشابہت محض اتفاقی ہے۔

شام کے مشہور عیسائی عالم سینٹ جان آف دمشق (م [illegible]) کو بازنطینی روایات کا بانی کہا جاتا ہے۔ جان نوجوانی کی عمر میں بنو امیہ کے دربار میں حاضر ہوا۔ وہ عربی، سریانی اور یونانی زبانیں جانتا تھا اور اپنے زمانے کے اہلِ علم میں ممتاز درجہ رکھتا تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں اسلام کا تعارف ایک بت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے کیا ہے جس میں ایک جھوٹے رسول کی پرستش ہوتی ہے۔ اس کے بیان کے مطابق محمدؐ نے ایک آرین راہب کی سرپرستی میں بائبل کی مدد سے اپنے اصول وضع کیے۔ یہ اسلام کے متعلق عیسائیت کے قدیم اور عام تصور کی ایک مثال تھی۔ چنانچہ دانتے (م ۱۳۲۱ء) نے اپنی مشہور کتاب میں محمدؐ اور علیؓ کو نویں جہنم کے سپرد کر دیا جو تفرقہ پردازوں اور رسوا کن اعمال کرنے والوں کے لیے مخصوص ہے۔ العیاذ باللہ۔

بازنطینیوں میں پہلا شخص جس نے محمدؐ کا باقاعدہ ذکر کیا اور اسلام پر گفتگو کی وہ مورخ تھیوفین (THEO PHANE) ہے جس کا زمانہ ۷۵۸ - ۸۱۸ ہے وہ ایک خانقاہ کا بانی بھی تھا۔ تھیوفین بغیر کسی حوالے کے محمدؐ کو مشرقی باشندوں کا حکمراں اور ایک بناوٹی رسول لکھتا ہے۔ ڈانٹے کا ایک ہم عصر مسیحی جس نے بغداد کا سفر بھی کیا تھا اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ شیطان جب خود مشرقی ممالک میں عیسائی مذہب کی ترقی کو روک نہ سکا تو اس نے اپنی طرف سے ایک آسمانی کتاب تیار کی اور ایک ابلیس فطرت آدمی کو اپنے وسیلے کے طور پر استعمال کیا۔ یہ آسمانی کتاب قرآن اور وسیلہ محمدؐ ہیں۔ العیاذ باللہ

عبدالمسیح ابن اسحاق الکندی ایک مشرقی عیسائی تھا اس کو اسپین میں ایک سید زادہ مسلمان نے تحریری طور پر اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ اس واقعہ نے عرب کے اس عیسائی کو برقع دیا کہ وہ عیسائیت کا دفاع کرے اور اسلام پر حملہ آور ہو۔ الکندی نے محمدؐ کو ایک شہوت پرست اور قاتل کی حیثیت سے پیش کیا جن کی کتاب محض مصنوعی الہامات کا مجموعہ تھی اور جن کا مذہب دھوکے، تشدد اور نفرت پرستانہ تعلیمات کی چاٹ دلا کر پھیلایا گیا۔

ان باتوں کے نتیجے میں عیسائی دنیا میں محمدؐ کے خلاف کچھ ایسی فضا پیدا ہو گئی تھی کہ کوئی افسانہ خواہ وہ کتنا ہی عجیب ہو اور اس کی کوئی اصل نہ ہو فوراً قبول کر لیا جاتا تھا اور بیان کیا جاتا تھا۔ قرطبہ کا ایک بشپ ایولوگس (EULOGIUS) جو اپنے وقت کا بڑا عالم تھا ایک لاطینی تحریر کے حوالے سے جو ایک عیسائی راہب نے تیار کی تھی لکھتا ہے کہ محمدؐ کی وفات کے بعد ان کے اصحاب فرشتوں کا انتظار کر رہے تھے جو آتے اور ان کے جسم کو اوپر لے جائیں مگر اس کی بجائے کتے آئے اور ان کے جسم کو کھا گئے اس لیے مسلمان ہر سال بڑے پیمانے پر کتوں کو ہلاک کرتے ہیں۔ ایولوگس اسپین کے مسلم دارالسلطنت میں رہتا تھا وہ معمولی کوشش سے جان سکتا تھا کہ اس پورے افسانے میں صرف اتنی سی حقیقت ہے کہ مسلمان کتے کو ایک ناپاک جانور جانتے ہیں۔

لاطینی زبان سے یہ کتے کا افسانہ فرانسیسی میں بھی پہنچا چنانچہ ایک قدیم فرانسیسی نظم میں کتے اور سؤر کو دکھایا گیا ہے کہ وہ محمدؐ کے جسم کو کھا رہے ہیں۔ سؤر کی یہ روایت عوام میں بہت مقبول ہوئی اور قرآن میں سؤر کی حرمت کی بہت آسان توجیہ بن گئی (حالانکہ سؤر کی حرمت آپ کی وفات سے بہت پہلے کا واقعہ ہے۔ دروغ گو را حافظہ نباشد۔ وحید الدین) اسی طرح یہ بھی کہا گیا کہ محمدؐ کا تابوت زمین

و آسمان کے درمیان فضا میں معلق ہے اور لوگوں نے اس پر یقین کر لیا۔

بارھویں اور تیرھویں صدی میں صلیبی جنگوں کے ذریعے اسلام کو مغلوب کرنے کی کوشش جب ناکام ہو گئی تو مسیحی حلقہ میں ایک نیا رجحان ابھرا۔ اسلام کو تبلیغ و تحریص کے ذریعے تباہ کیا جائے۔ بے دخلی کی کوشش کی جگہ عقیدہ کی تبلیغ نے لے لی۔ مشنری تحریک وجود میں آئی۔ کارملی رہبانوں کا حلقہ (CARMELITE FRIER ORDER) ایک صلیبی ہی نے (۱۱۵۶ء) ماؤنٹ کارمل پر قائم کیا تھا[1]

فرانسسکن نے اس کی پیروی کی۔ ۱۲۱۹ء میں سینٹ فرانسس آف اسیسی قاہرہ گئے اور اپنی فرانسسکن مشنری سرگرمیوں کا آغاز کیا مگر اس دور کی سب سے بڑی مشنری تحریک ایک اسپینی تحریک تھی جو ریمنڈ لل (RAYMOND LULL) نے شروع کی جس کا زمانہ ۱۳۱۵-۱۲۳۵ء ہے۔ لل نے روحانی صلیبی جنگ (SPIRITUAL CRUSADES) کے لیے بہت دانشمندانہ نقشے بنائے جس کا مقصد مسلمانوں کو عیسائی بنانا تھا۔ بحث ومناظرہ اور استدلال کے ذریعے کامیاب ہونے کے بارے میں اس کا یقین آخر وقت تک قائم رہا۔ اس کی تیاری کے لیے اس نے عربی پڑھی اور اپنی خانقاہ میں اس کا درس دینا شروع کیا۔ جو اس نے مرامر (MERAMAR) میں قائم کی تھی۔ اس کی عربی زبان اور اسلام سے واقفیت اس زمانہ میں اپنی مثال نہیں رکھتی تھی مگر ٹیونس میں اس کی مشنری سرگرمیاں ناکام ہو گئیں۔ توحید پرست مسلمانوں کے ذہن میں تثلیث کا عیسائی عقیدہ بٹھانے کی کوشش، تنی فضول تھی کہ بالآخر اس نے اسلام پر حملہ کرنا شروع کیا۔ وہ گلیوں میں نکل کر چلاتا پھرتا تھا۔ "عیسائیوں کا عقیدہ صحیح ہے اور مسلمانوں کا عقیدہ غلط ہے۔" ٹیونس میں ایک مشتعل مجمع نے اس پر حملہ کیا اور پتھر مارنے شروع کیے یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو گیا۔

عیسائیت اور اسلام میں ربط کا رکاوٹ پہلی بار اس وقت ٹوٹا جب فرانس میں قرآن کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا گیا۔ یہ بیرونی زبان میں قرآن کا پہلا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ تخمیناً ۱۱۴۱ء میں کیا گیا

---

[1] اس صلیبی کا نام BERTHOLD ہے۔ اس جماعت کے لوگ سفید جبہ پہنتے تھے۔ اس لیے ان کو سفید پوش رہبان (WHITE FRIERS) کہا جاتا ہے۔ (وحید الدین)

اور اس کے کرنے والے تین عیسائی اور ایک عرب کا باشندہ تھا۔ اس ترجمۂ قرآن کے ساتھ ایک ضمیمہ اس عنوان کے ساتھ لگا ہوا تھا "مسلمانوں کے عقائد کی تردید"۔ اس کے بعد ۱۶۳۹ء میں سیور ڈو رئر (SIEUR DU RYER) نے اس ترجمہ کی مدد سے قرآن کو فرانسیسی زبان میں منتقل کیا۔ یہ شخص اسکندریہ میں فرانسیسی کونسل رہ چکا تھا۔ پھر اسی سال سیور ڈو رئر نے براہ راست عربی زبان سے فرانسیسی زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا اور اس کے بعد اس کو محمدؐ کا قرآن (THE AL QURAN OF MOHOMET) کے نام سے انگریزی میں منتقل کیا۔ اس ترجمہ کی اشاعت کا مقصد مترجم کے الفاظ میں ان تمام لوگوں کو مطمئن کرنا تھا جو ترکی کے کھوکھلے مذہب (TURKISH VANITIES) کے جاننے کے خواہش مند تھے۔ لفظ (MOHOMET) خود محمدؐ کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں اس کی اٹھارہ شکلیں بتائی گئی ہیں۔ اسی طرح (MAHOUND) کی سترہ شکلیں (MOHAMMAD) کی پانچ۔ اور (MUHAMMED) کو لے کر ایک ہی نام کی اکتالیس شکلیں ہیں۔[1] قرآن کا یہ گمنام ترجمہ الیگزینڈر روس (ALEXANDERROSS) کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ سپین میں نام نہاد مورز (MOORS) کے زوال کے بعد عثمانی ترک دشمن مذہب (اسلام) کے علمبردار نظر آ رہے تھے۔ مارٹن لوتھر نے پہلے یہ خیال کیا کہ ترکوں کو مسیحیت کے گناہوں کی پاداش میں خدا کا بھیجا ہوا عذاب سمجھ کر گوارا کرنا چاہیے مگر ۱۵۲۹ء میں جب ترک وائنا کے دروازوں تک پہنچ گئے تو اس نے اپنے ذہن کو بدل دیا اور یہ تبلیغ کی کہ ان کافروں کے خلاف جنگ کرنے کی ضرورت ہے۔

قرآن کا پہلا انگریزی ترجمہ براہ راست عربی زبان سے ۱۷۳۴ء میں کیا گیا اور اس کا ترجمہ جارج سیل (GEORGE SALE) کا تھا۔ سیل عیسائی علوم کی ترقی کی انجمن کا ایک رکن تھا اور اس نے شامی علماء کی مدد سے عربی زبان سیکھی تھی۔ سیل کا ترجمہ انگریزی دنیا میں ڈیڑھ صدی تک چھایا رہا۔

سترھویں صدی میں ایک نیا رنگ پیدا ہوا جب آکسفورڈ یونیورسٹی نے عربی کی تعلیم کے لیے ایک نشست اپنے یہاں مخصوص کی اور ایڈورڈ پوکک (EDWAD POC:CK) کو ۱۶۳۶ء میں اس منصب پر مقرر کیا۔ پوکک چھ سال تک شام میں پادری کی حیثیت سے رہ چکا تھا اور عربی میں دستگاہ اور اسلام

---

[1] مصنف نے یہاں (MAUMET) کو شمار نہیں کیا جس کی سب سے زیادہ شکلیں آکسفورڈ ڈکشنری میں بتائی گئی ہیں اور ان کو شامل کرنے کے بعد شکلوں کی یہ فہرست ستر سے بھی زیادہ تک پہنچ جاتی ہے۔ (وحید الدین)

کی براہ راست معلومات حاصل کر چکا تھا۔ آکسفورڈ میں عربی شعبہ کے کھلنے سے یورپی عربی داں پیدا ہونے کا دروازہ کھل گیا۔ پکاک خود غالباً اپنی صدی کا سب سے بڑا یورپی عربی داں تھا۔ اس نے متعدد کتابیں ایڈٹ یا تصنیف کیں۔ اس نے قارئین کو یقین دلایا کہ معلق تابوت کا افسانہ مسلمانوں کے لیے ایک مضحکہ خیز بات ہے جس کو وہ صرف عیسائیوں کی ایجاد سمجھتے ہیں۔ اس نے مزید اس مروجہ کہانی کو چیلنج کیا کہ اسلام کے بانی نے ایک سفید کبوتر کو تربیت دے رکھی تھی کہ وہ ان کے کندھے پر بیٹھا رہے اور کان کے اندر پڑے ہوئے دانے کو چگنے کے لیے کان میں چونچ مارتا رہے۔ اس سے وہ اپنے متبعین کو یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ کبوتر کے ذریعہ سے روح القدس ان کو الہام کر رہا ہے۔ یہ افسانہ اس قدر مشہور ہوا کہ وہ انگریزی ادب میں شامل ہو گیا۔ چنانچہ شیکسپیر کے ایک کردار کی زبان سے ہم سنتے ہیں۔

WAS MAHOMET INSPIRED BY A DOVE

THOU WITH AN EAGLE ART INSPIRED THEN.

شیکسپیر سے بہت پہلے جان لڈگیٹ (JOHN LYDGATE) (م ۱۴۵۱ء) اس کبوتر کا رنگ تک جانتا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق کبوتر کا رنگ دودھیا سفید تھا۔ پھر یہ یقین یہاں تک بڑھا کہ اٹھارھویں صدی کے ایک کبوتروں کے ماہر نے ایک خاص قسم کے کبوتر کا نام (MAUMET) رکھ دیا جو دراصل لفظ محمد کی بگڑی ہوئی شکل تھی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کبوتر عیسائیوں کے ہاں تو روح القدس کی علامت ہے (لوقا ۳: ۲۲) مگر اسلام میں اس کی کوئی اصل نہیں۔

اسی طرح ماومٹ (MAUMET) کا لفظ بت کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ وہ شخص جس نے کعبہ کے سینکڑوں بتوں کو توڑا، جس کے پیرو فخر کرتے ہیں کہ وہی صرف حقیقتاً توحید پرست ہیں اور کسی قسم کے بت یا مورتی کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہی شخص مغربی من گھڑت میں ایک خدا اور ایک بت بن گیا۔ قرون وسطیٰ کی انگریزی روایات میں ماہون (MAHOUN) بار بار پرستش کا ایک مظہر قرار دیا گیا ہے۔ یہ مان لیا گیا تھا کہ ترکوں اور مسلمانوں کے یہاں اس کی پوجا ہوتی تھی۔

ماومٹ کی طرح قرآن بھی الکرون (ALKARON) کے نام سے مسلمانوں کا ایک بت قرار پایا۔ مزید یہ یقین دلایا گیا کہ مسلمان اپنے بتوں کے آگے عبادتی رسوم منعقد کرتے ہیں جن میں لوبان جلایا جاتا ہے اور نرسنگھا پھونکا جاتا ہے۔ اسی طرح سورج (APOLLO) ان کا دوسرا دیوتا تھا۔ ایک فرانسیسی مصنف

کے بیان کے مطابق [illegible]ء میں شارلی مین کی فوجوں سے مسلمانوں کو شکست ہوئی تو انھوں نے اپنا غصہ سورج دیوتا کے اوپر نکالا اور اس پر پل پڑے۔ ایک اور الزبتھ کے دور کا نامور مصنف فرانسس بیکن (FRANCIS BACON) محمد کو عطائی (MOUNTBANK) قرار دیتا ہے۔ اس نے اپنے مقالہ "ہمت و استقلال" (BOARDNESS) میں نقل کیا ہے۔

"محمد نے لوگوں کو یقین دلایا کہ وہ ایک پہاڑی کو بلائیں گے اور وہ ان کے پاس چلی آئے گی۔ لوگ جمع ہوئے اور محمد نے پہاڑی کو اپنے پاس آنے کو کہا۔ وہ بار بار پکارتے رہے اور جب پہاڑی اپنی جگہ کھڑی رہی تو وہ ذرا بھی نہ شرمائے بلکہ انھوں نے کہا —— اگر پہاڑی محمد کے پاس نہیں آسکتی تو محمد تو پہاڑی تک جاسکتے ہیں۔"[1]

مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں اس واقعہ کی کوئی اصل موجود نہیں ہے۔ تاہم قرون وسطیٰ کے تمام مصنفین نے اس خلاف اسلام انداز کو نہیں اپنایا تھا۔ صلیبی دور کا ایک بشپ جس کی پیدائش شام میں ہوئی تھی۔ ولیم آف تریپولی (WILLIAM OF TRIPOLI) نے ۱۲۷۳ء میں ایک رسالہ لکھا جس میں اگرچہ محمد کو وہ جھوٹے رسول کی حیثیت سے تسلیم کرتا ہے مگر آپ کے حالات میں دشنام طرازی اور افسانوی حصے کو بہت کم کر کے پیش کیا ہے۔ اسی طرح ۱۶۷۹ء میں ایک انگلش پادری لینسلوٹ اڈیسن — (LANCELOT ADDISON) نے ایک کتاب لکھی جس میں اس نے من گھڑت اجزاء کو الگ کرنے کی کوشش کی جو محمد کے نام سے وابستہ ہو گئے تھے۔ بعض بعض مواقع پر اس نے پہلے کسی واقعہ کی افسانوی تصویر کو نقل کیا ہے اور اس کے بعد تاریخی حقیقت کو بیان کیا ہے۔ اڈیسن کے ایک ہمعصر ہمفری پرائیڈکس (HUMPHRAY PRIDEAUX) نے آپ کی مکمل سوانح حیات لکھی جس میں کبوتر کے قصہ اور اسی طرح بہت سی دوسری کہانیوں کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ان کو صحیح ماننے کے لیے کوئی واقعی بنیاد موجود نہیں ہے۔ تاہم اس سوانح حیات کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ اسلام ایک مکارانہ مذہب (FRAU-DULENT RELIGION) کا معیاری نمونہ ہے۔ یہ سوانح عمری ایک صدی تک مغربی حلقوں میں مستند سمجھی جاتی تھی۔

زیادہ رواداری کا نقطہ نظر اٹھارھویں صدی میں پیدا ہوا۔ اس زمانہ میں مغرب کے عربی دانوں نے اسلام کے متعلق زیادہ قابل اعتماد ذرائع کا ترجمہ کیا۔ سیاح اور تاجر زیادہ اچھے تاثرات لے کر لوٹے اور

۱؎ WORKS OF FRANCIS BACON VOL. II (LONDON 1829) P. 274

سفیروں اور مشنری کے عہدیداروں نے بھی اضافہ معلومات میں حصہ لیا۔ مثال کے طور پر جارج سینڈیز (GEORGE SANDYS) جس نے قسطنطنیہ، مصر اور فلسطین کی زیارت کی تھی۔ وہ ۱۶۱۵ء میں اپنے سفر کی روداد لکھتے ہوئے مسلمانوں کی اور بہت سی چیزوں کے ساتھ زکوٰۃ کی تعریف کرتا ہے جو عیسائی اور یہودی غرباء کو دی جاتی تھی۔ تاہم زیادہ تر مثالوں میں لوگ ذاتی تحقیق سے زیادہ روایتی معلومات ہی پر اکتفا کرتے رہے حتیٰ کہ متخصصین پروفیسروں تک کا یہ حال تھا کہ پیدائشی طور پر سنی سنائی روایات کو دہرایا کرتے تھے۔ پکاک کا جانشین جوزف وائٹ (JOSEPH WHITE) ۱۷۸۴ء میں اپنے مشہور بمپٹین لیکچرز (BAMPTON LECTURES) میں مسیحیت کی حمایت کرتے ہوئے جب اسلام پر آیا تو محمدؐ کے لیے اس کے پاس جو لفظ تھا وہ وہی عام روایتی لفظ تھا۔ مکار اور فریبی (IMPOSTER) اسی طرح اور بعد کے ممتاز علماء مثلاً ولیم میور (ایڈنبرا یونیورسٹی) اور ڈاڈز ایس، مارگولیتھ (آکسفورڈ)، ہنری لامنز (بیروت یونیورسٹی) کے یہاں بھی قدیم رجحانات کے آثار ملتے ہیں۔

مقالہ نگاروں اور مورخوں کے ہاتھوں محمد، قرآن اور اسلام کا معاملہ اس سے بہتر رہا جو پہلے مذہبی علماء، ناول نگاروں اور شاعروں کے ہاتھ میں اس کا حشر ہوا تھا۔ اس سلسلے میں پہلا قابل ذکر نام سائمن آکلے (SIMON OCKLEY) کا ہے جو کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کا پروفیسر تھا۔ اس نے مسلمانوں کی تاریخ پر دو جلد والی ایک کتاب لکھی ہے۔ اگرچہ کیمبرج کا یہ عالم بھی مکار (IMPOSTER) کو محمد کے ہم معنی لفظ کے طور پر استعمال کرتا ہے اور اسلام اور توہمات اس کے یہاں مرادف الفاظ ہیں مگر مخصوص تاریخی واقعات کے بیان میں اس نے راست گوئی سے کام لیا ہے۔ شام کی فتح کا حال بتاتے ہوئے مثال کے طور پر وہ بازنطینیوں کی تجارت گری اور دغا بازی کا مقابلہ ابو بکرؓ کی فوجوں کی شجاعت اور ان کے اعلیٰ رویہ سے کرتا ہے جن کو خلیفہ کی ہدایت تھی کہ کسی عورت یا بچہ کو قتل نہ کریں۔ کھجوروں کے درخت نہ کاٹیں اور نہ ملکیت کو نقصان پہنچائیں۔ آکلے کی اس کتاب نے مستند درجہ حاصل کیا اور گبن کے ظہور سے پہلے تک عرب تاریخ پر بنیادی ماخذ سمجھی جاتی رہی۔

ایڈورڈ گبن (ADWARD GIBBON) جو جدید انگریزی تاریخ کا بانی ہے اس نے اپنی مشہور کتاب "سلطنت روما کا زوال" کی پانچویں جلد کے پچاسویں باب کو اس موضوع کے لیے مخصوص کیا ہے۔ اپنے اعتراف کے مطابق وہ "مشرقی زبانوں سے کمل طور پر ناواقف" تھا اس لیے قدرتی طور پر

اس کا ماخذ وہی کتابیں تھیں جو اس سے پہلے یورپ میں لکھی گئی تھیں اور اس بنا پر اس کی ترجمانی بھی واقعہ کے مطابق نہ ہو سکی۔ تاہم اس نے بہت سی روایات کو غلط قرار دیا۔ مثلاً اس نے کہا کہ مکار نبی کا لقب ایک خطرناک اور ناقابلِ اعتبار (PRILONS AND SLIPPERY) چیز ہے۔

فرانس میں والٹیر پیدا ہوا جو بحیثیت مورخ زیادہ محتاط ہے مگر بحیثیت المیہ نگار (TRAGE-DIAN) محتاط نہیں تھا۔ اپنی تاریخی کتاب (۱۷۵۶ء) میں وہ محمدؐ کا ذکر رواداری کے ساتھ کرتا ہے وہ محمد کا مقابلہ کرامویل (CROMWELL) سے کرتا ہے۔ ان کے کارناموں کو انگلینڈ کے نجات دہندہ (کرامویل) سے زیادہ عظیم قرار دیتا ہے گر اپنے المیہ ناٹک (TRAGEDY) ۱۷۴۲ء میں محمدؐ کو قرونِ وسطیٰ کے لباس میں مکار، ظالم اور عیاش بنا کر پیش کرتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ والٹیر کا اسلام پر حملہ، عمومی طور پر اس کے مخالفِ مذہب ہونے کا نتیجہ تھا۔ والٹیر کا انحصار انگریزی ماخذ پر تھا۔ خاص طور پر سیل کا ترجمہ قرآن۔ کیونکہ وہ انگلینڈ میں رہا تھا اور انگریزی زبان سیکھی تھی۔

والٹر سے زیادہ جرمن شاعر گوئٹے (۱۷۴۹-۱۸۳۲) وہ شخص تھا جو جدید سپرٹ اور بین الاقوامی نقطۂ نظر کا پیغامبر بنا۔ گوئٹے نے اپنی زندگی میں محمد کے حالات پر ایک نظم شروع کی مگر وہ اس کو مکمل نہ کر سکا۔ گوئٹے یہ یقین کرنے کے لئے تیار نہ تھا کہ عربی پیغمبر ایک مکار شخص تھا۔ سعدی کی گلستاں کے جرمن ترجمے نے خاص طور پر گوئٹے کو بہت متاثر کیا۔ ۱۸۱۲ء میں حافظ کے کلام کا جرمن زبان میں ترجمہ ہوا تو گوئٹے کو اس میں حکمت، تقدس اور سلامتی نظر آئی جو اس کے خیال میں مغرب کو خاص طور پر درکار تھی۔

اسلامی کلچر کے بارے میں مغربی علماء کا بدلا ہوا نقطۂ نظر جس کا آغاز انگریز اور فرانسیسی پروفیسروں نے کیا تھا اور جرمن اور دوسرے ادیبوں اور شاعروں نے جس کو تقویت دی تھی وہ انیسویں صدی کے وسط تک بالکل واضح ہو گیا۔ کارلائل کا محمدؐ کو پیغمبرانہ ہیرو کے کردار کے لیے منتخب کرنا بیک وقت نئے رجحان کی طرف اشارہ تھا اور اس میں اضافہ کرنے والا بھی تھا۔ کارلائل کی کتاب میں مشکل سے کوئی ناخوشگوار فقرہ ہو گا۔" درحقیقت یہ کتاب اس لیے قابلِ تنقید ہو سکتی ہے کہ وہ غیر تنقیدی ہے۔"

محمدؐ ایک سازشی، مکار ہیں، وہ جھوٹ کا مجسمہ ہیں، ان کا مذہب محض عطائی نسخوں کا مجموعہ ہے۔ اس قسم کی باتیں کارلائل کو گوارا نہیں تھیں۔ اس کا ہیرو (محمدؐ) واقعی ایک انسان تھا سچا انسان۔

مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی

جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ

وقت ایک دولت ہے

ایک تقریر جو خواص اہل علم اور جامعۃ الرشاد کے طلبہ اور اساتذہ کے ایک مجمع میں کی گئی

محترم حضرات، اساتذہ اور عزیز طلبہ!

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو بیشمار نعمتیں عطا کی ہیں ان میں ہر ایک کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل کشد کہ جا اینجاست

(یعنی سر سے پیر تک خدا کی جس نعمت پر نگاہ ڈالتا ہوں دل کھینچنے لگتا ہے اور تقاضا کرتا ہے کہ میری جگہ بس یہی ہے) مگر وقت شاید خدا کے قدرداں کی سب سے قیمتی نعمت ہے ہماری بول چال میں وقت کو دولت کہا جاتا ہے، وقت ایک دولت ہی نہیں بلکہ انسانی زندگی کا سارا تانا بانا اسی سے بنتا ہے اس کے بغیر انسانی زندگی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا، اسی کے ختم ہو جانے کا نام موت ہے، روزانہ وقت کی یہ سپلائی قدرت خداوندی کا سب سے بڑا کرشمہ بلکہ ایک معجزہ ہے، روزانہ ہم کو جب ہم اٹھتے ہیں تو وقت کی یہ دولت بے حد و حساب چوبیس گھنٹے، بغیر کسی جد و جہد کے ہم کو مل جایا کرتی ہے اور زندگی بھر ملتی رہتی ہے اس میں کبھی ناغہ نہیں ہوتا اور نہ کمی بیشی ہوتی ہے اور پھر وقت کی یہ سپلائی ایسے حیرت انگیز طریقے سے ہوتی ہے کہ نہ اس کو ہماری آنکھیں دیکھ پاتی ہیں اور نہ ہمارا احساس کی تیزی اسے اپنی گرفت میں لے سکتی ہے، ہماری رفتار وقت تیز ہو تب بھی یہ اسی طرح دبے پاؤں آتا اور جاتا ہے کہ اس کی

رفتار کی آہٹ تک ہمارے کانوں کو سنائی نہیں دیتی بلکہ تیز سے تیز آلۂ سماعت بھی اس کے آنے اور جانے کی آواز کو نہ تو سن سکتا ہے اور نہ کوئی بہتر سے بہتر ٹیپ ریکارڈ اسے محفوظ کر سکتا اس کی تیز رفتاری کا اندازہ آپ اپنی گھڑی کی سکنڈ کی سوئی سے لگا سکتے ہیں ایک سکنڈ جس کی ہمارے نزدیک کوئی قیمت نہیں ہے اسی ایک سکنڈ میں روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کا فاصلہ طے کر لیتی ہے، وقت کی اس دولت سے کائنات کا ذرہ ذرہ مستفیض ہوتا ہے اور اپنی بقا میں اس کا محتاج ہے، دن رات کی آمد و رفت، زمین کی گردش، سورج، چاند اور ستاروں کی گردش اور روشنی، ہوا، پانی اور مٹی کا رد و بدل یہ سب اسی وقت کی کرشمہ سازی کا نمونہ ہے، وقت کی یہ سپلائی اگر ایک لمحہ کے لیے بند ہو جائے تو انسان، حیوان، پرند و چرند ہی نہیں بلکہ کائنات کا ایک ایک ذرہ اپنا وجود کھو دے گا۔ خدائے قدوس کی یہ سب سے پہلی اور سب سے زیادہ قیمتی اور حیرت انگیز تخلیق ہے اسی لیے کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی حمد و ثنا کرتا ہے اور اس کی کرشمہ سازی کے گن گاتا ہے اور ہم کو بھی اس کی قدر دانی کا حکم دیا گیا ہے۔ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ (اللہ کی تسبیح بیان کرو صبح شام اور رات میں اور دوپہر کے بعد اس کی تعریف زمین و آسمان میں ہوتی ہے)۔ وقت خدا تعالیٰ کی عطا کردہ ایک ایسی دولت ہے جس کو اس کے علاوہ کوئی ہم سے چھین نہیں سکتا، اور نہ کوئی اسے چرا سکتا ہے، بچہ ہو یا جوان ہو اور ضعیف ہو یا بوڑھا ہو مرد ہو یا عورت وقت کی یہ نعمت سب کو برابر ملتی ہے، دیہاتی ہو یا شہری امیر ہو یا غریب سب کے لیے اس کا دروازہ یکساں کھلا ہوتا ہے نہ تو وہ غریب کو ایک منٹ کم ملتا ہے اور نہ امیر کو ایک منٹ زیادہ ملتا ہے، اگر کوئی اسے ضائع کر دے تو بظاہر کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں مگر اس کے ضائع کرنے والے کو جو نقصان اٹھانا پڑتا ہے اس کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے اور کبھی کبھی ایک لمحہ کی غفلت آدمی کو سالوں پیچھے کر دیتی ہے۔

گفتم کہ غبار از پئے محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

(میں سمجھ رہا تھا کہ نشان ہے جیسا اور میں راستہ سے ہٹ کر اسے سمجھنے لگا اس ایک لمحہ کی غفلت نے مجھے سواری اور قافلہ سے سیکڑوں سال منزل پیچھے کر دیا) لیکن جو اس وقت کی قدر دانی کرتا ہے اس کے

فائدے بھی اٹھاتا ہے اور اس کے نادانوں کا کوئی حد وشمار نہیں ہے، قرآن نے بہت مختصر مگر بڑے جامع انداز میں اس کی قدردانی اور ناقدری کا ذکر کیا ہے۔ وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔

وقت کی یہ خصوصیت بھی بڑی اہم ہے کہ وہ ہم کو بغیر کسی محنت اور کوشش کے ملتا ہے یوں تو زندگی کی ہر نعمت خدا کی دی ہوئی ہے مگر اس کے لیے کچھ محنت اور کوشش بھی کرنی پڑتی ہے جو نعمتیں ہم کو اللہ نے بغیر کسی جد وجہد کے دی ہیں ان کی بھی حفاظت اور جتن کا انتظام کرنا پڑتا ہے ورنہ وہ نعمت ہم سے چھن جاتی ہے یا اس کے فائدے سے ہم محروم ہو جاتے ہیں صحت بڑی نعمت ہے مگر اس کو قائم رکھنے کے لیے کچھ تدبیریں کرنی پڑتی ہیں انسان کے اعضاء وجوارح اس کا دل ودماغ اس کی اولاد روپیہ پیسہ یہ سب خدا کا عطیہ ہیں مگر ان میں سے ہر ایک کی دیکھ بھال اور حفاظت کا انتظام کرنا پڑتا ہے اگر ہم ایسا نہ کریں تو صحت برباد ہو جائے گی اعضاء وجوارح جواب دے جائیں گے اولاد بگڑ کے برباد ہو جائے گی۔ روپیہ پیسہ ضائع ہو جائے گا مگر وقت کو اگر آپ برباد کریں یا اس کا غلط استعمال کریں تو وہ موت سے پہلے آپ سے چھینا نہیں جائے گا اور نہ اس میں کوئی کمی ہوگی مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ وقت جتنی قیمتی شئے ہے اسی اعتبار سے اس کی ناقدری، بربادی اور اس کے غلط استعمال کے نتائج بھی بڑے ہولناک ہوتے ہیں اگر افراد اسے ضائع کرتے ہیں تو افراد کو اس کے برے نتائج سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور اگر کوئی قوم اسے برباد کرتی ہے تو وہ اجتماعی عذاب اور بربادی کا شکار ہوتی ہے۔

أَوَلَمْ نُعَمِّرْكُم مَّا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَن تَذَكَّرَ وَجَاءَكُمُ النَّذِيرُ فَذُوقُوا فَمَا لِلظَّالِمِينَ مِن نَّصِيرٍ	کیا ہم نے تم کو لمبی لمبی عمریں نہیں دیں جس میں جس نے چاہا نصیحت حاصل کی اور اس کی یاد دہانی کے لیے ڈرانے والے آئے، اب مزہ چکھو ظالموں کو کوئی مددگار نہیں ہے

محترم حضرات!

وقت کی اسی اہمیت کے پیش نظر اسلام نے سارے احکام کو وقت کا پابند بنا دیا ہے اگر آپ ان احکام اسلامی کو مقررہ وقت پر ادا نہ کریں تو خدا کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے اگر آپ فجر کی

نماز ظہر کے وقت پڑھیں یا ظہر کی فجر کے وقت، تو آپ کی نماز خدا کے حضور میں کوئی قیمت نہیں رکھے گی، روزہ اگر آپ ماہ رمضان کے بجائے دوسرے کسی مہینے رکھ لیں تو کبھی آپ کے سر سے فرض ادا نہ ہوگا، آپ زکوٰۃ کا سال بھر کا حساب کیے بغیر ہزار روپیہ کار خیر میں لگا دیں تو آپ زکوٰۃ کے فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتے، اگر آپ حج ۹-۱۰-۱۱ ذوالحجہ کے بجائے شوال یا رمضان میں ادا کریں تو آپ کا حج ادا نہ ہوگا، اسی طرح معاملات اور معاشرتی احکام میں بھی وقت کی پابندی کو اسلام نے ضروری قرار دیا ہے، قرآن نے ان قوموں اور افراد کو بار بار تنبیہ کی ہے جن کو لمبی لمبی عمریں دی گئیں اور انھوں نے حق کو نہیں پہچانا اور باطل میں پڑے رہے گویا اس طرح انھوں نے اپنی عمر اور وقت کا سارا سرمایہ ضائع کیا۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر "قیامت تمھارے سر پر کھڑی ہو اور تمھارے ہاتھ میں کوئی پودا ہو تو اس وقت بھی تم اسے جلد سے جلد زمین میں لگا دینے کی کوشش کرو" یعنی جو وقت میسر ہے اسے کام میں لاؤ۔

صحابہ کرامؓ نے آپ کے فیض صحبت سے وقت کی اہمیت کو خوب سمجھ لیا تھا وہ جب ایک دوسرے سے ملتے تو جدا ہونے سے پہلے سورۂ والعصر سنا دیتے تھے جس میں زمانہ اور وقت کی قسم کھا کر اس کے صحیح استعمال کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور جو لوگ اس کا غلط استعمال کرتے ہیں ان کو تنبیہ کی گئی ہے امام رازی نے لکھا ہے کہ کسی بزرگ نے ایک برف بیچنے والے کو دیکھا کہ وہ آواز لگا رہا تھا کہ "رحم کرو اس شخص پر جس کا سرمایہ گھلا جا رہا ہے"، "رحم کرو اس شخص پر جس کا سرمایہ گھلا جا رہا ہے"۔ اس کی یہ بات سن کر انھوں نے کہا کہ "آج سورۃ العصر کی تفسیر سمجھ میں آگئی" ان کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ عمر کی جو مدت انسان کو دی گئی ہے وہ برف کے گھلنے اور پگھلنے سے بھی زیادہ تیزی سے گزر رہی ہے۔ اور انسان غفلت میں پڑا ہوا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جب کسی آدمی کو بیکار دیکھتے تو اسے درہ لگاتے اور فرماتے کہ اِنِّیْ لَاَکْرَہُ اَنْ اَرٰی اَحَدَکُمْ سَبَهْلَلًا لَا فِیْ عَمَلِ الدُّنْیَا وَلَا فِیْ عَمَلِ الْاٰخِرَۃِ (میں تم میں سے کسی کو بیکار دیکھنا پسند نہیں کرتا نہ تو دنیا کے کام میں لگو اور نہ آخرت کے کام میں)

وقت کی قدر دانی ہی تھی کہ امام طبری، امام نووی، حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن کثیر، حافظ ابن حجر، علامہ سیوطی اور بہت سے محدثین و فقہا کی کتابوں کے صفحات کا شمار کیا گیا ہے تو ایک ایک

دن میں ۲۵-۳۰ صفحے روزانہ پڑھتے ہیں اگر دوسری انسانی ضروریات کو بھی سامنے رکھا جائے تو ان کتابوں کی ضخامت پر حیرت ہوتی ہے کہ اتنا بڑا علمی ذخیرہ ایک آدمی نے کیسے جمع کر لیا۔ ہمارے اسلاف اور بزرگان دین ایک لمحہ کی غفلت کو بھی گناہ تصور کرتے تھے۔ ان کا تو یہ وظیفہ تھا ؎

ناخوشش آں وقتے کہ بے زندہ دلاں بے عشق رفت
ضائع آں لحظہ کہ بر مستاں بہ ہشیاری گزشت

(وقت کے ضائع کرنے میں کام ہی کا نقصان نہیں ہوتا بلکہ وقت ضائع کرنے والا بغیر کسی ارادہ کے نیت سے برائیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور وہ بلا وجہ ذہنی انتشار میں مبتلا ہوتا ہے۔)

علامہ شبلی نعمانی نے اپنے سفرنامۂ مصر و شام میں لکھا ہے کہ جس جہاز سے وہ سفر کر رہے تھے اسی سے مشہور انگریز مصنف پروفیسر آرنلڈ جن کا علمی گروہ میں ساتھ رہ چکا تھا بھی سفر کر رہے تھے تو راستہ میں جہاز خطرہ میں آگیا اور قریب تھا کہ وہ غرق ہو جائے جہاز کے کپتان نے اعلان کر دیا کہ اب جہاز ہمارے قابو سے باہر ہے، سب لوگ اپنے بچنے کی تدبیر کر لیں۔ علامہ شبلی پریشان پروفیسر آرنلڈ کے پاس آئے تو دیکھا کہ وہ اطمینان سے بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں۔ انھوں نے تعجب سے کہا کہ آپ کو معلوم نہیں کہ جہاز کے ڈوب جانے کا اعلان ہو چکا ہے۔ انھوں نے کہا ہاں معلوم ہے مگر اب مرنے تک جو لمحے باقی ہیں انھیں کیوں ضائع کیا جائے جو ہونا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔ پروفیسر آرنلڈ نے ایسی بصیرت افروز بات کہی جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گی چنانچہ جہاز خطرہ سے نکل گیا اور جو لوگ حیران و پریشان تھے وہ بھی اپنی منزل تک پہنچے اور پروفیسر آرنلڈ بھی۔

اس طالب علم کا واقعہ بھی بڑا بصیرت افروز ہے جس کے پاس اثنائے تعلیم میں جب گھر والوں اور دوستوں کے خطوط آتے تو وہ کسی کو پڑھتا نہیں تھا بلکہ ایک الماری میں ڈال دیتا تھا جب اپنی تعلیم ختم کر چکا تو سارے خطوط نکال کر پڑھنے شروع کیے تو کسی میں کسی عزیز کی موت کی خبر تھی، کسی میں خوشی کی، کسی میں پریشانی کی، اس کے ساتھیوں نے پوچھا پہلے کیوں نہیں پڑھا اب پڑھنے سے کیا فائدہ۔ اس نے کہا کہ اس سے پہلے پڑھتا تو ذہن منتشر ہوتا اور تعلیم کا نقصان ہوتا اب تعلیم ختم کر چکا ہوں اب وہ سب حقوق ادا کروں گا۔ اس طالب علم کی اس بات میں زندگی کی بہت بڑی تعلیم پوشیدہ

تھی وہ یہ کہ جب تک کسی کام میں اور خاص طور پر تعلیم میں یکسوئی نہ ہوگی وہ حاصل نہیں ہوگی۔

مولانا عبدالحئی فرنگی محلی جس کمرہ میں مطالعہ کرتے تھے اس میں چاروں طرف دروازے تھے ان کے والد جو وقت کے بڑے عالم ہونے کے ساتھ رئیس بھی تھے ہر دروازے پر ایک جوڑا جوتا رکھوا دیا کرتے تھے کہ اگر وہ کسی ضرورت سے نکلیں تو جوتا تلاش کرنے میں وقت نہ ضائع ہو۔ گرمیوں کے زمانہ میں وہ کمرہ میں مطالعہ کر رہے تھے ان کے والد مولانا عبدالحلیم صاحب نے نوکر سے کہا کہ اگر میاں عبدالحئی ..... پانی مانگیں تو اس میں کچھ تیل ملا کر دینا اور جتنی بار مانگیں اتنا ہی اضافہ کرتے جانا چنانچہ انھوں نے تین بار پانی مانگا اور ملازم تیل میں اضافہ کرتا رہا اور وہ پیتے چلے گئے اور مطالعہ کے انہماک میں کچھ احساس نہیں ہوا اس کے بعد ان کے والد نے کہا کہ ہاں اب عبدالحئی کسی کام کے ہو جائیں گے۔

مغربی قوموں نے جہاں ہمارے علم و فن سے فائدہ اٹھایا ہے وہیں انھوں نے وقت کی قدردانی کو بھی اپنی زندگی کا جز بنا لیا ہے، پروفیسر آرنلڈ کے مذکورہ بالا واقعہ سے اس قوم کے مزاج کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ اپنی تمام خرابیوں کے باوجود یہ قومیں کام کے وقت کو ضائع کرنا جانتی ہی نہیں۔

اگر آپ آخرت کے نقطۂ نظر سے اس دنیا کی زندگی اور اس کی قیمتی گھڑیوں پر نگاہ ڈالیں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ یہاں کا ایک ایک لمحہ آخرت میں نہ جانے کتنے سالوں کے برابر قرار دیا جائے گا، یہاں کا ایک دن وہاں کے پچاس ہزار سال کے برابر ہے عمر کے یہ چند برس اگر ہم نے ضائع کر دیے تو نہ جانے وہاں ہم کو اس کا کتنا خمیازہ بھگتنا پڑے گا گویا عمر کی اس مختصر مدت ہی پر آخرت کی لامتناہی زندگی کی کامیابی و ناکامی کا مدار ہے۔

محترم حضرات اور عزیز طلبہ!

اس مختصر گفتگو کا حاصل صرف یہ ہے کہ آپ وقت کی قیمت کو پہچانیں اور اس مالِ مفت کے سلسلہ میں "مالِ مفت دلِ بے رحم" کا رویہ اختیار نہ کریں۔

وقت کا سب سے بہترین استعمال تو یہ ہے کہ آدمی یا تو اسے خدا کی عبادت میں گزارے یا انسان کی خدمت میں، عبادت میں نماز روزہ حج زکوٰۃ ذکر تسبیح اور تعلیم و تعلم سب کچھ شامل ہے، اسی طرح انسانوں کی خدمت کے بیشمار گوشے ہیں مثلاً اپنی اور اپنے بال بچوں کی خدمت، پاس پڑوس کی خدمت، غریبوں اور بیواؤں کی خدمت، ملک و قوم کی خدمت، دین کی خدمت، اسمٰعیل میرٹھی نے بہت صحیح کہا ہے ؎

مرد ہو تو کسی کے کام آؤ　　　ورنہ کھاؤ پیو چلے جاؤ

عام طور پر ہم لوگ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور ذکر و دعا کو عبادت اور آخرت میں کام آنے والے کام سمجھتے ہیں مگر مخلوق خدا کی خدمت کو ایسا نہیں سمجھتے۔ حالانکہ مخلوق خدا کی خدمت اگر اچھی نیت سے کی جائے تو یہ ساری خدمت بھی عبادت بن جاتی ہے اور بسا اوقات آدمی مخلوق کی خدمت کر کے خدا تعالیٰ کے یہاں جو مرتبہ حاصل کر لیتا ہے وہ نماز روزے سے نہیں حاصل کر پاتا حدیث کی کتابوں میں آپ کو مثال کے لیے بیشمار واقعات ملیں گے جن سے معلوم ہوگا کہ ایک انسانی سی خدمت نے آدمی کو جنت کا مستحق بنا دیا۔ حدیث میں آتا ہے وہ مومن جو سب سے ملتا جلتا ہے اور ان کی تکلیفوں کو برداشت کرتا ہے وہ اس مومن سے بہتر ہے جو کسی سے ملتا جلتا نہیں اور لوگوں کی تکلیفوں کو اٹھاتا نہیں اسی بنا پر ہر نبی سے نبوت سے پہلے خدمت خلق کا کام لیا گیا ہے آپ کو جب غار حرا میں نبوت کی ذمہ داری سونپی گئی تو آپ پر اس ذمہ داری کے احساس سے ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی اور آپ اسی حالت میں گھر واپس تشریف لائے تو حضرت خدیجہؓ نے تسکین دیتے ہوئے آپ کی بہت سی خدمات اور ان اخلاقی خوبیوں کا ذکر کیا جن کا تعلق بندگان خدا سے ہے آپ نے فرمایا

"خدا کی قسم اللہ تعالیٰ کبھی آپ کو ناکام اور رسوا نہیں کر سکتا، آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، تھکے ماندوں کا بوجھ اٹھا لیتے ہیں اور غریبوں کی مدد کرتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، حق کی ادائیگی میں جو پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں ان میں آپ مددگار ثابت ہوتے ہیں"

عام طور پر ہم لوگ اپنی خدمت تو لینا جانتے ہیں مگر دوسروں کی خدمت کرنا جانتے ہی نہیں ہمارا یہ طرز عمل سیرت نبوی سے بالکل ہٹا ہوا ہے اگر ہم مخدوم بننا چاہتے ہیں تو ہمیں دوسروں کی خدمت کرنی چاہیے ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد، یہ اصول افراد کے لیے بھی ہے اور قوموں کے لیے بھی اور اس دنیا میں وہی قومیں سربلند ہیں جن میں خدمت کا جذبہ موجود ہے تفصیل کا موقع نہیں ہے ورنہ اسے مثال دیکر بتایا جا سکتا ہے کہ کسی نازک موقع پر ان قوموں کے افراد عام انسانوں کی کتنی خدمت اور مدد کرتے ہیں۔ ہمارے اندر یہ جذبہ نہیں ہے اس لیے ہم دوسروں کی مدد اور خدمت کیا کرتے خود اپنے بھائیوں کی بھی حق تلفی کرتے ہیں۔ ہمیں اپنا حق تو یاد رہتا ہے مگر

دوسروں کا حق بہت کم یاد رکھتے ہیں۔ ایک پادری کا طرزِ عمل بھی ہمارے لیے بہت سبق آموز ہے وہ جب تبلیغ کے وقت دعا کرتے یا تقریر کرتے تو شروع میں اُردو کے یہ دو شعر ضرور پڑھتے تھے، پہلا شعر خواجہ میر دردؔ کا ہے جو اپنے وقت کے بہت بڑے شیخ تھے۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کر و بیاں

خدا رحم کرتا نہیں اس بشر پر نہ ہو درد کی چوٹ جس کے جگر پر

خلاصہ یہ کہ وقت کی سب سے بڑی قدردانی یہ ہے کہ وہ یا تو اپنے خالق کی عبادت میں گزرے یا مخلوق کی خدمت میں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں وقت کی قدردانی کی توفیق عطا فرمائے۔

قوم پھر ہمت سے آگے بڑھنے لگی ہے

۷۶-۱۹۷۵ء

نوجوانوں کی بہبود کے نئے اقدامات

- کنٹرول نرخوں پر ضروری اشیاء ۱۰،۴۹۰ ہوسٹلوں میں بہم پہنچائی جا رہی ہیں جس سے ۹،۵۶،۰۰۰ سے زیادہ طلبا مستفید ہو رہے ہیں۔

- چھپائی کے سفید کاغذ کی رعایتی داموں پر فراہمی کے سبب نصابی کتابوں اور کاپیوں کے نرخوں میں کمی ہوئی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں کتابوں کے ۸۸،۶۰۰ بنک کام کر رہے ہیں۔

- ۲۱۹ صنعتوں اور ۱۰۳ ٹریڈوں کو اپرنٹس شپ اسکیم کے دائرہ کار میں لایا جا چکا ہے۔

- اپرنٹس بھرتی کرنے کی اسکیموں کے تحت ۱۸،۸۰۰ سیٹوں کا اضافہ کیا گیا جس سے ان کی کل تعداد ۱،۳۳،۹۰۰ ہو گئی۔ ۱،۲۸،۹۰۰ سیٹیں پُر کی گئی ہیں جن میں سے ۲۸،۰۰۰ سیٹیں (۲۰ فیصد سے زیادہ) شیڈولڈ کاسٹ، شیڈولڈ قبیلوں اور دیگر پسماندہ طبقوں کے افراد کو دی گئی ہیں۔

۷۶/۹۱

DAVP - 76/91

Regd. No. LLW/NP-62

Monthly **AL-FURQAN** 31, Naya Gaon West Lucknow (U.P.)

VOL. 44 NO. 8 AUGUST 1976 Phone : 25541

Cover Printed at—Shining Press, Naya Gaon, Lucknow-1

مدیر

محمد منظور نعمانی

قوم پھر ہمت سے آگے بڑھنے لگی ہے

۷۶ — ۱۹۷۵ء

بجلی کی پیداوار میں اضافہ

× ۴۰،۹۷،۶۴۰ لاکھ یونٹ بجلی پیدا کی گئی، پہلے کبھی اتنی بجلی تیار نہیں ہوئی۔ ایک دن میں ۲۰۶۰۰ لاکھ یونٹ بجلی تیار کرنے کا نیا ریکارڈ۔

× ۲۵ نئے بجلی گھروں میں ۱۸۰۰ میگاواٹ بجلی تیار کی گئی۔ ان میں سے ۲۰ بجلی گھروں میں ستمبر ۱۹۷۵ء اور مارچ ۱۹۷۶ء کے درمیانی عرصے میں بجلی تیار ہوئی۔

× اس سال مزید ۲۰،۵۰،۰۰۰ ہیکٹر رقبہ زمین کے لیے سینچائی کی سہولتیں میسر آنے کی توقع ہے۔

× ۶،۳۵۶ دیہات میں بجلی مہیا کی گئی جس سے بجلی والے دیہات کی گنتی ۱،۴۷،۰۷۹ ہو گئی۔ ۱،۴۰،۰۰۰ پمپ سیٹ چالو کیے گئے۔

D.A.V.P. 76/89

ماہنامہ

الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ

ہندوستان سے ۱۵/۰

پاکستان سے ۲۵/۰

بنگلہ دیش سے ۱۶/۰

فی کاپی ۱/۵۰

ممالک غیر سے سالانہ چندہ

محصول ڈاک میں غیر معمولی اضافہ کی بناء پر نئی شرح اس طرح ہوگی

بحری ڈاک سے ۲ پونڈ

ہوائی ڈاک سے ۴ پونڈ

جلد (۴۴)	بابت ماہ ستمبر ۱۹۷۶ء مطابق رمضان المبارک ۱۳۹۶ھ	شمارہ (۹)

اگر اس دائرہ میں سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۵ تاریخ تک آجائے ورنہ اگلا پرچہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۵ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ ان کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانا چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر پبلشر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱۔ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

پاکستان کے بعض اخبارات و رسائل سے یہ عجیب و غریب خبر ملی ہے کہ وہاں کے کچھ بریلوی (رضاخانی) حضرات نے حکومت سے حضرت شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور تصنیف "تقویۃ الایمان" کی ضبطی کا مطالبہ کیا ہے۔ اس کی پوری تفصیل ان اخبارات سے معلوم نہ ہو سکی۔ مطالبہ میں غالباً کہا گیا ہوگا کہ اس میں معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان پاک میں گستاخیاں کی گئی ہیں لہٰذا "مسلمانوں کے ملک" پاکستان اور اس کی "اسلامی حکومت" میں اس کو ضبط کیا جانا چاہیے اور اس کی اشاعت کو ممنوع قرار دیا جانا چاہیے!

جو لوگ اس عجیب و غریب فرقہ یا طبقہ کی تاریخ، اس کے مزاج، اس کی خصوصیات اور مشاغل حیات سے واقف نہیں ہیں انہیں حیرت ہوتی ہوگی کہ کوئی آدمی ہوش و حواس رکھتے ہوئے ایسا لغو اور مضحکہ خیز مطالبہ حکومت سے کیسے کر سکتا ہے، اور اگر کوئی عقل باختہ ایسا کرنا چاہے تو بہرحال اس کو قانون کے ماہر وکلاء اور ایسے کاموں اور ان کے طور طریقوں سے واقف، عقل و ہوش رکھنے والے اور پڑھے لکھے کچھ آدمیوں کا تعاون بھی حاصل کرنا ہوگا، وہ کیونکر اس کو اس کا مشورہ دیں گے۔

دلوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے، لیکن چونکہ راقم سطور کا ایک طویل مدت تک ان لوگوں سے خاص واسطہ اور سابقہ رہا ہے، اس لیے ان لوگوں کے بارہ میں جو واقفیت اور تجربہ اس عاجز کو ہے شاید ہی کسی دوسرے کو ہو۔ اس وجہ سے مطالبہ کی اس خبر پر جو تعجب لوگوں کو عام طور سے ہوا ہوگا مجھے وہ نہیں ہوا۔

[illegible] جانتے ہیں کہ مختلف عبارات پر ان لوگوں کے [illegible] بالکل بے بنیاد

نوٹ:۔ آئندہ صفحات میں صفحہ [illegible] کے بجائے [illegible] سے نمبر دیکھ کر مضمون پڑھیں۔

بارہ میں صاف کہتے ہیں کہ ان کو کافر نہ کہا جائے تو اُن کے متبعین کو ماننا پڑے گا کہ اُن کی عبارتوں میں "گستاخی" نہیں ہے، ورنہ "اعلیٰحضرت" خود اپنے فتوے کی زد میں آجائیں گے۔ "تمہید ایمان" مولوی احمد رضا خاں صاحب کی مشہور کتاب ہے، اُس میں انھوں نے اپنی کئی کتابوں کی وہ عبارتیں خود نقل کی ہیں جن میں انھوں نے شاہ اسمٰعیلؒ کی تکفیر سے انکار کیا ہے اور صاف کہا ہے کہ ان کو کافر نہ کہا جائے۔ یہاں ان میں سے صرف ایک عبارت نقل کرنا کافی ہو گا ——— تمہید ایمان صفحہ ۴۲ پر اپنی کتاب "سبحان السبوح" کے صفحہ ۹۰ کے حوالے سے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے بارہ میں اپنی یہ عبارت نقل کی ہے۔

علمائے محتاطین انھیں کافر نہ کہیں، یہی صواب ہے وہو الجواب وبہ یفتیٰ وعلیہ الفتوےٰ وہو المذہب وعلیہ الاعتماد وفیہ السلامۃ وفیہ السداد۔ یہی جواب ہے اور اسی پر فتوےٰ ہو اور اسی پر فتویٰ ہے اور یہی ہمارا مذہب اور اسی پر اعتماد اور اسی میں سلامت اور اسی میں استقامت۔ ——— تمہید ایمان صفحہ ۴۲ (مطبوعہ ۱۳۲۶ھ)

ظاہر ہے کہ اس کے بعد بریلوی حضرات میں سے کسی کے لیے اس کی گنجائش نہیں، حتیٰ کہ وہ "تقویۃ الایمان" کے بارہ میں یہ بات زبان سے نکالیں یا قلم سے لکھیں کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان پاک میں کوئی گستاخی کی گئی ہے! ——— حکومت سے کوئی مطالبہ تو بہت آگے کی بات ہے۔ راقم سطور کا خیال ہے کہ جن لوگوں نے یہ مطالبہ والی بات اٹھائی ہے وہ بیچارے اعلیٰحضرت کی ان تحریروں سے بے خبر ہیں ——— لیکن پاکستان میں بریلوی جماعت کے ایسے علماء یقیناً موجود ہوں گے جنھوں نے مولوی احمد رضا خاں صاحب کی "تمہید ایمان" دیکھی ہوگی اور وہ اپنے اعلیٰحضرت کی منقولہ بالا عبارت اور اس کے علاوہ ان دوسری عبارتوں سے واقف ہوں گے جن میں انھوں نے حضرت شاہ شہیدؒ کی تکفیر کے خلاف اپنی رائے ظاہر کی ہے اور دوسروں کو بھی تکفیر سے منع کیا ہے ——— وہ اس نزاکت سے بھی واقف ہوں گے کہ اگر "تقویۃ الایمان" کے بارہ میں گستاخی والی بات پر اصرار کیا گیا تو مولوی احمد رضا خاں صاحب کا تکفیری فتویٰ خود اُن پر لوٹ جائے گا اور کوئی منطق ان کو نہ بچا سکے گی ———

بہرحال مولوی احمد رضا خاں صاحب کی ان عبارتوں نے "تقویۃ الایمان" اور شاہ شہیدؒ سے متعلق ساری بحث ختم کر دی ہے۔ وکفی اللہ المومنین القتال۔

کا انداز اور رویہ اختیار کیا جو قرآن مجید کا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا رویہ ہے۔ ——— اول سے آخر تک کتاب کا انداز یہ ہے کہ شاہ صاحب قرآن مجید کی آیت یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بلفظہ نقل کرتے ہیں۔ پہلے اس کا ترجمہ پھر اُس کی تشریح کرتے ہیں اور شرک میں گرفتار جاہل مسلمانوں کے لیے اُس کا جو پیغام ہے، اُن جاہلوں کی سمجھ میں آنے والی عامی زبان ہی میں اس کی وضاحت کرتے ہیں۔ اور تا امکان یہ وضاحت اُسی اسپرٹ میں کرتے ہیں جو آیت یا حدیث کی اسپرٹ ہوتی ہے۔ الغرض "تقویۃ الایمان" میں جہاں شدت ہے وہ آیتِ قرآنی اور ارشادِ نبوی کے جلال اور شدت کی ترجمانی ہے یا "اُس غیظ وغضب کا پرتو ہے جو مسلمان کہلوانے والوں میں قبر پرستی اور تعزیہ پرستی جیسا شرک دیکھ کر ایک سچے مومن کے قلب میں پیدا ہوتا ہے ——— جو صاحبِ علم و نظر اس روشنی میں تقویۃ الایمان کو دیکھے گا وہ محسوس کرے گا کہ اُس میں توحید و شرک کے بارہ میں آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی کی صرف ترجمانی کی گئی ہے۔ اس ترجمانی کی اسپرٹ بھی وہی ہے جو آیات و احادیث کی اسپرٹ ہے اور اُس کے اصل مخاطب وہ جاہل مسلمان ہیں، جو اُس زمانہ میں طرح طرح کے شرک میں گرفتار تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ قبر پرستی وغیرہ سے دلچسپی رکھنے والے شاہ شہیدؒ کے دشمنوں اور بعض حاسدوں کی طرف سے اگر "تقویۃ الایمان" کے خلاف یہ پروپیگنڈا نہ کیا گیا ہوتا تو کسی دیکھنے پڑھنے والے کا ذہن بھی اس طرف نہ جاتا! لیکن جب بریلی اور بدایوں وغیرہ سے یہ مہم شروع کی گئی ——— تو تقویۃ الایمان کے جن فقروں کو اعتراضات کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ متعدد علماء اہلِ حق نے عام مسلمانوں کے لیے اُن کی مزید شرح و وضاحت بھی کردی۔ اس سلسلہ میں ایک رسالہ ——— "شاہ اسمٰعیل شہید اور معاندین اہلِ بدعت کے الزامات" ——— کے نام سے راقم سطور نے بھی اب سے ۳۰-۲۵ سال پہلے لکھا تھا، اس موضوع پر الحمدللہ وہ کافی شافی ہے ——— لیکن اس سلسلہ کی خاص قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ بریلوی حضرات کے اعلیٰحضرت مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی ہی کے قلم سے اللہ تعالیٰ نے شاہ شہید کے بارہ میں لکھوا دیا ہے کہ "ان کو کافر نہ کہا جائے" ——— حالانکہ یہ سب کا مسئلہ ہے اور خود بریلوی احمد رضا خاں صاحب نے کم از کم سیکڑوں جگہ لکھا ہے کہ جو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ پاک میں گستاخی کرے وہ کافر ہے اور جو اس کو کافر نہ کہے وہ بھی کافر ہے ——— تو جب وہ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے

جھگڑے کھڑے کیے اور برسوں مقدمہ بازی کا چکر چلایا۔ تحقیق و تجسس کے بعد اس کی تہ میں صرف یہ بات نکلی کہ اس مقدمہ بازی اور اس کے بے حساب مصارف کے نام پر بیچارے جاہل عام مقتدوں سے بھاری بھاری رقمیں حاصل کی جاتی رہیں۔ اور یہ وہ مد ہے جس کا نہ کوئی حساب لیتا ہے نہ دیتا ہے۔ واللہ اعلم

اس مطالبے اور اس کے پروپیگنڈے سے یہ فائدہ حاصل کرنا بھی مقصود ہوگا کہ ان کے جاہل معتقدین سمجھ لیں کہ ضرور "تقویۃ الایمان" میں کچھ ایسی گستاخانہ باتیں ہوں گی ورنہ ہمارے مولانا صاحب حکومت سے ایسا مطالبہ کیسے کر سکتے تھے اور بیچارے اُن عام مسلمانوں کے دلوں میں بھی یہ وسوسہ پیدا ہو جائے جنھوں نے تقویۃ الایمان نہیں دیکھی اور نہیں پڑھی ——— اسی لیے اس سلسلہ میں کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

واقعہ یہ ہے کہ شاہ شہیدؒ کے دور سے ۲-۳ صدی پہلے سے بلکہ اس سے بھی کچھ پہلے سے ہندوستانی مسلمانوں کے بعض جاہل طبقوں میں شیطان کی کوششوں سے اور مشرکین برادران وطن کے اثر سے طرح طرح کا شرک آگیا تھا۔ ——— الفرقان کی گزشتہ سے پیوستہ اشاعت (جولائی کے شمارہ) کے تکملہ والے چند صفحات میں اس بارہ میں امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ کے احساسات اور اس سلسلہ کی ان حضرات کی اصلاحی جدوجہد کا ذکر کیا جا چکا ہے ——— گزشتہ تیرھویں ہجری کے شروع میں جب حضرت شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ اسماعیل شہیدؒ نے ہوش سنبھالا تو دیکھا کہ جاہل مسلمان پیروں شہیدوں کو اور بزرگوں اور ان کی قبروں کو مشکل کشا اور حاجت روا سمجھ کر ان کی پرستش کر رہے ہیں۔ بھیداں کو بتا ڈگو ڈکا مالک و مختار سمجھ کر ان کی منتیں مان رہے ہیں اور نذریں چڑھا رہے ہیں۔ سیتلا وغیرہ دیوی دیوتاؤں کی پوجا کر رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک کو اور اولیاء اللہ کو خدا کی صفات میں شریک کر رہے ہیں ——— اس صورت حال کے خلاف انھوں نے ایک مصلح اور مجدد کی طرح جدوجہد کا فیصلہ کیا۔ ایک طرف تقریروں اور وعظوں کا سلسلہ شروع کیا اور دوسری طرف اُس اردو زبان میں جو اُس وقت عہد طفولیت میں تھی اور ابھی علمی اور تصنیفی زبان نہیں بنی تھی اور اُس کو اس وقت "ہندی" کہا جاتا تھا (اور وہ جاہل طبقہ جو شرک میں گرفتار تھا اسی زبان کو سمجھ سکتا تھا) تو اس طبقہ کے لیے انھوں نے اُس زبان میں "تقویۃ الایمان" لکھی اور اس میں ہر قسم کے شرک کے خلاف بڑی شدت

اس موضوع پر جب گفتگو کرنی ہی پڑی تو یہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سید عالم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء علیہم السلام اور ان کے تابعین اولیاء کرام کے کمالات و مقامات اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ عظمت میں اُن کی عزت و وجاہت کے بارہ میں حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا جو عقیدہ اور مسلک ہے وہ انہی کے الفاظ میں یہاں پیش کر دیا جائے اور گفتگو کا یہ سلسلہ اسی پر ختم کیا جائے۔

ناظرین کو یہ تو معلوم ہو چکا ہے کہ "تقویۃ الایمان" خاص کر مسلمانوں کے اُن جاہل اور گمراہ طبقوں کی اصلاح کے لیے لکھی گئی ہے جو انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام اور اماموں، شہیدوں، پیروں، قبروں اور تعزیوں وغیرہ کے بارے میں مشرکوں اور عیسائیوں کے سے عقائد رکھتے تھے اور صریح مشرکانہ اعمال کرتے تھے ـــــ یہی گمراہ طبقے "تقویۃ الایمان" کے خاص مخاطب ہیں ـــــ اس کے باوجود خود "تقویۃ الایمان" میں بھی ایسی عبارتیں موجود ہیں جن سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اُس کے مصنف (شاہ اسمٰعیل شہیدؒ) کے نزدیک انبیاء علیہم السلام اور خاص کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا مقام اور مرتبہ ہے ـــــ ایمان بالرسول کے بیان میں فرماتے ہیں

"اور اللہ کے رسول پر یقین لانا یہ ہے کہ اُس کو رسول، اللہ کا اور بندہ مقبول سب مخلوق سے کمالات اور خوبیوں میں افضل جانے اور جو بات رسول فرما دے اس کے بجا لانے میں اللہ تعالیٰ کی رضا سمجھے اور سب کے حکم کو سب مخلوق کے حکم سے مقدم کرے .... اور اس کے فرمودہ کو برحق جانے، پھر اس بات میں ایسا مضبوط ہو جائے کہ کبھی شبہ نہ آوے۔" تقویۃ الایمان ص۹۱

آگے ایمان بالرسول کے بیان میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی یہ مشہور حدیث نقل کی ہے۔

"لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من ولدہ و والدہ والناس اجمعین"

اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"یعنی جب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ماں باپ اور اولاد سے اور تمام مخلوقات سے زیادہ دوست جانے اور سب کی دوستی سے زیادہ اس کی محبت دل میں رکھے .... اور حضرت کے فرمودہ کے موافق سب کے حکم سے زیادہ عمل کرے تب مسلمان ٹھیرے اور نہیں تو نہیں۔" ص۹۲

اس طرح کی بیسیوں عبارتیں خود تقویۃ الایمان میں موجود ہیں لیکن انبیاء علیہم السلام اور اُن کے تابعین حضرات اولیاء کرام وغیرہ کے کمالات اور مقامات کے بیان میں حضرت شاہ شہید کی ایک مستقل

تصنیف "منصب امامت" ہے۔ جو لوگ اس باب میں حضرت شہیدؒ اور علمائے حق کا مسلک اور نقطۂ نظر جاننا چاہیں ہماری اُن سے خاص طور سے درخواست ہے کہ وہ اس کا ضرور مطالعہ فرمائیں ان شاء اللہ وہ محسوس کریں گے کہ اُس کی سطر سطر سے ایمان و معرفت کا نور ابلتا ہے۔ "منصب امامت" کے مخاطب اہل علم اور اصحاب معرفت ہیں۔ اس کی زبان فارسی ہے جو اس دور کی تصنیفی زبان تھی۔۔ "مشتے نمونہ از خروارے" اس کی چند سطریں یہاں بھی درج کی جاتی ہیں ــــ اس کے بالکل شروع میں فرماتے ہیں۔

مقامات انبیاء و کمالات ایشاں بسیار از بسیار است و خارج از حد و شمار کہ احصاء آں از مثل ما مردم کہ از آحاد امتیم متعسر است بل متعذر ص۲

انبیاء علیہم السلام کے کمالات و مقامات بہت سے بہت اور حد و شمار سے باہر ہیں، اُن سب کا بیان کرنا ہم جیسے ایک امتی کے لیے دشوار اور بہت مشکل ہے۔

پھر اس کے بعد ان کمالات کے صرف ایک شعبہ وجاہت کا بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

باید دانست کہ انبیاء علیہم السلام را بحضور حضرت رحمان بہ نسبت جمیع افراد انسان نوعے از امتیاز ثابت است کہ بنگاہ مہربانی منظور اند و بہ لطف ربانی مسرور، بمزیت انعام سرفراز اند و بمزید اکرام ممتاز، یاسمین چمن محبوبیت اند و رنگ نشین انجمن مقبولیت، اختران افلاک انس اند و افسران املاک قدس، بتفویض مناصب عظیمہ لائق اند و در سرانجام مہمات فخیمہ فائق، سرداران کامل کروبیان اند و سران عساکر قدسیان، ہمت ایشاں مفتاح اغلاق ابواب

معلوم ہونا چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دوسرے تمام انسانوں کی بہ نسبت ایک خاص نوعیت کا امتیاز حاصل اور ثابت ہے، ان پر اللہ تعالیٰ کی خاص نظرِ عنایت ہے وہ الطاف ربانی سے مسرور ہیں، اللہ تعالیٰ کے خاص انعامات سے سرفراز ہیں اور ان کو اعزاز و اکرام حاصل ہے۔ وہ چمن محبوبیت کے یاسمین اور انجمن مقبولیت کے تخت نشین ہیں۔ وہ آسمان انس کے ستارے ہیں اور اقلیم قدس کے افسر ہیں، عظیم مناصب کی تفویض کے لائق ہیں اور بڑی مہمات کو سر کرنے میں فائق ہیں۔ کروبیوں کی فضلوں کے سردار ہیں اور قدسی لشکروں کے سپہ سالار۔ اُن کی توجہ سے بند دروازے کھلتے ہیں اور ان کی

است ...عائے ایشاں بلاریب مستجاب،
محب ایشاں محبوب حضرت رب الارباب
است و مبغض ایشاں مبغوض آنجناب
محبت ایشاں باعث رفع درجات
است و توسل ایشاں وسیلۂ نجات...
...... منبع فیض غیب اند و مخزن اسرار
لاریب ص۲

دعائیں بارگاہ ایزدی میں بلاشبہ مستجاب و مقبول ہوتی ہیں، ان سے محبت کرنے والا اللہ کا محبوب ہے اور اُن سے بغض رکھنے والا اللہ کی جناب میں مبغوض و مردود، اُن کی محبت درجات کی بلندی کا ذریعہ ہے اور اُن کے دامن سے وابستگی نجات کا وسیلہ ہے۔ وہ اللہ کے عین فیض کا سرچشمہ ہیں اور لاشک اسرارِ الٰہی کا خزانہ ہیں۔

اسی سلسلہ میں چند سطر کے بعد فرماتے ہیں:۔

"و چنانکہ ایں منصب بانبیاء اللہ ثابت
است...... ہم چنیں دیگر عباد
مقربین را ہم علی حسب قدرہم ازیں
منصب جلیل القدر بدست می آید۔
منصب امامت ص۳"

اور جس طرح یہ منصب (وجاہت) انبیاء علیہم السلام کے لیے ثابت ہے اسی طرح علی قدر مراتب دوسرے مقرب بندوں (یعنی اولیاء اللہ) کو بھی اس سے حصہ ملتا ہے۔

پھر اس کے اگلے صفحہ پر فرماتے ہیں:۔

"باید دانست کہ انبیاء علیہم السلام را در
معاملات روحانی و کمالات انسانی
بہ نسبت عموم ناس اعتبارے می باشد
کہ از حضرت رب الارباب قابل
خطاب اند و حامل کتاب، باشارات
غیبی مامور اند و بہ بشارات لاریبی
مسرور...... مخزن اسرار احکام
اند و مورد انوار الہام...."
منصب امامت صفحہ

جاننا چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام کو روحانی حالات اور انسانی کمالات میں بہ نسبت دوسرے عام انسانوں کے ایک خاص اعتبار وامتیاز حاصل ہوتا ہے، اُن کو اللہ تعالیٰ کی خصوصی مخاطبت کی قابلیت کا شرف حاصل ہوتا ہے اور وہ اللہ کی کتاب کے حامل ہوتے ہیں، اُن کو غیبی اشارات سے اللہ کے احکام ملتے ہیں اور قطعی اور یقینی بشارتوں سے وہ مسرور ہوتے ہیں، احکام ربانی کے اسرار کا وہ خزانہ ہوتے

جب ساری امام فطرت کے انوار کا ان پر فیضان ہوتا

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی یہ کتاب "منصب امامت" اسی طرح کے شیریں اور نورانی مضامین سے بھری ہوئی ہے، ایک مقام کی صرف چند سطریں ہم ناظرین کی خدمت میں اور پیش کرتے ہیں — جس میں وحی اور الہام ہی کے بارہ میں کلام کیا گیا ہے انبیاء علیہم السلام اور ان کے تابعین اولیاء کرام کے خاص مقام ولایت پر کلام کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے شعبوں میں سے ایک الہام بھی ہے۔ آگے فرماتے ہیں:-

واز انجملہ الہام است ، ہمیں الہام کہ	اور ولایت کے شعبوں میں سے ایک الہام بھی ہے
انبیاء اللہ ثابت است آنرا وحی	یہی الہام جب اس کا تعلق انبیاء علیہم السلام سے
میگویند واگر بغیر ایشاں ثابت میشود	ہو تو اس کو وحی کہتے ہیں اور جب نبیوں کے
اورا تحدیث میگویند	علاوہ دوسرے مقبول بندوں سے متعلق ہو تو (دین
	کی خاص زبان میں) اس کو تحدیث کہتے ہیں۔

آگے اس وحی و الہام کی چند صورتیں بیان کی ہیں مثلاً غیبی آواز آنا یا فرشتہ کے ذریعہ پیام آنا وغیرہ وغیرہ اور قرآن و حدیث سے اُن سب کی دلیلیں اور مثالیں پیش کی ہیں اسی سلسلہ میں فرماتے ہیں:-

واز جملہ اقسام الہام خواب است	اور الہام کی قسموں اور صورتوں میں سے ایک
کہ کسے را از مقبولین عالی مقام در	خواب بھی ہے کہ عالی مقام مقبولین میں سے ـــ
حالت منام بر امرے از امور غیبیہ	کسی کو سونے کی حالت میں اللہ تعالیٰ خواب
مطلع میفرمایند۔	کے ذریعہ امور غیبیہ میں سے کسی بات کی اطلاع
منصب امامت ص[illegible]	فرما دیتے ہیں۔

منصب امامت کے یہ چند سطری اقتباسات ہم نے یہاں صرف اس لیے نقل کیے ہیں کہ: ناظرین یہ جان سکیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کے کمالات و مقامات اور بارگاہ خداوندی میں ان کی عزت و وجاہت اور اُن پر اللہ تعالیٰ کی خاص نظر عنایت اور اکرام و انعام کے بارہ میں اور خاص کر وحی و الہام کے ذریعہ امور غیب کی اطلاع کے بارہ میں تقویۃ الایمان کے مصنف حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا عقیدہ و مسلک کیا ہے۔

ایک ضروری اطلاع

رمضان المبارک کی مشغولیات اور اس ماہ کے خصوصی معمولات کے پیش نظر اس مرتبہ یہ ارادہ کیا گیا تھا کہ اس مہینے میں الفرقان کی ترتیب و تیاری کے کاموں سے اپنا وقت بالکل خالی رکھا جائے اور رمضان سے پہلے زیر نظر شمارے کے بعد (جس کی تیاری شعبان میں مکمل ہو چکی تھی) آئندہ شمارہ شوال کے بجائے ذیقعدہ میں شائع کیا جائے۔ موجودہ صورت حال میں ——— مدیر الفرقان کی علالت کے بعد ——— آئندہ شمارہ میں تاخیر اب حتمی طور پر ناگزیر ہو گئی ہے۔

ناظرین کرام نوٹ فرمالیں کہ ستمبر کے اس شمارہ کے بعد اگلا پرچہ اب اکتوبر کے بجائے نومبر میں شائع ہوگا لہٰذا اکتوبر میں کسی شمارہ کا انتظار نہ کیا جائے۔

ناظم دفتر الفرقان

مدیر الفرقان کی ناگہانی علالت

الفرقان کے زیر نظر شمارہ کی کتابت قریب قریب مکمل ہو چکی تھی صفحات کی ترتیب اور طباعت کا آخری مرحلہ سامنے تھا کہ اچانک مدیر الفرقان (حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ) شدید علیل ہو کر صاحب فراش ہو گئے ——— قارئین کو یاد ہوگا کہ اب سے تقریباً ۳ سال پہلے دیوبند سہارنپور کے ایک سفر کے دوران پیش آنے والے حادثہ میں مدیر الفرقان کے بائیں کولہے کی ہڈی شدید طور پر مجروح ہو گئی تھی ——— ڈاکٹروں کی رائے اور تشخیص سے اب تک جو کچھ سامنے آیا ہے اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ضعف یا تکان یا کسی جھٹکے سے اسی ہڈی میں ورم آگیا ہے جس کی تکلیف سے بخار اور دوسرے عوارض لاحق ہو گئے

واللہ اعلم بالصواب

ناظرین کرام سے بصد منت التجا ہے کہ مدیر محترم کی کامل و عاجل شفایابی کے لیے دعا فرمائیں۔

کتاب المعاملات

مَعَارِفُ الْحَدِيْث

(مسلسل)

مالی معاملات میں دوسروں کے ساتھ نرمی اور رعایت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تعلیم میں ایمان اور اللہ کی عبادت کے بعد بندگانِ خدا اور عام مخلوق کے ساتھ حسن سلوک، خاص کر کمزوروں اور حاجت مندوں کی خدمت و اعانت پر بڑا زور دیا گیا ہے اور آپؐ کی تعلیم و ہدایت کا یہ نہایت وسیع اور اہم باب ہے۔ اسی سلسلۂ معارف الحدیث کی کتاب الاخلاق اور "کتاب المعاشرہ" میں ناظرین کرام مختلف عنوانات کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ بیسیوں ارشادات پڑھ چکے ہیں جن کا تعلق اسی وسیع باب کے مختلف شعبوں سے ہے۔ — خرید و فروخت اور قرض وغیرہ لین دین کے معاملات میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو مختلف عنوانات سے اس کی ہدایت فرمائی اور ترغیب دی کہ ہر فریق دوسرے کی رعایت اور خیر خواہی کرے۔ جس پر کسی کا حق ہے وہ اس کو حتی الوسع جلد ہی ادا کرنے کی اور پورا ادا کرنے کی کوشش کرے اور جس کا کسی دوسرے پر حق ہے وہ اُس کے وصول کرنے میں نرم اور فیاضی سے کام لے اور سخت اور بے لچک رویہ اختیار نہ کرے۔ آپ نے بتلایا کہ جو بندے ایسا کریں گے وہ ارحم الراحمین کی خاص الخاص نظر رحمت کے مستحق ہوں گے — اس سلسلہ کے حضورؐ کے چند ارشادات ذیل میں پڑھئے۔

عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَحِمَ اللّٰهُ رَجُلًا سَمْحًا إِذَا بَاعَ وَإِذَا اشْتَرٰى وَإِذَا اقْتَضٰى۔ رواہ البخاری

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کی رحمت اُس بندے پر جو بیچنے میں، خریدنے میں اور اپنے حق کا تقاضا کرنے اور وصول کرنے میں نرم اور

فراخدل ہو۔   (صحیح بخاری)

عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ رَجُلًا كَانَ فِيْمَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ أَتَاهُ الْمَلَكُ لِيَقْبِضَ رُوْحَهُ فَقِيْلَ لَهُ هَلْ عَمِلْتَ مِنْ خَيْرٍ؟ قَالَ مَا أَعْلَمُ قِيْلَ لَهُ أُنْظُرْ قَالَ مَا أَعْلَمُ شَيْئًا غَيْرَ أَنِّيْ كُنْتُ أُبَايِعُ النَّاسَ فِي الدُّنْيَا وَأُجَازِيْهِمْ فَأُنْظِرُ الْمُوْسِرَ وَأَتَجَاوَزُ عَنِ الْمُعْسِرِ فَأَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ۔

رواه البخاری ومسلم وفی روایة لمسلم نحوه عن عقبة بن عامر وابی مسعود الانصاری فقال الله انا احق بذا منک تجاوزوا عن عبدی۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ تم سے پہلے کسی امت میں ایک آدمی تھا، جب موت کا فرشتہ اُس کی روح قبض کرنے آیا (اور قبض روح کے بعد وہ اس دنیا سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہو گیا) تو اُس سے پوچھا گیا کہ تو نے دنیا میں کوئی نیک عمل کیا تھا؟ (جو تیرے لیے وسیلۂ نجات بن سکے) اُس نے عرض کیا کہ میرے علم میں میرا کوئی (ایسا) عمل نہیں ہے۔ اُس سے کہا گیا کہ (اپنی زندگی پر) نظر ڈال (اور غور کر!) اس نے پھر عرض کیا کہ میرے علم میں (میرا ایسا کوئی عمل اور) کوئی چیز نہیں سوا اس کے کہ میں لوگوں کے ساتھ کاروبار اور خرید و فروخت کا معاملہ کیا کرتا تھا تو میرا رویہ اُن کے ساتھ درگزر اور احسان کا ہوتا تھا، میں پیسے والوں اور اصحاب دولت کو بھی مہلت دے دیتا تھا (کہ وہ بعد میں جب چاہیں ادا کر دیں) اور غریبوں مفلسوں کو معاف بھی کر دیتا تھا ——— تو اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے لیے جنت میں داخلہ کا حکم فرما دیا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

[حضرت حذیفہ کی یہ حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں اسی طرح روایت کی گئی ہے ——— اور صحیح مسلم میں حضرت عقبہ بن عامر اور حضرت ابو مسعود انصاریؓ سے بھی یہ حدیث روایت کی گئی ہے اور اس کے آخر میں بجائے "فادخله الله الجنة" کے یہ الفاظ ہیں۔ "فَقَالَ اللّٰهُ أَنَا أَحَقُّ بِذَا مِنْكَ، تَجَاوَزُوْا عَنْ عَبْدِيْ" (اللہ تعالیٰ نے اس شخص سے فرمایا کہ احسان اور درگزر کا جو معاملہ تو میرے بندوں سے کرتا تھا کہ غریبوں مفلسوں کو معاف بھی کر دیتا تھا)۔ یہ (کریمانہ رویہ میرے لیے زیادہ سزاوار ہے اور میں اس کا تجھ سے زیادہ حقدار ہوں کہ معافی اور درگزر کا معاملہ کروں، اور اللہ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ میرے اس بندے سے درگزر کرو (یہ معاف کر دیا گیا اور بخش دیا گیا)۔

(تشریح) اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے زمانہ کے کسی شخص کا جو واقعہ بیان فرمایا ہے، ظاہر ہے کہ وہ آپ کو وحی سے ہی معلوم ہوا ہوگا، یہ شخص دنیا سے ایسے حال میں گیا کہ خود اس کی نظر میں اس کا کوئی عمل ایسا نہیں تھا جس کی بنیاد پر وہ نجات اور جنت کی امید کر سکتا، سوا اس کے کہ وہ کاروباری معاملات اور لین دین میں اللہ کے بندوں کے ساتھ رعایت کیا کرتا اور اُن کو سہولت دیا کرتا تھا، اگر کسی غریب شخص کے ساتھ کوئی چیز اُدھار بیچی ہوتی یا قرض دیا ہوتا اور وہ ادا نہ کر سکتا تو اس کو معاف کر دیا کرتا تھا اور پیسے والوں سے بھی فوری ادائیگی پر اصرار نہیں کرتا تھا بلکہ اُن کو مہلت دیدیتا تھا کہ آئندہ ادا کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے اسی عمل کی بناء پر مغفرت فرما دی۔ اور اس کو جنت کا پروانہ عطا ہوگیا تعلیم اور نصیحت کا یہ موثر ترین طریقہ ہے کہ اگلوں کے سبق آموز واقعات بیان کیے جائیں۔ قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کے یا بعض اشخاص وافراد کے جو واقعات اور قصص بیان فرمائے گئے ہیں اُن کا خاص مقصد و مدعا یہی ہے۔ اس حدیث میں اور اس سے آگے والی حدیث میں حضورؐ نے نصیحت اور تربیت کا یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَانَ رَجُلٌ یُدَایِنُ النَّاسَ فَكَانَ یَقُوْلُ لِفَتَاهُ اِذَا اَتَیْتَ مُعْسِرًا فَتَجَاوَزْ عَنْهُ لَعَلَّ اللّٰهَ اَنْ یَتَجَاوَزَ عَنَّا قَالَ فَلَقِیَ اللّٰهَ فَتَجَاوَزَ عَنْهُ ـــ رواه البخاری ومسلم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک آدمی تھا جو لوگوں کو قرض ادھار دیا کرتا تھا تو جب اپنے غلام کو تقاضے کے لیے اور قرض وصول کرنے کے لیے بھیجتا تو غلام سے کہتا اور اس کو ہدایت کر دیتا کہ جب تم قرضہ وصول کرنے کے لیے کسی غریب اور مفلس کے پاس جاؤ تو اس سے درگزر کیجیو۔ شاید (اس کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ ہم سے درگزر فرمائے اور معاف فرما دے ـــ یہ بیان فرما کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پھر جب مرنے کے بعد وہ بندہ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو معاف فرما دیا۔

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں جس شخص کا واقعہ بیان کیا گیا ہے ظاہر یہی ہے کہ وہ بھی اگلی امتوں میں سے کسی امت کا فرد تھا۔ واللہ اعلم

عَنْ اَبِیْ قَتَادَۃَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ اَنْظَرَ مُعْسِرًا اَوْ وَضَعَ عَنْہُ اَنْجَاہُ اللّٰہُ مِنْ کُرَبِ یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ

—————— رواہ مسلم

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے بیان کرتے ہیں کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ ارشاد فرماتے تھے کہ جس بندہ نے کسی غریب تنگدست کو مہلت دی یا اپنا مطالبہ کل یا اس کا جز معاف کر دیا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کی تکلیفوں اور پریشانیوں سے اس بندہ کو نجات عطا فرمائے گا۔ (صحیح مسلم)

عَنْ اَبِی الْیَسَرِ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ اَنْظَرَ مُعْسِرًا اَوْ وَضَعَ عَنْہُ اَظَلَّہُ اللّٰہُ فِیْ ظِلِّہٖ —————— رواہ مسلم

حضرت ابو الیسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ ارشاد فرماتے تھے کہ جو بندہ کسی غریب تنگدست کو (جس پر اس کا قرضہ وغیرہ ہو) مہلت دیدے یا مطالبہ کل یا جز معاف کر دے تو اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) اس کو اپنے سایۂ رحمت میں لے لیگا۔ (صحیح مسلم)

عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَیْنٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ کَانَ لَہٗ عَلٰی رَجُلٍ حَقٌّ فَمَنْ اَخَّرَہٗ کَانَ لَہٗ بِکُلِّ یَوْمٍ صَدَقَۃٌ رواہ احمد

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس آدمی کا کسی دوسرے بھائی پر کوئی حق (قرضہ وغیرہ) واجب الادا ہو اور وہ اس مقروض کو ادا کرنے کے لیے دیر تک مہلت دیدے تو اس کو ہر دن کے عوض صدقہ کا ثواب ملے گا۔ (مسند احمد)

(تشریح) ان سب حدیثوں کا مضمون اور پیغام بالکل واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

قرض کی فضیلت اور اس سے متعلق ہدایات

ظاہر ہے کہ حاجتمند اور ضرورتمند کو قرض دینا اس کی مدد ہے اور بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اجر و ثواب صدقہ سے بھی زیادہ ہے۔ اسی کے ساتھ قرض کے بارہ میں کچھ وعیدیں بھی ہیں۔

عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ دَخَلَ رَجُلٌ الْجَنَّۃَ فَرَاٰی عَلٰی بَابِہَا مَکْتُوْبًا اَلصَّدَقَۃُ بِعَشْرِ اَمْثَالِہَا وَالْقَرْضُ بِثَمَانِیَۃَ عَشَرَ ——— رواہ الطبرانی فی الکبیر

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ ایک آدمی جنت میں داخل ہوا تو اس نے جنت کے دروازہ پر لکھا دیکھا کہ صدقہ کا اجر و ثواب دس گنا ہے اور قرض دینے کا اٹھارہ گنا۔ (معجم کبیر طبرانی)

(تشریح) حدیث میں اس کا کوئی اشارہ نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کس آدمی کے بارہ میں فرمایا کہ وہ جنت میں داخل ہوا تو اس نے اس کے دروازہ پر مندرجہ بالا جملہ لکھا دیکھا، ہوسکتا ہے کہ آپ نے یہ کسی مرد صالح کے خواب کا واقعہ بیان فرمایا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ خود آپ کا مشاہدہ یا مکاشفہ ہو اور آپ نے اس انداز میں اس کو بیان فرمایا ہو۔ اس دوسرے احتمال کی کسی قدر تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اس حدیث کو ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے اور اس کے آخر میں یہ اضافہ ہے کہ

فقلت لجبریل ما بال القرض افضل من الصدقۃ؟ قال لان السائل یسئل و عندہ والمستقرض لا یستقرض الا من حاجۃ (جمع الفوائد)

میں نے جبریل سے پوچھا کہ قرض میں کیا خاص بات ہے کہ وہ صدقہ سے افضل ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ سائل (جس کو صدقہ دیا جاتا ہے) اس حالت میں بھی سوال کرتا اور صدقہ لیتا ہے جبکہ اس کے پاس کچھ ہوتا ہے اور قرض مانگنے والا قرض جب ہی مانگتا ہے جب وہ محتاج اور ضرورتمند ہوتا ہے۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اللہ کا ایک غریب مگر شریف و عفیف بندہ انتہائی حاجتمند اور گویا اضطرار کی حالت میں ہوتا ہے لیکن وہ کسی سے سوال کرنا چاہتا ہے اور نہ صدقہ خیرات لینے کے لیے اس کا دل آمادہ ہوتا ہے ہاں وہ اپنی ضرورت پوری کرنے اور بچوں کا فاقہ توڑنے کے لیے قرض چاہتا ہے ظاہر ہے کہ اس کو قرض دینا صدقہ سے افضل ہوگا ——— نیز خود راقم سطور کا تجربہ ہے کہ بہت سے لوگ کسی ضرورت مند کی زکوٰۃ خیرات سے مدد کرنے کے لیے تیار

ہو جاتے ہیں لیکن اس کو قرض دینے پر اُن کا دل آمادہ نہیں ہوتا! اُن کے لیے اِس حدیث میں خاص سبق ہے ـــــ حدیث کے اُس آخری حصہ سے (جو ابن ماجہ کے حوالہ سے درج کیا گیا ہے) یہ بھی معلوم ہوا کہ صدقہ کے مقابلہ میں وہ قرض افضل ہے جو کسی حاجتمند کو اس کی حاجت رفع کرنے کے لیے دیا جائے۔

قرض کا معاملہ بڑا سنگین اور اس کے بارہ میں سخت وعیدیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف تو اصحابِ وسعت کو ترغیب دی کہ وہ ضرورت مند بھائیوں کو قرض دیں اور اس کی ادائیگی کے لیے مقروض کو مہلت دیں کہ جب سہولت ہو ادا کرے اور نادار مفلس ہو تو قرضہ کا کل یا جزء معاف کر دے اور اس کا بڑا اجر و ثواب بیان فرمایا اور دوسری طرف قرض لینے والوں کو آگاہی دی کہ وہ جلد سے جلد قرض کے ادا کرنے اور اُس کے بوجھ سے سبکدوش ہونے کی فکر اور کوشش کریں اگر خدانخواستہ قرض ادا کیے بغیر اِس دنیا سے چلے گئے تو آخرت میں اس کا انجام ان کے حق میں بہت بُرا ہوگا۔ کبھی کبھی آپ نے اس کو سنگین ترین اور ناقابل معافی گناہ بتلایا اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ کسی میت کے متعلق آپ کو معلوم ہوا کہ اس پر کسی کا قرضہ ہے جس کو اُس نے ادا نہیں کیا ہے، تو آپ نے اُس کی نماز جنازہ پڑھنے سے انکار فرمادیا۔ ظاہر ہے کہ یہ آپ کی طرف سے آخری درجہ کی تنبیہ تھی۔

عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اَعْظَمَ الذُّنُوْبِ عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ یَّلْقَاہُ عَبْدٌ بَعْدَ الْکَبَائِرِ الَّتِیْ نَہَی اللّٰہُ عَنْہَا اَنْ یَّمُوْتَ رَجُلٌ وَّعَلَیْہِ دَیْنٌ لَا یَدَعُ لَہٗ قَضَاءً ـــــ رواہ احمد وابوداؤد

حضرت ابو موسیٰ اشعری راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اُن کبیرہ گناہوں کے بعد جن سے اللہ تعالیٰ نے سختی سے منع فرمایا ہے (جیسے شرک اور زنا وغیرہ) سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی اس حال میں مرے کہ اس پر قرض ہو اور اس کی ادائیگی کا سامان چھوڑ کر نہ گیا ہو۔

(مسند احمد، سنن ابی داؤد)

عَنْ اَبِیْ ہُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَفْسُ الْمُؤْمِنِ مُعَلَّقَۃٌ بِدَیْنِہٖ حَتّٰی یُقْضٰی عَنْہُ ـــ رواہ الشافعی واحمد والترمذی وابن ماجہ والدارمی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن بندہ کی روح اس کے قرضہ کی وجہ سے بیچ میں معلق اور رکی رہتی ہے جب تک کہ وہ قرضہ ادا نہ کردیا جائے جو اس پر ہے —— (مسند شافعی، مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، مسند دارمی)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی بندہ ایسی حالت میں دنیا سے گیا جس کو ایمان بھی نصیب ہے اور وہ اعمال صالحہ بھی اس کے اعمال نامہ میں ہیں جو نجات اور جنت کا وسیلہ بنتے ہیں لیکن اس پر کسی کا قرضہ ہے جس کو وہ ادا کرکے نہیں گیا اور اس معاملہ میں اس نے غفلت اور کوتاہی کی تو جب تک کہ اس کی طرف سے قرضہ ادا نہ ہوجائے وہ راحت و رحمت کی اس منزل اور مقام تک نہ پہنچ سکے گا جو مومنین صالحین کے لیے موعود ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يُغْفَرُ لِلشَّهِيْدِ كُلُّ ذَنْبٍ اِلَّا الدَّيْنَ —— رواہ مسلم

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شہید ہونے والے مرد مومن کے سارے گناہ راہ خدا میں جان کی قربانی دینے کی وجہ سے بخش دیے جاتے ہیں بجز قرض کے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ راہ خدا میں شہید ہونا ایسا مقبول عمل ہے کہ وہ آدمی کے سارے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے اور اس کی برکت سے سارے گناہ معاف کردیے جاتے اور بخش دیے جاتے ہیں، لیکن اگر اس پر کسی بندہ کا قرضہ تھا تو اس کے حساب میں وہ گرفتار رہے گا کیونکہ وہ حق العبد ہے، اس سے نجات اور رہائی کی صورت یہی ہے کہ وہ قرضہ ادا کیا جائے۔ (یا جس کا قرضہ ہے وہ یا بوجہ اللہ معاف کردے) آگے درج ہونے والی دو حدیثوں سے یہ بات اور زیادہ صراحت سے معلوم ہوگی کہ اس معاملہ میں اللہ کا قانون کس قدر بے لاگ اور سخت ہے۔

عَنْ اَبِيْ قَتَادَةَ قَالَ قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَاَيْتَ اِنْ قُتِلْتُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ صَابِرًا مُحْتَسِبًا مُقْبِلًا غَيْرَ مُدْبِرٍ يُكَفِّرُ اللّٰهُ عَنِّيْ خَطَايَايَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَعَمْ —— فَلَمَّا اَدْبَرَ نَادَاهُ

فَقَالَ نَعَمْ إِلَّا الدَّيْنَ كَذَالِكَ قَالَ جِبْرِيْلُ ـــــ رواہ مسلم

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے بتلائیے کہ اگر میں اللہ کے راستہ میں صبر اور ثابت قدمی کے ساتھ اور اللہ کی رضا اور ثواب آخرت کی طلب ہی میں جہاد کروں اور مجھے اس حالت میں شہید کر دیا جائے کہ میں پیچھے نہ ہٹ رہا ہوں بلکہ پیش قدمی کر رہا ہوں تو کیا میری اس شہادت اور قربانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ میرے سارے گناہ معاف کر دے گا؟ — آپ نے جواب میں فرمایا ہاں! اللہ تمہارے سارے گناہ معاف فرما دے گا، پھر جب وہ آدمی آپ سے یہ جواب پا کر لوٹنے لگا تو آپ نے اس کو پھر بلایا اور فرمایا ہاں! تمہارے سب گناہ معاف ہو جائیں گے سوائے قرضہ کے یہ بات اللہ کے فرشتہ جبرئیل امین نے اسی طرح بتلائی ہے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ یہ بات کہ شہید ہونے سے بندے کے سارے گناہ تو معاف ہو جاتے ہیں لیکن اگر کسی کے قرضہ کا بار لیکر گیا ہے تو اس کی وجہ سے گرفتار رہے گا میں خدا کی وحی کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں جو جبرئیل امین نے مجھے پہنچائی ہے۔

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ جَحْشٍ قَالَ كُنَّا جُلُوْسًا بِفِنَاءِ الْمَسْجِدِ حَيْثُ يُوْضَعُ الْجَنَائِزُ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسٌ بَيْنَ ظَهْرَيْنَا، فَرَفَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَصَرَهٗ إِلَى السَّمَاءِ فَنَظَرَ ثُمَّ طَاطَأَ بَصَرَهٗ وَوَضَعَ يَدَهٗ عَلٰى جَبْهَتِهٖ قَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ، مَاذَا نُزِّلَ مِنَ التَّشْدِيْدِ، قَالَ فَسَكَتْنَا يَوْمَنَا وَلَيْلَتَنَا فَلَمْ نَرَ إِلَّا خَيْرًا حَتّٰى أَصْبَحْنَا، قَالَ مُحَمَّدٌ فَسَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا التَّشْدِيْدُ الَّذِىْ نُزِّلَ؟ قَالَ فِى الدَّيْنِ وَالَّذِىْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَوْ أَنَّ رَجُلًا قُتِلَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ عَاشَ ثُمَّ قُتِلَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ عَاشَ ثُمَّ قُتِلَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ عَاشَ وَعَلَيْهِ دَيْنٌ مَا دَخَلَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يُقْضٰى دَيْنُهٗ ـــــ رواہ احمد

حضرت محمد بن عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم لوگ ایک دن مسجد کے باہر کے میدان میں

جہاں جنازے لاکر رکھے جاتے ہیں، بیٹھے ہوئے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہمارے درمیان تشریف فرما تھے، اچانک آپ نے نگاہ مبارک آسمان کی طرف اٹھائی اور کچھ دیکھا، پھر نگاہ نیچی فرمائی، اور ایک خاص فکرمندانہ انداز میں اپنا ہاتھ پیشانی مبارک پر رکھ کر بیٹھ گئے اور ایسی حالت میں فرمایا: "سبحان اللہ، سبحان اللہ! (اللہ پاک ہے اس کا ہر حکم اور فیصلہ برحق) کس قدر سخت وعید اور سنگین فرمان نازل ہوا ہے" —— حدیث کے راوی محمد بن عبداللہ کہتے ہیں کہ اس دن اور اس رات ہم سب خاموش رہے (اور منتظر رہے کہ کیا ظہور میں آتا ہے) مگر خیریت ہی رہی، تو اگلے دن صبح کو میں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ حضرت وہ کیا سخت اور بھاری چیز تھی جو کل نازل ہوئی تھی؟ آپ نے فرمایا کہ وہ نہایت سخت وعید اور بھاری فرمان قرضہ کے بارہ میں نازل ہوا ہے (اس کے بعد آپ نے اس خداوندی فرمان اور وعید کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا) قسم اس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے اگر کوئی آدمی راہ خدا میں یعنی جہاد میں شہید ہو اور وہ شہادت کے بعد پھر زندہ ہو جائے اور پھر جہاد میں شہید ہو اور اس کے بعد پھر زندہ ہو جائے اور پھر راہ خدا میں شہید ہو اور پھر زندہ ہو اور اس کے ذمہ قرض ہو تو وہ جنت میں اس وقت تک نہ جاسکے گا جب تک اس کا قرض ادا نہ ہو جائے۔

(تشریح) بظاہر ان سب حدیثوں اور وعیدوں کا تعلق اس صورت سے ہے جبکہ قرضہ کے ادا کرنے میں بدنیتی یا غفلت و لاپروائی کا دخل ہو، اگر ادا کرنے کی نیت تھی اور فکرمند بھی تھا لیکن بیچارہ ادا کرنے پر قادر نہ ہوسکا اور اسی حال میں دنیا سے چلا گیا تو اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ وہ عنداللہ معذور ہوگا جیسا کہ عنقریب ہی درج ہونے والی ایک حدیث سے معلوم ہوگا۔ واللہ اعلم

اس حدیث سے ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے دور میں جنازوں کی نماز مسجد سے باہر میدان میں ہوتی تھی، حنفیہ کے نزدیک یہی بہتر ہے۔

عَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْأَكْوَعِ قَالَ كُنَّا جُلُوْسًا عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذْ أُتِيَ بِجَنَازَةٍ فَقَالُوْا صَلِّ عَلَيْهَا فَقَالَ هَلْ عَلَيْهِ دَيْنٌ قَالُوْا لَا فَصَلّٰى عَلَيْهِ ثُمَّ أُتِيَ بِجَنَازَةٍ أُخْرٰى فَقَالَ هَلْ عَلَيْهِ دَيْنٌ قِيْلَ نَعَمْ قَالَ فَهَلْ تَرَكَ شَيْئًا؟ قَالُوْا ثَلٰثَةَ دَنَانِيْرَ فَصَلّٰى عَلَيْهَا ثُمَّ أُتِيَ بِالثَّالِثَةِ فَقَالَ هَلْ عَلَيْهِ

دَيْنٌ؟ قَالُوا ثَلَاثَةُ دَنَانِيرَ، قَالَ هَلْ تَرَكَ شَيْئًا؟ قَالُوا لَا، قَالَ صَلُّوا عَلَى صَاحِبِكُمْ، قَالَ أَبُو قَتَادَةَ صَلِّ عَلَيْهِ يَا رَسُولَ اللّٰهِ وَعَلَيَّ دَيْنُهُ، فَصَلَّى عَلَيْهِ

—————— رواہ البخاری

حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، ایک میت کا جنازہ لایا گیا، اور عرض کیا گیا کہ حضرت اس کی نماز جنازہ پڑھا دیجیے! آپ نے دریافت فرمایا کہ کیا اس آدمی پر کچھ قرض ہے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ کچھ قرض نہیں ہے، تو آپ نے اس جنازہ کی نماز پڑھا دی۔ پھر ایک دوسرا جنازہ لایا گیا، اس کے بارہ میں آپ نے پوچھا کہ اس میت پر کسی کا قرضہ ہے؟ عرض کیا گیا کہ ہاں اس پر قرض ہے، تو آپ نے دریافت فرمایا کیا اس نے کچھ ترکہ چھوڑا ہے (جس سے قرض ادا ہو جائے) لوگوں نے عرض کیا کہ اس نے تین دینار چھوڑے ہیں تو آپ نے اس کی نماز جنازہ پڑھا دی، پھر تیسرا جنازہ لایا گیا تو آپ نے اس کے بارہ میں بھی دریافت فرمایا کہ کیا اس مرنے والے پر کچھ قرضہ ہے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ ہاں اس پر تین دینار کا قرض ہے، آپ نے دریافت فرمایا کہ اس نے کچھ ترکہ چھوڑا ہے (جس سے قرض ادا ہو سکے) لوگوں نے عرض کیا کہ کچھ نہیں چھوڑا تو آپ نے حاضرین صحابہ سے فرمایا کہ اپنے اس ساتھی کی نماز جنازہ تم لوگ پڑھ لو، —— تو ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ حضور اس کی نماز پڑھا دیں اور اس پر جو قرض ہے وہ میں نے اپنے ذمے لیا، (میں ادا کروں گا) تو اس کے بعد آپ نے اس جنازہ کی نماز بھی پڑھا دی۔ —— (صحیح بخاری)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طرز عمل بظاہر زندوں کو تنبیہ کے لیے تھا کہ وہ قرضوں کے ادا کرنے میں غفلت اور کوتاہی نہ کریں اور ہر شخص کی یہ کوشش ہو کہ اگر اس پر کسی کا قرضہ ہے تو وہ اس سے سبکدوش ہونے کی فکر اور کوشش کرے اور دنیا سے اس حال میں جائے کہ اس کے ذمہ کسی کا کچھ مطالبہ نہ ہو۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث اسی بارہ میں مروی ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طرز عمل (کہ قرضدار میت کی نماز جنازہ سے جو معذرت فرما دیتے اور صحابہ کرام سے فرما دیتے تھے کہ تم لوگ پڑھ لو) ابتدائی دور میں تھا،

بعد میں جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے فتوحات کا دروازہ کھل گیا اور افلاس و ناداری کا دور ختم ہو گیا تو آپ نے اعلان فرما دیا کہ اگر کوئی مسلمان اس حال میں انتقال کر جائے کہ اُس پر قرض ہو (اور ادائیگی کا سامان نہ چھوڑا ہو) تو وہ قرض میرے ذمہ ہے میں اس کو ادا کروں گا۔ اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ کسی مسلمان کے ذمہ کسی دوسرے کا حق باقی نہ رہ جائے۔

بہرحال ان سب حدیثوں سے معلوم ہوا کہ قرض ادا نہ کرنا اور اس حال میں دنیا سے چلا جانا بڑا سنگین گناہ ہے اور اس کا انجام بہت ہی خطرناک ہے اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات سے سبق لینے کی ہم سب کو توفیق دے اور دنیا سے اس حال میں اُٹھائے کہ کسی بندہ کا قرض اور کوئی حق ہمارے ذمہ نہ ہو۔

قرض ادا کرنے کی نیت ہو تو اللہ تعالیٰ ادا کرا ہی دے گا

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَخَذَ اَمْوَالَ النَّاسِ یُرِیْدُ اَدَاءَهَا اَدَّی اللّٰهُ عَنْهُ وَمَنْ اَخَذَ یُرِیْدُ اِتْلَافَهَا اَتْلَفَهُ اللّٰهُ عَلَیْهِ ——— رواہ البخاری

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو آدمی لوگوں سے (قرض اُدھار) مال لے اور اس کی نیت اور ارادہ ادا کرنے کا ہو تو اللہ تعالیٰ اُس سے ادا کرا دے گا۔ (یعنی ادائیگی میں اُس کی مدد فرمائے گا اور اگر زندگی میں وہ ادا نہ کر سکا تو آخرت میں اُس کی طرف سے ادا فرما کر اس کو سبکدوش فرما دے گا) اور جو کوئی کسی سے (قرض اُدھار) لے اور اس کا ارادہ ہی مار لینے کا ہو، تو اللہ اس کو تلف اور برباد ہی کرا دے گا (یعنی دنیا میں بھی وہ اس بدنیت آدمی کو لینا نہ ہوگا اور آخرت میں اس کے لیے وبال عظیم ہوگا) (صحیح بخاری)

عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَیْنٍ عَنْ مَیْمُوْنَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ خَلِیْلِیْ وَصَفِیِّیْ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَا مِنْ اَحَدٍ یُدَانُ دَیْنًا یَعْلَمُ اللّٰهُ اَنَّهُ یُرِیْدُ قَضَاءَهُ اِلَّا اَدَّاهُ اللّٰهُ عَنْهُ فِی الدُّنْیَا ——— رواہ النسائی

(تشریح) حضرت عمران بن حُصینؓ ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے

بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ جو کوئی بندہ قرض لے اور اللہ کے علم میں ہو کہ اس کی نیت اور ارادہ ادا کرنے کا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا وہ قرضہ دنیا ہی میں ادا کرا دے گا۔ (سنن نسائی)

(تشریح) حضرت عمران بن حصین کی اس روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا بہت قرض لیا کرتی تھیں (غالباً مصارفِ خیر میں صرف کرنے کے لیے لیتی ہوں گی) تو ان کے خاص اعزہ اور متعلقین نے اس بارہ میں ان سے بات کی (اور اس معاملہ میں احتیاط کا مشورہ دیا) تو آپ نے صراحت فرمادیا کہ میں اس کو نہیں چھوڑوں گی اور ان کو حضورؐ کا یہی ارشاد سنایا۔ مطلب یہ تھا کہ حضورؐ کے اس ارشاد کی بنا پر مجھے کامل یقین ہے کہ میں جو کچھ قرض لیتی ہوں گی اس کی پائی پائی اللہ تعالیٰ دنیا ہی میں ادا کر دے گا، مجھے اس کی ضمانت اور کفالت پر پورا اعتماد اور بھروسہ ہے ——— بیشک ایسے اصحاب یقین کے لیے یہ طرز عمل درست ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ جَعْفَرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الدَّائِنِ حَتّٰى يَقْضِيَ دَيْنَهٗ مَا لَمْ يَكُنْ فِيْمَا يَكْرَهُ ——— رواہ ابن ماجۃ

حضرت عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مقروض کے ساتھ ہے جبتک کہ اس کا قرضہ ادا ہو بشرطیکہ یہ قرضہ کسی برے کام کے لیے نہ لیا گیا ہو۔ (سنن ابن ماجہ)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ جو بندہ اپنی صحیح ضرورت وحاجت یا کسی نیک کام کے لیے قرض لے اور وہ اس کی ادائیگی کی نیت اور فکر رکھتا ہو تو قرضہ ادا ہونے تک اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت اور مدد اس کے ساتھ رہے گی ——— سنن ابن ماجہ کی اسی روایت میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ حدیث کے راوی عبداللہ بن جعفرؓ اس حدیث کی بنا پر ہمیشہ مقروض رہتے تھے، فرماتے تھے کہ میں چاہتا ہوں کہ میرا کوئی دن اور کوئی رات ایسی نہ گزرے جس میں اللہ تعالیٰ کی معیت یعنی خاص عنایت مجھے نصیب نہ ہو ——— ان کے حالات میں ذکر کیا گیا ہے کہ یہ بہت سخی تھے اس لیے بھی ہمیشہ مقروض رہتے تھے
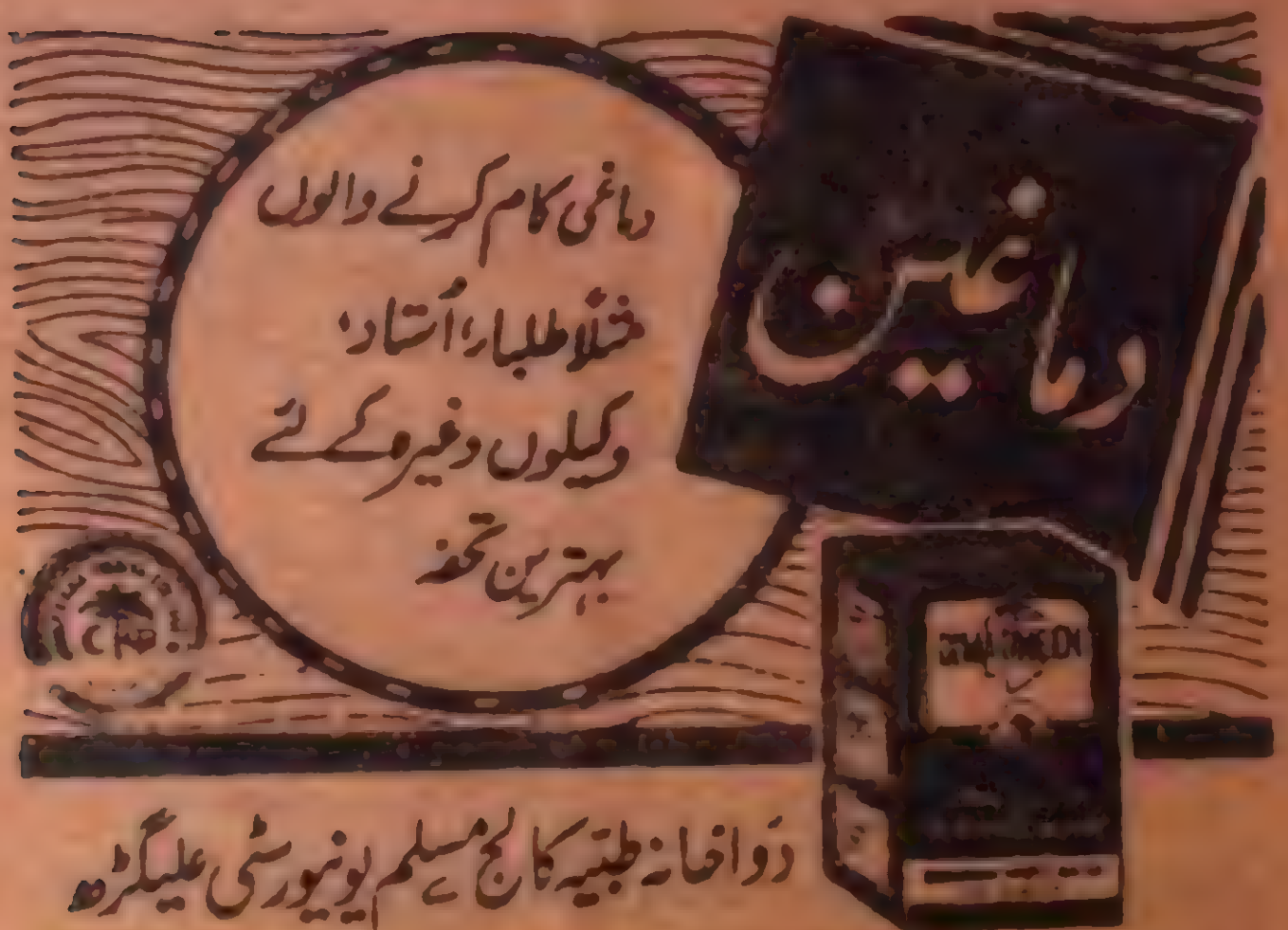
قرض لینے اور ادا کرنے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی قرض لینے کی ضرورت پڑتی تھی اور آپ قرض لیتے تھے اسی

سلسلۂ معارف الحدیث میں یہ بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ آپ غیر مسلموں یہودیوں سے بھی قرض لیتے تھے اور اس میں جو عظیم دینی مصلحتیں اور حکمتیں تھیں وہ بھی وہاں بیان کی جا چکی ہیں —— یہاں اس سلسلہ میں صرف دو حدیثیں درج کی جاتی ہیں۔

عَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ لِي عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَيْنٌ فَقَضَانِي وَزَادَنِي —— رواہ ابو داؤد

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کچھ قرض تھا تو آپؐ نے جب وہ ادا فرمایا تو (میری واجبی رقم سے) زیادہ عطا فرمایا (سنن ابو داؤد)

(تشریح) قرضدار کا ادائگی کے وقت اپنی طرف سے کچھ زیادہ ادا کرنا جائز بلکہ مستحب اور سنت ہے —— چونکہ یہ کسی شرط اور معاہدہ کی بنا پر نہیں ہوتا اس لیے یہ "ربوا" ہوتا نہیں بلکہ تبرع اور احسان ہے —— یہ ان سنتوں میں سے ہے جس کو بتلانے اور رواج دینے کی ضرورت ہے۔

خصوصی رعایت

۵ رمضان المبارک سے ۱۵ شوال تک اپنی مطبوعات پر ۲۰٪ فیصد؛ دوسرے اداروں کی مطبوعات پر ۱۰٪ فیصد

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کی ایمان افروز تالیفات

اسلام کیا ہے؟

نہایت آسان زبان عام، بحد دل نشین اور پر اثر انداز میں اسلامی تعلیمات کا جامع اور مکمل خلاصہ۔ دین کی ضروری واقفیت حاصل کرنے ہی کے لیے نہیں بلکہ کامل مسلمان اور ان شاء اللہ کا ولی بننے کے لیے بھی اس کا مطالعہ اور اس پر عمل ان شاء اللہ کافی ہے۔ مولانا موصوف کی سب سے زیادہ مقبول کتاب۔ انگریزی، فرانسیسی، برمی اور ہندی وغیرہ متعدد ملکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ جدید ایڈیشن عمدہ کاغذ آفسٹ کی چھپائی ——— دھوکا نہ کھائیے!

بعض بجز کتب خانوں نے ہماری کتاب "اسلام کیا ہے؟" گھٹیا کاغذ پر غلط سلط چھاپی ہے اور بجرمانہ طور پر اس پر کتب خانہ الفرقان کا نام چھاپا ہے اُسے خرید کر آپ دھوکا نہ کھائیے! عمدہ کاغذ اعلیٰ چھپائی دیکھ کر خریدیے! قیمت ۵۰/۴

دین و شریعت

اس کتاب میں توحید، آخرت، رسالت، نماز، روزہ، زکوٰۃ و حج، اخلاق و معاملات، دعوت و جہاد، سیاست و حکومت اور احسان و تصوف کے مباحث پر ایسی محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے کہ دل و دماغ اور عقل و وجدان، ایمان و اطمینان سے معمور ہو جاتے ہیں۔ -/۸

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟

قرآنی ہدایات اور اسلام کی اہم تعلیمات کا ایک جامع مرقع۔ جس میں سیکڑوں عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت موثر اور مؤثر تشریح کے ساتھ جمع کیا گیا ہے۔

(مندرجہ بالا تینوں کتابوں کے انگریزی ایڈیشن بھی چھپ چکے ہیں طلب فرمائے جا سکتے ہیں۔) قیمت -/۱

معارف الحدیث

(احادیث نبوی کا ایک نیا اور جامع انتخاب مع اردو ترجمہ اور تشریح کے) مولانا نے احادیث کے مستند مجموعوں سے گہرے غور و فکر کے بعد وہ حدیثیں منتخب کیں جن کا انسانوں کی فکری و اعتقادی اور عملی زندگی سے خاص تعلق ہے اور جن میں امت کے لیے ہدایت کا خاص سامان ہے۔ اس سلسلے کی ۶ جلدیں الحمد للہ مکمل ہو چکی ہیں۔ مکمل سیٹ مجلد ۴۹/- انگریزی ایڈیشن۔ معارف الحدیث کی پہلی جلد اور نصف دوم کا انگریزی ترجمہ ایک جلد میں شائع ہو گیا ہے۔ قیمت -/۲۲

تصوف کیا ہے؟

یہ کتاب اپنے اختصار کے باوجود افادات و تحقیق اور مباحث کے تسلسل اور علماء کے لحاظ سے اپنے موضوع میں بہت ممتاز سمجھی گئی ہے۔ -/۵

دینی مدارس کے طلبہ سے

مولانا نعمانی کی اس تقریر میں طلباء کے لیے ایک جامع پیغام ہے۔ -/۶

میری طالب علمی

مولانا موصوف نے اس میں اپنی تعلیمی زندگی کے مختصر حالات بیان کیے ہیں۔ -/۲

تذکرہ مجدد الف ثانی رح

امام ربانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رح کی سوانح حیات۔ آپ کے خدائی اور ارشادی خصوصیات اور اس عظیم تجدیدی کارنامے کی تفصیل جس کے نتیجہ میں اکبر اور اس کے حواریوں کا چلایا ہوا "دین الٰہی" تاریخی قصہ ہو کر رہ گیا۔ اور سلطنت مغلیہ کا رخ الحاد سے صحیح اسلام کی طرف مڑ گیا۔ زیر طبع!

ملفوظات حضرت مولانا الیاس رح

جن لوگوں نے حضرت کو نہیں پایا وہ ان ملفوظات کے مطالعہ سے آپ کو پوری طرح سے جان اور سمجھ سکتے ہیں۔ دین کی حقیقت سمجھنے اور اس کے لیے دل میں سوز و تڑپ پیدا کرنے میں یہ کتاب بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہے۔ -/۶

نوٹ:- مفصل جانکاری کے لیے ہماری فہرست کتب طلب کیجیے۔

ناشر: کتب خانہ الفرقان۔ ۳۱۔ نیا گاؤں مغربی۔ لکھنؤ

مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

جواہر پارے

تلخیص و اقتباسات مکاتیب رشیدیہ

(مسلسل)

بنام مولانا الحاج المولوی محمود حسین صاحب بریلوی

آپ کا خط آیا حال معلوم ہوا جو کچھ مقدر ہو چکا ہے اس میں کوئی کمی زیادتی نہیں کر سکتا اور وہ ہی بندہ کے حق میں مستحسن ہے۔ ذکر کے وقت سردی اور قشعریرہ اور رونگٹے کھڑے ہونا بلکہ بھی اس ہی سلطان ذکر کے آثار میں سے ہے اور امر محمود ہے۔ مسح گردن مستحب ہے بعض احادیث سے اس کا نشان

حضرت مولانا محمود حسین صاحب بریلوی۔ آپ حضرت محدث گنگوہی کے تلامذہ میں سے تھے۔ تذکرۃ الرشید جلد اول میں ذریت تلامذہ کے اندر آپ کا نام بھی ملتا ہے۔ اس سلسلہ کے آگے درج ہونے والے تیسرے مکتوب سے معلوم ہوا کہ حافظ قرآن بھی تھے۔ احقر نے قیام بریلی کے زمانے میں دفتر الفرقان بریلی کے قریب کی مسجد میں آپ کو کئی مرتبہ دیکھا ہے۔ اس وقت احقر کو آپ کی اس عالی نسبت کا علم نہیں تھا کبھی نماز پڑھاتے تو قرات سادہ اور بڑی دلکش ہوتی۔ طویل مدت تک، اٹاوہ کے اسلامیہ کالج میں عربی فارسی کے استاد غالباً ہیڈ مولوی رہے۔ وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد اپنے مکان محلہ [illegible] بریلی میں قیام فرمایا۔ معلوم ہوا ہے کہ آپ پر ایک مستقل مقالہ [illegible] الفرقان گذشتہ میں شائع ہو چکا ہے۔ افسوس ہے کہ احقر کو وہ شمارہ دستیاب نہ ہو سکا۔

(نسیم احمد فریدی غفرلہٗ)

ملتا ہے. جذامی کے ساتھ اختلاط کرنا درست ہے۔ اور الگ رہنا بایں وجہ کہ مبادا یہ مرض ہو جاوے اور یوں دل میں عقیدہ ہو جاوے کہ یہ مرض متعدی ہے۔ جائز ہے کہ پہلے سے ہی الگ رہے تا فسادِ اعتقاد پیدا نہ ہووے سکوت، ادا سنن سے بعد فرض فجر، عند الحنفیہ منسوخ ہے عموم اس حدیث سے جو در باب منع نوافل بعد الفجر والعصر وارد ہوئی ہے۔ یا خصوصیتہ پر محمول ہے کہ کسی وجہ غیر معلوم سے آپ نے اس شخص کو اجازت دی مگر وہ شخصیہ (الحکم) ہے کلیہ حکم اس سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ کلیہ منع نوافل کا بحالِ خود رہے گا۔

ادا سنتہ فجر در صورت جماعتِ فرض بشرطیکہ ایک رکعتِ جماعت مل جاوے اور سنت کو پردہ میں ادا کرے بحضور جماعت نہ پڑھے، درست ہے، ورنہ نہیں۔ اور یہ امر تاکید سنتہ فجر کے باعث ہے، اور سنن میں یہ امر نہیں ہوتا اور مدرک ایک رکعت کا مدرک جماعت و صلوٰۃ کا ہوتا ہے، ادراک کر از رکعت کا ادراک فضیلت ہے۔ نہ (کہ) ادراکِ جماعت۔ بعض کو حکم کل ہے لہذا ایسی صورت میں ادا کا مضائقہ نہیں اور بحضور جماعت (سنت فجر کو) ہرگز نہیں پڑھنا چاہیے کہ مخالفتِ جماعت مسلمین اور افتراق حرام ہے۔ فقط والسلام

...... آپ کا خط آیا حال معلوم ہوا بندہ کے نزدیک کتب دینیہ کا پورا کرنا عمدہ ہے اور ادب کی چنداں ضرورت نہیں ایک دو کتاب بھی کافی ہے اور کتب دینیہ کے درس (یعنی پڑھنے) کو شغل باطن پر ترجیح دیتا ہوں سو اگر اتمام۔ کتب دینیہ کا مراد آباد ہی ہو جاوے تو عمدہ ہے۔ کہیں جانا کیا ضرورت ہے، ورنہ چندے قیام مراد آباد رکھو پھر جیسا ہووے گا کرنا۔ اور معقول کا خیال ہرگز مت کرنا، بس مختصر المعانی کا ختم کر لینا مناسب ہے یہ بھی ایک فن عمدہ ہے، اور کار آمد دینیات ہے بعد ازاں اگر یہ تکمیل ہی ہووے بقا یا تفسیر و حدیث و فقہ و اصول ہو جاوے اصول میں توضیح تلویح کافی ہے ہر چند اصول آتا نہیں۔ مگر تاہم کار آمد علم ہے اور قدر مایحتاج تو نور الانوار ہی میں حاصل ہو جاتا ہے۔

الحاصل اتمام علوم دینی کا ضرور و مقدم جانو اگر مراد آباد ہو جاوے تو بہتر ہے ورنہ دوسری جگہ تکمیل کرنی چاہیے۔ فقط والسلام

...... آپ کا خط آیا شغل کے ناتمام رہنے کا افسوس لکھا ہے برادرم حصولِ دولتِ آخرت کا رنج و افسوس بھی نعمت ہے جو شوق پر دلالت کرتا ہے۔ شوقِ ذکر و شغل الی اللہ تعالیٰ کسی سعید کو نصیب ہوتا ہے اور فی الواقع دردِ آخرت کی برابر کوئی دوا و لذت نہیں۔

بہر حال جو کچھ ہو سکتا ہے کرتے ہو اور جب گاہے ناغہ ہو گیا تو دوسرے وقت قضا کر لیا التزام تھوڑے شغل کا بھی عمدہ ہے۔

رمضان شریف میں قرآن شریف کا پڑھنا مناسب ہے کہ سال بھر یہ کام آتا ہے مگر شغل کا بہت التزام رکھنا الغرض عدد اسم ذات اگر چار ہزار نہ ہو سکیں (تو) چند روز کو دو ہزار ہی رہنے دو۔ جاڑے کے موسم میں راتیں طویل ہو دیں گی اس وقت زیادہ کر دینا۔ خواب تمہارا مقبولیت کا نشان ہے نسبتِ اہلِ حق سے تم کو حصہ کامل ملے گا انشاء اللہ تعالیٰ فرحت کی بات ہے۔ مبارک ہو وے۔ فقط

آپ کا خط آیا سرور کیا۔ بندہ بخیریت ہے قرآن شریف کا سنانا بہت اچھا ہوا، جب خیال اس بات کا آیا کہ مقتدیوں کو میرے پڑھنے سے خوشی ہوئی تو فوراً خیال کر لیا کہ اس میں میرا کیا کمال ہے سب حق تعالیٰ کا احسان ہے۔ میرا کچھ دخل نہیں اور اپنے عجُب پر اس مضمون سے تو امنع کر لی کہ میں تو وہی مشتِ خاک ناپاک منی کا مادہ ہوں یہ سب خوبی و حمد خداوند تعالیٰ کی ہے۔ ضبطِ پاسِ انفاس اور ضبطِ حرکات لطائف جہاں تک ہو سکے کرتے رہو۔ اور جب غفلت آوے اور غفلت لازم انسان کو ہے تو پھر متنبہ ہو کر گریہ و زاری اور دعا کرو کہ الٰہی تیرا بندہ ہوں تو مجھ کو اپنے ذکر سے غافل مت کر اور اس غفلت پر استغفار و ندامت کو لازم کرو اگر رونا نہ آسکے تو رونا لاؤ۔ شغل اسم ذات معمولی طرح پر جس قدر ہو سکے پھر بعد رمضان زیادہ کر دینا۔ مگر آدمی کی زبان سے جو کلمۂ ذکر نکل جاوے اگرچہ ایک بار ہی ہو بہت غنیمت ہے دنیا و ما فیہا سے (ذکر کا) ایک لفظ بہتر ہے سو کار بار کرتے کرتے بھی اللہ اللہ کرتے رہو۔ کچھ شمار کی حاجت نہیں چلتے پھرتے بھی اسی میں ہو غرض ذکر کرتا ہے سانس سے حرکت سے، زبان سے کثرتِ ذکر ہو وے۔

بعد رمضان مشکوٰۃ تمام کر کے حدیث ہی پڑھنا اور دینیات کا ہی خیال رہے، فقہ تفسیر مختصر المعانی

کا بھی مضائقہ نہیں۔

مذاہب سب حق ہیں۔

مذہب شافعی پر بغرض الضرورت عمل کرنا کچھ اندیشہ نہیں مگر نفسانیت اور لذت نفسانی سے نہو — عذر یا حجتِ شرعیہ سے ہووے تو کچھ ہرج نہیں سب مذاہب کو حق جانے کسی پر طعن نہ کرے۔ سب کو اپنا امام جانے۔ فقط

...... آپ کا خط آیا حال معلوم ہوا یہ نہیں کہہ سکتا کہ مشکوٰۃ شریف کا پڑھنا چھوڑ دو کیونکہ یہ اساسِ دین ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ سبق تھوڑا پڑھو اور شغل جس قدر ہو سکے کرتے رہو اگر اسم ذات بعدادِ معین نہیں ہو سکتا تو کم سہی۔ اور اب جاڑہ کا موسم آتا ہے رات طویل ہو جاوے گی اس وقت پچھلے وقت اٹھنا اگر وہ کبھی نہ ہو سکے تو خیر شغل باطن پر ہی قناعت رکھو اور جس قدر ہو سکے کرتے رہو۔ زیادہ مشقت بعد فراغ کتب حدیث کے کر لینا کچھ گھبرانے کی بات نہیں ہے سب امور بتدریج ہوتے ہیں جلدی سے کام نہیں نکلتا مداومت چاہیئے اگرچہ اقلّ قلیل کام ہو ملازمت و مداومت کو بہت بڑا اثر ہے۔

مولوی صاحب (حضرت مولنا محمد قاسم نانوتویؒ) مرحوم کی زیارت رویاء صالحہ (اور) موجب قبولیت عمل اور آثارِ صلاح و رشد میں سے ہے اور ان کی توجہ کی علامت ہے شکر کی بات ہے۔

رقت اس کا اثر ہے مولنا مرحوم (اپنی) حیات میں جہاد لسانی میں سرگرم تھے اس کا ظہور ہے اور تم کو اس حلیہ میں نظر آنا بھی یہ ہی مقصد ہے کہ راہِ حق تعالیٰ میں دلیرانہ کام کرو اور سعی کرو۔

اگر (تمہارے) بھائی صاحب کچھ تم کو دیا کریں تو استعمال کر لیا کرو فتویٰ سے جو امر جائز ہو سکے مضائقہ نہیں آجکل تقوی معاملات اور طعام میں ہو نہیں سکتا۔ ظاہر کا حلال دیکھ لیا اور بس روزگار کو ترک مت کرو اپنا کام شغل کا بھی کرتے رہو جس قدر ہو سکے اور کچھ کچھ حدیث بھی پڑھتے رہو۔

میرا قصد کم ذی قعدہ کو ہو گیا کہ سفر عرب کروں بعد حج راہ واپس ہونا ہووے گا اگر زندہ رہا ورنہ جو مقدر ہے۔

بضرورت جواب لکھتا ہوں، فرصت نہیں سب کی طرف سے نام بنام سلام پہونچے۔ میرا سلام کہہ دینا جو کوئی پوچھے ——

بنام مولانا صدیق احمد صاحب

از بندہ رشید احمد عفی عنہ

بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند۔ عورت بیعت نہیں لے سکتی۔ اور متقدمین میں سے کسی نے عورت کو بیعت لینے کی اجازت نہیں دی، اگر کوئی شخص عورت کو خلافت بیعت دے خاطی (خطا کار) ہے۔ دستار و جبۂ خلافت عورات (عورتوں) کو نہیں مل سکتا۔ البتہ اگر صرف برکت کے واسطے مرشد اس کو کوئی شے مرحمت فرمائے تو وہ تبرکاً اپنے پاس رکھ سکتی ہے نہ کہ دستار خلافت و جبۂ خلافت اور عورت کو یہ امر جائز ہے کہ وہ کسی کو کچھ وظیفہ و ذکر اذکار بتا دیوے مگر مرید کرنا نادرست ہے ——

ذیل کا خط ایک منتسب کے نام ہے جس کا نام مرتب مکاتیب رشیدیہ نے مطلق ظاہر نہیں کیا ہے۔

از بندہ رشید احمد عفی عنہ

بعد سلام مسنون مطالعہ فرمائیں۔ بندہ کے اوپر فرض ہے کہ جو صاحب مجھ سے علاقہ رکھتے ہیں ان کو میں بھلائی برائی سے مطلع کروں ہر چند نہ میں قابل پیری کے ہوں اور نہ بسبب اپنی نا قابلیت کے۔ اپنے آپ کو کسی کا مقتدا اور دوسروں کو اپنے تابع جانتا ہوں اگرچہ دوسروں کے دل میں اس امر کا خیال واقعی یا بناوٹ سے ہو۔ مگر بہر حال (یہ) مسلمان کا حق مسلمان کے ذمہ ہے —— اور برے کام سے روک دینا سب پر واجب ہے —— لہذا مجھ کو اس تحریر کی ضرورت ہوئی ....

پس سنو کہ آدمی آخرت کے واسطے پیدا ہوا ہے نہ دنیا کے واسطے۔ آدمی کو دنیا میں حق تعالیٰ نے امتحان کے واسطے بھیجا ہے۔ جس نے دنیا میں آکر اپنے عمر کو خدا تعالیٰ کے فرمانے کے موافق عمل کیا تو وہ امتحان میں پورا ہوا۔ دنیا میں بھی نیک نام اور بعد مرنے کے بھی اجرت اور انعام اکرام کا ہوگا۔ اور ہمیشہ ابدالآباد راحت سے رہے گا۔ اور جس نے غفلت میں عمر گذاری اور خلاف امر حق تعالیٰ کے کیا نفس پرستی تعدی اور ظلم پر رہا تو وہ دنیا میں بھی بدنام اور بعد مرنے کے بھی امتحان میں ناکام اور مبتلائے

برا انجام ہوگا۔ (مبتلائے انجام بد) ہوگا سو کسی عاقل کا کام نہیں کہ پچاس ساٹھ سال دنیا کے جو آخرت کی نسبت ایک لمحہ کے قدر بھی نہیں نفس و شیطان کی ترغیب سے راحت و عشرت میں گذار کر اس کے عوض کروڑ وں سال آگ کا عذاب گوارا کرے۔

اس کی ایسی مثال سمجھو کہ کوئی شخص اپنے گھر سے ایک جوہر بے بہا کہ جس کی قیمت کے سامنے عالم کی دولت بھی ہیچ ہو، لیکر تجارت کے واسطے نکلا کہ اس کو ضائع کر لوے گر جب وہ بازار میں گیا تو بد معاشوں بد وضع کا بانڈوں کے فریب میں آکر غافل ہو کر اس جوہر کو برباد کیا۔ آگے تو کیا تجارت کرتا۔ اور وہ چند گھڑی بدمعاشوں کے ساتھ مل کر نفس کو مزہ ہوا اور عیش سے گذری اور وہ جب دو چار گھڑی کے ان بدمعاشوں سے جدا ہو گیا اور تہیدست گھر لوٹ کر آیا تو گھر والوں نے اس جوہر بے بہا کا مطالبہ کیا اور نفع مانگا۔ مگر چونکہ وہ خود جوہر کو برباد کر چکا تھا نفع تو کیا حاصل ہوتا سوائے اس کے کہ گھر والے اس کو مار مار کر ذلیل کر دیں اور ہر قسم کا عذاب اس پر ڈالیں اور یہ کوئی اس کی تدبیر سوائے پشیمانی اور اور ذلت کے نہ کر سکے اور کیا حاصل ہوگا۔ بس ایسا ہی حال بندے کا ہے کہ وہ آخرت سے جو اصلی گھر اس کا اصلی مقام ہے اور وہیں لوٹ کر جا کر ہمیشہ کو رہنا ہے ایک جوہر ایمان اور نعمت بندگی لیکر دنیا میں آیا ہے اگر اس نے یہاں آکر موافق مرضیٔ مولیٰ کے کام کیا، یہ جوہر بے بہا بڑھتا چلا جاتا ہے اور آخرت میں بادشاہ بنا دیتا ہے اور اگر خلاف امر کیا تو اس جوہر کو برباد کیا اور باغی، مخالف، نافرمان اور غافل ہو کر عذاب آخرت میں مبتلا ہو گیا۔

پس اے عزیز! ایسا غافل ہونا اور ایسا کام کرنا کہ موجب خسران ابد ہو ادنیٰ عقل والا بھی نہیں کر سکتا، بلکہ اس بات کو تو موٹی عقل والا احمق بھی گوارا نہیں کرتا ؏

چہ کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

تو اب سنو! کہ بزعم حکومت فانیہ ظلم یا پرستم کرنا اور رشوت لینا کس قدر اپنے اوپر ظلم کرنا ہے کہ پیسہ دو پیسہ ناحق لیکر اپنی نعمت بے بہا کو ضائع کرے۔ بعض روایت میں آیا ہے کہ اگر کسی نے کسی کا چند رتی حق بھی مار لیا، خواہ غصب سے خواہ رشوت سے خواہ خیانت سے خواہ فریب سے اس کے عوض سات سو نماز بروایتی لی جاویں گی اور ایک نماز ہفت اقلیم کی سلطنت اور دولت سے زیادہ ہے۔ علیٰ ھذا القیاس ـــــ تو ان مظلوموں کے گناہ اس ظالم پر ڈال دیے جاویں گے تو کتنے خسارہ کی بات

ہے کہ کسی گرانمایہ عبادت کو ایک ذرہ نجاست حاصل کر کے زائل کر دے۔

بعد اس تحریر دیکھنے کے یقین کرتا ہوں کہ ہر شخص خصوصاً تم جیسا فہمیدہ آدمی ایسی بے جا حرکت سے تائب ہو کر متنفر ہو جاوے اور تمام اہل حقوق سے اپنے قصور و حقوق معاف کرانے کی فکر میں ہو گا اور آئندہ کو ایسی حرکت کے قریب بھی نہ جاوے گا مگر ہاں اگر کوئی حساب آخرت کا منکر ہو اور وعدہ وعید قرآن و حدیث کو جھوٹ جانتا ہو تو وہ جو چاہے کرے ـــــ مگر اس وقت تک بندہ تم سے ایسی امید نہیں رکھتا۔ اور جو کچھ مجھ پر واجب تھا وہ تم کو سنا کر حق تعالیٰ کے یہاں سے اپنی براءت حاصل کر چکا اب آپ کی بابت مجھ سے باز پرس نہ ہو گی ؏

ہر کہ دانا بکارِ خود ہشیار

میں لکھنے پڑھنے سے معذور ہو گیا ہوں اگر کوئی لکھنے والا مل جاتا ہے تو اس کو بتلا دیتا ہوں وہ لکھ دیتا ہے اس سبب سے یہ مضمون کم لکھا گیا۔ اگر خود لکھتا ہوتا تو بہت لکھتا۔ فقط والسلام

بنام حافظ وحید الدین رامپوریؒ [عہ]

برادرم حافظ وحید الدین سلمہ السلام علیکم بخیر ہوں آپ کا خط آیا حال معلوم ہوا بندہ بھی از ذی الحجہ سے ایک مدت تک بیمار رہا اور ہر روز خیال آپ کا رہا کہ کیا وجہ ہوئی کہ یک لخت خط بند ہو گئے خیال گذرا کہ شاید مثل سابق پھر آ گئی تھی۔ وہ اب بند ہو گئی ہو گی یا بوجہ اس کے کوئی جواب باصواب نہ پایا تحریر ترک کر دی یا کوئی اور وجہ ہوئی ہو اور خود سخت کم فرصت ہو گیا کسی کو خط لکھنا دشوار یا سخت ضرورت ہو یا تقاضا ہو ورنہ کچھ نہیں۔

معہذا اپنی کم لیاقتی سے دل سرد ہو گیا کہ ساری عمر حرماں میں گذاری اب پیری میں محنت بھی نہیں ہو سکتی پہلے حالات بھی فرو ہو گئے اب سنو کہ قصہ بہت طویل ہے اور تحریر اس کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

عہ مولانا حافظ وحید الدین رامپوری حکیم ضیاء الدین کے قریبی عزیز اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت تھے حضرت محدث گنگوہیؒ سے بھی استفادہ باطنی کیا تھا۔ آپ نے حضرت حاجی صاحبؒ کے مکاتیب جمع کیے تھے جو مرقومات امدادیہ کے نام سے امداد المشتاق کا جز بنا دیے گئے ہیں۔ (ماخوذ از تبرکات مرتبہ مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی سلمہ)

نہ معلوم کیا لکھوں کیا سمجھو گے یہ ضرور ہے کہ مقصود تمام سلوک سے یہی ہے کہ معاصی سے نفرت ہو جاوے اور اطاعت کی رغبت ہو جاوے اور حالات، تڑپ، بیقراری مقصود نہیں۔ بندہ بندگی کو بنا ہے نہ بیقراری خونخوار کو جب یہ امر حاصل ہوا تو اصل مطلب حاصل آیا وہ سب مقدمہ تھا نہ مقصد راہ ....

حضرت حاجی صاحب کا نامہ اپنے پاس رکھو کہیں ضائع نہ ہو جائے۔ جو آؤ گے تو دیکھوں گا۔

نماز سب کے پیچھے ہو جاتی ہے ہاں امام متقی ہو تو بہتر ہے۔ قرآن مترجم کو بے وضو ہاتھ لگانا منع ہے۔ تیمم غسل اور وضو کا اگر کرنا ہو تو ایک تیمم میں دونوں کی نیت کرے تو درست ہے اور جو جدا جدا کرے تو بھی درست ہے جس کو چاہے پہلے کرے جس کو چاہے پیچھے۔

تحیۃ الوضو سنت ہے جو نماز بیماری میں بیٹھ کر پڑھی، درست ہوئی اعادہ کی حاجت نہیں۔ ہاں اگر نشستہ (بیٹھ کر) پڑھنے کے قابل نہوا تھا اور فقط کاہلی سے نشستہ ادا کر دی تو جب وہ نماز نہ ہوئی تھی اب قضا فرض ہے۔

جب سنت نفل نماز کی نیت کر کے توڑ دی خواہ تکبیر (بوقت جماعت) کی وجہ سے خواہ اور امر کی وجہ سے۔ اس کا اعادہ واجب ہے۔ رکعات تہجد تیرہ، گیارہ، نو، سات جو وارد ہیں مع وتر کے ہیں ـــــ اگر ہو سکے تو قصد وطن کرنا شاید ملاقات ہو جاوے ورنہ بھائی موت لگی ہوئی ہے۔

برابر جوان جوان آدمی مرتے جاتے ہیں اپنی کیا توقع کہ پچاس سے بہت زیادہ بوڑھا قریب ساٹھ کے ہو چکا روز بروز ضعف اعضا تزاید پر ہے اور قوت فکریہ، علمیہ، عملیہ کمی پر۔ افسوس ہے افسوس ہے ـــــ آج جمعہ کا روز ہے سارا دن خطوط کے جواب میں گذرے گا اور ہفتہ بھر طالب علموں سے فرصت نہیں۔

جانتا ہوں شاید کہ علم دین کا مذاکرہ ہی موجب نجات ہو جاوے ورنہ سخت اندیشہ ہے اور تو کچھ نہ ہوا فقط

یہ بندہ پنجم جمادی الاول سے گنگوہ چھوڑے ہوئے ہے دیوبند رہا اور سہارنپور اب چند روز سے رامپور آیا ہوا ہے تمہارا خط گنگوہ پہونچا اور گنگوہ سے رام پور آیا۔ رامپور سے جواب لکھتا ہوں....

وہ کیفیت کہ اپنے آپ کو روبرو مالک معبود کے جانے اور شرم و حیا طاری ہو جاوے اس کا نام

حضور اور یادداشت ہے اسی کو لسان شرع میں احسان کہتے ہیں۔ اور یہی نسبت معتبرہ ہے کہ مسلسل چلی آتی ہے۔

جب اس کا ملکہ خوب ہو جاوے تو یہی امر ہے کہ قابل اجازت تلقین کا بناتا ہے اور اس کا ہی نام ذکر قلبی ہے اور اس سے پہلے سب مقدمات اس کے ہیں۔

مبارک ہو پھر مبارک ہو۔ حق تعالیٰ اس میں ترقی فرماوے اور تمکن عطا فرماوے بہت شکر کی جگہ ہے بہت بہت شکر کرنا واجب ہے خطرات بھی رفع ہو جاویں گے اور اگر خطرات رفع نہوں اور یہ نسبت قائم ہو گئی تو پھر خطرات کا کچھ اندیشہ بھی نہیں .... فقط والسلام

بعد دیر دراز آپ کا رقیمہ آیا۔ آپ نے اپنی ندامت عدم تحریر، تحریر کی ہے عزیزا کوئی بات ندامت کی نہیں اگرچہ کہ نہ میں اس کام کا اپنے آپ کو جانتا ہوں اور نہ دوستوں کی تحریرات کا طالب ہوتا ہوں کیونکہ اپنا حال خوب معلوم ہے اپنا سارا جھگڑا حسن ظن دوستاں پر مبنی ہے سو آپ کو ندامت بے فائدہ ہے ہمیشہ آپ کو اپنے سے براتب اچھا جانتا ہوں۔ اولاً حق تعالیٰ نے تم کو وہ طبع عطا کی کہ جس پر مجھ کو غبطہ (رشک) ہے دوسرے تم تلاش معاش اور کسب کے ابتلا میں کچھ نہ کچھ کرتے رہو یہ کاہل باوجود فراغ کے کچھ نہیں کر سکتا۔

اپنی ندامت کو حق تعالیٰ جانتا ہے اور اسی کو ہی استغاثہ ہے ذکر اشغال: سیر اور ولادت فخر عالم علیہ السلام کا عین سعادت اور ذکر خیر اور موجب برکات کا ہے اور جہاں ذکر آپ کا ہووے گا نزول ملائکہ اور رحمت کا ہووے گا۔

اس میں کسی کو کلام نہیں مگر جب اس کے ساتھ کوئی خرابی لاحق ہو جاوے گی اور کسی طرح کا کوئی امر خلاف شرع مل جاوے گا تو اس وقت میں بسبب اس امر غیر مشروع کے خرابی ہو جاوے گی۔

دیکھو نفل نماز عمدہ عبادت ہے مگر جب اس کے ساتھ کوئی امر بیکار شامل ہو جاتا ہے تو وہ بھی مکروہ ہو جاتی ہے پس مجلس مولود میں جو اس زمانے میں شائع ہے بہت سے امور خلاف شریعت کے پائے جاتے ہیں کہ جس پر شرع کو اعتراض ہے۔ حاضر ہونا غیر متشرع لوگوں کا اور اہتمام اس کا زیادہ جمعہ اور جماعت سے اور ضرور جاننا اس کو کہ اس کے تارک کو ملامت کریں اور سوائے اس کے چند امور ہیں

کہ شرع کو ان پر اعتراض ہے لہٰذا ایسی محفل غیر جائز ہوگئی ورنہ اصل میں تو موجب اجر و برکت ہی تھی بس شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ایسی ہی مجلس کا ذکر لکھا ہے کہ ممنوع نہ تھی کیونکہ اس زمانہ میں ہرگز یہ بدعات نہ ہوئے تھے اور اب جو تشدد ہے تو اس زمانہ کی مجالس پر ہے سوایسے وقت میں بیشک یہ مجالس بدعت ہیں نہ کہ موجب خیرات ۱۱ اور ایسا ہی حال قیام کا ہے کہ وہ بھی بدعت ہے۔

آپ کا خط آیا معنی میرے فقرے یہ نہیں تھے کہ اب کوئی خط نہ لکھوں گا۔ مرجاؤں گا یا نا خوش ہو کر ترک تحریر کروں گا۔ یہی معنی تھے۔ کہ بسبب فرصت نہ ہونے کے جمعہ کو خط لکھا جاتا ہے یہ جواب خط آپ کا سب خطوط سے فارغ ہو کر لکھنا شروع کیا ہے۔ کیونکہ اہل لوگوں کے خطوط اول آئے تھے وہ ترتیب مرعی تھی دوسرے پچھلا خط طمانیت سے لکھا جاتا ہے (چاہتا تھا کہ) بحالت فراغ و فرصت میں آپ کو خط لکھوں سو آپ کو ہر حال افسوس ہی رہتا ہے اس کا کیا علاج۔ اجی صاحب یہی غنیمت جاننا تھا کہ جواب لکھ دیا اگر نہ لکھتا تو بکافاقہ آپ کی ترک تحریر کے کیا عجب تھا یا میں بھی برس دو برس میں جواب لکھ دیتا ــــــ

توکل یہ ہے کہ جو کچھ آدمی کے ہاتھ میں ہے اس پر چنداں بھروسہ نہ ہووے جس قدر بھروسہ حق تعالیٰ کی رزاقی پر ہووے اور ترک کسب کو توکل نہیں کہتے۔ کسب کرے اور اعتماد کسب پر بالکل نہ ہووے حق تعالیٰ پر اعتماد رہے۔

مولانا حافظ محمد نعیم صدیقی ندوی ایم۔اے
رفیق دار المصنفین اعظم گڑھ

کردار شکنی کا المیہ

(۵)

رشوت: رشوت ہر اس معاوضہ کو کہتے ہیں جو کسی فرض منصبی کی ادائیگی، واجب کام کی انجام دہی اور ناحق و ناجائز کام کرنے کے لیے نقد رقم یا کسی دوسری چیز کی شکل میں وصول کیا جاتا ہے۔ یہ تعریف تو ایک عام اور کثیر الوجود رشوت کی ہے۔ ورنہ اگر رشوت کے مفہوم کی وسعت کو دیکھا جائے تو اس میں اور بھی صورتیں آ جائیں گی۔ مثلاً کوئی عہدہ دار اپنے منصب و عہدہ کی بنا پر کسی سے بلا استحقاق کوئی ایسا مفاد حاصل کرے کہ اگر وہ اس عہدہ پر نہ ہوتا تو وہ مفاد اسے حاصل نہ ہو سکتا۔ یہ بھی درحقیقت ایک قسم کی رشوت ہے۔ آج ہر محکمہ کے ذمہ دار اس رشوت میں ملوث نظر آتے ہیں۔ اور خال خال ہی کوئی ایسا افسر مل سکتا ہے۔ جو اس نوع کی رشوت سے اپنی پاکدامنی کا دعویٰ کر سکے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

یأتی علی الناس زمان لا یبالی المرء ما اخذ أمن الحلال ام من الحرام	لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ آدمی پرواہ بھی نہ کرے گا کہ وہ کیا لے رہا ہے حلال ہے یا حرام ہے

آج مرور وقت کے ساتھ عرب کے اُس صاحب وحی اُمّی نبی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی اس پیش گوئی کے مظاہر کن نت نئے عنوانات کے ساتھ نظر کے سامنے آتے جا رہے ہیں۔ آج کا ہر فرد [illegible] کسب مال کے لیے گردش میں ہے۔ وہ ہمہ وقت اسی فکر میں سرگرداں و غلطاں رہتا ہے کہ کس طرح بیش از بیش مال اسے حاصل ہو جائے۔ وہ کبھی بھول کر بھی یہ سوچ بچار اپنے حاشیہ دماغ میں نہیں لاتا کہ حصول

مال کا یہ طریقہ جائز ہے یا ناجائز، مناسب ہے یا نامناسب، حرام ہے یا حلال؟؟

یہی اور صرف یہی وجہ ہے کہ آج انسانی زندگی پر حرص و آز کی فرمانروائی ہے۔ کم کمانے والا زیادہ مال حاصل کرنے کے لیے ساعی ہے۔ اور زیادہ مال رکھنے والا بیش از بیش دولت حاصل کرنے کے لیے جد و جہد کر رہا ہے۔ اور اس کے لیے بلا کسی خوف و تذبذب پوری آزادی کے ساتھ تمام ناجائز طریقوں کو استعمال کر رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج دولت سے برکت یکسر ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ جس راہ سے مال کی ریل پیل ہوتی ہے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اسی راہ پر رخصت ہو جاتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "جو شخص حرام کا مال کھاتا ہے۔ اس میں برکت نہیں دی جاتی۔ اور اس کا صدقہ قبول نہیں کیا جاتا اور جو کچھ وہ پیچھے چھوڑ جاتا ہے وہ اس کے لیے دوزخ کا ایندھن بنا دیا جاتا ہے۔"

رشوت — قرآن میں

خداوند قدوس نے انسان کو رزق حلال حاصل کرنے کا حکم فرمایا ہے تاکہ ہر شخص اپنی ضروریات حلال سے پوری کرے اور حرام کی طرف اس کی نگاہ بھی نہ اٹھے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:۔

یا ایہا الذین آمنوا کلوا من طیبات ما رزقناکم واشکروا للہ ان کنتم ایاہ تعبدون۔ (بقرہ ع ۲۰)

مسلمانو! ہم نے تم کو جو رزق طیب دے رکھا ہے اس کو بے تامل کھاؤ اور (اس کے دینے والے) اللہ کا شکر کرو اگر تم اس کی بندگی کا دم بھرتے ہو۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

یا ایہا الناس کلوا مما فی الارض حلالا طیبا ولا تتبعوا خطوات الشیطان انہ لکم عدو مبین (البقرۃ رکوع ۲۰)

لوگو! زمین میں جو چیزیں حلال طیب (قسم کی) ہیں۔ ان میں سے (جو چاہے) بے تامل کھاؤ اور شیطان کی اتباع نہ کرو وہ تو تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

علاوہ ازیں قرآن مجید نے رشوت کی حرمت کو مستقل طور پر بھی واضح کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل وتدلوا بہا الی الحکام لتاکلوا فریقا من اموال الناس بالاثم وانتم تعلمون (البقرۃ ع ۲۳)

اور آپس میں ناحق ایک دوسرے کے مال کو خورد برد نہ کرو۔ اور نہ مال کو حاکموں کے پاس رسائی پیدا کرنے کا ذریعہ بناؤ، تاکہ لوگوں کے مال میں سے (تھوڑا بہت جو) کچھ ہاتھ لگے اس کو جان بوجھ کر ناحق ہضم کر جاؤ۔

آیت مذکورہ بالا میں "اکل" درحقیقت "اخذ" کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ یعنی مال کو ناجائز طریقہ سے لینا اور کسی طرح بھی اپنے تصرف میں لے آنا۔ —— یہ مطلب نہیں کہ اگر اس مال کو کھایا نہ جائے بلکہ کسی اور مصرف میں استعمال کر لیا جائے تو وہ جائز ہو جائے گا۔ چونکہ عمومی طور پر مال کے حصول کا مقصد اپنی اور متعلقہ خاندان کی معیشت کو خوشحال بنانا ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن نے یہاں "اکل" کا لفظ استعمال کیا۔ عام طور پر مفسرین نے اس لفظ کو "اخذ" کے معنی پر محمول کیا ہے۔ چنانچہ علامہ آلوسی آیت زیر نظر کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں کہ

المراد من الأكل ما يعم الأخذ والاستيلاء۔[1]

یہاں اکل کا مفہوم لینے اور قبضہ میں کر لینے کو عام ہے۔

علامہ رشید رضا مصری لکھتے ہیں:

المراد بالأكل مطلق الأخذ والتعبير من الأخذ بالأكل معروف في اللغة تجوزوا فيه قبل نزول القرآن[2]

یہاں اکل سے مطلق لینا مراد ہے۔ لغت عرب میں یہ معروف ہے اہل عرب نزول قرآن سے پہلے مجاز کے طور پر "اکل" کو "اخذ" کے معنی میں استعمال کرتے تھے۔

ہمارے محترم مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی نے اس آیت کی تفسیر میں یہی بات اور زیادہ وضاحت کے ساتھ لکھی ہے —— فرماتے ہیں:۔

"اکل یہاں لفظی معنی میں نہیں یعنی صرف "کھانا" مراد نہیں بلکہ کسی طرح بھی اپنے تصرف میں لے آنا ہے۔ اردو میں محاورہ بھی ایسے موقع پر بولتے ہیں فلاں صاحب روپیہ کھا گئے یا رقم ہضم کر گئے .... اور بالباطل سے ہر ناجائز طریق مراد ہے .... وہ مال حلال بھی باطل ہی کے حکم میں آتا ہے جو کسی کے مالک سے اس کی خوشدلی کے بغیر حاصل کیا جائے۔ گو مالک اسے خوشی سے دے رہا ہو لیکن شریعت نے اس امر کو ناجائز قرار دیا ہو"[3]

آیت بالا میں "لا تاکلوا" کا لفظ قرآن کی بلاغت کا ایک نمونہ ہے کہ فرمایا "اپنا مال نہ کھاؤ"۔ بظاہر رشوت لینے والا دوسرے کا مال حاصل کرتا ہے لیکن درحقیقت وہ اپنے ہی مال کو ناحق [illegible]

---

[1] روح المعانی ج ۲ ص ۶۶ [2] تفسیر المنار ج ۲ ص ۱۹۵ [3] تفسیر ماجدی ج ۱ ص ۷۰ [illegible]

سے غصب کر رہا ہے کیونکہ "انما المومنون اخوۃ" کے اصول کے تحت ملت کے تمام افراد ایک ہی برادری سے متعلق ہیں۔ ان میں باہم اس طور پر اسلامی اخوت پائی جاتی ہے کہ ایک انسان کی کوئی چیز درحقیقت پوری قوم کی ملکیت ہے۔ اس کی مثالیں قرآن میں دوسرے مقامات پر بھی موجود ہیں مثلاً لا تقتلوا انفسکم اور لا تلمزوا انفسکم۔ اس طرح کسی بھی فرد کے مال، جان اور آبرو کا احترام اور حفاظت اصل میں اپنے مال، جان اور آبرو کا احترام اور حفاظت ہے۔ اس لیے اس میں ناجائز و باطل طریق کا استعمال کس طرح جائز و مناسب ہو سکتا ہے۔

اور "باطل" کا مطلب یہ ہے کہ اس مال کے مقابل میں کوئی حقیقی شے نہ ہو جسے اس مال کا معاوضہ قرار دیا جا سکے۔ مثال کے طور پر ایک پیشکار کا یہ فرض منصبی ہے کہ وہ عوام کی درخواستوں اور شکایات کو حاکم کے روبرو پیش کرے۔ اب اگر وہ کسی شخص سے درخواست پیش کرنے کا کچھ "حق الخدمت" لیتا ہے تو یہ رشوت ہے اور قطعی ناجائز اور حرام۔ کیونکہ درخواست پیش کر کے تو اس نے اپنا فرض منصبی انجام دیا جس کی تنخواہ وہ ماہ بماہ حکومت سے وصول کرتا ہے۔ اب یہ حق الخدمت کے نام سے معاوضہ کے مقابل کوئی بھی چیز باقی نہیں رہتی۔ لہٰذا اس کے جواز کا کوئی سوال نہیں۔ علامہ رشید رضا لکھتے ہیں:-

أما الباطل فهو ما لم يكن في مقابله شيء حقيقي ...... فهم حرمت الشريعة اخذ المال بدون مقابلة حقيقية[۱]

باطل وہ ہے کہ جس کے مقابلہ میں کوئی حقیقی چیز موجود نہ ہو ...... شریعت نے بغیر کسی حقیقی چیز کے مقابل میں ہوئے مال لینے کو جیسا کہ رشوت میں ہوتا ہے حرام قرار دیا ہے۔

مفسر ابو حیان اندلسی نے لکھا ہے کہ بالباطل سے مراد یہ کہ مال کو کسی ایسے طریق سے لیا جائے جو شرعاً درست اور جائز نہیں ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:-

فيدخل في ذلك الغصب والنهب والقمار وحلوان الكاهن والخيانة والرشاء وما يأخذه المنجمون وكل ما لم يأذن في اخذه الشرع[۲]

چنانچہ اس میں لوٹ کھسوٹ، جوا، کاہن کی شیرینی، خیانت، رشوت، نجومیوں کا معاوضہ۔ اور ہر وہ چیز داخل ہے جس کے لینے کی شریعت نے اجازت نہیں دی ہے۔

۱؎ تفسیر المنار ج ۲ ص ۱۸۹ و ۱۹۰ ۲؎ البحر المحیط ج ۲ ص ۵۶

تفسیر خازن میں ہے کہ ظلم کرنا، چوری کرنا، ڈاکہ ڈالنا، رہزنی کرنا، جوا کھیلنا، گانے بجانے کو ذریعہ روزگار بنانا، لہو ولعب کے ذریعہ روزی کمانا، رشوت لینا، جھوٹی گواہی دینا، جعلی دستاویز تیار کرنا، دروغ حلفی کرنا، حاکموں کو تحفہ نذرانے اور ہدایا و تحائف پہونچانا، ان کی دعوتیں کرنا اور امانت میں خیانت کرنا یہ سب چیزیں "ناجائز طریق" (بالباطل) کی تعریف میں داخل ہیں۔[1]

رشوت احادیث میں

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سماج و سوسائٹی سے تمام برائیوں کی جڑ کاٹتے ہوئے، رشوت پر شدید نکیر فرمائی ہے اور رشوت لینے اور دینے دونوں کو موجب لعنت فعل قرار دیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الراشی والمرتشی۔[2] رشوت لینے اور دینے والے دونوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی۔ اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الراشی والمرتشی فی الحکم۔[3] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حق میں فیصلہ حاصل کرنے کے لیے رشوت دینے والے پر اور اس رشوت کے لینے والے پر لعنت فرمائی۔

اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
لعن اللہ الآکل والمطعم الرشوۃ[4]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ جل شانہ کی لعنت ہے رشوت کھانے اور کھلانے والے پر

اور نہ صرف رشوت لینے دینے والوں پر لعنت کی گئی ہے۔ بلکہ وہ شخص جو ان دونوں کے درمیان معاملت اور دلالی کا کام کرتا ہے۔ اس کو بھی اسی سزا کا مستوجب قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
الراشی والمرتشی والرائش الذی
بینہما[5]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی رشوت لینے والے اور دینے والے پر نیز ان دونوں کے درمیان معاملت کرنے والے پر

---

[1] تفسیر خازن ج۱ ص ۱۲۰ [2] جامع ترمذی باب ما جاء فی الاحکام ص ۱۵۹۔ [3] جامع ترمذی ص ۱۵۹ [4] کنز العمال ج۳ ص ۲۱۰ [5] مسند ابن حنبل ج۵ ص ۲۷۹

رشوت اور حکام

سطور بالا میں رشوت سے متعلق قرآن کریم کی جو آیت درج کی گئی ہے اس میں تحریم رشوت کے ساتھ حکام کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ معاشرہ میں سب سے زیادہ حکام ہی اس میں ملوث پائے جاتے ہیں۔ آج بھی عدالتوں میں، کچہریوں میں، سرکاری اور نیم سرکاری دفاتر میں اور پرائیوٹ تجارتی اداروں میں غرض ہر جگہ رشوت کی گرم بازاری اور نت نئی شکلوں میں اس کا دور دورہ نظر آتا ہے۔ کہیں بالواسطہ اور کہیں بلاواسطہ، کہیں نقد اور کہیں دوسرے ناجائز مفاد کی شکل میں۔ حالانکہ ہر محکمہ کا ذمہ دار درحقیقت عوام اور رعایا کے حقوق کا پاسبان اور اپنے شعبہ کا امین ہے۔ اگر وہ اپنے اس فرض میں کوتاہی اور خیانت کا ارتکاب کرتا ہے تو درحقیقت حقوق اللہ کے توڑنے کے ساتھ حکومت کی عمارت میں شگاف ڈالنے کا مرتکب ہوتا ہے۔

جناب ماہر القادری

دین کے خدمت گذاروں کی خدمت میں......

ماہنامہ "فاران" پاکستان کے فاضل اڈیٹر محترم ماہر القادری برصغیر ہندو پاک کے علمی و دینی حلقوں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ زیر نظر مضمون موصوف کے قلم سے "فاران" کے اداریہ کے بطور شائع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے ملک کے علمبرداران دعوت سے درخواست کی ہے کہ وہ ایک مدت کے تجربات کی روشنی میں اپنے طریق کار پر نظر ثانی کریں اور اس میں جو خامیاں ہیں اس کی اصلاح کریں ورنہ ہر قدم منزل سے دور کرتا جائے گا اور حسرت و ندامت کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

یہ مسئلہ کا تعلق صرف پاکستان سے نہیں، ہندوستان اور تمام اسلامی ممالک سے بھی ہے اس لیے ہم نے اپنے قارئین کا حق سمجھا کہ قادری صاحب کی آواز "الفرقان" کے ذریعہ • ان تک بھی پہونچا دی جائے۔ و باللہ التوفیق۔ (مرتب)

اب تک یہ ہوتا رہا ہے کہ پاکستان کے ہر دور کے ارباب اقتدار پر اُن حضرات نے شدید سے شدید تنقید کی ہے جو دینی مزاج اور دینی کردار رکھتے ہیں اور پاکستان کے مخلص خیر خواہ ہیں۔ کوئی شک نہیں طبقۂ اعلیٰ کی غلط کاریوں پر نقد و احتساب ضروری تھا اور سکوت جرم! منکرات کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی ارشاد ہے کہ طاقت ہو تو اسے مٹا دیا جائے، طاقت نہ ہو تو اس پر احتجاج کیا جائے اور تیسرا اور آخری درجہ یہ ہے کہ اسے دل میں برا سمجھا جائے۔ منکر اور معصیت سے سمجھوتا نہیں ہو سکتا! یہ تمام حقائق اور مسائل کی نزاکتیں راقم الحروف کے سامنے ہیں۔ مگر اس تصویر کا یہ رخ بھی بہت کچھ قابل غور

ہے کہ عوام اور دینی طبقہ کے شدید احتجاج کے نتیجہ میں گذشتہ حکومتوں میں انقلابات تو بے شک آتے رہے ہیں مگر دینی طبقہ کو نہ تو زمام اقتدار ملی اور نہ کسی انقلاب کے بعد دینی فضا پیدا ہوئی بلکہ دین واخلاق کا جہاں تک تعلق ہے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے!

سکندر مرزا کی برطرفی کے بعد ایوب خاں برسر اقتدار آئے، انھیں حکومت کا سب سے زیادہ طویل زمانہ ملا، فیلڈ مارشل صاحب گیارہ برس کے قریب اپنی آمریت کے جھنڈے اڑاتے رہے، خوشامدی اہل قلم اور درباری دانشوروں نے ایوب خاں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے اور یہ بات دلوں میں بٹھانے کی کوشش کی کہ اتنا عظیم سیاست داں اور مدبر فرمانروا تو کسی ملک کو نصیب ہی نہیں ہوا مگر اس جابر آمرانہ سیاست کے سائے میں جمہوریت اور اسلام کی قدروں کی ناقدری بلکہ اہانت ہوتی رہی، علمائے کرام نے اخباروں میں اعلانات شائع کرائے کہ ہمارے سر قلم ہو سکتے ہیں مگر شریعت کے قوانین میں ترمیم و اضافہ اور رد و بدل کو گوارا نہیں کیا جا سکتا! لیکن ہوا کیا؟ عائلی قوانین میں علی الرغم شریعت کتربیونت کر دی گئی اور کسی عالم دین کے سر پر خراش بھی نہیں آئی! جس زمانے میں ایوب خاں کے خلاف نفرت و بیزاری کا پارہ تیزی کے ساتھ چڑھ رہا تھا، ایک فوجی افسر نے راقم الحروف سے کہا کہ ایوب خاں کی برائیاں اور غلط کاریاں اپنی جگہ مسلّم مگران کے ہٹنے کے بعد جو شخص آئے گا وہ ایوب خاں سے بھی زیادہ برا ثابت ہوگا، اور قوم پچھتائے گی کہ کیسا آوارہ، بدچلن اور سیاہ کردار شخص ہم پر مسلط ہو گیا! چنانچہ یہی ہوا کہ ایوب خاں تو ہٹ گئے مگر ان کی جگہ یحییٰ خاں کا آنا ملک و ملت کے لیے بدترین ٹریجڈی ثابت ہوا۔ اسی شخص کے دور حکومت میں ملک کے دو ٹکڑے ہوئے، یحییٰ خاں کے بعد پیپلز پارٹی کو حکومت ملی، اس کا پنج سالہ دور حکومت احتجاج اور فریاد و فغاں کا دور ہے!

مقصود گذارش یہ ہے کہ وہ لوگ جو دین کے اجتماعی تقاضوں کو پہچانتے ہیں، ملک و ملت کے مخلص خیر خواہ بھی ہیں، جن کے پیش نظر اپنا ذاتی مفاد نہیں بلکہ ملت کی فلاح و بہبود ہے، انھوں نے ہر دور میں حکومت کی غلط کاریوں پر احتجاج کیا ہے اور اس حق گوئی کے جرم میں انھیں مصیبتیں بھی اٹھانا پڑی ہیں، مگر بات بڑی نازک ہے اور اس نازک گرہ کو اسلام پسند دانشور ہی کھول سکتے ہیں —— یہ کہ ارباب اقتدار کی بے راہ روی پر احتجاج اور کلمۂ حق بھی ضروری، مگر انقلاب کی جو فصل وہ تیار کرتے ہیں اسے دوسرے لوگ کاٹ لیتے ہیں، ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔

راقم الحروف نے جو کچھ اوپر عرض کیا ہے وہ دینی انقلاب کے داعیوں، دانشوروں اور اہل رائے کے غور و فکر کا محتاج ہے وہ ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ ان کی پالیسی کیا ہونی چاہیے؟ جام و سندان باختن کے بڑے نازک تقاضے ہیں! سوچنا اور غور کرنا یہ ہے کہ اب تک حکومتوں کے انقلابات سے اسلام پسندوں کو کیا ملا؟ یعنی دین کے جن تقاضوں کو بروئے کار لانے کے لیے وہ جد و جہد کر رہے تھے وہ تقاضے نہ صرف یہ کہ پورے نہیں ہوئے بلکہ ان کی سطح اور نیچی ہو گئی۔ اور اب صورت حال اس مصرعہ کے مصداق ہے ع

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

کسی ناپسندیدہ حکومت کے خلاف اضطراب و بیزاری کی فضا پیدا کرنے کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں انقلاب آئے! مگر صرف "انقلاب" نہیں تعمیری انقلاب آنا چاہیے، جو برائیوں کو بھلائیوں سے بدل سکے اور پچھلی خرابیوں کی تلافی کر سکے! سوچنا یہ ہے کہ نفرت و بیزاری کی فضا کے بعد انقلاب آ گیا جس کا تجربہ ایوب خاں کے دور حکومت میں ہو چکا ہے کہ ایوب خاں کو ہٹنا پڑا، مگر اس انقلاب کا کیا نتیجہ نکلا؟ — دیندار طبقہ کو سوچنا اور غور کرنا ہے کہ ان کی روش، تنقید و احتجاج اور دعوت انقلاب کے سلسلے میں کیا ہونا چاہیے؟ تعمیری انقلاب کے لیے کن عوامل و اسباب کی ضرورت ہے؟

دوسری بات غور طلب یہ ہے کہ ارباب اقتدار ہی نہیں عوام بھی اصلاح کے محتاج ہیں۔ ان میں بھی بہت کچھ بگاڑ پیدا ہو چکا ہے، اسلام پسند دانشوروں کو عوام کی بھی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے؟ یہ عوام ہی ہیں جو عین جمعہ کی نماز کے بعد سینما ہالوں پر ٹکٹ لینے کے لیے لائنوں میں کھڑے رہتے ہیں، قصر و ایوان اور جھگیوں کی اخلاقی سطح میں شاید بہت زیادہ فرق نہیں۔ اہل خیر و تجار کی نشستیں کلب گھروں ہی تک محدود نہیں ہیں قلی اور مزدور بھی شراب اور چرس پیتے ہیں۔ سیاسی جلسوں میں جہاں ہزاروں کا مجمع ہوتا ہے ان میں ارباب اقتدار پر تنقید کے ساتھ عوام سے بھی خطاب کرنا چاہیے اور ان کو بھی غیرت دلانی چاہیے کہ تم دین سے کس قدر غافل ہو اور وہ زندگی گزار رہے ہو جو دینی نقطۂ نگاہ سے ناپسندیدہ زندگی ہے! عوام مسلمانوں کو آخرت کے محاسبہ اور عذاب سے ڈرانے کی ضرورت ہے، اگر حکومتوں میں انقلاب نہ بھی آئے اور عوام سدھر جائیں تو یہ چیز خود اپنی جگہ سعید و مبارک انقلاب ہے۔ حکومت میں

انقلاب آیا اور بدتر انقلاب آیا اور عوام جیسے تھے ویسے ہی رہے ـــــ تو یہ ایک المیہ ہے ؎

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم　　نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

عوام مسلمانوں میں اخلاقی پستی کے ساتھ بدعات کی گرم بازاری ہے، اسلام پسند دانشوروں کو توحید و سنت کی تبلیغ اور مشرکانہ عقائد اور بدعات کی تردید کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے۔ ملت اسلامیہ کا ہمیشہ سے ایک ہی نعرہ رہا ہے اور وہ نعرہ "اللہ اکبر" ہے ـــــ پاکستان میں تین نعرے "نعرۂ رسالت" (یا رسول اللہ) ـــــ نعرۂ حیدری" (یا علی) ـــــ نعرۂ غوثیہ" (یا غوث الاعظم) ایجاد ہوئے ہیں!

یہ نعرے "اللہ اکبر" پر اضافے ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی الوہیت کو چیلنج کیا جاتا ہے کہ ہم "اللہ اکبر" کے ساتھ بزرگان دین کو بھی اس عقیدہ کے ساتھ پکارتے ہیں کہ یہ بزرگ شخصیتیں ہماری پکار سن رہی ہیں۔ ان کی بڑائی بھی اللہ تعالیٰ کی کبریائی کے قریب قریب برابر ہے۔ اگر کوئی شخص یا ادارہ اس لیے بدعات اور مشرکانہ عقائد پر نقد و احتساب نہیں کرتا کہ عوام مسلمان اس سے خفا ہو جائیں گے اور ایسا کرنے سے انتخاب میں ووٹ نہیں ملیں گے ـــــ تو یہ روشِ دین و حکمت کی بڑی کجروی ہے۔

حالات ایسے ہیں کہ اسلام پسندوں کو ہر فیلڈ میں کام کرنا ہے۔ ارباب اقتدار کی غلط روش پر بھی انھیں ٹوکنا ہے۔ عوام کی اخلاقی اصلاح کے لیے بھی جد و جہد کرنی ہے، اور توحید و سنت کے تقاضوں کو بھی پورا کرنا ہے اور خود اپنی سیرت و کردار کو بھی سدھارنا ہے! تزکیۂ نفس سے زندگی میں نکھار پیدا ہوتا ہے! کیا کیا جائے اس چوکھی محاذ آرائی کے بغیر نہ تعمیری انقلاب آسکتا ہے اور نہ معاشرہ کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ عوام کے شدید دباؤ سے جمہوری ملکوں میں حکومتیں بدل جاتی ہیں مگر دیکھنا یہ ہے کہ حکومت بدلنے کے بعد جو انقلاب آیا اس نے گذشتہ حکومت کی بدعنوانیوں کی تلافی کی یا ان بدعنوانیوں میں اور اضافہ کر دیا اور حالات بد سے بدتر تو نہیں ہو گئے! کسی حکومت کی مخالفت کا مقصود صرف "انقلاب" نہ ہو بلکہ "بہتر انقلاب" ہونا چاہیے!

مقصودِ گذارش یہ ہے کہ دعوت و انقلاب کا کام صحیح خطوط پر اور انتہائی محتاط انداز میں ہونا چاہیے، انسان کا کام کوشش کرنا ہے اور اسی کوشش پر اس کا اجر ملے گا! کامیابی اور ناکامیابی اللہ کے ہاتھ میں ہے لہٰذا ملت اور اسلام کی بہتری کے لیے مرکزی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں حصہ لینا ضروری سمجھا جائے تو اس جد و جہد میں اپنی طاقت کا صحیح اندازہ اور

واقعی تخمینہ لگانے کی ضرورت ہے۔ مبالغہ آمیز اندازے ہمت شکن ثابت ہوتے ہیں اور عوام کے جلسوں میں تقریر کی ایسی فضا پیدا ہونی چاہیے کہ ہم دین کی سربلندی اور ملک کے قدرو نواح کے لیے اتنی بات کی: لہذا میں اترے ہیں۔ اگر ہم کامیاب ہوگئے تو بھی اللہ تعالی کے دین کی خدمت کریں گے اور کامیابی نہ ہوئی پھر بھی ہماری دینی جدوجہد جاری رہے گی، الیکشنوں کی کامیابی اور ناکامی سے ہمارے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کیا جائے ہمارا مقصد حصول رضائے الہی کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اللہ کی رضا کے لیے شکست ذاتی طور پر بھی گوارا کی جا سکتی ہے۔

جب پاکستان بنا تھا اور اس کے بعد چند برس تک یہ نعرہ دین پسندوں کو زیب دیتا تھا کہ:

"اسلام پاکستان کے لیے مقدر ہو چکا ہے"

"یہاں اسلام آکر رہے گا"

مگر اب جبکہ اسلام کے لیے فضا شدید ناسازگار ہوتی جا رہی ہے تو اب اس قسم کے نعروں کی ضرورت ہے:

"پاکستان اسلام کے لیے بنا ہے، یہاں اسلام ہی کو آنا چاہیے، اور ہم اسی مقصد کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں"

اس طرز اور اس قسم کے نعروں سے ——— "اسلام پاکستان کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔ نظام شریعت پاکستان میں ضرور آکر رہے گا" ——— کوئی شک نہیں کہ عوام پرامید ہو جاتے ہیں اور ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر یہ نعرے اس وقت زیب دیتے تھے جب پاکستان کے تمام فرقوں میں یک جہتی پائی جاتی تھی، ہر طبقہ اور فرقہ کے بائیس علماء نے مل کر منشور مرتب کیا تو، حکمراں طبقہ کو اسلام کے خلاف کچھ کہنے کی جراءت نہ ہوتی تھی مگر گزشتہ کے انتخابات نے مسلمانوں کی اس وحدت اور یک جہتی کو باقی نہیں رکھا۔ اب یہاں خود دینی طبقہ میں گروہی عصبیتیں ابھر آئی ہیں، اور متعدد مذہبی جمعیتوں اور پارٹیوں کے پیش نظر انتخابات میں زیادہ سے زیادہ سیٹیں حاصل کرنا ہے۔ پاکستان بننے کے بہت دن بعد تک علمائے کرام، ارباب اقتدار کی غلط کاریوں پر دھڑلے سے تنقید کرتے تھے مگر اب یہ کلمۂ حق "قصیدہ خوانی" سے بدلتا جا رہا ہے۔ ایسے کتنے علماء ان لاہوتی "کی پرواز میں کوتاہی آ چکی ہے، اور ضمیر شخصی مفادات کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں!

پاکستان بننے کے بعد کئی برس تک شیعہ حضرات پاکستان میں اسلامی نظام کی جدوجہد سے الگ نہیں رہے اور وہ عام طور پر گذشتہ حکومتوں کے خلاف احتجاج میں بھی سنیوں کی ہمنوائی کرتے تھے یا کہے کم اس جدوجہد کی مخالفت نہیں فرماتے تھے! مگر گذشتہ انتخابات میں ان کی اکثریت نے غالباً پیپلز پارٹی کو ووٹ دیئے اور اب جبکہ ان کے احتجاج پر تعلیمی نصاب کے دو حصے کر دیئے گئے ہیں، ایک شیعہ طلبہ کے لیے، دوسرا غیر شیعہ (یعنی اہلسنت والجماعت) طلبہ کے لیے۔ تو ان کا تعلق خاطر اور ہمدردیاں موجودہ حکومت کے ساتھ ہیں! پھر مقابلہ کی یہ رو چل رہی ہے کہ ماتم و عزاداری کا زیادہ زور بڑھتا ہے یا میلاد کے جلسے اور جلوس کے اہتمام کو اولیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ سابقت ملت کے اتحاد کی علامت نہیں ہے۔ پاکستان میں شروع ہی سے اسلامی دستور اور اسلامی نظام کے لیے جدوجہد کی جاتی رہی ہے۔ گروہ جمعیت جو اپنے کو سواد اعظم کا نمائندہ کہتی ہے اس نے "نظام مصطفےٰ" کا نعرہ ایجاد کیا۔ اسلامی نظام اور نظام شریعت میں جو وحدت پائی جاتی ہے اس کے مقابلے میں یہ نعرہ ایک جمعیت کی انفرادیت کو مشخص کرتا ہے۔ حالات میں دینی انقلاب کی جدوجہد کے لیے بڑی نزاکتیں اور دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں۔

جو حضرات پاکستان بننے کے بعد ہی سے اسلامی نظام کے قیام کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اور ہر دور حکومت میں انھوں نے حق گوئی کے جرم میں طرح طرح کی مصیبتیں جھیلی ہیں اور جو اپنے موقف سے ادھر اُدھر نہیں ہوئے۔ بعض تسامحات اور بشری کمزوریوں کے باوجود ان کے اخلاص میں شبہ نہیں کیا جاسکتا اُن کے لیے اب پہلے سے اور زیادہ مشکلات پیدا ہو گئی ہیں! ان کی منزلت میں ۱۰-۱۲ برس پہلے افراد تھے مگر اب منظم جماعتیں کام کر رہی ہیں۔ پاکستان میں زیادہ تر صف طاقت انہی کی جماعت ہے۔

اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے کام کرنا ہے اور ہر حالت میں کرنا ہے مگر تمام نزاکتوں کو ذہن میں رکھ کر تدبیر و حکمت سے کام لینا ہے! یہ کانٹے بہت دنوں سے کھٹک رہے تھے جو ہم نے کاغذ پر نکال کر رکھ دیئے ہیں! اللہ تعالیٰ دین کے مخلص خدمت گذاروں کی مدد فرمائے۔ آمین

قوم پھر ہمت سے آگے بڑھنے لگی ہے

۱۹۷۵-۷۶ء

دیہات میں نئی زندگی

- مکان تعمیر کرنے کی ۵.۹ لاکھ سے زیادہ جگہیں الاٹ کی گئیں جن میں سے ۳,۶۸,۰۰۰ تعمیر کے لیے بالکل تیار کر کے دی گئی ہیں۔ ۲,۴۶,۰۰۰ مکانوں کی تعمیر کا کام پورا ہو گیا۔
- تقریباً ۴۷,۰۰۰ افراد جن سے جبری مزدوری لی جا رہی تھی آزاد کرائے گئے ہیں۔
- زمین کی ملکیت کی حد مقرر کرنے کے قوانین پر عملدرآمد سے ۱۶,۶۷,۰۰۰ ایکڑ زمین فاضل قرار دی گئی جس میں سے اب تک ۴,۲۴,۰۰۰ ایکڑ زمین الاٹ کی جا چکی ہے۔ اس سے تقریباً ۱,۰۸,۰۰۰ افراد کو فائدہ پہنچا ہے۔
- ۱۹ دیہی بنک قائم کیے جا چکے ہیں۔ ۱۹۷۶-۷۷ء میں مزید ایسے ۵۰ بنک قائم کرنے کی تجویز ہے۔ قرض دینے والے کوآپریٹو اداروں کو مضبوط بنانے کے اقدامات کیے گئے ہیں۔

DAVP. 76/88

Monthly AL-FURQAN 31, Naya Gaon West Lucknow (U.P.)

VOL. 44 NO. 9 SEPTEMBER 1976 Phone : 25547

SELECTED READINGS

By **Maulana Manzoor Nomani**

	Rs. P.		Rs. P.
What Islam Is ?	18 00	Haj Made Easy	[illegible]
The Quran & You	15 00	Meaning and Message of	
Islamic Faith & Practice	15 00	Tradition	32 00

By **Maulana Abul Hasan Ali Nadvi**

Islam & the World	18 00	Tales of the Prophets	5 00
Saviours of Islamic Spirit		Syed Ahmad Shaheed	40 00
Vol. I	40 00	Qadianism—a Critique	1 00
" " Vol. II	35 00	Islam and Ahmadism	2 00
The Four Pillars of Islam	30 00	New Menace and its Answer	1 50
Western Civilisation Islam		The World of Islam Today	00 60
& Muslims	22 00	Basis of a New Social Order	1 00
Glory of Iqbal	18 00	Reconstruction of Indian	
The Musalman	10 00	Society	2 00
Faith versus Materialism	10 00	Islam—the Perfect Religion	1 50
Qadianism—a Critical Study	13 00	The Haj	6 00
Speaking Plainly to the West	5 00	Tales of the Prophet	4 00

By **OTHER AUTHORS**

Fatawa Rahimia	30 00	Teachings of Islam	30 00
The Message of Quran	25 00	" Vol. I & II	55 00
Key to the Garden of Bliss	22 00	Hadees-E-Qudsi	20 00
Fear of Hell	16 00	Bahishti Zewar	45 00
The Book of Thousand Lights	12 00	Sayings of Mohammad	5 00
The Glorious Caliphate	25 00	Punjsura Shareef	12 00
Isabella	15 00	Darood-o-Salam	8 00
The Balanced Way	4 00	Prayers of the Prophet	3 50
Rights of Husband & Wife	5 00	Salat	4 00

Can be obtained from :—

AL-FURQAN BOOK DEPOT

31, Naya Gaon West (Nazirabad),

LUCKNOW (India).

Cover Printed at—Shining Press, Naya Gaon, Lucknow-1

مدیر

محمد منظور نعمانی

Cover Printed at—Shining Press, Naya Gaon, Lucknow-1

ممالک غیر سے سالانہ چندہ
محصول ڈاک میں زبردست اضافہ کے
بعد اب نئی شرح اس طرح ہوگی
بحری ڈاک سے: ۲ پونڈ
ہوائی ڈاک سے: ۴ پونڈ

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے: ۱۵/-
پاکستان سے: ۲۵/-
بنگلہ دیش سے: ۱۶/-
فی شمارہ: ۱:۵۰

جلد (۴۴) | بابت ماہ دسمبر ۱۹۷۶ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۹۶ھ | شمارہ (۱۲)

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا دوسری کوئی اطلاع ۲۵ تاریخ تک آجائے ورنہ اگلا پرچہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیجیے جو پتہ ... تا ہے۔

... الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع ۳۰ تاریخ تک آجانا چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر پبلشر ایڈیٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

الفرقان کے اکثر ناظرین کو اخبارات اور دوسرے ذرائع سے مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی کی وفات کا علم ہو چکا ہوگا۔ حضرت ممدوح ہمارے اس دور میں جماعت دیوبند کے اکابر و اسلاف کا نمونہ اور ان کی خصوصیات کے حامل و امین تھے۔ راقم سطور اب سے ۵۲ سال پہلے (شوال ۱۳۴۳ھ میں) جب دار العلوم دیوبند میں ایک طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوا تھا اُس وقت حضرت مفتی صاحب دار العلوم کے اساتذہ میں تھے۔ اگرچہ وہ ان کے شباب کا زمانہ تھا لیکن اُس وقت بھی اخلاق و اطوار میں بزرگوں کا نمونہ تھے، تواضع اور انکسار تو اللہ تعالیٰ نے کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ کوئی یہ محسوس نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اپنے کو کسی طالب علم سے بھی برتر سمجھتے ہیں — اپنے اس ابتدائی دور میں وہ بہت اچھے صاحب قلم اور کامیاب مصنف بھی تھے۔ استاذنا امام العصر حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ اگر کچھ اردو میں لکھوانا چاہتے تو زیادہ تر مفتی صاحب ہی سے لکھواتے۔ مسئلہ ختم نبوت پر اردو میں اُن کی فاضلانہ تصنیف "ختم النبوۃ" جو تین حصوں میں ہے، اور عربی میں "ہدیۃ المہدیین" وغیرہ اُن کی اسی ابتدائی زمانہ کی تصانیف ہیں جو ان کے علمی کمال اور وسعت مطالعہ کی آئینہ دار ہیں۔ اس کے بعد کی نصف صدی کی مدت میں مفتی صاحب علمی و عملی کمالات میں برابر ترقی فرماتے رہے۔ اس وقت وہ بلاشبہ جماعت علماء دیوبند میں بلند ترین مقام پر تھے۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن قدس سرہٗ نے پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ تا ۱۹۱۸ء) کے دوران

اپنے خاص مجاہدانہ پروگرام کے تحت جب ہندوستان سے حجاز مقدس ہجرت کا ارادہ کیا تھا تو دارالعلوم کے جن چند سعادت مند اور ممتاز منتہی طلبہ نے بہ نیت برکت حضرت سے بخاری شریف کے ایک دو سبق لیے تھے ان میں حضرت مفتی صاحب ممدوح بھی تھے۔ بعد میں حدیث کی تکمیل امام العصر حضرت کشمیریؒ اور دارالعلوم کے دوسرے اکابر اساتذہ سے کی ------ طریقت اور سلوک میں بیعت بھی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے مفتی صاحب اور ان کے چند اور ساتھیوں نے اسی زمانہ میں کی تھی، اور جب انھوں نے دریافت کیا کہ حضرت کے تشریف لے جانے کے بعد ہم اصلاح کا تعلق کس سے رکھیں؟ تو حضرت شیخ الہندؒ نے حضرت علامہ کشمیری کے لیے ایما فرمایا تھا۔

حضرت مفتی صاحب یوں تو جامع العلوم تھے لیکن خصوصی اور امتیازی مناسبت فقہ سے تھی بالخصوص یہ بہت بڑی سعادت تھی (من یرد اللہ بہ خیرا یفقہہ فی الدین۔ اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے کو نیکی اور بھلائی سے نوازنا چاہتا ہے اُسے تفقہ فی الدین کی دولت عطا فرماتا ہے) اپنے اسی کمال کی وجہ سے حضرت مفتی صاحب دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی کے منصب پر فائز ہوئے۔ پھر جب کچھ خاص عوامل اور محرکات کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند کے اس منصب سے مستعفی ہوئے تو فتوے کے لیے اس کے بعد بھی مرجع بنے رہے۔ حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کو بھی آپ کی فقیہانہ نظر اور فتوے پر خاص اعتماد تھا۔

قیام پاکستان (۱۹۴۷ء) کے بعد حضرت مفتی صاحب پاکستان (کراچی) منتقل ہو گئے اور وہاں بھی وہ فتوے کا مرجع رہے۔ اہم مسائل پر بہت سے مستقل رسائل بھی لکھے جو ان کے علم و تحقیق کے آئینہ دار ہیں مفتی صاحب کا یہ بھی معمول تھا کہ اگر کسی مسئلہ کے بارے میں غور و فکر یا جدید علم و مطالعہ کے بعد رائے تبدیل ہو گئی تو پہلی رائے سے رجوع کا اعلان فرما دیتے تھے اور کچھ مدت سے تو اس طرح کے اعلانات کا ایک مستقل سلسلہ جاری فرما دیا تھا۔ یہ سلسلہ اسی طرح کا تھا جس طرح کا حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے یہاں ترجیح الراجح کا مستقل سلسلہ تھا۔

یہ بات ذکر سے رہ گئی کہ غالباً ۴۳ھ میں حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ سے بیعت سلوک کی تجدید کر لی تھی اور تکمیل سلوک و اصلاح نفس کی طرف خاص طور سے متوجہ ہو گئے تھے۔ اس سلسلہ میں حضرت حکیم الامت کی خانقاہ میں کبھی مختصر مدت کے لیے اور کبھی طویل مدت تک قیام بھی فرمایا۔ اور

اللہ تعالیٰ نے اس لائن میں بھی بہت کامیاب فرمایا حضرت حکیم الامت کی اجازت و خلافت سے بھی سرفراز ہوئے اور بلا شبہ وہ حضرت کے ممتاز خلفا میں تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے سیکڑوں ہزاروں بندوں کی اصلاح کا بھی ذریعہ بنایا ـــــ اور بظاہر بڑی کامیاب زندگی گذار کر ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو ۷۲ سال کی عمر میں وفات پائی رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالحین۔

مفتی صاحب اس دنیا میں نہیں رہے اور کوئی بھی ہمارے اس دنیا میں نہیں رہے گا (کل نفس ذائقۃ الموت) لیکن ان کے بیشمار فتاوی، دو سو کے قریب ان کی دینی و اصلاحی تصانیف اور آخری عمر کا ان کا شاہکار تفسیر معارف القرآن ان کے یہ باقیات صالحات انشاء اللہ رہیں گے اور ان کے ذریعہ حضرت مرحوم کے درجات میں برابر ترقی ہوتی رہے گی۔ اللہ تعالیٰ ان کے اخلاف اور تمام اہل تعلق کو طریقہ حق اور صراط مستقیم پر استقامت نصیب فرمائے۔

حضرت مولانا محمد سعید راندیری رح

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رح کے حادثہ وفات کے ٹھیک ایک مہینے بعد ۱۰ نومبر کو گجرات کے ممتاز اور بافیض عالم اور دینی رہنما، جامعہ حسینیہ راندیر کے سربراہ و مہتمم مولانا محمد سعید صاحب راندیری نے بھی ہماری اس دنیا کو خیر باد کہا اور باذن اللہ تعالیٰ عالم آخرت کی طرف رحلت فرمائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون مولانا موصوف اس خاندان کے چشم و چراغ تھے جس نے مسلمانان گجرات کی دینی اصلاح اور اس علاقہ کی جاہلانہ رسوم اور بدعات کے خلاف جد و جہد اور ہدایت نبوی کی نشر و اشاعت کو اپنا مشن اور زندگی کا نصب العین بنا رکھا تھا۔ آپ کے عم محترم حضرت مولانا محمد حسین صاحب راندیری اور والد ماجد مولانا حکیم ابراہیم صاحب نے راندیر میں جامعہ حسینیہ اسی لیے قائم کیا تھا اور وہی ان کی دینی و اصلاحی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ (اسی لیے راندیر کو گجرات کا "دیوبند" کہا جاتا تھا) ـــــ انہیں بزرگوں کے سایہ عاطفت میں مولانا محمد سعید صاحب نے تربیت پائی۔ اور ان کی دینی خصوصیات کو جذب کیا اولاً جامعہ حسینیہ ہی میں درسیات کی تکمیل کی اس کے بعد مزید استفادہ اور مکرر دورہ حدیث پڑھنے کے لیے دار العلوم دیوبند گئے اور وہاں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور اس دور کے دوسرے اکابر اساتذہ سے صحیحین وغیرہ دورہ حدیث کی کل کتابیں پڑھیں (غالباً اسی زمانہ میں حضرت مولانا مدنی رح سے بیعت بھی ہوئے) ان کے بعد حضرت مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں دہلی قیام کر کے فتویٰ نویسی کی مشق بھی کی۔ بعد ازاں ایک

مدت تک جامعہ حسینیہ میں تدریسی خدمات انجام دیں — پھر اپنے والد ماجد حضرت مولانا حکیم محمد ابراہیم صاحب اور راندیر کے مشہور بزرگ حافظ احمد مُوٹا صاحب کی وفات کے بعد جامعہ حسینیہ کے اہتمام و انصرام کی ذمہ داری بھی آپ پر آگئی اور زندگی کے آخری ایام تک پورے اخلاص اور تندہی کے ساتھ آپ ان ذمہ داریوں کو ادا کرتے رہے۔ آپ کے زمانہ میں جامعہ حسینیہ میں ہر جہتی ترقی ہوئی۔ گجراتی زبان میں آپ نے مختلف مسائل اور موضوعات پر متعدد اصلاحی رسالے بھی لکھے جن میں سے بعض کے انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں ترجمے بھی شائع ہوئے جو بندگان خدا کی اصلاح کا ذریعہ بنے۔

مولانا مرحوم راقم سطور کے خاص عنایت فرماؤں میں سے تھے اور وہ تعلق رکھتے تھے جس کا یہ عاجز مستحق نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے ساتھ مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے، ان کی خدمات حسنات کو اپنے فضل و کرم سے قبول فرمائے، ان کے صاحبزادوں کو ان کی اور ان کے اسلاف کرام کی علمی و دینی خصوصیات کا وارث بنائے اور جامعہ حسینیہ کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

اپنا کچھ حال

گذشتہ شمارے کے نگاہ اولیں کے صفحات میں حال دریافت کرنے والے جناب مخلصین کی اطلاع کے لیے اپنی علالت کا ذکر خاصی تفصیل سے کیا گیا تھا۔ وہ حال اب سے قریباً دو مہینے پہلے شروع ذیقعدہ میں لکھا گیا تھا اس سے ناظرین کو معلوم ہوا ہو گا کہ بلڈ پریشر اور اس کے اثر سے بخار کا جو سلسلہ کچھ مدت تک جاری رہا تھا اور جو مخلصین اور تیمارداروں کے لیے سخت تشویش کا باعث تھا، بفضلہ تعالیٰ اس سے نجات مل چکی تھی لیکن ٹانگوں کی تکلیف باقی تھی اُس وقت امید تھی کہ انشاء اللہ جلد ہی یہ تکلیف بھی زائل ہو جائے گی لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت کہ وہ اب تک بھی باقی ہے۔ ابھی تک نماز کرسی پر بیٹھ کر رکوع سجدے کے بغیر ہی ادا کرتا ہوں۔ علاج جاری ہے۔ ناظرین کرام دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ صحت تامہ عطا فرمائے۔ ٹانگ کی اس تکلیف ہی کی وجہ سے ابھی تک خود کچھ لکھنے کے لائق نہیں ہوا۔ نگاہ اولیں کے مندرجہ بالا تعزیتی نوٹ بھی املاء لکھوائے ہیں۔ اپنا یہ حال اسی امید پر لکھا رہا ہوں کہ مخلص احباب دعا کا اہتمام فرمائیں۔

واجرهم على الله

مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

جواہر پارے

(تلخیص مفاوضات رشیدیہ)

مولانا حکیم سید اشرف علی سلطان پوری کے نام

الحمد للہ کہ اس ذات پاک نے آپ کو اپنے کام میں لگا رکھا ہے۔ نہایت توجہ اور عنایت ازلی ہے۔

در باب سوالات جو تحریر فرمایا ہے، بندہ اجازت دیتا ہے۔ اگر بندہ سے بہ سہولت جوابات ہو سکے تو دریغ نہ ہوگا اور جو میری وسع (وسعت) سے خارج ہو یا وسعت اور ہمت نہ ہوئی تو دوسری بات ہے۔ غرض آپ لکھ دیویں، جو منظور حق تعالیٰ کو ہوگا، وہ ہوگا۔ اور بندہ کا حال آپ کو معلوم ہے کہ بدعت اور اہل بدعت سے متنفر ہوں۔

وحدت شہود و وجود ایک شے ہے۔ فرق بیان کا ہے اور کچھ نہیں۔ بندی کو ان تحقیقات سے مضرت ہوتی ہے ——— تم کو جو گھبراہٹ ہے وہ اثر ذکر ہے ——— مرض جسمی نہیں ———

محبت کے مقام میں قرب و بعد یکساں ہے بندہ کو چونکہ اس راہ سے واقفیت نہیں ابتدائی شغل و اشغال کیے ہیں، لہذا کسی کو تکلیف دینا پسند نہیں کرتا ہوں کہ بے سود ہے۔ اور اثر صحبت کاملین کا البتہ ہے بندہ خصوصاً اس کاروبار سے چھڑا دیا گیا ہے کہ رات دن درس و افتاء کا کام سپرد کیا گیا ہے۔ لہذا طالب کو یہاں آنا چنداں مفید نہیں۔ بلکہ عجب نہیں کہ میرا حال دیکھ کر عقیدت میں نقصان کا وے۔

الحمد للہ کہ آثار ذکر آپ پر لائح (ظاہر) ہوئے۔ دل لگنا ذکر میں بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کے برابر کوئی دولت نہیں کہ مناسبت ذکر کے ساتھ پیدا ہو گئی۔ اور محسوس ہونا انوار و شعاع کا بھی عمدہ ہے ——— مگر نہ اس طمانیت کے برابر ——— خفت جسم اور محویت خرق حجب یہ سب آثار ذکر ہیں اور ترقی کے موجب ہیں اور یہ حافظ روحانی باطن سے زجر کرتا ہے۔ یہ سب برکات ذکر اللہ تعالیٰ کی ہیں۔ بہت بہت شکر کرنا واجب ہے۔ بالکل وساوس و خطرات سے خالی ہونا محالات سے ہے۔ کھانا پینا حاجت دوائیاں سب خطرات ہیں۔ اس سے انبیاء علیہم السلام بھی خالی نہیں تھے۔ البتہ باوجود مشغولی قلب دوسرے موطن (مقام) سے یہ خواطر تعلق رکھتے ہیں۔ بعد ترقی کے خود انکشاف ہو جائے گا۔ حاجت تحریر و تقریر کی نہیں یا در کھنا کیفیات کا ضروری نہیں۔ البتہ ضعف دماغ کی تدبیر کرنا لازم ہے۔ یہ سب کاروبار قوت دماغ پر ہیں ——— خمیرہ گاؤ زبان، نوشدارو اور کوئی (اچھی) غذا آپ استعمال کرتے رہا کریں۔ اس کی رعایت رہے۔ اس قدر جوع و عطش (بھوک پیاس) نہ رکھنا کہ موجب سقوط قوت ہو جائے ——— پہلے بزرگوں کا حال مت کرنا۔ ہر زمانے کا حال مختلف ہے۔ ان کی خلقت و قویٰ بہت قوی تھے اس وقت سب ضعیف ہیں اس کا بہت خیال رہے۔ شیرگاؤ اور مغز بادام ہیں کے، رفع ضعف کے واسطے مستعمل رہیں۔ ذکر جہر میں بقدر وسعت مشغول ہونا اور پاس انفاس جس قدر ہو سکے کرتے رہو ——— اسم ذات کا اگر (ذکر) کرو تو ہر روز چھ ہزار بار خفیہ طور پر اللہ اللہ کر لیا کرو۔ کچھ طریق ترتیب نہیں نفس ذکر بہ ہوشیاری کر لیا، خواہ ایک جلسہ (نشست) میں خواہ تین چار جلسہ میں ……

آپ اپنے کام میں مصروف رہیں اور کچھ اندیشہ نہ فرمائیں۔ ترقی تنزل کا کوئی خطرہ نہ لائیں۔ ذکر کی ملازمت برضائے حق تعالیٰ کرتے رہیں۔ جو کچھ حصہ ہے وہ ملے گا۔ اور جو مقدر نہیں وہ ہرگز نہیں مل سکتا ——— اور ترقی جلدی نہیں ہوتی۔ اپنے وقت پر آتی ہے۔ سو یاس نہ کرنا چاہیے ——— حقیقت میں تصوف احسان اور اتباع سنت کا نام ہے۔ جب سنت فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ترقی ہے تو یہ عین ترقی ہے اور شکر کی جگہ ہے ——— گھبراہٹ کی کمی بھی ترقی ہے۔ غرض دونوں حالتیں موجب ترقی کی ہیں۔ شکر کی جگہ ہے نہ پریشانی کی ——— بندہ بھی دعا کرتا ہے۔ ان شاء اللہ

بقیہ وحشت بھی رفع ہو جائے گی۔ معاش کے واسطے کوئی قلیل حیلہ کر لو تو مضائقہ نہیں۔ کچھ مطلب کر لیا کرو اگر مضرت شغل کو نہ دیوے ۔ ورنہ کہیں تعلیم کی صورت ہو جائے۔ اس زمانہ شور و فساد میں ایسی ایسی تہمتیں حسود لگاتے ہیں کہ سامعہ کو پریشان کر دیتی ہیں۔ لہٰذا وہ فقرہ لکھا تھا کہ بندہ کے ساتھ بھی مبتدعین کو ملال ہے اور درپے بدنامی کے ہیں۔ سوا پنا اس میں کچھ ضرر نہیں بلکہ فائدہ ہے۔ مگر متوسل کے دل میں شبہ ہونا اس کو ضرر دیتا ہے، لہٰذا یہ فقرہ گوش گذار کر دیا ہے۔

اسم ذات کا ذکر ایک جلسہ میں پورا ہونا دشوار ہے۔ دو تین جلسوں میں مضائقہ نہیں۔ ذکر کا کیے جانا آپ کا کام ہے اور وہب (عطیا) بہ اختیار مختار حقیقی تعالیٰ شانہ ہے ــــ بندہ کا سبب ذکر ہے، خالق۔ خطرات سے کوئی بشر خالی نہیں۔ مگر خطرہ جو مفرّق ہو کہ ذکر میں تفرقہ ڈال دے اور ذکر سے مشغول و غافل کر دے وہ اثر اچھا نہیں اور جو مفرق نہیں باوجود ذکر کے آتا ہے تو کچھ حرج نہیں ــــ

یہ بدنام کنندۂ مرشداں محض نااہل ہے کہ قابلیت تعلیم و تربیت (کی) نہیں رکھتا۔ مگر چونکہ بزرگوں سے نسبت رکھتا ہے تو خود حق تعالیٰ بواسطۂ مشائخ کرام نفع پہنچاتا ہے۔ اگرچہ حرمان سے پُر ہوں جیسا ناؤدان (پرنالہ) خالی ہے۔ چاہ سے آب نکلتا ہے اور زراعت میں جمع ہو کر نفع دیتا ہے۔ مگر نالی و ناودان خالی ہے۔ بس ایسی ہی مثال یہاں تصور فرمائیں۔ محض آپ کے حسن ظن کا قصہ ہے۔ البتہ دعا گو ہوں۔ حق تعالیٰ سے التجا کرتا ہوں۔ حق تعالیٰ آپ کو کامیاب فرمائے ــــ آمین!

شغل پر دل لگنا عین جذب من اللہ تعالیٰ ہے اگرچہ تکلف سے (ہو) اور احیاناً (کبھی کبھی) ہو۔ جب اس کا غلبہ ہوگا دوام بھی ہو جائے گا۔ غفلت لازمۂ انسان ہے۔ اس غفلت کے رفع کے واسطے سالہا سال مشائخ کرام نے خلوات و ترک تعلقات کیے ہیں۔ اور رقت کا ہونا ہر طبع میں ضروری نہیں۔ جس کی نسبت وجدی ہوتی ہے، اس کو ہوتی ہے۔ اور جس کی نسبت حضور کی ہوتی ہے اس کو رقت لازم نہیں۔ اکثر نہیں ہوتی ــــ دل لگنا ذکر میں حضور ہے ــــ جو امر طبع میں

نہیں وہ بہ تکلف پیدا نہیں ہو سکتا۔ تم رقت و بکا کی فکر مت کرو اور طبیعت کو اس طرف مت کھینچو جس طرف طبع چلتی ہے اس طرف ہی چلنے دو۔ یہ کشاکش مضر ہو جاتی ہے۔ البتہ نفسانی خواہشیں جو محض لذتِ مباحہ میں ہیں وہ تھوڑا اکدر لاتی ہیں۔ اور جو معصیت ہیں وہ بالکل عوائق اور حجاب ہیں۔ ان سے نفس کو روکنا اور ضبط کرنا واجب ہے۔ حق تعالیٰ آپ کو ان سے نجات دیوے۔ آمین۔ بندہ دعاگو ہے۔ حق تعالیٰ خود بندوں کے کام کرتا ہے تم اگر لگے رہو گے، خالی نہ رہو گے۔ مَنْ دَقَّ بابَ الکریم اِنفتح[1] کہا گیا ہے۔

شغل برابر کیے جاؤ نہ انشراح پر حصر رکھو نہ اس کے طالب ہو۔ اپنے کام میں سرگرم رہو۔ آدمی کامل وہ ہے کہ اپنے عیوب پر اس کو عبرت اور نظر ہو اور اپنی معصیت پر ندامت ہو وے۔ ورنہ وہ کون ہے کہ غفلت اور عصیان سے خالی ہو۔ اپنے اپنے درجہ کے سب عاصی ہیں —— یہ شکر کی جگہ ہے کہ آپ نے اپنے کو ایسا حقیر جانا اور وقوع سب و شتم پر ندامت ہوتی رہی اسے آپ کا انجام ان شاء اللہ تعالیٰ اچھا ہے اور جماعت اولیاء میں حشر ہو گا۔ شغل میں البتہ کوتاہی نہیں چاہیے۔ اگر کسی دن کوئی ورد وظیفہ قضا ہو، دوسرے وقت ادا کر دینا چاہیے۔ اور جب کوئی امر منکر سرزد ہو تو اس کے جرم میں روزہ رکھنا یا دوسری کوئی سزا دینا چاہیے کہ نفس اس سرزنش سے اصلاح پذیر ہو جائے گا۔

آپ شغل کو برابر جاری رکھیں بایں نیت کہ حق تعالیٰ کا ذکر بندہ پر فرض ہے، حال، اور وارد کی توقع محض فضل اس کے سے رہے مراد اصل ذکر ہے کیونکہ فاذکرونی اذکرکم وارد ہے۔

ذاکرِ حق تعالیٰ مذکورِ حق تعالیٰ کا ہوتا ہے۔ اس نعمت سے زیادہ کوئی نعمت نہیں۔ یہ وہ قطعی انعام ہے کہ جس کا انکار ممکن نہیں اور وارد و حال کا کبھی وہی مختار ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

---

[1] جو شخص کریم کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو دروازہ کھل جاتا ہے۔

آپ کا یہ سوز و گداز اور شوق و ورد نایافت بہت مبارک نعمت جان کر تمنا کرتا ہوں کہ یہی اس محروم کو مل جائے اور وصول تو کسی صاحبِ نصیب کو (نصیب) ہوا ہوگا۔ اور تمہارے عزیزوں کے مرض سے ملال ہوا۔ حق تعالیٰ سب کو صحت عطا فرمائے اور وظائف جو حالت مرض میں ترک ہوتے ہیں ان کا اجر برابر ملتا ہے ــــ خطرات کا آنا تادم حیات رہتا ہے۔ مگر خطرات سے کام نہ بند ہو جائے۔ اگر ذکر کے ساتھ خطرہ ہے وہ ایسا ہے (جیسے) آبِ صاف پر خاشاک پڑ جائے ــــ وہ مضر نہیں ــــ البتہ وہ خطرہ کہ ذکر کو مسدود (بند) کردے معیوب ہے۔ اس کا قلع (قمع) بغور ملاحظہ معنیٔ ذکر کرنا چاہیے ــــ ہمارے شیخ المشائخ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے کلیہ لکھ دیا ہے کہ "خطرہ حبِ محض دنیا کے سبب پیدا ہوتا ہے بوجہ معاش کی ضرورت کے۔ سوائے سے خالی ہونا دشوار ہے مگر بہر حال کام کیے جانا چاہیے اگر جذب الٰہی (شامل حال) ہے تو وہ (خطرہ بھی) دفع ہو جائے گا ــــ آپ کی کتاب تنبیہ الغرور اگر کسی امیر کی ہمت سے شائع ہو جائے تو بہتر ہے ــــ خواہش قلبی تو ہے کہ خود بھی اس کو دیکھوں۔ مگر اول تو بسبب کثرت کاروبار کے مہلت مطالعہ کی نہیں اور اب تو ایک سال سے ایسا معطل ہوا ہوں کہ یہ آپ کا جواب (بڑی کوشش) سے کئی دن کے بعد (لکھ سکا) ہوں　　پہلی پریشانی فوت حافظ محمد اسحٰق عفی مرحوم کی دل سے زایل نہیں ہوئی تھی کہ اب اس سے بھی زیادہ صدمہ پہنچا۔ ۱۹ر جمادی الاول ۱۳۱۰ھ کو میرا فرزند خورد حافظ محمود احمد بعارضۂ اسہال دموی فوت ہوا۔ جس سے کسی کام کا ہی نہیں رہا۔ اب بجز موت تمنا نہیں اور حیات کا لطف نہیں رہا، نہ کوئی کام ہو سکے۔ مگر اپنے اختیار میں (کچھ) نہیں۔ اس کے واسطے دعا مغفرت کریں۔

ذکر و شغل میں مشغول رہیں اور حتی الامکان غیر ضروری امور کے اشتغال سے یکسوئی رہے کہ ع
ہرچہ گیرید مختصر گیرید ــــ جب حق تعالیٰ کو منظور ہو گا ذکر بیخ پذیر درون قلب ہو جائے گا ــــ اُس وقت کیفیت، ذکر کی مبرہن (ظاہر) ہو جائے گی ــــ ہر چند ہمارا کیا کسب ہے؟ کسب وہ

عـہ حضرت محدث گنگوہیؒ کے نواسے جنھوں نے ۴ ربیع الثانی ۱۳۰۹ھ بروز جمعہ وفات پائی
(تذکرۃ الرشید جلد دوم ص ۳۴۷)

تھا کہ شب و روز میں کار دنیا سے کچھ بھی تعلق نہ ہوتا تھا۔ اور ایک لمحہ کے ضائع ہو جانے کو خسران جانا جاتا تھا۔ پھر بھی یہ مشہور تھا کہ کسب سبب وصلت، وہبہ کا نہیں ہو سکتا۔

بہرحال فضل الٰہی تعالیٰ شانہ کا (منتظر) رہے کہ کب اس کا فضل توجہ فرماتا ہے۔ گو کچھ نہ ہو تو جو کچھ اشتغال ذکر ہے، اگرچہ لسانی بہ غفلت قلب ہو، تاہم فضل و عنایت حق تعالیٰ کا ہے —— فاذکرونی اذکرکم —— کا مصداق ہے، خواہ کسی درجہ میں ہو ——

ذکر کی مشغولیت ہے جو درجہ اس کا مل جاوے شکر کرے لئن شکرتم لازیدنکم

آپ عمل صالح جو کچھ ہو سکے اور شغل ذکر جس قدر ہو سکے برابر کرتے رہیں۔ پابندی لذت کی مت کرنا۔ عدم تلذذ کی وجہ سے ترک مت کرنا اور نہ خطرات و وساوس کی کثرت کے سبب سے مایوس ہونا۔ عمل صالح و ذکر اگرچہ ظاہری (اور) سرسری ہو، اگرچہ بلاحضور قلب ہو، اگرچہ غفلت تامہ سے ہو اور فقط حرکت جوارح و لسان سے ہو، نہایت درجہ قبولیت رکھتا ہے۔ اور ہرگز اثر عجیب سے خالی نہیں اور ثواب سے عاری نہیں —— آپ ایسے ذکر و عمل کو مثل عدم کے تصور فرماتے ہیں! قرآن شریف کی تلاوت بھی عمدہ ذکر و شغل ہے۔ اگرچہ فقط الفاظ کا عبور ہی ہو، اس کو ترک نہ کریں۔ مگر ایک امر خیال میں رہے کہ تلاوت معمولہ ہر روز کرو اور ایک رکوع یا زیادہ کو خوب غور معانی سے اور اس فکر سے (پڑھو) کہ کلام الٰہی میرے سامنے ہے۔ گویا حق تعالیٰ کی درگاہ میں عرض کرتا ہوں، جیسا کہ شاگرد استاد کے روبرو عرض کرتا ہے۔ اس کو بہ تکلف تصور کیا اور ایک ایک آیۃ پر (غور و) فکر کر لیا۔ اگر تصور درست نہ ہو اور بتدریج اگرچہ دیر میں ہو (تو) اس کو ایک وظیفہ کے طور پر مقرر کر لو۔ گاہ ایک رکوع ہو، گاہ کم و بیش تو امید ہے کہ ایک مدت اس پر واقع ہوگی تو دل لگے گا۔ اس شغل کو سب اشغال سے عمدہ جان کر کریں، اور گھبراویں نہیں۔ ایک دفعہ ہی) کوئی امر حاصل نہیں ہوتا۔ بتدریج سب کچھ ہوتا ہے —— آخر طفلک کم عمر کی ابجد خوانی کو خیال کرو اور امیدوار درگاہ حق تعالیٰ رکھو۔ یہ سب امور اپنے آپ کو حاصل نہیں، مگر دوستوں سے کہتا ہوں کہ الدال علی الخیر کفاعلہ[عہ] میں بھی شریک ہو جاؤں —— فتوح الغیب کا مطالعہ بہت عمدہ

عہ کسی نیک کام کی طرف رہنمائی کرنے والا اور بتلانے والا ایسا ہی ہے جیسا کہ اس کام کو کرنے والا۔

امر ہے مگر فصوص الحکم کا مطالعہ بظاہر نہایت مضر کرے گا۔ لہٰذا اجازت نہیں دے سکتا ہوں۔
عوارف المعارف کا مطالعہ مضائقہ نہیں۔

بندہ تو بفضلہ تعالیٰ بعافیت ہے مگر والدہ حافظ مسعود احمد اس عالم سے رخصت ہوگئی ہیں۔
حق تعالیٰ اس کو بخشے۔ آمین۔ رفیقۂ قدیم اور اہل خانہ تھی اس کا البتہ قلق ہوتا ہے۔ مگر بجز
رضاء خدا چارہ نہیں ——

حق تعالیٰ ہم کو، تم کو اور سب دوستوں کو اپنی رضامندی میں رکھے۔ آمین۔ عزیزا بعالجہ
کرنا امر مُباح ہے۔ اگر (تم) اس میں معروف رہے تو کوئی امر ناجائز نہیں ہوا۔ اپنے عزیز کا اگر
علاج کیا تو بھی اچھا کیا۔ صلۂ رحم میں داخل ہے اور جو اکتساب معاش کے واسطے کیا تو بھی نیت
سے وہ عبادت میں داخل ہے۔ سو اس کو ضائع کرنا وقت کا نہیں کہہ سکتے —— جو کام مباح
ہو اس میں نیت خیر کر لیویں تو عبادت ہو جاتی ہے ——

تم خود عالم ہو پس سب امور میں نیت خیر کر لیا کرو اور شغل باطن جس قدر ہو سکے اس کو کرتے
رہیں۔ اس سے بہتر کیا ہے۔ اور کچھ بھی نہ ہو تو فرائض کا ادا کرنا اور خلاف شرع سے بچنا ولایت
کبریٰ ہے۔ حق تعالیٰ کی درگاہ میں اتباع شریعت کی پرسش ہوگی اور اسی پر مواخذہ ہے۔ باقی بس۔
اور جو کچھ زہد و حالات، مقامات ہیں وہ نوافل میں داخل ہیں۔ مواخذہ ان کے ترک پر نہیں۔ پس بعد
اتباع شرع کے جو کچھ ہے وہ نفل (زیادہ) ہے، جس قدر ہو سکے۔

سیادت جو لقب بنی فاطمہ کا ہو گیا ہے، یہ محض اصطلاح اہل ہند کی ہے۔ لغتہً و شرعاً ان کا
یہ لقب نہیں۔ صاحب رسالہ لغت اور شرع سے بحث کرتا ہے اور حق کہتا ہے۔ اور یہاں ان کو سید
کہنا اصطلاحاً ہے۔

آپ کے الفاظ شوق دیکھ کر خود اپنے نفس کو ہی تنبہ ہوتا ہے۔ فی الواقع اس دنیا میں دبی

بلکہ یہ کہ توشۂ آخرت کی تحصیل میں مشغول رہے نہ کہ اس دنیا کے شوق میں مشغوف رہے۔
حق تعالیٰ ہم کو اور تم کو اور سب دوستوں کو تبصر عطا فرمائے۔ آمین۔

آدمی کا ذرہ بھر بھی، تصرف و اختیار نہیں۔ اپنے خیر و شر میں ذرا بھی اس کو قدرت نہیں
وَمَا تَشَاءُونَ اِلَّا اَن یَّشَاءَ اللہ (تم نہیں چاہتے مگر وہ جو اللہ چاہتا ہے) اگر معہذا با وصف ایسی
بے اختیاری کے مختار رہنا یا اور طلب موافقت کا حکم ہے اور تنفر از مخالفت کا بھی حکم ہے، سہ

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردئی
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش[1]

بس بندہ کیا کرے اور کہاں جاوے بجز اس کے کہ اپنا عجز بیان کرے اور اپنی تقصیر کی معافی
چاہے۔ اور کیا کر سکتا ہے۔ اور (اس کی توفیق بھی) اسی طرف سے ہے۔ حیرانی در حیرانی ہے
اب جبکہ اپنی زبان کو بظاہر اختیار مجازی اس پر ہے، کیوں ساکت رکھے؟ نام اس خالق
محسن کا لیتا رہے، اگرچہ قلب غافل ہو۔ اللہ اللہ کہتا رہے گو مثل حضور قلب کے (اس) ذکر سے
نفع نہ ہو۔ مگر نفع سے تو خالی نہیں۔ آگے قلب کو بھی اگر وہ چاہے گا ہوشیار فرماوے گا۔ کامل
اپنے جوارح کو ذکر ظاہر سے اور قلب کو ذکر باطن سے اور دیگر لطائف کو ان کے وظیفے سے خالی نہیں
رکھتا۔ مگر عاجز ناقص اگر تحریک عضو زبان بھی نہ کرتا رہے تو پھر کیا کرے۔ اگر پاس انفاس یاد نہ رہے
تو زبان کی حرکت خفیہ خفیہ چلے جاوے۔ جو بھول جاوے تو اپنی تقصیر پر نادم ہو کر دوبارہ شروع
کرے۔ علی ہذا ذکر نفس کا معاملہ رکھے کہ کثرت ان دونوں کی مورث ذکر قلبی ہے ———
کار کن کار بگذر از گفتار[2]

اگر معاملات دنیا گھیرے ہوئے ہیں اور دل ان میں لگا ہے تو زبان کو اپنے کردگار کے
کام میں لگا دے ——— گندم اگر بہم نرسد جو غنیمت است[3] مثل مشہور ہے۔ بہرحال اپنا عجز و نیاز

[1] تو نے قعر دریا میں مجھ کو تختہ بند کر دیا ہے، اور پھر یہ کہتا ہے کہ خبردار دامن کو تر مت کرنا۔
[2] از جو، کام کر اور خالی گفتار سے پرہیز کر
[3] 〃 گیہوں اگر نہ مل سکیں تو پھر جو ہی غنیمت ہیں۔

رکھنا اور نادم ہونا بندۂ عاجز کا کام ہے۔ لہٰذا جو کچھ ہوسکے اس کے دامن کو مضبوط پکڑ کر نہ چھوڑنا بھی اس عاجز (بندہ) کا شعار ہے کہ عاجز ہر شے پر ہاتھ ڈالتا ہے اور اپنی نجات کا فکر کرتا ہے —
الغریق یتعلق بکل حشیش[1] —— ہرچند کاہ بیچارہ کیا موجب نجات ہوتا ہے مگر عاجز اس کو بھی اپنا ملجا جان کر توجہ اس کی طرف کرتا ہے۔ پس ذکرِ غفلت لسانی ہرچند عرفا کے نزدیک کوئی قدر نہ رکھتا ہو مگر عند اللہ رستگاری کا بڑا ذریعہ ہے اگرچہ ادنیٰ ہے پس آپ عالم میں ذکر لسانی یا نفسی کو ہرگز نہ چھوڑیں پریشانی و حیرانی میں اس کو اپنا رفیق جانیں فاذکرونی اذکرکم کو اعلیٰ مونس سمجھیں۔ —رزقنا اللہ تعالیٰ وایاکم[2]۔ آپ کے گھر کے مرض سے تردد و ملال ہوا۔ حق تعالیٰ صحت بخشے۔ سورۂ فاتحہ کو چینی کی رکابی میں لکھ کر اور دھو کر کسی عرق یا پانی میں ہر روز پلاؤ اور اس پر چنداں مداومت کرو۔ حق تعالیٰ صحت دیوے۔ آمین۔

---

[1] ڈوبنے والا ہر تنکے کا سہارا لیتا ہے۔ [2] اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں عطا فرمائے۔
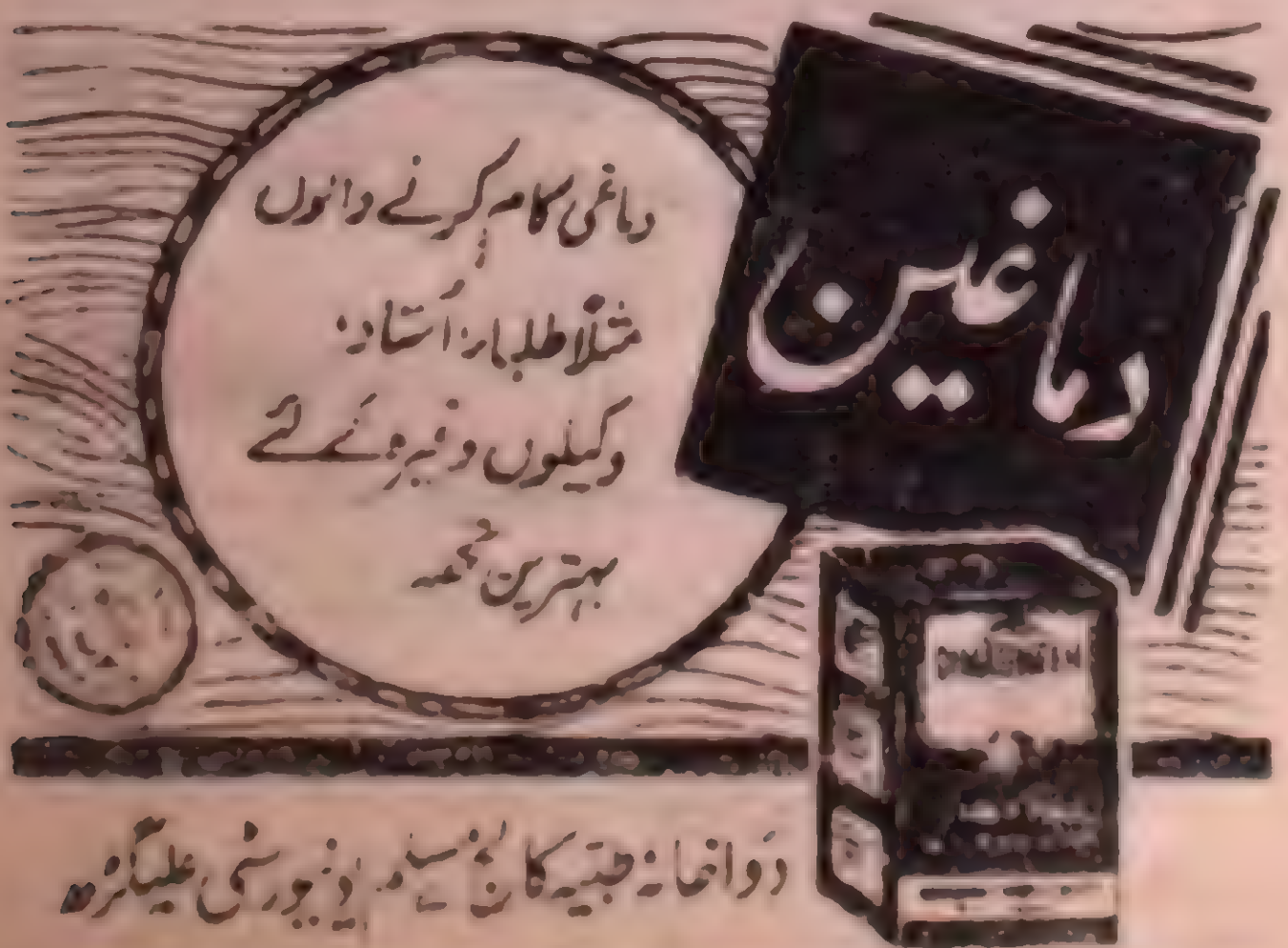
مولانا مجیب اللہ ندوی

ملفوظات بقیۃ السلف

حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپگڈھی

دامت برکاتہم

[گذشتہ سال "الفرقان" میں حضرت مولانا مدظلہ کے کچھ ملفوظات کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا جس سے بہت سے تشنگان دین کو فائدہ پہنچا۔ جی چاہتا تھا کہ یہ سلسلہ جاری رہے مگر کچھ وجوہ سے جاری نہ رہ سکا اب پھر یہ چند شذرات الذہب آپ کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں ــــــ یہ اگست ۸۰ء سے مارچ ۸۱ء تک کی درمیانی مدت کی بعض مجالس کے ارشادات ہیں۔]

اس سے پہلے راقم الحروف عرض کر چکا ہے کہ مولانا کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی تواضع بے نفسی اور فنائیت ہے اس وجہ سے مولانا کو مرض اور شدید ضعف کے باوجود جو زحمتیں اٹھانی پڑتی ہیں اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ بعد نماز فجر سے دس بجے رات تک آنے والوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے نہ تو سونے کا وقت ملتا ہے اور نہ آرام کا۔ اگر خدام کچھ پابندی بھی لگانا چاہتے ہیں تو بعد میں اتنا خجل ہوتے ہیں کہ پھر کسی کو روک ٹوک کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایک دن مولانا کی طبیعت زیادہ خراب تھی۔ ٹھیک دوپہر کے وقت ان کی ایک عزیزہ پانی دم کرانے اور تعویذ لینے کے لیے آئیں مولانا اسی وقت ذرا دیر کے لیے لیٹے تھے ان کے صاحبزادے نے ان عزیزہ سے کہا کہ ابا ابھی لیٹے ہیں آنکھ لگ گئی ہے اس لیے میری ہمت نہیں پڑتی کہ ان سے کچھ کہوں۔ وہ یہ کہکر چلی آئیں کہ اچھی بات ہے میں پھر آ جاؤں گی ابھی ان کو واپس ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ مولانا نے پوچھا کہ کوئی آیا تو نہیں تھا؟ صاحبزادے نے بتایا کہ فلاں عزیزہ آئی تھیں آپ کی آنکھ لگ گئی

تھی اور طبیعت بھی خراب تھی اس لیے میں نے ان سے یہ کہہ دیا کہ پھر آجائیے گا۔ اس وقت ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ابھی ابھی آنکھ لگی ہے وہ پھر آنے کے لیے کہہ کر چلی گئیں۔ مولانا کو یہ سنکر انتہائی افسوس ہوا اور فرمایا کہ مجھ کو جگا کیوں نہیں دیا؟ بیچاری اتنی دور سے آئیں اور ان کی حاجت پوری نہ ہو سکی۔ میرے وہاں سے ناکام واپس چلی گئیں۔ پھر اسی وقت اٹھے اور حاضرین سے کہا کہ میں ابھی آرہا ہوں حالانکہ بارش ہو رہی تھی مگر مولانا پیدل ان کے گھر گئے اور دم کرکے پھر واپس ہوئے اور واپس آکر فرمایا کہ میں قسم کھا سکتا ہوں کہ میں کسی کی دل آزاری پسند نہیں کرتا اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ میرے فلاں طرز عمل سے کسی کو تکلیف پہنچی ہے تو جب تک اسے راضی نہ کرلوں چین نہیں آتا میں خود تکلیف اٹھا لیتا ہوں مگر مجھ سے کسی کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔

ایک بار کسی عزیز کے تجہیز و تکفین میں شریک تھے مئی کا مہینہ تھا دن کے گیارہ بج چکے تھے شدت کی دھوپ تھی۔ تدفین کے بعد قبر برابر کرنے والا تنہا قبر کی مٹی برابر کر رہا تھا اور پسینہ سے شرابور تھا اس کی حالت دیکھ کر مولانا سے نہیں رہا گیا اور فوراً ایک پھاوڑا لیا اور اس کے ساتھ شریک ہو کر مٹی برابر کرنی شروع کر دی۔ مولانا کو دیکھ کر بہت سے لوگ اس میں شریک ہو گئے اور چند منٹ کے اندر مٹی برابر ہو گئی۔ وہاں سے آکر فرمایا کہ آج اس کام میں جو لطف مجھے آیا اسے بیان نہیں کر سکتا۔

اگست ۱۹۵۰ء میں راقم الحروف حاضر تھا الہ آباد کے ایک وکیل صاحب آئے اور عرض کیا کہ حضرت میرے والد صاحب بیمار ہیں۔ بظاہر مرض الموت معلوم ہوتا ہے ان کی دلی خواہش آپ سے بیعت ہونے کی ہے مگر وہ گاؤں بھانے مئو میں ہیں اگر آپ وہاں تک چلنے کی زحمت گوارا فرما لیتے تو میرے والد کی آرزو پوری ہو جاتی مولانا نے منظور فرما لیا اور پوچھا کہ کب چلنا ہے؟ وہ بولے کہ کل میں گاڑی لیکر آؤں گا اور آپ کو لے چلوں گا۔ بھانے مئو الہ آباد سے ۲۲ میل کے فاصلے پر ہے اس میں چار میل خام راستہ ہے۔ دوسرے دن گاڑی لیکر آئے مگر بہت دیر میں۔ بہرکیف حضرت نے مولانا الیٰتق احمد صاحب، قاری عبد الحفیظ صاحب اور راقم الحروف کو ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ ہم لوگ ٹھیک ۱ بجے الہ آباد سے روانہ ہوئے۔ پکی سڑک پر تو گاڑی باآسانی گئی مگر کچی سڑک پر کچھ دور چل کر ٹیکسی والے نے آگے جانے سے انکار کر دیا۔ وکیل صاحب نے

گھر تک چلنے کے لیے بہت اصرار کیا مگر وہ کسی طرح تیار نہیں ہوا بالآخر وکیل صاحب نے عرض کیا کہ حضرت آپ اسی گاڑی سے الہ آباد واپس چلے جائیں کل کسی جیپ کا انتظام کروں گا تاکہ وہ مکان تک پہنچا دے۔ ہم سب کی رائے بھی واپسی ہی کی تھی مگر حضرت مولانا نے فرمایا کہ بھائی یہ تو اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ اتنا نقصان کرکے واپس ہو جائیں ہم سب لوگ ان کے مکان تک پیدل کیوں نہ چلیں؟ چنانچہ برسات کی تیز دھوپ میں ہم سب روانہ ہوئے اور افتاں وخیزاں دو تین میل کا راستہ طے کرکے گاؤں میں پہنچے۔ وکیل صاحب سخت شرمندہ تھے مگر مولانا نے کسی ناگواری کا اظہار نہیں کیا بلکہ ان کی شرمندگی کم کرنے کے لیے دلداری ہی فرماتے رہے اور وہاں پہنچکر سب سے پہلے ان کے والد صاحب کو وضو کروایا اور خود باوضو تھے ہی فوراً ان کو بیعت کیا اس کے بعد چائے وغیرہ پی گئی گاؤں میں جب حضرت کی آمد کی اطلاع ہوئی تو بہت سے لوگ حاضر خدمت ہوئے جو پہلے سے عقیدت کا تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے کئی آدمی بیعت کے خواہشمند ہوئے آپ نے سب کو بیعت فرمالیا اور پھر ظہر کی نماز پڑھ کر کھانا کھا کر واپسی کا پروگرام بنا۔ وکیل صاحب نے کچے راستہ کے لیے ایک یکہ طے کیا اس پر ہم سب سوار ہو کر روانہ ہوئے جونہی گاؤں سے چند فرلانگ باہر نکلے کہ اچانک بادل گھر آیا اور سخت گرج اور چمک کے ساتھ تیز بارش شروع ہوگئی۔ اس وقت ہم سب کی عجیب حالت تھی۔ کھلے میدان میں وہ گرج اور چمک تیز بارش دیکھ کر عجیب عالم طاری تھا۔ ادھر حضرت مولانا پر تو عجیب کیفیت طاری تھی اور متوجہ الی اللہ ہو کر نہایت گریہ وزاری کے ساتھ خود بھی دعا میں مشغول تھے اور ہم سب لوگوں کو بھی حکم فرمایا کہ متوجہ الی اللہ ہو کر دعا میں مشغول ہو جاؤ اس وقت دعا کی عجیب کیفیت تھی اسے لفظوں میں کیسے بیان کروں؟ الغرض ہم سب بھی حضرت کے ساتھ عاجزی و توجہ سے مشغول دعا تھے۔ اس دعا میں ایک خاص قسم کی کیفیت ولذت محسوس ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے ہماری دعا قبول فرمائی پھر ہم لوگ کسی طرح سڑک تک پہونچے اور وہاں سے ٹیکسی کرکے الہ آباد واپس ہوئے وکیل صاحب بار بار اپنی شرمندگی کا اظہار کرتے تھے اور مولانا اس بات پر خوشی کا اظہار کرتے تھے کہ آخر وقت میں ان کے والد صاحب کی جو خواہش تھی وہ پوری ہوگئی چنانچہ ایک ہفتہ کے اندر ان کا انتقال بھی ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور درجات عالیہ نصیب کرے۔ آمین

متوسلین کے علاوہ جو حضرات حضرت سے ملنے آتے ہیں ان کے لیے تو وہ سراپا خادم بن جاتے ہیں اور اس طرح پیش آتے ہیں کہ حساس آدمی پانی پانی ہو جاتا ہے ان کی جن خصوصیات کا ذکر میں نے کیا ہے ان کی مجلس کی باتوں سے اور ان کے طرز عمل سے ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے مگر جو حضرات دور رہتے ہیں ان کو حضرت کی مجلس میں پہنچنے کی سعادت مشکل سے مل سکتی ہے اس لیے ان کی مجلسی گفتگو کا حستہ حستہ کچھ حصہ نقل کر دیا جاتا ہے جس سے ان کی مجلس کی افادیت کا کچھ اندازہ ہو جائے گا۔

میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حضرت مولانا کی مجلس میں ہو نکر جب آدمی عشق و محبت کی باتیں سنتا ہے تو کچھ دیر کے لیے محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی وادی محبت میں پہنچ گیا ہے محبت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت شیخ یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات میں تحریر کیا ہے کہ فرشتوں کے کاموں میں جو یکسانیت نظر آتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں محبت کا عنصر نہیں ہوتا۔ یہ عنصر انسان کے لیے مخصوص ہے اور چونکہ محبت میں نشیب و فراز ہوتا ہے اس لیے انسان کے اعمال میں بھی نشیب و فراز ہوتا ہے۔ وہ کبھی کسی حال میں ہوتا ہے کبھی کسی حال میں۔ اس موقع کے لیے مولانا نے اپنا یہ شعر پڑھا ۔

کبھی طاعتوں کا سرور ہے کبھی اعتراف قصور ہے
ہے ملک کو جس کی نہیں خبر وہ حضور میرا حضور ہے

فرمایا کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شخص مخالف تھا اور ہمیشہ برا بھلا کہا کرتا تھا مگر امام صاحب برابر اسے تحائف بھیجا کرتے تھے۔ کچھ دن بعد وہ آپ کی خدمت میں آنے لگا تو آپ نے اسے تحفہ دینا بند کر دیا۔ اس نے کچھ دن تو صبر کیا مگر ایک دن کہنے لگا کہ عجیب بات ہے کہ جب میں آپ کی مخالفت کرتا تھا تو آپ مجھ کو ہدیہ بھیجا کرتے تھے اور جب میں آپ کی خدمت میں آنے لگا اور برا بھلا کہنا بند کر دیا اور تعریف کرنے لگا تو آپ نے ہدیہ دینا بند کر دیا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ جب تم مجھ کو برا بھلا کہتے تھے اور مجھ پر لعن طعن کرتے تھے تو اس کے عوض تمھاری نیکیاں مجھے مل جایا کرتی تھیں اس احسان کے بدلے میں میں تم کو ہدیہ دیا کرتا تھا اور اب تم نے مجھے برا بھلا کہنا بند کر دیا تو نیکیاں ملنی بھی بند ہو گئیں اس لیے میں نے ہدیہ دینا بھی بند کر دیا ۔۔۔۔۔ حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مرشد حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی محفل سماع میں شریک نہیں ہوتے تھے کسی نے ان سے کہا کہ

آپ اپنے شیخ کی محفل سماع میں کیوں نہیں جاتے؟ تو فرمایا کہ "فعل مشائخ سنت نباشد" (مشائخ کا فعل سنت نہیں ہوتا) لوگوں نے اس بات کو نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا تو انھوں نے فرمایا کہ نصیر الدین حق کہتے ہیں۔ سبحان اللہ اس سے ان کی للہیت کا پتہ چلتا ہے اور اتباع سنت و شریعت کا کس قدر اہتمام معلوم ہوتا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ اپنے مخصوص حال کی بنا پر یہ محفل سماع منعقد کرتے تھے اس میں مزامیر (باجا گاجا) وغیرہ نہیں ہوتے تھے۔

فرمایا کہ بیماری بھی بڑی نعمت ہے اس سے لوگوں کی ہمدردیاں شامل ہو جاتی ہیں دل میں نرمی آجاتی ہے مگر انسان کا عجیب حال ہے کہ جب اسے تکلیف و مصیبت پہونچتی ہے تو خوب لمبی لمبی دعائیں کرتا ہے قرآن پاک نے کہا ہے اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُو دُعَاءٍ عَرِيضٍ (یعنی جب انسان کو کوئی بری حالت پیش آتی ہے تو لمبی لمبی دعائیں کرتا ہے) قرآن نے مشرکین کی صفت یہ بیان کی ہے کہ وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ (جب دریا کے سفر میں موجیں بادلوں کی طرح ان کو آگھیرتی ہیں تو وہ لوگ اخلاص کے ساتھ خدا سے دعا کرتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ اس سے نجات دیدیتا ہے تو شرک کرنے لگتے ہیں۔) یہی حال اب مسلمانوں کا ہو گیا ہے۔

فرمایا کہ کسی شیر خوار بچے سے اگر آپ یہ کہیں کہ میں تمہارے نام سے ایک لاکھ روپیہ جمع کردوں بڑے ہو کر تمہاری اس سے شادی ہوگی اور یہ ہوگا تو وہ بچہ اس کی اہمیت کیا سمجھ سکتا ہے؟ بالکل یہی حال آخرت کے اعتبار سے ہمارا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو جو وعدے جنت اور اس کی نعمتوں کے کیے ہیں ان پر پورا یقین رکھنے کے اعتبار سے ہم لوگ بھی بچے ہی ہیں اسی کو مولانا روم فرماتے ہیں۔

خلق اطفال اند جز مست خدا نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

(یعنی تمام مخلوق بچے ہیں بجز اس شخص کے جو محبت الٰہی سے سرشار ہے اور بجز اس شخص کے کوئی بالغ نہیں ہے جو ہوائے نفسانی سے نکل چکا ہے۔)

فرمایا کہ ہمارے شیخ حضرت مولانا سید بدر علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایک صاحب آتے تھے جن کی آنکھوں کی روشنی جاتی رہی تھی انھوں نے حضرت شاہ صاحب سے دعا کی درخواست کی۔ شاہ صاحب نے دعا کی، اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور ان کی بینائی عود کر آئی۔

پھر ان کو شاہ صاحب سے غیر معمولی عقیدت ہوگئی۔ ایک اور شخص بھی حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں آتے تھے جن سے ان نابینا صاحب کی دشمنی تھی ایک دن ان نابینا صاحب نے حضرت شاہ صاحب سے کہا کہ فلاں آدمی میرا دشمن ہے جو آپ کے یہاں آتا ہے اسے آپ روک دیجیے۔ فرمایا کہ وہ تمہارا دشمن ہے میرا تو دشمن نہیں ہے؟ میں اس کو اپنے پاس آنے سے کیوں روک دوں؟ انھوں نے کہا کہ پھر آپ سے میرا اعتقاد جاتا رہا، شاہ صاحب نے ان سے فرمایا کہ کیا کہہ رہے ہو؟ سوچ لو؟ انھوں نے یہ جملہ تین بار دہرایا اس کے بعد شاہ صاحب نے فرمایا کہ اچھا تو سنو! تمہارا اعتقاد چلا گیا تو میری توجہ بھی تمہاری طرف سے چلی گئی۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ دوبارہ ان کی بینائی جاتی رہی اور نابینا ہو کر رہ گئے۔ اللہ والوں سے مقابلہ کی صورت نہیں کرنی چاہیے یہ نہایت خطرناک چیز ہے۔ حدیث قدسی ہے کہ من عادیٰ لی ولیاً فقد آذنتہ بالحرب (یعنی جو شخص میرے کسی ولی سے دشمنی رکھے میں اس سے جنگ کا اعلان کرتا ہوں مجھ سے جنگ کے لیے تیار ہو جائے) اس سے معلوم ہوا کہ اللہ والوں سے مقابلہ درحقیقت اللہ تعالےٰ سے مقابلہ ہے ظاہر ہے کہ اس کی تاب کون لاسکتا ہے۔

فرمایا کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک صاحب آئے اور کہنے لگے کہ فلاں آدمی آپ کو ایسا ایسا کہہ رہا تھا اور وہ الفاظ بھی نقل کر دیے حضرت حاجی صاحب نے فرمایا کہ تم نے اس سے زیادہ برا کام کیا، اس نے تو پیٹھ پیچھے کہا تھا اور تم نے منہ پر کہہ دیا۔

فرمایا کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا جب ابتدائی زمانہ تھا اور ان کی شہرت نہیں ہوئی تھی اور عسرت کے ایام گزار رہے تھے اس زمانہ میں بغداد میں ایک حجام رہتا تھا جو صرف شہزادوں اور رئیسوں کی حجامت بناتا تھا۔ ایک دن وہ کسی رئیس کے بال بنا رہا تھا اسی اثناء میں حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ اس کے پاس آئے اور کہا کہ میرے پاس پیسے تو نہیں ہیں کیا اللہ کے لیے میرے بال آپ بنا سکتے ہیں؟ اللہ کا نام سن کر اس کے آنکھ سے آنسو نکل پڑے اور اس پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ اس نے رئیس صاحب سے کہا کہ اب میں اپنے اندر آپ کے بال بنانے کی قدرت نہیں پاتا پہلے ان کے بال بنا لوں تب آپ کے بال بناؤں گا اور اس بات سے وہ رئیس بھی متاثر ہوگیا اور حجام سے کہا کہ ہاں بھائی پہلے ان کے بال بنا لو تب میرے بال بناؤ۔ چنانچہ ان کی

حجامت ادھوری چھوڑ کر حضرت جنیدؒ کی حجامت بنائی۔ جس وقت وہ حجامت بنا رہا تھا حضرت جنیدؒ نے اپنے دل میں نیت کی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے کوئی رقم عنایت فرمائی تو پہلی رقم اس حجام کو پیش کروں گا۔ چنانچہ کچھ دنوں کے بعد جب ان کی شہرت ہوئی اور فتوحات کا دروازہ کھلا تو کسی نے پانچ سو درہم کی رقم حضرت کو ہدیہ میں پیش کی وہ اس رقم کو لیکر اس حجام کے پاس آئے اور پیش کرنا چاہا! اس نے پوچھا یہ کیا؟ فرمایا کہ آپ نے جب میری حجامت بنائی تھی تو میں نے یہ نیت کی تھی کہ جو پہلی رقم مجھے ملے گی وہ آپ کو پیش کروں گا۔ وہ بولا کہ اے جنید! آپ اتنے بڑے ولی ہو گئے مگر یہ راز نہیں سمجھے۔ کیا آپ نے حجامت بنانے کے لیے مجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ اللہ کے لیے میری حجامت بنا دو؟ آپ کے کہنے کے مطابق میں نے اللہ کے لیے حجامت بنائی تھی تو اب اس کا معاوضہ کیسے لوں؟ یہ کہکر اس نے رقم لینے سے انکار کر دیا۔ یہ واقعہ مجلس میں کچھ اس انداز سے بیان فرمایا کہ پوری مجلس میں دیر تک رقت کی کیفیت طاری رہی۔

فرمایا کہ نفس خدا تک پہونچنے میں حارج ہوتا ہے۔ اگر آدمی نفس کے مکائد سے واقف ہو جائے اور اس کے رذائل سے نکل جائے تو خدا تک پہنچنے میں دیر نہیں ہوتی۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے اللہ میں آپ تک کیسے پہونچوں؟ الہام ہوا کہ دع نفسك وتعال (اپنے نفس کو چھوڑ دو اور آجاؤ)۔ پھر مولانا نے خواجہ میر دردؔ کا یہ شعر پڑھا ؎

حجاب رخ یار تھے آپ ہی ہم   کھلی آنکھ تو کوئی پردا نہ دیکھا

واقعی آدمی کی نظر جب تک اپنی خوبیوں پر رہتی ہے وہ نفس سے نکل نہیں پاتا ؎

ابھی واقف نہیں تو نفس وشیطاں کے مکائد سے   مگر افسوس کرتا ہے تو دعوائے ہمہ دانی

پھر مولانا نے عشق ومحبت کی وہ گداز باتیں کیں جو محفوظ نہ کر سکا آخر میں اپنا یہ شعر پڑھا ؎

آتش عشق نے جلا ڈالا   زندگی ہم نے مر کے پائی ہے

مولانا جب کبھی اپنے شیخ حضرت مولانا سید بدر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر فرماتے ہیں تو بڑی محبت کے ساتھ اور عجیب کیفیت کے ساتھ ذکر فرماتے ہیں۔ اس سے پہلے[1] ذکر آچکا ہے کہ حضرت سید بدر علی شاہ صاحب اٹھارہ برس تک شام ومصر میں رہے تھے آپ کی تکمیل جامع ازہر سے ہوئی تھی

[1] حضرت مولانا مدظلہ کے ملفوظات کی پہلی قسط میں (الفرقان جولائی ۱۹۹۹ء)

اور عرب علماء سے کافی استفادہ فرمایا تھا۔ عربی زبان گویا ان کی مادری زبان ہوگئی تھی اور بخاری شریف ذرک زبان رہتی تھی پوری بخاری شریف ان کو حفظ تھی۔ حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن صاحب گنج مراد آبادی کے یہاں روزانہ بخاری شریف کا درس ہوتا تھا غالبًا اس لیے اس سے اور زیادہ قلبی تعلق تھا۔ متعدد اجلہ آپ سے بیعت تھے مگر با ایں ہمہ فضائل و مناقب اپنے کو ایسا مٹایا تھا کہ دیکھنے میں ایک معمولی آدمی معلوم ہوتے تھے۔ سادگی کا یہ عالم تھا کہ معمولی کپڑے میں رہتے تھے اور عام دیہاتی زبان بولتے تھے ایک بار کسی نے پوچھ لیا کہ آپ نے کتنے حج کیے ہیں؟ تو اس سوال پر خفا ہو گئے کہ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ پھر مجھ سے تنہائی میں چپکے سے فرمایا کہ اٹھارہ حج کر چکا ہوں۔ حضرت بہت ہی صاحب کشف تھے ایک دفعہ میں حضرت کی خدمت میں جا رہا تھا رائے بریلی سے کئی میل کی مسافت طے کر کے حضرت کی بستی میں پہونچنا ہوتا تھا وہاں تک اکثر و بیشتر پیدل ہی جاتا تھا چنانچہ اس مرتبہ بھی پیدل جا رہا تھا راستہ میں بہت بڑے بڑے دو سانپ لڑتے ہوئے ملے ان کو سامنے دیکھ کر بہت خوف معلوم ہوا اس راستہ کو چھوڑ کر دوسری طرف کھیت میں سے ہو کر کسی طرح گذر گیا جب حضرت کی خدمت میں پہونچا تو دیکھا کہ حضرت دروازے کے باہر کالی چادر اوڑھے ہوئے ایک چھڑی لیکر کھڑے ہوئے ہیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انتظار ہی میں ہیں چنانچہ جیسے ہی پہونچا اور سلام کیا تو مجھکو دیکھ کر اس انداز سے مسکرائے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ راستے کا واقعہ حضرت پر منکشف ہو گیا ہے اور فرمانے لگے کہ آپ تو ہاتھ میں کوئی چھڑی وغیرہ نہیں رکھتے راستے میں سانپ وغیرہ رہتے ہی ہیں۔ حضرت نے مجھے ایک چھڑی بھی عطا فرمائی تھی آج بھی وہ میرے پاس محفوظ ہے۔ اسے دیکھکر حضرت یاد آجاتے ہیں۔

فرمایا کہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ حضرت مولانا سید بدر علی شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ نے اپنے لیے ایک کچا کمرہ بنوایا تھا ابھی اس میں رہنا نہیں شروع کیا تھا جب میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمانے لگے کہ میں نے یہ کمرہ بنوایا ہے ابھی اس میں رہنا نہیں شروع کیا ہے آپ کا انتظار تھا آپ آگئے۔ پھر میرے لیے حضرتؒ نے خاص طور پر ایک مرغ ذبح کروایا اور بڑی شفقت و محبت سے اسی کمرے میں بٹھا کر مجھ کو اپنے ساتھ کھلایا اس کے بعد سے اس کمرے میں رہنا شروع فرمایا۔ کہاں تک بیان کروں اور کیا کیا بیان کروں اور کون سننے والا ہے آخر کس کے لیے بیان کروں۔ اب یہ سب چیزیں رفتہ رفتہ دنیا سے رخصت ہوتی جا رہی ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی بے نفسی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک دفعہ کسی شخص نے ان سے کوئی مسئلہ پوچھا انھوں نے بتادیا اور وہ آدمی چلا گیا اس کے جانے کے بعد ایک شاگرد نے عرض کیا کہ حضرت آپ نے جو مسئلہ اسے بتایا ہے وہ یوں ہے ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور بڑی پریشانی کے عالم میں باہر نکلے کہ اس شخص کو ڈھونڈ کر صحیح مسئلہ بتادیں۔ اتفاق سے وہ مل گیا اس سے کہا کہ بھائی میں نے جو مسئلہ بتایا تھا وہ غلط ہے تمہارے جانے کے بعد میرے ایک شاگرد نے مجھ کو صحیح مسئلہ بتایا اور وہ مسئلہ یوں ہے اب تم اس پر عمل کرنا سبحان اللہ کیسی بے نفسی اور للّٰہیت ان حضرات کے اندر تھی کہ بے تکلف شاگرد کے صحیح قول کی تصویب فرمائی اور اپنی غلطی کا اظہار فرمادیا۔

فرمایا کہ کسی بزرگ کا قول ہے کہ جس کو حسن سیاست سے حصہ نہیں ملا تو اس کی تبلیغ سے فائدے سے زیادہ نقصان ہوگا۔

فرمایا کہ اہل تعلق کے معاملہ میں بھی تفویض ہونی چاہیے تجویز نہیں یعنی یہ تمنا نہ ہونی چاہیے کہ لوگ میرے پاس آئیں اور مرید ہوں اگر اللہ تعالیٰ بھیجیں گے تو فائدہ ہوگا اور اگر آدمی بھیجیں گے تو فائدہ نہیں ہوگا۔ البتہ مشورہ دیا جاسکتا ہے مگر خواہ مخواہ کسی کو کسی شیخ کے پاس زبردستی نہیں بھیجنا چاہیے۔

اس ضمن میں فرمایا کہ جس طرح شیخ کا حق ہوتا ہے اسی طرح تعلق رکھنے والوں کا بھی حق ہوتا ہے۔ جس طرح وہ ہمارے پاس استفادہ کے لیے آتے ہیں، ہمیں بھی ان کے پاس عیادت اور دریافت خیریت کے لیے جانا چاہیئے۔ راقم الحروف نے اس چیز کی رعایت جتنی حضرت مولانا کے اندر دیکھی وہ دوسری جگہ کم نظر آتی ہے خاص طور پر بے حیثیت اہل تعلق کی رعایت تو عام طور پر بہت کم کی جاتی ہے مگر مولانا کی عادت یہ ہے کہ وہ راہ چلتے رک رک کر ایسے لوگوں کی خیریت دریافت فرماتے جاتے ہیں۔

فرمایا کہ آدمی جب تک اپنے کو مٹاتا نہیں اس کو کچھ نہیں حاصل ہوتا۔ فنا فی الشیخ ہی تو اس طریق میں اصل شئے ہے۔ اسی سے فنا فی الرسول اور فنا فی اللہ کا مقام حاصل ہوتا ہے اور فنا فی الشیخ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اپنی رائے اور تجویز کو شیخ کی رائے اور مرضی میں فنا کردے بزرگان سلف نے مشائخ کے سامنے اپنے کو کس کس طرح مٹایا ہے اور ان کے سامنے اپنے کو کیسا فنا کیا ہے ان کے حالات دیکھنے سے اس کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے اس موقع پر حضرت مولانا نے اپنا ایک

شعر پڑھا وہ یہ ہے ؎

جب تک فنائے رائے کی ہمت نہ پائیے
کیوں آپ اہل عشق کی محفل میں آئیے

فرمایا کہ حضرت مولانا سید بدر علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہتا تھا میں حضرت کے ساتھ یہ معاملہ تھا کہ رات دن ان کی خدمت میں رہتا تھا اور شب میں جب تک حضرت کو نیند نہیں آجاتی تھی خود کبھی نہیں سوتا تھا چاہے مجھ پر کچھ گزر جائے مگر حضرت کے سونے سے پہلے سونے جانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی اور یہ خیال ہوتا تھا کہ حضرت جاگ رہے ہیں میں کیسے سو جاؤں راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں اس واقعہ سے شیخ کے ساتھ جس قدر تعلق اور محبت معلوم ہو رہی ہے وہ اظہر من الشمس ہے یہی فنا فی الشیخ ہے کہ اپنی خواہش اور چاہت کو شیخ کی مرضی میں فنا کر دیا جائے اور اپنے آرام و راحت پر شیخ کے آرام و راحت کو مقدم کر رکھا جائے۔ آج کل تو ہمارے حالات عام طور پر اس قسم کے ہو رہے ہیں کہ اپنے آرام و راحت کو چھوڑنا اور دوسرے کی راحت کو اپنی راحت پر مقدم کرنا تو درکنار اگر ہمارے ہی فائدے کے لیے نفس کے خلاف کوئی بات کہہ دی جائے تو اس کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اگر بزرگان سلف کے معیار پر ہم کو پرکھا جائے تو ہم میں سے بہت کم لوگ پورے اتریں گے۔

فرمایا کہ محبت کا مقام بہت اونچا مقام ہے اور یہ بہت ہی دقیق اور باریک چیز ہے اس میں بہت سے لوگ فیل ہو جاتے ہیں اور جو لوگ اہل اللہ کی محبت کی قدر کرتے ہیں ان کو اسی سے بڑے بڑے مراتب حاصل ہو جاتے ہیں۔ یہ محبت بھی عجیب شئے ہے۔

اس موقع پر حضرت نے اپنا ایک شعر پڑھا۔

نہیں کھیل ناصح جنوں کی حقیقت
سمجھ لیجیے گا تو سمجھائیے گا

ان واقعات کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مولانا نے کئی بار کسر نفسی میں فرمایا کہ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں مگر بزرگوں کی جوتیوں کی برکت سے کچھ مل گیا ہے اور لوگوں کو حسن ظن قائم ہو گیا ہے اللہ تعالیٰ مجھ کو اپنے نیک بندوں کے حسن ظن کے مطابق بنا دے اور آخرت میں اپنا فضل و

کرم فرما دے اور وہاں کی رسوائی سے بچائے پھر فرمایا کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں ہوں تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی قاعدہ بغدادی پڑھنے والا بچہ کسی عالم کے سامنے کہے کہ میں کچھ نہیں ہوں تو وہ اپنے قول میں صادق ہے۔

فرمایا کہ جب کوئی آدمی یہ کہتا ہے کہ حضرت ذرا اپنا جھوٹا دے دیجیے اس وقت یہ سوچنا چاہیے کہ مجھ میں تو کچھ نہیں ہے اس شخص کو میرے ساتھ حسن ظن ہے اس لیے اے اللہ تو ایسا کر دے۔

فرمایا کہ جس کسی سے حضرات مشائخ خصوصی تعلق اور محبت رکھتے ہیں اس کے لیے یہ بڑے ہی سعادت اور خوش بختی کی چیز ہے آدمی کو اس کی قدر کرنا چاہیے مگر اس زمانے میں ان چیزوں کی قدر کرنے والے بہت کم لوگ رہ گئے ہیں۔ اب تو لوگوں میں نہ وہ طلب ہے نہ وہ محبت ہے نہ وہ اتباع ہے اس لیے اب وہ کمالات بھی بہت کم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اپنے اسلاف کی سیرت کو سامنے رکھیں اور اسی کے مطابق اپنے کو بناویں تاکہ جس طرح ان کو حیات طیبہ نصیب ہوئی ہم کو بھی نصیب ہو۔

سید جلال الدین عمری

اسلام کا نظریۂ مال

جن مذاہب نے ترک دنیا کو عبادت سمجھا انھوں نے مال و دولت کو بھی نفرت و حقارت سے دیکھا اس لیے کہ دولت، دنیا کی ضرورتیں پوری کرنے اور یہاں کی آسائش و راحت حاصل کرنے کا ایک بڑا ذریعہ ہے اور جب تک انسان اس ذریعہ ہی سے دست کش نہ ہو جائے دنیا اور اس کی آلائشوں سے اس کا دامن پاک نہیں ہو سکتا۔ اسلام ترک دنیا کا مخالف ہے اس لیے مال کمانا اور اس سے فائدہ اٹھانا اس کے نزدیک غلط نہیں ہے بلکہ اس دنیا میں رہنے اور یہاں کی زندگی بسر کرنے کے لیے اسے وہ ضروری تصور کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے مال کو اللہ کے فضل سے تعبیر کیا ہے اور اس کے لیے دوڑ دھوپ کی ترغیب دی ہے۔ ایک جگہ فرمایا۔

وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ آيَتَيْنِ فَمَحَوْنَا آيَةَ اللَّيْلِ وَجَعَلْنَا آيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِتَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنَاهُ تَفْصِيلًا

(بنی اسرائیل: ۱۲)

ہم نے رات اور دن کو (اپنی قدرت کی) دو نشانیاں بنایا۔ پھر ہم نے رات کی نشانی کو تاریک کیا اور دن کی نشانی کو اس طرح بنایا کہ ہر چیز اجالے میں نظر آتی ہے تاکہ تم اپنے رب کا 'فضل' تلاش کرو اور برسوں کی گنتی کرو اور اپنے معاملات کا حساب رکھو اور ہم نے ہر چیز کو کھول کھول کر بیان کر دیا ہے۔

یہی بات ایک دوسرے موقع پر اس طرح کہی گئی ہے۔

وَمِنْ رَحْمَتِهِ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ

یہ بھی اس کی رحمت ہے کہ اس نے تمھارے لیے رات اور دن بنائے تاکہ تم رات میں سکون

وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (القصص: ۷۳)

چلو پھرو اور دن میں اس کا فضل تلاش کرو اور شاید کہ تم اس کا شکر ادا کرو

ایک جگہ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے سمندر کو تمہارے تابع کر دیا ہے۔ چنانچہ تم اس سے معاشی فائدہ اٹھاتے ہو۔ اس کے اس احسان پر تمہارا سر اس کے سامنے جھک جانا چاہیے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (الجاثیۃ: ۱۲)

وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کر دیا تاکہ اس میں جہاز اس کے حکم سے چلیں اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور شاید کہ تم اس کا شکر ادا کرو۔

حج ایک ایسی عبادت ہے جس میں کافی وقت لگتا ہے۔ اس دوران میں اگر کوئی شخص کوئی معاشی فائدہ اٹھانا چاہے تو قرآن کے نزدیک یہ غلط نہیں ہے۔ البتہ وہ معاشی جدوجہد کو عبادت کے منافی نہیں سمجھتا۔ چنانچہ فرمایا

لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ (البقرۃ: ۱۹۸)

اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ دوران حج تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو۔

اسلام کے ابتدائی دور میں تہجد کی نماز فرض تھی لیکن بعد میں یہ فرض نہیں رہی۔ اس کی ایک وجہ یہ بیان کی گئی کہ جو لوگ خدا کے فضل کی تلاش اور معاشی تگ و دو میں لگے ہوئے ہیں وہ اس سخت عبادت کو برداشت نہیں کر سکتے۔ دن بھر کی محنت کے بعد عبادت میں رات بسر کرنا ان کے لیے زحمت کا باعث ہوگا۔

وَاٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (المزمل: ۲۰)

اور کچھ دوسرے لوگ ہوں گے جو اللہ کے فضل کی تلاش میں زمین میں پھر رہے ہوں گے۔

ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ مدینہ کے باہر سے فروخت کے لیے غلہ آگیا۔ اس وقت غلہ کی کمی تھی اس لیے بعض لوگ خطبہ چھوڑ کر غلہ خریدنے کے لیے چلے گئے۔ قرآن مجید نے اس نازیبا حرکت پر سخت تنقید کی لیکن اس کے ساتھ یہ بیان فرمایا۔

فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا

جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں چلو

فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ (الجمعۃ) جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔

قرآن مجید کے نزدیک مال میں بذات خود کوئی شر نہیں ہے بلکہ وہ خیر کا بہت بڑا ذریعہ ہے اور اس سے بے شمار امور خیر انجام پاتے ہیں چنانچہ اس نے متعدد مقامات پر مال کے لیے خیر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ذیل میں دو تین آیتیں نقل کی جا رہی ہیں :۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلِاَنْفُسِکُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْہِ اللّٰہِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ یُّوَفَّ اِلَیْکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ .... وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ (البقرہ ۲۷۲، ۲۷۳)

جو کچھ تم مال خرچ کرو گے اس کا فائدہ تمھیں کو ہوگا اور تم تو اللہ ہی کی رضا جوئی کے لیے خرچ کرتے ہو تم جو بھی مال خرچ کرو گے اس کا تم کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔۔۔تم جو بھی مال خرچ کرو گے اللہ اس کو جانتا ہے۔

کُتِبَ عَلَیْکُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَکَ خَیْرَا اَلْوَصِیَّۃُ لِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَی الْمُتَّقِیْنَ (البقرہ۔ ۱۸۰)

تم میں سے کسی کی موت آجائے اور اس کے پاس مال موجود ہو تو اس پر فرض ہے کہ والدین اور قرابت داروں کے لیے دستور کے مطابق وصیت کرے۔ یہ لازم ہے متقیوں کے لیے۔

وَاِنَّہٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ (العادیات ۸)

بے شک، انسان مال کی محبت میں بہت سخت ہے۔

جو شخص خدا کو مانے، اس کی عبادت و اطاعت کی راہ اختیار کرے اور تقوے و پرہیزگاری کی زندگی گزارے اس کے بارے میں بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ وسائل حیات سے محروم ہوگا اور غربت و افلاس اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ قرآن مجید نے اس تصور کو غلط قرار دیا ہے اور اس کی تردید کی ہے اس میں شک نہیں کہ خدا کے نیک بندے بعض اوقات مالی مشکلات اور معاشی الجھنوں کے ذریعہ بھی آزمائے جاتے ہیں لیکن خدا سے تعلق انسان کو لازماً فقر و فاقہ اور دنیوی احتیاج کی طرف نہیں لے جاتا بلکہ خدائے تعالیٰ روزی رساں ہے۔ جس شخص کے دل میں خدا کا خوف ہو اور جو ہر معاملہ میں تقوے کی روش

اختیار کرے اس سے اس کا وعدہ ہے کہ وہ اس کے لیے رزق کے دروازے کھول دے گا اور جہاں سے روزی کا بظاہر امکان نہیں ہے وہاں سے بھی اسے روزی پہنچائے گا۔

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (الطلاق ۳-۲)	جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لیے راہ نکالتا ہے اور جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہو وہاں سے اسے روزی پہنچاتا ہے جو شخص اللہ پر بھروسہ کرے وہ اس کے لیے کافی ہے۔ بے شک اللہ اپنے حکم کو انجام تک پہنچاتا ہے۔ اس نے ہر چیز کے پورے ہونے کا ایک اندازہ کر رکھا ہے۔

افراد کی جگہ جب کوئی قوم اطاعت اور بندگی کی روش اختیار کرتی ہے تو دولت و ثروت اس کے قدم چومتی ہے اور خوش حالی اس کا استقبال کرتی ہے۔ یہ سوچنا بھی خدا کی شان اور عظمت کے منافی ہے کہ اس کی اطاعت سے ملنے والی آسائش و راحت بھی چھن جائے گی اور نئی نئی مصیبتیں اور بلائیں نازل ہونے لگیں گی۔ حضرت نوحؑ اپنی قوم کو خدا کی عبادت کی طرف بلاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

وَيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا (نوح)	مال و دولت اور اولاد کے ذریعے تمھاری مدد کرے گا تمھیں باغات دے گا اور تمھارے لیے نہریں جاری کرے گا۔ تمھیں کیا ہو گیا تم اللہ سے عزت اور وقار کی توقع نہیں رکھتے۔

خانہ کعبہ کو سارے حجاز میں تقدس اور عظمت کا مقام حاصل تھا اور اس کی وجہ سے مکہ ایک تجارتی مرکز بن گیا تھا۔ فتح مکہ کے بعد مشرکین کو خانہ کعبہ کی زیارت سے روک دیا گیا تو خیال ہوا کہ ان کی وجہ سے جو معاشی فائدہ ہوتا تھا وہ ختم ہو جائے گا۔ قرآن نے اطمینان دلایا کہ خدائے تعالیٰ تمھیں غربت میں مبتلا نہیں کرے گا اور اپنے فضل و کرم سے تمھیں دولت و ثروت سے نوازے گا۔

وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ	اگر تمھیں غربت کا ڈر ہے تو اللہ اگر

يُغْنِيكُمُ اللّٰهُ مِن فَضْلِهِ إِن شَاءَ ۚ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝ (التوبہ ۲۸)

چاہے تو بہت جلد اپنے فضل سے تم کو غنی کر دے گا۔ اللہ علم و حکمت والا ہے۔

منافقین کہا کرتے تھے کہ مدینہ میں مسلمانوں کے قدم ہمارے سرمایہ اور دولت کی بنا پر جمے ہوئے ہیں، اگر ہماری دولت نہ ہو تو انھیں دو وقت کی روٹی نہ ملے اور یہ آن کی آن میں تتر بتر ہو جائیں۔ قرآن نے اس کا جواب دیا کہ تم نے مسلمانوں کی طاقت کا غلط اندازہ لگایا۔ جس خدا پر مسلمانوں کو بھروسہ ہے اس کے پاس زمین و آسمان کے خزانے ہیں تمہارے ہاتھ روک لینے کی وجہ سے وہ بھوکے نہیں مر جائیں گے بلکہ خدائے تعالیٰ اپنے بے پایاں خزانوں سے ان کی ضرورتیں پوری کرے گا۔

هُمُ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تُنفِقُوا عَلَىٰ مَنْ عِندَ رَسُولِ اللّٰهِ حَتَّىٰ يَنفَضُّوا ۗ وَلِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَفْقَهُونَ ۝ (المنافقون: ۷)

یہی منافق ہیں جو کہتے ہیں کہ جو لوگ رسول اللہ کے پاس ہیں ان پر خرچ نہ کرو۔ یہاں تک کہ یہ منتشر ہو جائیں۔ حالانکہ آسمانوں اور زمین کے سارے خزانے اللہ ہی کے ہیں لیکن منافق اس بات کو نہیں جانتے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے نزدیک مال نجس اور ناپاک چیز نہیں ہے۔ جس سے پرہیز واجب ہو بلکہ وہ خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت اور اس کا فضل و احسان ہے۔ دولت و ثروت خدا کے نافرمانوں اور گنہگار انسانوں ہی کو نہیں ملتی بلکہ یہ خدا سے قرب اور اس کے تقوے کے نتیجہ میں بھی حاصل ہوتی ہے خدا کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے ماننے والوں اور اطاعت کرنے والوں کو دنیا کی دولت اور خوش حالی بھی عطا کرے گا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس کا یہ وعدہ پورا ہوا ہے اور یقین ہے کہ آئندہ بھی پورا ہوگا۔

اس کے ساتھ اسلام نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے زندگی کی ایک راہ بتائی ہے۔ کچھ اصول و نظریات اور اعلیٰ قدریں دی ہیں۔ دنیا کے مال و منال کے مقابلہ میں ان چیزوں کی زیادہ اہمیت ہے۔ خدا پر ایمان لاکر انسان ان چیزوں کی اہمیت کا اعتراف کرتا ہے۔ وہ اس بات کا عہد کرتا ہے کہ خدائے تعالیٰ نے زندگی کی جو راہ بتائی ہے، جو اصول و نظریات اور اعلیٰ اقدارِ حیات دیے ہیں

ان کا کبھی سودا نہیں کرے گا۔ قرآن نے بار بار اس کا مطالبہ کیا ہے کہ ایمان لانے کے بعد انسان خدا سے کیے ہوئے عہد پر مسلسل قائم رہے اور کبھی اسے ٹوٹنے نہ دے۔

وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ ○ (البقرہ ۴۱)

اور میری آیتوں کو تھوڑی سی قیمت پر نہ بیچ ڈالو اور مجھ ہی سے ڈرو۔

قرآن مجید نے اپنے ماننے والوں سے کہا کہ حق کے مخالفین کو جو مال و دولت اور دنیا کا ساز و سامان حاصل ہے اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھو اس لیے کہ وہ باطل پر قائم ہیں اور زندگی کی اعلیٰ قدروں سے محروم ہیں۔ تمہارے پاس حق ہے۔ تم زندگی کی ایک محکم اساس رکھتے ہو اور تمہیں خدا کی طرف سے وہ نعمت ملی ہے جس سے بڑی نعمت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اس نعمت کی ناقدری اور توہین ہوگی کہ تم اس دنیا کے مال و اسباب کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھو۔

وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ (الحجر: ۸۷، ۸۸)

ہم نے تم کو بار بار دہرائی جانے والی سات آیتیں اور قرآن عظیم عطا کیا ہے۔ (لہذا) ہم نے ان میں مختلف قسم کے لوگوں کو جو ساز و سامان دے رکھا ہے اس کو نگاہ اٹھا کر نہ دیکھو اور نہ ان کے حال ہی پر غم کھاؤ۔

سب سے بڑی بات یہ کہ یہ دنیا اور اس کا سارا ساز و سامان آخرت کے مقابلہ میں بالکل بے حقیقت ہے۔ یہاں کی ہر چیز فنا ہونے والی ہے اور آخرت کی کلفتیں اور راحتیں ابدی اور ہمیشہ رہنے والی ہیں۔ اس لیے ایک مومن متاع دنیا کی خاطر اپنے دین و ایمان کو فروخت نہیں کر سکتا۔ وہ دنیا کا نقصان آسانی سے برداشت کر سکتا ہے لیکن آخرت کا نقصان اس کے لیے ناقابل برداشت ہوگا۔ اسی وجہ سے قرآن نے جگہ جگہ دنیائے فانی کے مقابلہ میں باقی رہنے والی آخرت کو اختیار کرنے کی ہدایت کی ہے۔ ایک جگہ فرمایا۔

وَلَا تَشْتَرُوا بِعَهْدِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۚ إِنَّمَا عِنْدَ اللَّهِ هُوَ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ

اللہ سے کیے ہوئے عہد کو تھوڑی سی قیمت لے کر نہ بیچ ڈالو جو اللہ کے پاس ہے وہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ اگر تم جانو۔ جو تمہارے

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

(النحل: ۹۶)

جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا۔ لیکن جو اللہ کے پاس ہے وہ سدا رہنے والا ہے۔ اور جن لوگوں نے (اس دنیا میں) صبر کیا۔ ہم ان کو ان کے اچھے کاموں کا ضرور بدلہ دیں گے۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ○

(القصص ۶۰، ۶۱)

جو کچھ بھی یہاں تم لوگوں کو دیا ہے وہ حیات دنیا اور اس کی زینت کا ساز و سامان ہے لیکن جو اللہ کے پاس ہے وہ اس سے بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔ سوچو! جس شخص سے کہ ہم نے اچھا وعدہ کیا ہے اور وہ اس وعدہ کے مطابق انعام پانے والا ہے کیا اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جسے ہم نے دنیا کی زندگی کا سامان تو دیا لیکن پھر وہ قیامت کے دن خدا کے حضور اپنے اعمال کی سزا پانے کے لیے حاضر ہونے والا ہے۔

مال امانت ہے

اسلام کے نزدیک اس کائنات اور اس کی ہر چیز کا مالک اللہ ہے یہاں انسان کو جو کچھ بھی ملا ہے وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ (آل عمران ۱)

ان سے کہہ دو۔ اے اللہ سلطنت کے مالک تو جسے چاہتا ہے سلطنت عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے سلطنت چھین لیتا ہے جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے۔ تیرے ہی ہاتھ میں ساری بھلائی ہے اور بلاشبہ تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اس نے صراحت کے ساتھ کہا کہ اللہ تعالیٰ ہی انسان کو مال و دولت عطا کرتا ہے۔

وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اٰتٰىكُمْ (النور: ۳۳) — اللہ تعالیٰ نے جو مال تمہیں دیا ہے اس میں سے ان (مستحقین کو) دو

اس نے قدم قدم پر انفاق کا مطالبہ کیا ہے۔ اس مطالبہ کی بنیاد یہ ہے کہ انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ خدا نے اسے دیا ہے اس لیے وہ اس کی راہ میں خرچ کرنے سے انکار نہیں کر سکتا۔ ایک جگہ حکم دیا۔

اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ — جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو۔

ایمان والوں کا وصف یہ بیان کیا گیا۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ — جو ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔

اسی وجہ سے اس کے کہا مال انسان کے پاس خدا کی امانت ہے۔ امانت کا تصور یہ تقاضا کرتا ہے کہ انسان اس کو نہ تو اپنی ذاتی ملک سمجھ بیٹھے اور نہ اس میں من مانے طریقہ سے تصرف کرنا شروع کر دے بلکہ خدا کو مالک حقیقی مانے اور اس کے حکم کے مطابق اس میں تصرف کرے۔ اس تصور کو قرآن مجید نے ایک جگہ اس طرح واضح کیا ہے۔

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْهِ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِیْرٌ (الحدید: ۷) — اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور مال و دولت جس میں کہ اللہ نے تم کو اپنا نائب بنایا ہے۔ اس میں سے خرچ کرو۔ پس تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے خرچ کیا۔ ان کے واسطے بڑا اجر ہے۔

امانت میں انسان کے اخلاق اور دین و ایمان کا امتحان ہے۔ امانت کو امانت سمجھنا قابل تعریف ہے اور خیانت کی روش اختیار کرنا مذمت کا مستحق بناتا ہے۔ اس پہلو سے مال انسان کے لیے سخت وجہِ آزمائش ہے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید میں مال کو "فتنہ" بھی کہا گیا ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِیْمٌ — جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد فتنہ ہیں اور اللہ ہی کے پاس اجر عظیم ہے۔

جو چیز انسان کو آزمائش اور امتحان میں ڈال دے وہ "فتنہ" ہے۔ مال کو قرآن نے "خیر" کہا ہے کیونکہ وہ اس دنیا میں خیر کا سبب ہے اور اسے فی الواقع خیر کے کاموں میں صرف ہونا بھی چاہیے لیکن

اس کو "شر" کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مال سے دنیا میں حق و صداقت کو بھی فروغ ملا ہے اور باطل بھی پھیلا ہے، اصلاح و تعمیر بھی ہوئی ہے اور تخریب و فساد بھی برپا ہوا ہے۔ افراد اور قوموں کی ترقی بھی ہوئی ہے اور وہ بربادی سے بھی ہمکنار ہوئی ہیں۔ انسان کا امتحان اس میں ہے کہ وہ "خیر" کے اس ذریعہ کو "شر" کی تقویت کا سبب نہ بننے دے اور اسے "خیر" ہی کی راہ میں استعمال کرے۔

مال ایک دوسرے پہلو سے بھی وجہ آزمائش ہے۔ وہ یہ کہ مال کی محبت انسان کو حق کے قبول کرنے، اس کا ساتھ دینے، اس کے لیے تکلیف برداشت کرنے اور قربانی دینے سے روک دیتی ہے۔ حالانکہ انسان کی کامیابی اس میں ہے کہ مال و دولت اور حق و صداقت کے درمیان انتخاب کا سوال پیدا ہو تو وہ حق کی خاطر ہر طرح کا مادی نقصان جھیل جائے اور کسی قیمت پر حق سے محرومی گوارا نہ کرے۔

مال کا شکر واجب ہے

مال و دولت خدا کی دین اور اس کا عطیہ ہے۔ اس پر انسان کو اسی کا شکر گزار ہونا چاہیے لیکن انسان کی کم ظرفی یہ ہے کہ اسے وہ اپنے علم اور قوت و صلاحیت کا نتیجہ سمجھتا ہے اور خدا کو بھول جاتا ہے۔ حالانکہ اس کو فکر و عمل کی جو صلاحیتیں ملی ہیں اور تگ و دو کے جو مواقع حاصل ہوئے ہیں وہ سب خدا کی بخشش ہوئی ہیں۔ اس کی مدد اور فضل شامل حال نہ ہو تو کوئی بھی چیز وہ اپنے زور بازو سے نہیں حاصل کر سکتا۔ قرآن نے اس کی ناسپاسی کا ذکر اس طرح کیا ہے:-

فَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ إِذَا خَوَّلْنَاهُ نِعْمَةً مِنَّا قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (الزمر: ۴۹)	جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے۔ پھر جب ہم اس کو اپنی طرف سے نعمت عطا کرتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو مجھے علم اور قابلیت کی وجہ سے ملی ہے۔ واقعہ یہ ہے اس میں اس کی آزمائش اور امتحان ہے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

قارون نے بھی اپنے خزانوں کے بارے میں یہی کہا تھا۔

إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِنْدِي (القصص: ۷۸)	یہ تو مجھے اس علم کی وجہ سے ملے ہیں جو مجھے حاصل ہے۔

قرآن مجید نے اس ذہنیت پر سخت تنقید کی اور کہا کہ جن لوگوں کو اللہ نے مال و دولت سے نوازا ہے وہ ناسپاسی کا رویہ ترک کریں اور اس کے شکر گزار بنیں۔ خدا کی نعمتوں کا اعتراف ایک حقیقت کا اعتراف ہے اور حقیقت کو جھٹلا کر انسان کسی دوسرے کا نہیں اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔ بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ نے بہت سے احسانات کیے۔ قرآن مجید نے ان احسانات کے ساتھ اس احسان کا بھی خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ اللہ نے ان کے مال اور اولاد میں برکت عطا کی اور اس میں اضافہ فرمایا۔

وَأَمْدَدْنَاكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا

ہم نے مال اور اولاد میں تمہاری مدد کی اور تمہاری تعداد کو بڑھایا

اسی طرح مشرکین مکہ سے قرآن مجید نے کہا کہ خانہ کعبہ کی وجہ سے عرب کے ریگستان میں انھیں جو تجارتی اور معاشی فوائد حاصل ہیں اس پر انھیں خدا کے سامنے جبین عبادت جھکا دینی چاہیے اور سجدۂ شکر بجالانا چاہیے۔

أَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَهُمْ حَرَمًا آمِنًا يُجْبَىٰ إِلَيْهِ ثَمَرَاتُ كُلِّ شَيْءٍ رِزْقًا مِنْ لَدُنَّا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝
(القصص: ۵۷)

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ امن والے حرم کو ہم نے ان کے قیام کی جگہ بنایا جہاں ہر طرف سے پھل کھنچے چلے آتے ہیں۔ ہماری طرف سے رزق کے طور پر۔ لیکن ان میں سے بیشتر نہیں جانتے۔

ایک اور موقع پر فرمایا۔

لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ إِيلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَٰذَا الْبَيْتِ الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ وَآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ ۝
(قریش)

قریش کے عادی ہو جانے یعنی ان کے جاڑے اور گرمی میں (تجارتی) سفر کے عادی ہو جانے کی وجہ سے ان کو اس گھر (خانۂ کعبہ) کے رب کی عبادت کرنی چاہیے جس نے ان کو بھوک سے بچایا اور کھانے کو دیا اور (دشمنوں کے) خوف سے محفوظ رکھا۔

جن قوموں کو دنیا کی فراغت ملی اور انھوں نے بار بار کی یاد دہانی اور تنبیہ کے باوجود ناسپاسی کا رویہ ترک نہیں کیا اور خدا کی نافرمانی اور بغاوت پر اصرار کرتی رہیں۔ ان کی آسائش و راحت ان سے چھین لی گئی اور وہ تباہ کر دی گئیں۔ ایسی ہی قوموں کے بارے میں قرآن نے کہا ہے۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِنْ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ ۝ (القصص: ۵۸)

کتنی ہی ایسی بستیاں ہم تباہ کر چکے ہیں جن کے لوگ اپنی خوش حالی پر اترانے لگے تھے۔ یہ ان کے مقامات ہیں جو ان کے بعد کم ہی آباد ہوئے اور ہم ہی وارث ہو کر رہے۔

حضرت مسیح سے تقریباً ۹ سو سال پہلے یمن میں اللہ تعالیٰ نے قوم سبا کو بڑی مادی ترقی اور خوش حالی عطا کی تھی۔ انھوں نے بڑے بڑے بند باندھ کر عرب کے ریگستان کو سرسبز و شاداب بنا ڈالا تھا۔ ان کی آبادی کے دونوں طرف دور دور تک اور مسلسل ہرے بھرے باغات پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ شام تک ان کی تجارت کا سلسلہ جاری تھا۔ راستہ کی آبادیوں سے ان کے تعلقات اچھے تھے۔ اس لیے سفر بے خوف و خطر ہوتا تھا اور وہ پورے اطمینان سے تجارتی فوائد حاصل کرتے تھے لیکن اس فراغت اور خوش حالی نے انھیں خدا سے غافل کر دیا اور وہ یہ بھول گئے کہ ان نعمتوں پر انھیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اس کا فرماں بردار بنکر رہنا چاہیے۔ نصیحت کرنے والوں نے ان کو نصیحت کی۔

كُلُوا مِنْ رِزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُورٌ ۝

اپنے رب کی دی ہوئی روزی کھاؤ اور اس کا شکر ادا کرو۔ پاکیزہ شہر ہے اور مغفرت کرنے والا رب۔

لیکن انھوں نے اس نصیحت اور خیر خواہی کو ماننے سے انکار کر دیا اور اپنے عیش و عشرت میں لگے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زراعت کی ترقی کے لیے انھوں نے جو بند باندھے تھے وہ سیلاب سے ٹوٹ گئے اور معاشی لحاظ سے تباہ ہو گئے۔ ان کی یہ تباہی محض اتفاق سے نہیں تھی بلکہ خدا کی نافرمانی اور اس کی نعمتوں کی ناسپاسی کا نتیجہ تھی۔ اسی وجہ سے قرآن کہتا ہے:-

ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ۚ وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ

یہ ہم نے ان کو ان کی ناشکری کا بدلہ دیا اور ہم اس طرح کا بدلہ اسی کو دیتے ہیں جو ناشکرگزار ہو۔

اس کے بعد فرمایا:۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (سبا: ۱۹)

بے شک اس میں اس شخص کے لیے عبرت کی نشانیاں ہیں جو صبر کرنے والا اور شکر کرنے والا ہے۔

یہ واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ صبر و شکر کا راستہ ہی کامیابی کا راستہ ہے۔ جب انسان تکلیف پر جزع فزع اور آسائش و راحت پر ناشکری کا رویہ اختیار کرنے لگتا ہے تو یہیں سے اس کی ناکامی کا آغاز ہو جاتا ہے۔

سورہ کہف میں دو آدمیوں کی مثال دی گئی ہے۔ ایک کے پاس انگور کے بہترین دو باغ تھے۔ ان باغوں کے چاروں طرف کھجور کے درخت تھے۔ کھیتی باڑی تھی۔ آب پاشی کے لیے نہر تھی۔ جس کی وجہ سے پیداوار بہت اچھی ہو رہی تھی اور اس کی خوش حالی میں اضافہ ہو رہا تھا لیکن دولت و ثروت نے اس کے اندر جذبات شکر کی جگہ غرور اور گھمنڈ پیدا کر دیا۔ اس نے اپنے ساتھی سے حقارت آمیز لہجہ میں کہا۔

اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا

میں تجھ سے زیادہ مال رکھتا ہوں اور تجھ سے طاقتور افراد میرے ساتھ ہیں۔

مال و دولت کو پانے کے بعد جس طرح ایک دنیا دار آدمی یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ اس کی آسائش و راحت ابدی ہے اسی طرح اس نے بھی سوچا کہ اسے عیش جاودانی مل گیا ہے اور اس کی خوشحالی کبھی ختم نہ ہوگی۔ جب اس سے کہا گیا کہ یہ دنیا ہی سب کچھ نہیں ہے یہ تو دار فانی ہے۔ اس کے بعد آخرت بھی ہے۔ جہاں تمہیں اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا تو اس نے کہا آخرت کا تصور میرے لیے ناقابل قبول ہے۔ میں اسے نہیں مانتا مگر آخرت آ بھی جائے تو میرا انجام اچھا ہی ہوگا۔ جو آج خوش قسمت ہے وہ کل بدنصیب نہیں ہو سکتا۔ اس کے ساتھی نے اسے سمجھایا کہ تم خدا کا انکار کس طرح نہیں کر سکتے۔

اس لیے کہ تمھارا اپنا وجود ہی اس کی شہادت دے رہا ہے۔ اس نے تم کو عدم سے نکالا اور انسان بنایا۔ تمھیں جو دولت ملی ہے یہ بھی اسی کی طرف سے ملی ہے اس پر تمھیں اس کا شکر گزار ہونا چاہیے لیکن اس نے یہ راستہ اختیار نہیں کیا بالآخر اس کا انجام وہی ہوا جو ناسپاس افراد اور اقوام کا ہوتا ہے۔ قرآن نے اس کی بربادی کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔

وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ۔ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ۔ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا

(الکہف: ۴۲، ۴۴)

اس کی ساری فصل برباد ہوگئی اور اپنے باغ کو الٹا پڑا دیکھ کر اس نے اس پر جو کچھ خرچ کیا اس پر وہ کف افسوس ملنے لگا اور کہنے لگا کاش کہ میں نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرایا ہوتا۔ اس کا کوئی گروہ ایسا نہ تھا جو اس کی مدد کرتا اور نہ خود اس میں بدلہ لینے کی طاقت تھی۔ اس وقت معلوم ہوگیا کہ سارا اقتدار اللہ کے ہاتھ میں ہے اسی کے پاس بہتر بدلہ ہے اور وہی اچھے انجام تک پہنچاتا ہے۔

احادیث میں بھی واقعات کی مدد سے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مال و دولت کا شکر واجب ہے۔ شکر سے نعمت میں اضافہ ہوتا ہے اور ناشکری زوال نعمت کا سبب بنتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنی اسرائیل میں تین معذور انسان تھے ایک برص والا۔ دوسرا گنجا اور تیسرا اندھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو مصیبت کے بعد راحت سے آزمانا چاہا تو ان کے پاس ایک فرشتہ بھیجا۔ فرشتہ سب سے پہلے برص والے کے پاس پہنچا اور دریافت کیا کہ تمھیں سب سے زیادہ کون سی چیز پسند ہے ؟ اس نے جواب دیا۔ یہ بیماری جس کی وجہ سے لوگ مجھ سے کراہت اور گھن محسوس کرتے ہیں ختم ہو جائے۔ جسم کے دھبے دور ہو جائیں اور اچھی رنگت مل جائے۔ فرشتہ نے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا تو اس کا مرض ختم ہوگیا اور اسے خوبصورتی مل گئی۔ اس کے بعد فرشتہ نے اس سے پوچھا تمھیں کس قسم کی دولت سب سے زیادہ عزیز ہے ؟ اس نے اونٹ یا گائے کا نام لیا اور اسے گابھن اونٹ یا گابھن گائے مل گئی فرشتہ نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ تمھارے مال میں برکت عطا کرے

اور چلا گیا۔ پھر وہ گنجے کے پاس گیا اور اس کی پسندیدہ چیز دریافت کی۔ اس نے کہا میری سب سے بڑی تمنا یہ ہے کہ یہ گنجا پن دور ہو جائے اور اچھے بال مل جائیں۔ فرشتہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کا گنجا پن جاتا رہا اور خوبصورت بال نکل آئے۔ فرشتہ نے اس سے بھی پوچھا کہ کس قسم کی دولت چاہتا ہے؟ تو اس نے گائے یا اونٹ کا انتخاب کیا اور وہ اسے مل گئی۔ فرشتہ نے برکت کی دعا دی اور چلا گیا۔ اس کے بعد وہ اندھے کے پاس آیا اور اس کی سب سے بڑی خواہش دریافت کی۔ اس نے جواب دیا کہ میری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دوبارہ بینائی عطا کر دے اور میں پھر سے یہ دنیا دیکھ سکوں۔ فرشتہ نے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو اس کو بینائی مل گئی اور وہ دیکھنے لگا۔ فرشتہ نے اس سے بھی پوچھا کہ تمہیں کس قسم کی دولت چاہیے۔ اس نے بکری کا انتخاب کیا۔ چنانچہ اسے ایک گابھن بکری مل گئی۔ فرشتہ نے اس کے لیے بھی خیر و برکت کی دعا دی اور چلا گیا۔

زمانہ گزرا اور ان جانوروں کی نسل خوب پھیلی۔ یہ تینوں آدمی اونٹوں گایوں اور بکریوں کے ریوڑ کے مالک ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس دولت کا امتحان لینا چاہا۔ چنانچہ وہی فرشتہ دوبارہ ایک مسافر کی شکل میں برص والے کے پاس پہنچا اور کہا میں ایک مسکین اور ضرورت مند آدمی ہوں راستہ کی مشکلات میں گھر گیا ہوں۔ تمام وسائل و ذرائع ختم ہو گئے ہیں اب اللہ کی مدد اور تمہارے تعاون ہی سے منزل تک پہنچ سکتا ہوں۔ اس خدا کا واسطہ دے کر تم سے ایک اونٹ مانگ رہا ہوں جس نے تمہیں صحت و تندرستی بخشی اور یہ دولت عطا کی۔ اس نے جواب دیا بہت سے حقوق اور ذمہ داریاں ہیں جنہیں مجھے ادا کرنا ہے۔ اس لیے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ فرشتہ نے اس سے کہا مجھے خیال آتا ہے کہ میں نے تمہیں پہلے بھی دیکھا ہے۔ کیا تم برص میں مبتلا نہیں تھے۔ اللہ نے تمہیں اس سے شفا عطا کی اور تم فقیر نہیں تھے اللہ نے تمہیں یہ دولت دی؟ تمہیں اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اس نے جواب دیا تم غلط کہتے ہو۔ یہ دولت مجھے اپنے باپ دادا سے ملی ہے۔ فرشتہ نے بددعا کی کہ اگر تم جھوٹ بول رہے ہو تو خدا تمہیں اسی حالت میں لوٹا دے جس میں تم پہلے پڑے ہوئے تھے۔ پھر وہ گنجے کے پاس گیا اور اس سے بھی یہی درخواست کی۔ اس کا جواب بھی برص والے کے جواب سے مختلف نہیں تھا۔ فرشتے نے اسے بھی بددعا دی اور چلا گیا۔ آخر میں وہ اندھے کے پاس پہنچا۔ جب اسے اس کی سابقہ حالت یاد دلائی تو اس نے اعتراف کیا کہ ہاں میں اندھا تھا اللہ نے مجھے بینائی عطا کی اور مال و دولت سے نوازا۔ بکریوں کا یہ

ریوڑ موجود ہے تمہیں جتنی بکریوں کی ضرورت ہو اس میں سے لے لو۔ میری طرف سے پوری اجازت ہے۔
فرشتے نے کہا "مجھے تمہارے مال کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دراصل اس طرح تم لوگوں کو آزمایا تھا۔ تم تو اس آزمائش میں پورے اُترے اور تمہارے دونوں ساتھی ناکام ہوئے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے رویہ سے خوش ہے اور ان سے ناخوش ؟"

(مشکوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ، باب الانفاق وکراہیۃ الامساک، بحوالہ بخاری ومسلم)

ایک اور حدیث ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک شخص میدان میں گزر رہا تھا۔ اس نے غیب سے آواز سنی کہ اوپر بادل کو ہدایت کی جارہی ہے کہ فلاں شخص کے باغ کو سیراب کردو۔ چنانچہ بادل ایک خاص سمت میں بڑھنے لگا اور کچھ دور ایک سنگلاخ زمین پر برس پڑا۔ پھر ایک چھوٹے نالہ میں یہ پانی بہنے لگا۔ یہ شخص جو اس حیرت انگیز واقعہ کا مشاہدہ کر رہا تھا نالے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ نالہ ایک باغ میں پہنچ رہا ہے اور وہاں ایک آدمی اپنے باغ کو پانی دے رہا ہے۔ اس نے اس کا نام پوچھا تو باغ والے نے اپنا وہی نام بتایا۔ جو اس نے اوپر سنا تھا۔ باغ والے نے اس سے کہا۔ بندۂ خدا یہ تو بتاؤ کہ تم نے میرا نام کیوں دریافت کیا۔ اس نے پورا واقعہ اسے سنایا اور دریافت کیا کہ وہ اپنے باغ میں کن باتوں کا خیال رکھتا ہے، جس کی وجہ سے اللہ نے خاص طور پر اس کے باغ کو سیراب کرنے کا حکم دیا۔ اس نے جواب دیا کہ اس باغ سے جو پیداوار ہوتی ہے اس کے تین حصے کرتا ہوں۔ ایک حصہ خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہوں۔ دوسرے سے اپنے اور اپنے بچوں کی ضروریات پوری کرتا ہوں۔ تیسرا حصہ خود اس باغ کی دیکھ بھال میں صرف کرتا ہوں۔ (مشکوٰۃ، حوالہ سابق، بحوالہ مسلم)

اس طرح کے واقعات کے بارے میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کی کوئی تاریخی حیثیت ہے یا یہ محض تمثیل ہیں۔ لیکن یہ سوال زیادہ اہم نہیں ہے۔ اصل اہمیت اس بات کی ہے جو ان میں کہی گئی ہے۔ سادہ الفاظ میں وہ بات یہ ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ مال و دولت سے نوازے اس پر اس کا شکر واجب ہو جاتا ہے۔ شکر کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان اپنی زبان سے خدا کا انعام اور اس کے فضل و احسان کا اعتراف کرے بلکہ یہ بھی ہے کہ اسے خدا کی مرضی کے مطابق استعمال کرے اور اس میں بندوں کے جو حقوق ہیں ان کو ادا کرے۔ (محترم مضمون نگار اور ماہنامہ زندگی رام پور کے شکریہ کے ساتھ)

مولانا اشفاق احمد گیاوی
دارالافتاء، دارالعلوم کراچی ۱۴

مدینہ منورہ اور مسجد نبوی

(۲۱) عن عائشة ان النبي صلى الله عليه وسلم كان يقول للمريض بِسمِ اللهِ تُربَةُ اَرضِنَا بِرِيقَةِ بَعضِنَا يُشفىٰ سَقِيمُنَا. (رواہ البخاری)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مریض سے فرمایا کرتے تھے: اللہ کے نام کے ساتھ ہماری زمین کی مٹی ہمارے بعض آدمیوں کے لعاب کے ساتھ مل کر ہمارے بیمار کو شفا دیتی ہے

مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ جب کوئی بیمار ہوتا یا اس کو کوئی زخم وغیرہ ہوتا تو حضور ایسا کرتے تھے۔

علامہ قسطلانی نے مواہب اللدنیہ میں مدینہ طیبہ کی خصوصیات میں لکھا ہے کہ اس کا غبار جذام اور برص کے لیے خصوصیت سے باعثِ شفا ہے۔ علامہ زرقانی نے ان لوگوں کے حالات بھی لکھے ہیں جن کو برص کی بیماری تھی اور خاکِ مدینہ ملنے سے شفایاب ہوئے، بلکہ علامہ قسطلانی یہاں تک فرماتے ہیں کہ مدینہ طیبہ کی مٹی ہر مرض کے لیے باعثِ شفا ہے۔ (فضائل حج ص ۲۲۶، ۲۲۸)

شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب دامت برکاتہم کا ارشاد گرامی ہے کہ "اس ناکارہ کا تجربہ تو یہاں تک ہے کہ مدینہ طیبہ کی مٹی اس دعا کے ساتھ طاعون کی گلٹی کے لیے بھی نافع ہوئی ہے۔"

وفاء الوفاء میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی منقول ہے کہ "اس ذات کی قسم

جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس کی مٹی میں ہر بیماری کا علاج ہے۔

(۱۴۱) عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضـ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنِ اسْتَطَاعَ اَنْ يَّمُوْتَ بِالْمَدِيْنَةِ فَلْيَمُتْ بِهَا فَاِنِّيْ اَشْفَعُ لِمَنْ يَّمُوْتُ بِهَا (ترمذی و ابن ماجہ)

حضرت ابن عمرؓ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ جو شخص اس کی طاقت رکھتا ہو کہ مدینہ طیبہ میں مرے تو اسے چاہیے کہ وہیں آکر مرے، اس لیے کہ میں اس شخص کا سفارشی بنوں گا جو یہاں مرے گا۔

علماء نے لکھا ہے کہ یہاں شفاعت سے مراد خاص قسم کی شفاعت ہے، ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت تو سارے مسلمانوں کے لیے ہوگی۔

مدینہ طیبہ کی موت ایمان کے ساتھ کسی خوش نصیب کو میسر ہو جائے اس سے بڑھ کر اور کیا دولت ہو سکتی ہے کہ جنت البقیع میں دفن کی جگہ نصیب ہو جائے جہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک بڑی جماعت مدفون ہے۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دس ہزار صحابہ کرام جنت البقیع میں مدفون ہیں، ان پاک ارواح پر اللہ جل شانہ کی کس قدر رحمتیں ہر وقت نازل ہوتی ہوں گی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

(فضائل حج ص۲۷۱)

مدینہ منورہ میں حضورؐ کی تشریف آوری اور تعمیر مسجد

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو دارالامان مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا لیکن خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو ان کافروں کے حقیقی ہدف ستم تھے اپنے لیے حکم خدا کے منتظر تھے۔ چنانچہ ہجرت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب دیکھا کہ دارالہجرت ایک باغ و بہار مقام ہے، نبوت کا تیرھواں سال شروع ہوا، اکثر صحابہ کرام مدینہ پہنچ چکے تھے، وحی الٰہی کے مطابق آپ نے بھی مدینہ کا عزم فرمایا، امام بخاریؒ نے اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔

تشریف آوری کی خبر مدینہ میں پہلے پہنچ چکی تھی، تمام شہر ہمہ تن چشم انتظار تھا، معصوم بچے فخر اور جوش میں کہتے پھرتے تھے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا رہے ہیں، روزانہ لوگ شہر سے باہر جمع ہوتے اور دوپہر تک انتظار کر کے واپس چلے جاتے ایک دن انتظار کر کے واپس جا چکے

تھے کہ ایک یہودی نے قلعہ سے دیکھا اور قرائن سے پہچان کر پکارا "اے اہل عرب! تم جس کے منتظر تھے وہ آگیا، تمام شہر تکبیر کی آواز سے گونج اٹھا، انصار ہتھیاروں سے سج دھج کر بیتاباںہ گھروں سے نکل آئے۔

قبا سے مدینہ تک دو رویہ انصار کی صفیں تھیں، ہر قبیلہ سامنے آکر عرض کرتا تھا حضورؐ یہ جان و مال اور دولت حاضر ہے، آپ دعائے خیر فرماتے ہوئے مدینہ پہنچے، سارا مدینہ جوش استقبال میں امنڈ آیا! عورتیں گاتی ہوئیں چھتوں پر چڑھ گئیں، معصوم لڑکیاں خوشی میں دف بجا کر گاتی تھیں۔ جب کوکب نبوی ابو ایوب انصاریؓ کے مکان کے پاس پہنچا تو شرف میزبانی کے لیے سخت کشمکش ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اونٹنی خدا کی طرف سے امور ہے جہاں جاکر بیٹھ جائے گی وہی میری قیام گاہ ہوگی۔ چنانچہ یہ دولت حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئی۔ آپ نے سات مہینے ان کے یہاں قیام فرمایا، اسی وقت سے سنہ ہجری کا آغاز ہوا۔

(سیرۃ النبی ص ۲۶۸، ۲۶۹)

تاریخ مسجد نبوی

اسلام کا سب سے بڑا مقصد عبادات اور تسبیح و تقدیس ہی تھا اس لیے مسجد کی تعمیر سب سے مقدم فرض تھا، عبادت و ریاضت کے علاوہ مسجد مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا مرکز بھی تھی، جہاں مسلمان دن میں پانچ مرتبہ جمع ہوتے تھے، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت کی سخت تاکید فرمائی ہے، جب کوئی قبیلہ مسلمان ہوتا تھا تو اس کے لیے مسجد ضروری ہو جاتی تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی زندگی جن مصیبتوں اور تکلیفوں میں گھری ہوئی اور ہلا دینے والی جن آفتوں اور پریشانیوں سے لبریز تھی اس کی کوئی ادنیٰ مثال بھی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ کمی زندگی جن مشکلات و مصائب سے پُر گذری ہے اس سے سیرت کی کتابیں بھری پڑی ہیں، آپ کو اور آپ کے جاں نثاروں کو جس قسم کی اذیتیں دی گئیں اس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، ایسے نازک اور کٹھن دور میں باضابطہ مسجد کی تعمیر کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا، یہی وجہ ہے کہ مکی زندگی میں کسی باضابطہ مسجد کی تعمیر کا پتہ نہیں ملتا۔ چھپ چھپا کر لوگ نماز پڑھ لیتے تھے، جہاں وقت آجاتا نماز پڑھ لی جاتی۔

عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں۔

کان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یصلی قبل ان یبنی المسجد حیث ادرکتہ الصلوٰۃ (ابن ماجہ ص۵۳ ج۱)	مسجد بننے سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جہاں وقت ہوتا نماز پڑھ لیتے۔

البتہ بعض صحابہ کرام نے اپنے گھروں میں نماز کے لیے ایک جگہ متعین کر لی تھی، جہاں وہ تہجد و نوافل اور گریہ وزاری میں رات کے وقت مشغول ہوتے اور اللہ تعالیٰ سے طلب مغفرت کرتے جن کو فقہ کی اصطلاح میں "مسجد البیت" کہہ سکتے ہیں۔ باضابطہ مسجد اس وقت بنی جب اللہ تعالیٰ کے حکم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ ہجرت فرماتے ہوئے "مقام قبا" میں نزول اجلال فرمایا، یہاں کے چند روزہ قیام میں سب سے پہلے مسجد وجود میں آئی جس کی بنیاد کی پہلی اینٹ خود ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی پھر صدیق اکبرؓ نے پھر فاروق اعظمؓ نے پھر دیگر صحابہ کرام نے (وفاء الوفاء ص ۱۸۰ ج ۱) خود معمار تھے اور خود ہی مزدور، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مسجد سے ایسی والہانہ محبت تھی کہ ہر شنبہ یہاں تشریف لاتے اور دو رکعت نماز ادا فرماتے۔ آپ کے اصحابؓ نے بھی اپنے وقتوں میں اس پر عمل باقی رکھا، یہ مسجد مدینہ منورہ سے تین میل کی دوری پر واقع ہے، قرآن پاک نے اس کی رفعت و عظمت شان کا اعلان ان لفظوں میں کیا۔

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ (سورہ توبہ ۱۳)	البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد اول ہی دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے زیادہ لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں۔

مسجد نبویؐ کی تعمیر

چند دنوں کے بعد قبا سے شہر کی طرف روانہ ہوئے، مدینہ پہنچکر سب سے پہلا کام جو کیا وہ مسجد نبویؐ کی تعمیر تھی، ناقہ جہاں بیٹھی تھی اسی جگہ بنی نجار کے دو یتیموں کی (ویران) زمین پڑی ہوئی تھی۔ آپ نے اس کے متعلق خواہش کا اظہار فرمایا، اس خواہش کی اطلاع پا کر وہ زمین آپ کی خدمت میں بغیر کسی قیمت کے پیش کی گئی اور آپ سے قبول کرنے کی درخواست کی گئی، مگر آپ نے یہ گوارا نہ فرمایا بلکہ قیمتہً لینے پر راضی ہوئے۔ چنانچہ قیمت دے کر زمین حاصل کی گئی۔ قیمت ادا کرنے کا شرف صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو

حاصل ہوا۔ (نووی شرح مسلم ص ۲۰۰ ج ۱، مطبع نول کشور)

اب آپ نے صحابہ کرامؓ کی معیت میں اسی جگہ مسجد نبوی کا سنگ بنیاد رکھا۔ پہلی اینٹ خود ذات بابرکت سراپا رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی پھر آپ کے خلفاء و اصحابؓ نے۔ اینٹوں کے ڈھونے کا کام خود بنفس نفیس اور صحابہ کرامؓ کر رہے تھے اور آپ کی زبان مبارک پر اس وقت یہ کلمات جاری تھے۔

اللّٰھُمَّ لاخیرَ الّا خیرُ الآخرۃ	فارحمِ الانصار والمھاجرۃ

یعنی بھلائی بس آخرت کی بھلائی ہے، انصار و مہاجرین پر (اے اللہ) رحم فرما۔

مسجد نبوی کی سادگی اپنی مثال آپ تھی، کچی اینٹوں کی دیواریں، کھجور کے پتوں کی چھت اور کھجور کے ستون۔ (بخاری شریف باب بنیان المسجد)

مسجد نبوی کی حقیقت

مرکزِ اسلام کی یہ مسجد صرف رسمی مسجد نہ تھی بلکہ اسلام کا ناقابل تسخیر قلعہ تھی جہاں دین و دنیا کے سارے قوانین ترتیب پاتے تھے، لشکرِ اسلام کو قواعد جنگ بتائے جاتے تھے، یہیں سے جہاد کے لیے فوج روانہ کی جاتی تھی، یہیں وفود اترتے تھے، اسی میں مدینہ کا پہلا دار العلوم اسلامی تھا، اسی میں فصلِ خصومات سنائے جاتے تھے، اور اسی میں مجرمین کو قید بھی کیا جاتا تھا۔ گویا دار الشریعت (پارلیمنٹ)، دار العلوم (یونیورسٹی)، دار العسکر (فوجی چھاؤنی) اور دار الحبس (جیل خانہ) گویا سب کام اسی مسجد مقدس سے لیا جاتا تھا اسی میں وہ متبرک حصہ بھی ہے جس کو حدیث میں "روضۃ من ریاض الجنۃ" فرمایا گیا ہے، اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ اس مسجد محترم کے باب میں آپ کا ارشاد ہے:۔

صلوٰۃ فی مسجدی ھذا خیرٌ من الف	میری اس مسجد میں نماز دوسری مسجدوں کی
صلوٰۃ فیما سواہ الا المسجد الحرام	ہزار نمازوں سے بہتر ہے۔ بجز مسجد حرام

(بخاری شریف)	کے۔

مسجد حرام اور مسجد نبوی کے بارہ میں اکثر علماء مسجد حرام کی فضیلت کے قائل ہیں جس کی حدیث سے بھی تائید ہوتی ہے مگر امام مالکؒ مسجد نبویؐ کی فضیلت کے قائل ہیں کیونکہ یہ محترم و مقدس مسجد دس سال تک درگاہِ نبوت اور سجدہ گاہِ رسول رہ چکی ہے اور اسی زمین میں آپ آرام فرما ہیں لیکن

محققین علماء کی رائے ہے کہ من وجہٍ (مثلاً حق نماز میں) مسجد حرام کا درجہ بڑھا ہوا ہے اور من وجہٍ (مثلاً حق موت میں) مسجد رسول کا درجہ بڑھا ہوا ہے۔

(جذب القلوب باب ثانی در مسائل ارکان بحر العلوم ص ۲۸۳)

مگر اس بحث میں پڑنا قرین عقل نہیں، باقی علماء احناف کا فیصلہ یہ ہے کہ افضل مسجد مکہ ہے پھر مسجد مدینہ پھر مسجد اقصیٰ پھر مسجد قبا۔

بلاشبہ مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ اپنی تاریخی اور دینی اہمیت کے لحاظ سے ممتاز ہیں، اسلام میں جو مرتبہ اور بزرگی ان مسجدوں کو حاصل ہے وہ کسی اور کو میسر نہیں، اسی وجہ سے ثواب کی نیت سے ان مسجدوں کے لیے سفر کرنا جائز بلکہ مطلوب قرار دیا گیا ہے، اوروں کے لیے اجازت نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلٰثَۃِ مَسَاجِدَ مسجد الحرام والمسجد الاقصیٰ ومسجدی ھذا (بخاری ومسلم) یعنی کجاوہ نہ باندھا جائے مگر تین مسجدوں کے لیے، یعنی مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور میری (اس) مسجد کے لیے۔

اس حدیث سے اتنی بات ضرور معلوم ہوئی کہ مسجدوں کے درجے متفاوت ہیں خود ان تینوں مسجدوں کے مراتب بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ابن ماجہ شریف کی ایک حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فرض نماز جو گھر میں بغیر عذر شرعی پڑھی جائے، اس کا ایک نماز کا ثواب ہے محلہ کی مسجد میں باجماعت پڑھی جائے تو پچیس گنا ثواب ملتا ہے، جامع مسجد میں نماز کا ثواب پانچ سو گنا زیادہ ملتا ہے، مسجد اقصیٰ میں پچاس ہزار نمازوں کا ثواب ملتا ہے اور میری مسجد میں (یعنی مسجد نبوی میں) پچاس ہزار نمازوں کا ثواب ہے اور مکہ مکرمہ کی مسجد میں ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ہے۔ (مشکوٰۃ باب المساجد فصل الثالث صد۲)

عہ بہت سی احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسجد نبوی کا ثواب مسجد اقصیٰ سے زائد ہے، اس لیے علماء نے ان روایات کی وجہ سے اس حدیث میں یہ توجیہ کی ہے کہ یہاں ہر مسجد کا ثواب اس سے پہلی مسجد کے اعتبار سے ہے۔ اس صورت میں مسجد نبوی کا ثواب مسجد اقصیٰ سے بہت زائد ہو گیا لیکن عام روایات میں مسجد حرام کا جو ایک لاکھ ثواب ہے اس اعتبار سے بہت زیادہ ہو گیا۔

فقہاء کرام نے دوسری حدیثوں کے پیش نظر مسجد اقصیٰ کے بعد مسجد قبا کا درجہ بتایا ہے پھر جامع مسجد کا، پھر محلہ کی مسجد کا، پھر شارع عام کی مسجد کا۔ لیکن پنج وقتہ نماز کے لیے محلہ کی مسجد کو جامع مسجد پر فضیلت حاصل ہے۔ البتہ جمعہ کی نماز جامع مسجد میں ادا کرنا افضل ہے۔

(نظام مساجد ص۱۹ تا ص۲۵)

عہد نبویؐ کی مساجد

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مساجد کی تعمیر پر بھی پورا زور دیا اور اس امر کی تاکید فرمائی کہ جو محلہ ہو وہ اپنے مقام پر عبادت کے لیے مسجد فوراً تیار کرے، آپ کے عہد مبارک میں بڑی بڑی آبادیوں میں ایک مقام پر کئی کئی مساجد تھیں صرف مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کے علاوہ نو مسجدیں تیار ہو چکی تھیں جن میں پانچوں وقت نماز ہوتی تھی۔

(۱) مسجد بنو عمرو (۲) مسجد بنو ساعدہ (۳) مسجد بنو عبید (۴) مسجد بنو زریق (۵) مسجد بنو سلمہ (۶) مسجد بنو غفار (۷) مسجد بنو اسلم (۸) مسجد جہینہ (۹) مسجد بنی راتج۔ (تاریخ اسلام ج اول دار المصنفین ص۹۳)

تعمیر رسول مقبولؐ میں مسجد نبوی کا طول و عرض

تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءِ تعمیر میں مسجد کی دیواروں کی بلندی قد آدم سے کچھ زیادہ تھی، چنانچہ احادیث میں یہ آتا ہے کہ "کان مقارب السقف" یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ مسجد بہت نیچی چھت کی تھی اس وقت نمازیں چونکہ مسجد اقصیٰ کی طرف رُخ کر کے پڑھی جا رہی تھیں اس وجہ سے دیوار قبلہ بیت المقدس کی سمت رکھی گئی تھی، یہ وہ دیوار ہے جس میں اب باب النساء جو باب جبرئیل والی دیوار ہے اس کا بایاں گوشہ شام کی سمت ہے۔ مسجد کے تین دروازے رکھے گئے، ایک دروازہ جہاں اب قبلہ کی دیوار ہے، دوسرا دروازہ مغرب کی جانب جس کو اب باب الرحمۃ کہتے ہیں، تیسرا شرق کی جانب جس کو اب باب جبرئیل کہا جاتا ہے، اسی دروازے سے آپ مسجد میں تشریف لایا اور لے جایا کرتے تھے۔

خارجہ ابن زید فقیہ مدینہ سے منقول ہے کہ مسجد کا طول ستر ذراع (ذراع کی مقدار دو بالشت سے کچھ زیادہ ہوتی ہے گویا ایک ذراع ڈیڑھ فٹ کا ہوتا ہے) اور عرض ساٹھ ذراع، مسجد نبوی کے طول و عرض کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔ ابن البخار نے بیان کیا ہے کہ طول ۷۰ ذراع اور عرض ۶۰ ذراع تھا۔

محمد بن یحییٰ نے بیان کیا ہے کہ :۔ شامی حد ۵۴ اور دو تہائی ذراع اور مشرق و مغرب کی حد ۶۳ ذراع۔

ایک روایت میں اس کا طول و عرض سو سو ذراع منقول ہے۔ ساٹھ، ستر اور سو ذراع کی روایتوں کا فرق اس بات پر مبنی ہے کہ مسجد نبوی کی تعمیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ فرمائی، ایک دفعہ ہجرت کے بعد (یہ احاطہ بنو نجار سے خرید کر تعمیر کی گئی۔ اس وقت اس کا طول و عرض ساٹھ اور ستر ذراع یا اس سے قدرے کم تھا)

دوسری دفعہ فتح خیبر کے بعد ۷ھ میں تعمیر کی گئی اس وقت پیمائش کے اعتبار سے سو ذراع طولاً و عرضاً تھی۔

معجم طبرانی میں ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مسجد نبوی کی توسیع کا ارادہ فرمایا تو مسجد سے متصل ایک انصاری کی زمین تھی، آپ نے اس سے فرمایا کہ تم جنت کے ایک محل کے عوض یہ زمین ہمارے ہاتھ فروخت کر دو، وہ صحابی کثیر العیال اور تنگدست تھے اس لیے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ دس ہزار درہم اس کو معاوضہ دے کر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا یا رسول اللہ! آپ جو قطعۂ زمین اس انصاری سے جنت کے محل کے عوض خریدنا چاہتے تھے وہ مجھ سے جنت کے محل کے عوض خرید فرما لیجیے۔ آپ نے اس کو قبول فرما کر مسجد میں شامل کر دیا۔ اس کی تعمیر میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی شریک تھے چونکہ آپ ۷ھ میں اسلام لا چکے تھے۔ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بھی اس کی تعمیر میں شامل تھے چونکہ آپ ۵ھ میں مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ (تاریخ حرمین از ص ۹۳ تا ص ۹۵)

(بشکریہ البلاغ کراچی)

تصوف کیا ہے؟
مولانا محمد منظور نعمانی
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
اور مولانا محمد اویس ندوی
کی مشترکہ تصنیف
اردو میں تصوف سے متعلق کئی اچھی کتابیں اس زمانہ میں شائع ہو چکی ہیں، لیکن یہ کتاب اپنے اختصار کے باوجود انصاف، تحقیق اور مباحث کے سلجھاؤ کے لحاظ سے اپنے موضوع میں بہت ممتاز سمجھی گئی ہے اور اُن تمام حق پسند حضرات کیلئے باعث اطمینان ثابت ہوئی ہے جو تصوف کے بارے میں انصاف سے غور کرنا چاہتے ہیں۔
آٹھ گران قدر مقالوں پر مشتمل ہے
معیاری کتابت و طباعت
عمدہ کاغذ
خوبصورت گردپوش سے مزین
قیمت مجلد — صرف پانچ روپیہ (علاوہ محصولڈاک)
تاجر حضرات کیلئے معقول شرح کمیشن
ہماری دیگر اہم مطبوعات
تصنیفوں کی جانکاری کیلئے ہماری فہرست کتب طلب فرمائیں
اسلام کیا ہے؟
دین و شریعت
قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟
معارف الحدیث مکمل
تذکرہ مجدد الف ثانی
مکتوبات خواجہ محمد معصوم
حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت
ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس
صحبتے با اہل دل
مجموعہ ملفوظات حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی بھوپالی
منتخب تقریریں
تصوف کیا ہے؟
نماز کی حقیقت
کلمہ طیبہ کی حقیقت
برکات رمضان
انیس نسواں
بریلوی فتنہ کا نیا روپ
فیصلہ کن مناظرہ
شاہ اسمٰعیل شہید
انسانیت زندہ ہے
آپ حج کیسے کریں
آسان حج
سفرنامہ حجاز
میری طالبعلمی
کفر و اسلام کے حدود اور قادیانیت
دینی مدارس کے طلباء سے
قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ
ناشر کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

Regd. No. I.LW/NP-62

Monthly 'ALFURQAN' 31, Naya Gaon West Lucknow (U.P.)

VOL. 44 NO. 12 DECEMBER 1976 Phone : 25547